اس دور کا خوبصورت ڈیزائن
موجد
کے کمال فن کی گواہی دیتا ہے

مشہورِ عالم کیپسٹن

جسے صاحبِ ذوق حضرات ساری دُنیا میں پسند کرتے ہیں۔ جس کا ہر کش لطیف اور تسکین بخش ہے۔ اپنی اعلیٰ کوالٹی کی بدولت پچاس سے زائد ملکوں میں مقبول۔

کیپسٹن لندن میں بگ بین کے قریب۔ ہانگ کانگ کے عالیشان بندرگاہ میں

سڈنی جیسے دُور دراز شہر میں باآسانی دستیاب ہے۔ آپ دُنیا کے ہر حصے میں کیپسٹن سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔

کالونی تھل ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
اسماعیل پور، بھکر کی :-
مصنوعات
مثلاً : وائل — ۴۰۴۰ — ۳۰۳۶
مختلف دیدہ زیب رنگوں میں وائل — ۳۰۳۶
مشہور عالم دو چابی مارکہ سفید لٹھا — ۹۵۰۰۰
لٹھا — ۱۱۰۰۰ لٹھا — ۴۴۰۰۰
ان کے علاوہ،
کھدر کریپ ۴۴۳۶ ۴۴۴۰
پاپلین ○ نیلم ○ موون لائٹ
نرگسی آنچل • پی ۹۹۱۱ • پی ۷۷۷ • پی ۹۹۷۱ • پی ۱۲۱۲
ایس آر ۵۵۵ • ٹی ۴۰۰۰ • پاپلین پی ۳۰۰۱ • سفید کیمبرک ۱۸۸۷
کالونی تھل ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ، اسماعیل پور (بھکر)

CAVANDER'S
NAVY CUT
کیوینڈرز
پاکستان کا
پہلا
میگنم
سگریٹ
CAVANDER'S
MEDIUM
NAVY CUT
MAGNUM
خوردہ قیمت
۳۸ پیسے
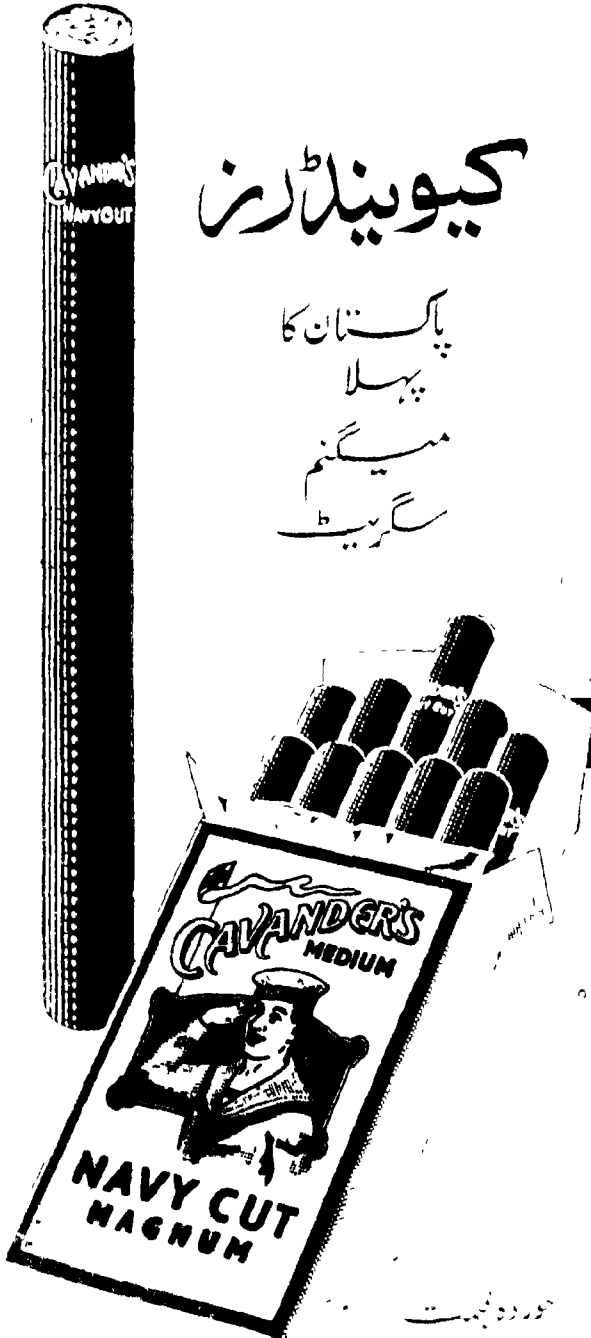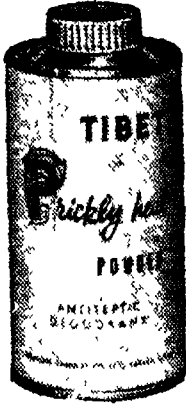
ITED FPH 1/67

ٹیلیفون: ۶۹۵۸۰

فنون

خاص سہ ماہی شمارہ

۸

ادارہ

احمد ندیم قاسمی   حبیب اشعر دہلوی

تزئین

موجد

مئی، جون ۱۹۶۷ء   شمارہ: ۱،۲

۱۴ روپے   غیر ممالک سے: ۲۵ روپے

قیمت فی پرچہ (اشاعتِ خاص ۸) ۳ روپے ۵۰ پیسے

مقام اشاعت: ۴۷ - انارکلی - لاہور (مغربی پاکستان)

مندرجات

سرورق ——— عمل : مرجد
مستقبل ——— زوفی ، اسد علی
بیگم عطیہ فیضی ———
سعادت حسن منٹو ——— عمل ، مرجد
میراجی ———

افسانے

مکالمہ

ڈرامہ

سفرنامہ

منٹو کی یاد میں

طنز و مزاح

اختلافات

تبصرے

میرا جی

بشکریہ ضیا جالندھری

نديم

حرفِ اوّل

فنون کے سہ ماہی نمبروں کی بروقت اشاعت کے موسم راغ کو اب کے اخباری کاغذ (نیوز پرنٹ) کی نایابی اور اس کے بعد گرانی نے شکست دی۔ اب تک کی قیمتیں معمول پر نہیں آئیں۔ "فنون" اور دوسرے معیاری ادبی رسائل کے لئے یہ قیمتیں ناقابل برداشت ہیں تو سہ ماہی رسالے کی اشاعت میں تاخیر بھی ل برداشت ہے ۔ ان میں سے ایک کو برداشت کرنا ضروری تھا، سو "فنون" کی سہ ماہی اشاعتِ خاص پیش خدمت ہے ۔

ذ کی مشکل

ہم قارئین اور معاونین سے اس تاخیر کے معذرت خواہ ہیں۔ ملکی مصنوعات کو اہل ملک تک پہنچانے کے ذمہ دار حضرات سے شاکی ہیں کہ بڑے بڑے صنعتی ادارے تو شاید کاغذ کی نایابی اور گرانی کو اتنی شدت سے محسوس نہ کرتے ہوں مگر یہ صورت حال ادبی رسائل کے لئے زندگی و موت کا مسئلہ بن جاتی ہے۔ بازار میں قیمتیں من مانا عروج حاصل کرتی رہتی ہیں اور کسی کو توفیق نہیں ہوتی کہ وہ اس کا تدارک کرے اور صنعت کو مدھاسے یا پھر ایسے دعاوی ہی جاری کر دیا جائے کہ ملکی ضروریات سے کہیں زیادہ کاغذ تیار کرنے والے کارخانے کو کاغذ مہیا کرنے کے سلسلے میں بیکار کہار کا ڈھیں پیش آگئی ہیں۔ پاکستان میں "انجمن ادبی ل" کے نام کا ایک ادارہ بھی ہوا تھا۔ "فنون" کو اس ادارے کی رکنیت کی عزت حاصل نہیں ہے مگر اس متذکرہ انجمن سے یہ پوچھنے کا حق تو شاید حاصل ہے کہ کاغذ کے اس شدید کے دنوں میں اس انجمن نے اپنے وجود کا کیا ثبوت مہیا کیا ہے اور کیا اس کی سرگرمیاں صرف انتخابات اور عہدوں کی تقسیم تک محدود رہیں۔ کم سے کم لاہور سے شائع ہونے والے ادبی و علمی رسائل کو کاغذ کی اس نایابی اور گرانی نے بے حد پریشان کر رکھا ہے اور انجمنیں ایسے ہی حالات کے مقابلے کے لئے قائم کی جاتی ہیں ۔

شکل کا حل

یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ "فنون" کو کاغذ حاصل کرنے یا مقررہ قیمتوں پر حاصل کرنے میں دشواری پیش آئی ہو۔ قریب قریب ہر اشاعت پر ہمیں ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اس مشکل کا کوئی سبب سوائے اس کے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کاغذ انڈسٹری نے مغربی پاکستان میں اپنا کوئی ذخیرہ قائم کی ضرورت ۔ تک محسوس نہیں کی اور ساحل کراچی پر جہازوں کے لنگر انداز ہونے میں ذرا سی تاخیر مغربی پاکستان کے تمام شہروں میں کاغذ کے بازاروں میں تہلکہ تی ہے متعلقہ حکام سے استدعا ہے کہ وہ اس صورت حال کے حتمی سدباب کی کوئی سبیل سوچیں اور ادبی رسالوں کو باقاعدگی سے جاری رہنے کا موقع بخشیں ۔

عطیہ فیضی

گزشتہ دنوں ہماری تہذیب و ثقافت کی ایک مجسم تصویر کو جس کا نام بیگم عطیہ فیضی تھا، موت نے ہم سے چھین لیا۔ بیگم عطیہ فیضی کے انتقال کے بعد ہی اہل ملک پر یہ انکشاف ہوا کہ ان کی شخصیت کتنی ہمہ جہت اور ہمہ رنگ تھی۔ پنجابی کے معروف شاعر اور اردو کے مشہور صحافی منو بھائی نے عطیہ فیضی کے انتقال پر امروز میں جو یادگار مرثیہ نثر لکھا تھا وہ اخبار مذکور کے شکریے کے ساتھ "فنون" میں شامل کیا جا رہا ہے کہ ہماری صحافت میں اس سے زیادہ موثر ماتم شاید ہی کسی تہذیبی شخصیت کا ہوا ہو۔

شاہد احمد دہلوی

پرچہ پریس میں بھیجا جا چکا تھا جب اردو زبان و ادب کی ایک اہم شخصیت شاہد احمد دہلوی کے انتقال کی خبر ملی۔ ہم شاہد احمد مرحوم کے متعلقین کے ساتھ اس غم میں برابر کے شریک ہیں کہ یہ غم پاکستان کی بھری تہذیبی زندگی کا غم ہے ۔

شاہد لطیف

اردو کے ایک ذہین افسانہ نگار اور فلمی ہدایت کار، شاہد لطیف بھی گزشتہ دنوں بمبئی میں انتقال کر گئے۔ ہمیں اس حادثے پر مرحوم کی بیگم عصمت چغتائی صاحبہ سے دلی ہمدردی ہے۔ آئندہ شمارے کا ایک حصہ بچھڑنے والے ان دونوں دوستوں کے لئے وقف کیا جائیگا۔

مختار صدیقی

کوئی ایسی طرزِ طواف ——

پہلا تابلو

عرفات

دن کی یہ خیرہ کُنساں دھوپ
اُجالوں کی جنوں خیز چمک !
رات کی یہ بیرتی ٹھنڈک کی نمُو دشمنی

صحرا سازی

آب کم یاب سے اس دیس کی محرومی
ہر اک رُت کی خزاں پروازی!
خار و خس مُردہ، یہ بے برگ و نوا ٹیلے فسردہ
یہ زمیں افتادہ!
خاک بھی زرد و زبُوں حال، تو ہر سنگ بھی بدرنگ یہاں
ریت تک جھلسی ہوئی بھوری، کہیں حدِ نظر تک
کوئی بستی نہ نشانِ جادہ!
پست کہساروں کے یہ سلسلے
میداں میں
ڈھلانوں پہ
نشیبوں میں بچھی کنکریں
ویرانی و نکبت کا یہ بے آب خرابہ
نہ گلستاں ہے نہ صحرا زادہ!!

ریگ و صرصر کا یہی دشتِ بلا ہے

جسے ٹھہرایا گیا مخزنِ خیرا

ملسفلے آتے ہیں — رُکتے ہیں یہاں

تازگیٔ جاں کے لیے !

حلِ مشکل میں کسی حیلۂ آساں کے لیے !

اور پر و بالِ ارماں کے لیے !!

(۲)

وقوفِ عرفات

تو بتو ریت کے بے پایاں سمندر پہ اُبھرتے ہیں حباب !

اور — ہر رنگ

ہر اک نسل

ہر اک عمر کا یہ جمِ غفیر —

اپنے ہی خیموں کی صورت — یہ کفن پوش ہجوم !

اپنے ہی ڈیروں، قناتوں کی طنابیں — یہ لوگ

اپنی عمروں کے ہر اک درد کی

بوسیدہ کتابیں — یہ لوگ !

اپنی ہر ایک دُعا، اور مناجات مجسّم

نہ یہ گویا نہ یہ خاموش ہجوم !

اپنے ہی سجدوں کی بے تاب — جبینیں — یہ لوگ !

اپنی دُنیاؤں کے خود آسماں

خود عجزِ تمنا کی زمینیں — یہ لوگ

ہر طرف پھیلا — رُکا

بڑھ نہ سکا

ٹھوکریں کھاتا رہا

خود ہی — نہ یہ بے ہوش نہ باہوش ہجوم !

نہ یہ بے حس نہ یہ پُرجوش ہجوم،
یہ نہ بھوکا نہ شکم سیر
نہ پیاسا، نہ بلانوش ہجوم!

یہ قناتوں کی طنابیں!
یہ ہر اک درد کی بوسیدہ کتابیں — یہ لوگ
یہ مناجات کے سجدوں کی جبینیں — یہ لوگ
عاجزی اور ندامت کی زمینیں — یہ لوگ

(۳)

دن کی صرصر زدہ اور خشمگیں گھڑیاں
نہ گزرتی نہ ٹھہرتی گھڑیاں!

کائنات اور وجود اور زماں سے
نہ الگ اور نہ مربوط
نہ زندہ ہی، نہ مرتی گھڑیاں!

خیموں اور لوگوں کی
یہ اوّلیں اور آخریں گھڑیاں
نہ بگڑتی، نہ سنورتی گھڑیاں!

سہ پہر تک رہیں آباد —
یہ صرصر میں نہ دبتی، نہ اُبھرتی گھڑیاں!

سہ پہر تک رہیں آباد —
مگر اُن کی تپش اور تمازت میں نہ کچھ آیا زوال!

ہر گھڑی ایک عجب صبر
عجب چین
عجب منّت و زاری سے رہی
کیسی بحال، اور نہال، اور چونچال!

(۴)

اس قیامت پہ مگر طرفہ سکوں ہے طاری
دیسے، ہر سمت فضاؤں میں تھی فریاد و فغاں و زاری!
کردہ ناکردہ گناہوں پہ وہ گریے بھی
کراہوں کی بھی پردہ داری
دل کے ارمانوں کی آوازیں گلوگیر
تمنّاؤں کے لہجے بھاری!
نسلوں اور عمروں کے، زخموں کے لیے
راحتِ مرہم کی طلب
اور ندامت کی جگرافگاری
اپنے فردا میں نئی زیست سے جینے کی
نئی موت سے مرنے کی نئی تیاری

دُوسرا تابلو

مزدلفہ کی رات

موتیوں اور ہیروں سے بھی پیاری اُجلی چاندنی!!
جھلملاتی ریت کی پہنائیاں، خنکی سے چوُر!
سائے لٹ چھٹکائیں، ان میں نور کے موتی پروتی چاندنی!
کوہ و صحرا کے پرانے زنگ دھوتی ان میں رنگ اپنا سموتی چاندنی!
اس تھکے انبوہ کی رُوحوں پہ برقِ طور ہوتی چاندنی!!
نرم جھونکے کس قدر آسودہ — کتنے ناصبور!
نسلوں اور عمروں کی راتوں میں کہیں آتی ہے
ایسی شام
یہ راتوں کی رات!
پہلے ایسا دن بھی گزرے
یہ دنوں کا دن - ازل آثار دن!

پھر کہیں آئے گی
ایسی روح میں ہستی ابد انجام
یہ راتوں کی رات!

دل میں اس کا حُسن، اس کا نور بھر لو — (دیکھو اب رونا نہیں)
اب گئے دن
اور نئے دن رات بھی، شاداب کر لو — (یہ بچپن کھونا نہیں)
اس سکوں اس چین کی رعنائیوں میں
خوب جی بھر کر سنور لو — (اس جگہ کچھ جاگنا سونا نہیں)
اور ریتی کی کنکریں چُننے کو
گردوپیش کی بھی کچھ خبر لو — (یہ خزانہ ہیں مگر ہیرے نہیں سو)

لاکھوں ہاتھوں ناخنوں میں
شعلہ افشاں اک تڑپ!
کنکریں چنتی ہیں —
کھودو اور کھودو!
رات کو چاہے سحر کرنا پڑے
ریت کی ہر تہہ کو چاہے سنگِ سر کرنا پڑے!!
کنکریں چُن کر — انھیں دھونا بھی ہے
گننا بھی ہے
کنکریں پوری بھی کرنی ہیں!
یہ صحرا ہو تہ و بالا
یہاں پاتال کو چاہے خبر کرنا پڑے!!

پھیلی شب آئی
نوکیلے، تیز تاروں کے دمکتے قافلے!

روح میں رچنے لگا ہے کوئی انجانا گداز
چُھپ کے ہلکوروں سے اب کچھ راز کی باتیں کرو!
کیسے پر بستہ ہو
—— کچھ تو حسرتِ پرواز کی باتیں کرو!!

باتیں ——

اے کہ میرے دل میں تیری پاک تنویریں بھی ہیں
میں نے ہر بُت جو بنایا اس کی تصویریں بھی ہیں
میری کایا کے کھنڈر پہ ثبت ہے تیری بقا
روح کی ویرانیوں میں تیری تعمیریں بھی ہیں

تیری راہ کا یہی ناز ہے، جو ملا سو آبلہ پا ملا
تجھے پا کے بھی یہی کر سکا، کہ وہ اپنے آپ سے جا ملا

مری زندگی کے تمام مرحلے آج میری نظر میں ہیں
مرے کیف و کم کے معاملے اسی شب کی راہ گزر میں ہیں

اسی ریت کا، اسی رات کا کوئی ذرّہ کوئی گھڑی ملے
تو یہ کائنات ہو نعرہ زن کہ تجلیاں مرے بر میں ہیں

کبھی رنج کوئی کٹا بھی ہے کبھی درد دل سے ٹلا بھی ہے
اے خدائے چارہ گری بتا کہ تو درد بھی ہے دوا بھی ہے

غمِ جاں تو میری سزا سہی، غمِ عشق دل کی خطا بھی ہے
ترا کھینچنا، ہم سے روا بھی ہے کہ تو حُسن بھی ہے خدا بھی ہے

رمیٰ جمار

اور اب دن کا ہر اک لمحہ
ہجوم اور شیاطین پہ برستے کنکر

کیسے فرسودہ و سنگیں ہیں یہ شیطان
عجب ساکت و بے بس بھی نظر آتے ہیں
اُن گھڑ بھی ہیں —
پھر بھی مری صدیوں میں بسے ہیں! — توبہ!
مرے ادراک کی توبہ
مرے اندیشۂ چالاک کی توبہ
مری دانش مری حکمت کی الٰہی توبہ!!

تیسرا تابلو

حرم

ماندہ مخلوق کا دم آ گیا آنکھوں میں
تھکی جانیں دعاؤں میں ہوئی ہیں لرزاں!
رب ترا گھر — ترا کعبہ تیری مخلوق پہ ہے سایہ کناں!

یہ سیہ ریشمی ملبوس میں لپٹا ہوا
یہ سارے جہانوں میں اکیلا گھرا!
سادگی اور حشم کا یہ انوکھا نقشا!
کبریائی کی جلالت کا
خدائی کی کرامت کا
ہر اک قدرت و شفقت کا ازل سے قبلہ!
اس کے سائے میں کوئی مشرق و مغرب نہیں
ہر سمت و جہت ہی سے یہی اور اُسی کا جلوہ!
پھیرے پھرتی ہوئی
احرام میں جکڑی ہوئی
دیوانگی — پل پل اڈی

آپا دھاپی کے ہر اک پاٹ میں

پستی ہوئی فرزانگی ـــ پل پل اڑی

نفسا نفسی کی قیامت میں وہلتی ہوئی شرمندگی ـــ پل پل اُڑی

حلقۂ رسم میں اک سنگ کو اب چومتی

پھیروں کے نئے پھیر نئے گھیر میں

چکرائی ہوئی - بندگی پل پل اڑی!

لغزشوں اور خطاؤں پہ دعا ساز ـــ یہ تُو

اپنے گناہوں کا در باز ـــ یہ میں!

اپنی ندامت کا کھلا راز ـــ یہ وہ!!

اور ـــ دیوارِ حرم سے یہ لپٹتے ہوئے

روتے ہوئے

یہ ـــ تُو بھی یہیں

میں بھی یہیں

وہ بھی یہیں!!

م ابراہیم

سجدہ گہ فرشِ حرم بھی ہے

ترا اور مرا جسم بھی ہے

پاؤں بھی، احرام بھی ہیں

سجدۂ شکر ادا کر کے یہاں لطف و عنایات کو ارزاں کر لیں

جسموں اور روحوں کو اس چشمۂ رحمت سے گلستاں کر لیں

جلوے اتنے ہیں کہ اب حیرتِ جلوہ نہ رہی

سجدے اتنے ہیں کہ اب طاقتِ سجدہ نہ رہی

صفا و مروہ

ایک ماں تھی جو انہی ٹیلوں میں دوڑی تھی

کہ مل جائے ذرا سا پانی

اب یہاں صدیوں سے ہر دوڑتا انبوہ تو زمزم سے ہے سیراب
پہ تھمتا نہیں آنکھوں سے اُمڈتا پانی!
آفرینش کی گواہی ہے یہ اب!
اور جنم دان کی یہ شرط ہے اب!
جو بھی زمانے ہوں وہ دنیاؤں کی حد تک دوڑیں!
صدیاں پاں مائیں نہیں اور ابد تک دوڑیں!

چوتھا تابلو

احن شوقاً الیٰ دیارِ ....
اور اب آنکھوں میں جلنے لگیں،
اِک راہ بتاتی راہیں
حیرتوں کو ترے جلووں سے ملاتی
تو کبھی کچھ نہ دکھاتی راہیں
میری رگ رگ میں دھڑکتی ہوئی
تقدیر کی شاہراہ بناتی راہیں
یہ وہ راہیں ہیں جہاں پاؤں نہیں
پاسے مژہ سے چلنا سفرِ شوق کے آداب میں ہے
یہ وہ راہیں ہیں جہاں اندھی تمازت کا وبال
باد پائی کے لیے حیلۂ نایاب میں ہے
یہ وہ راہیں ہیں جہاں گر کے نہ اُٹھنا ہی رہا عین حیات
یہ وہ راہیں ہیں، کہ ہر خم میں کہانی ہے
تو ہر ذرّے میں بات
یہ وہ راہیں ہیں جو منزل نہیں
منزل سے مگر کم بھی نہیں
یہ وہ راہیں ہیں کہ جو تا بہ حرم جاتی ہیں

اور ان میں دم رم بھی نہیں
یہ وہ راہیں ہیں جو کعبے سے پلٹ آتی ہیں
یثرب کو نکل جاتی ہیں
اور ان میں کوئی پیچ، کوئی خم بھی نہیں
اور ان راہوں میں ہیں — گنبدِ خضرا کے الوہی انوار
رُوح کھنچ آئی ہے آنکھوں میں، کُھلا ہے سینہ
اشک بے ساختہ بہ نکلے ہیں — یہ قلبِ تپاں
یوں دھڑک اُٹھا ہے — پھر جیسے نہ دھڑکے گا کبھی

جسمِ اطہر کی یہ آرام گہہِ عرش نشاں
سجدہ گہہِ ہفت نماں
گنبدِ سبز کا یہ دائرۂ یمن و سعادت
یہ سپہرِ رحمت!
یہ زمیں، نورِ نبوّت کی امیں
خلوتِ حضرت — یہ زمیں
یہی مقصودِ جہاں ہے
یہی اعلیٰ
یہی اولیٰ
یہی اکبر
تو یہی امینِ رحمت — یہ زمیں!!

احمد فراز

کشن بی بی

تو جب
ہمبر ستین کے فانی پہاڑوں کی صلیبوں سے اُتر آئے
تو یہ جانا
کہ ہم وشتِ عدم کو پار کر آئے
ہر اک کے پاؤں چھلنی، جسم شل
اعضا تھکن سے چُور
لیکن سب
ہراسِ مرگ سے بے جان — بے حس تھے
سبھی یوں زرد رُو جیسے
ابھی تک آسمانوں کے سفر سے لوٹ کر
روحیں نہیں آئیں
چلو ہم سب کے سب زندہ ہیں
جیسے بھی ہیں، یکجا ہیں
ضیا، باسط، سعید اور میں

ہمارا میزباں کب سے، نہ جانے
گھر کے دروازے کھلے چھوڑے
سبک شہتیر کے پُل پر ہمارا منتظر تھا
اس کو یہ معلوم تھا

ہمبر ستین: کافرستان کی خوبصورت وادی

ہم اجنبی مہماں
سیاحت کے بے کن مشکلوں سے
ہفت خواں طے کر کے
اس وادی میں آئیں گے

چناروں کے بلند اشجار
انگوروں کی بیلیں
چار سُو سبزہ
ہوائیں بید مشک و عود و مُر کی خوشبوؤں سے پُر بوجھل
طائرانِ خوشنما و خوش نوا ـــ بے کل
سبک رفتار چشموں کی تہوں میں
پتھروں کا نیلم و یاقوت سا جھل بل
ادھر کچھ دور بُزغالوں کے گلے
نوجواں چرواہیوں کے دودھیا چہروں کی صورت
برف سے شفاف و دل آرا
فضا حیرت فزا ـــ سحر آفریں دنیا
"مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را"

ہمارا میزباں مفلس تھا
لیکن شام کو خوانِ ضیافت دیکھ کر ہم
خس بدنداں تھے
کشادہ طشت میں بُزغالہ بریاں
بطک میں آبِ تاک
اور کشتیوں میں ڈھیر سیبوں کے
الاؤ کی دہکتی آگ کتنی گرم

کتنی خوب صورت تھی

مگر ہم منتظر اس پل کے تھے
جب کافرستاں کی جواں پریاں
زمیں خلد کی حُوریں
دف و مردنگ کی تھاپوں پہ رقصاں
اپنے محبوبوں کی فرقت کے
نشیلے گیت گائیں گی

الف لیلا کے شہزادوں کی صورت
ہم میں ہر اک
اس طلسماتی فضا کے سحر میں گم تھا

بتانِ آذری کا رقص جاری تھا
سیہ ملبوس میں لپٹے ہوئے
مرمر کے بُت
مہتاب سے پیکر
سبھی باہوں میں باہیں ڈال کر زنجیر کی صورت
کماں کی شکل میں جُنباں
کہ جیسے دیوتاؤں کے رتھوں کی گھوڑیاں
وحشت سے پاکوباں
دف و دمامہ و مردنگ کے آہنگ میں
آہستہ آہستہ
کھنکتے قہقہے، محجوب آوازیں بھی
شامل ہو گئیں آخر

کہ جیسے ان گنت سازوں میں
پائلیں چھنک اٹھیں
سبھی غارت گرِ تمکین و ہوش و دشمنِ ایماں
ہر اک فتنہ گرِ دوراں
گروہ سر گروہِ نازنیناں

غیرتِ ناہید
جانِ حلقۂ خوباں
گلشن بی بی
قد و قامت - قیامت
جنبشیں - جادو
بدن - طوفاں

ضیا کردار میں گوتم
مجسم صدق و ایثار و وفا
درد آشنا و نفس کش ہمدم
لہو اس کا بھی اس شعلے نے گرمایا
مگر سب سانحیوں سے کم

تبانِ آذری رقصاں
مگر باسط جو اک فنکار
لیکن شکوہ سنجِ زندگی ہردم
قلم اس کا دُر افشاں و گہر تحریر
لیکن خود تہی داماں
شکستہ دل
خود اپنے فن سے، اپنے آپ سے نالاں

قوسِ قزح

یہاں دنیا کے غم بھولا ہوا
بسمل
ہر اک پیکر پہ سو سو جان سے قرباں

سعید اک کم نظر، جذبات کا پُتلا
مہندس
اور فقط جسموں کا سوداگر
جو اپنے ساتھیوں سے بھی چھپا کر ساتھ لایا تھا
کئی تحفے
ملمع کی ہوئی انگوٹھیاں
جھوٹے نگوں کے ہار
دل آویز آویزے
کسی ماہر شکاری کی طرح
اپنی کمند و دام پر نازاں
ہر اک پر سحر طاری تھا
نشاطِ آذری کا رقص جاری تھا

ضیا حیرت میں گم
باسط زخود رفتہ
سعید افسوں زدہ
مَیں بُت!

کشن بی بی کے لب
کلیوں کی صورت نیم وا
اور ہم فقط
آواز کی خوشبو سے پاگل

لذتِ معنی سے نا محرم
"زبانِ یارِ کیلاشی و ما از حرف بیگانہ"

(ہمارے میزباں نے ترجمانی کی)
کشن بی بی یہ کہتی ہے —

"مرے محبوب، تُو اک دستۂ مُر ہے
کہ جو راتوں کو میری چھاتیوں کے درمیاں
خوشبو لٹاتا ہے
مری ہمجولیو!
بستی کے سارے نوجوانوں میں
مرا محبوب پیارا
جس طرح بن کے درختوں میں ہو نخلِ سیب استادہ
مرا محبوب
جیسے جھاڑیوں کے درمیاں کوئی گُلِ سوسن
مرا محبوب مجھ سے کل ملا تھا
اس نے مجھ سے خوب باتیں کیں
وہ کہتا تھا کہ اے میری پری
اے نازنیں
اب تو مری بستی کو میرے ساتھ چل
برسات کا موسم چلا
بادل برس کر کھل چکے
انگور اور سیبوں کی مٹی جاگ اُٹھی
اے کوہساروں کی کبوتر
تو نہ جانے

[illegible]

کن پہاڑوں کی دراڑوں میں چھپی ہے
آ مرے ہمراہ چل پیاری —"

بتانِ آذری کا رقص جاری تھا
فضا پر سحر طاری تھا
ہر اک کی آنکھ میں تل کی طرح
وہ کافرستاں کی قلوپطرا
مگر ہم میں کوئی سیزر نہ انطونی

ضیا گوتم سہی
لیکن کشن بی بی
وہ کافر جو ضیا کو بھی نہ سونپی جائے ہے مجھ سے

نہ جانے کس طرح یہ شب ڈھلی
لیکن سحر دم
جب پرندوں کے چہکنے کی صدا آئی
کشن بی بی
سیہ ملبوس میں پیشی
جبیں پر کوڑیوں کا تاج
گالوں پہ گھنی زلفیں
کنیزوں کی طرح اپنی رفیقوں کو لیے
رخصت ہوئی ہم سے
بصد انداز استغنا و دارائی
تو ہم سارے تماشائی تھے پتھر
اور پتھر تھے تماشائی

ظہور نظر

اور میں

ذہن میرا مجھ سے کہتا ہے کہ تو
ہے خود اپنے دل کے صحرا کا سراب
کون تیرے پاس آئے، کس لیے آئے
کہ خواب ـــــ،
جاگتی آنکھوں سے کرتے ہیں گریز
منتظر لمحوں پہ بنتے ہیں عذاب
اتنا کیا کم ہے کہ دشتِ دل کی تپتی دھوپ میں
تو جب اپنی تشنگی کو خود دکھاتا ہے سراب
چھوڑ کر جاتے نہیں تجھ کو، تری
روح کے بے چین و بے منزل سحاب

اور میں ـــــ،
بے رحم بوڑھے وقت کی زنجیر میں جکڑا ہوا
چیخ اٹھتا ہوں کہ ایسا ہے تو پھر
تشنہ لب، ترسیدہ، نم دیدہ تمنائیں، کہ جو
میرے دل سے میری جانب ہیں رواں اک عمر سے
ختم سیرِ دشت کرتی کیوں نہیں ! ؟
کیوں نہیں تھکتی ہیں، مرتی کیوں نہیں ! ؟

ادا جعفری

میلادِ بہار

رازداں بہاروں کے
تم کہ طفلِ ناداں ہو
جانے کس گلستاں سے
میرے پاس آ پہنچے
کتنے شوق سے میں نے
اپنے گھر کے آنگن کی
تم کو آبرو بخشی

سال بیت جائیں گے
جب بہار آئے گی
ریشمیں شگوفوں کے
زمزمے بکھیرو گے
اپنے آپ میں کھو کر
تکہتوں کے شہ پارے
لوحِ جاں پہ لکھو گے
سوچ ہمہ جوانی کی
نازسب حسینوں کے
ایک جیسے ہوتے ہیں
(اپنے عکس کے آگے
سارے رنگ پھیکے ہیں)

جب بہار آئے گی
جانے میں کہاں ہوں گی
پیچ و خم سے بنتی ہے
منزلوں کی پگڈنڈی
تم تو بھول جاؤ گے
لمس میرے ہاتھوں کا
خواب میری آنکھوں کے

میں تمھیں نہ بھولوں گی
میں کہ فطرتاً ماں ہوں

ادا جعفری

شب بیتی

میں بھی تھکن سے چُور ہوں ، تم بھی نڈھال ہو
گھائل مری نگاہ ہے ، تم پائمال ہو
چھالے تپک رہے ہیں، ذرا دھیان تو بٹے
کچھ داستانِ دل ہی کہو ، راستہ کٹے
کیا کیا فریب کھائے ہیں پندارِ ہوش کے
دھوکے دیئے ہیں آپ دلِ نامراد کو
کانٹوں کو تم نے تارِ گریباں سمجھ لیا
پھولوں کو میں نے حاصلِ درماندگی کہا
تم اکتسابِ درد کی لذت میں کھو گئے
میں انبساطِ برگِ گُلِ تر کی ہو گئی
اپنے دُکھوں کا چارہ نہ گُل تھے نہ خار تھے
اوروں سے اپنے گھر کا پتہ پُوچھتے پھرے
گھبرا کے آرزوؤں کی شمعیں بجھائی ہیں
کیا قہر ہے کہ خود سے بھی آنکھیں چرائی ہیں
صحرائے درد راہ میں ہے، مضمحل ہیں ہم
رہبر کسے بنائیے ، گُم کردہ دل ہیں ہم

مصطفیٰ زیدی

سایہ

تمام شہر پہ آسیب سا مسلّط ہے
دھواں دھواں ہیں دریچے ہوا نہیں آتی
ہر ایک سمت سے چیخیں سنائی دیتی ہیں
صدائے ہم نفس و آشنا نہیں آتی

گھنے درخت، در و بام، نغمہ و فانوس
تمام سحر و طلسمات و سایہ و کابوس
ہر ایک راہ پہ آوازِ پائے نامعلوم
ہر ایک موڑ پہ ارواحِ زشت و بد کا جلوس

سفید چاند کی اُجلی قبائے سیمیں پہ
سیاہ و سرد کفن کا گماں گزرتا ہے
فضا کے تخت پہ چمگادڑوں کے حلقے ہیں
کوئی خلا کی گھنی رات سے اُترتا ہے

تمام شہر پہ آسیب سا مسلّط ہے
کوئی چراغ جلاؤ، کوئی حدیث پڑھو
کوئی چراغ برنگِ عذارِ لالہ رخسار
کوئی حدیث بعنوانِ صدقۂ دل و جا
کوئی کرن پئے تزئینِ غرفہ و محراب
کوئی نوا پئے درماندگان و سوختہ جا

سنا ہے عالمِ روحانیاں کے خانہ بدو
سحر کی روشنیوں سے گریز کرتے ہ
سحر نہیں ہے تو مشعل کا آسرا لا
کہیں سے دل کی شگفتہ ہوئی دعا ا
دلوں کے غسلِ طہارت کے واسطے جا
کہیں سے نعرۂ شہیدانِ نینوا ا

ہر اک قبا پہ کثافت کے داغ گہرے
لہو کی بوند سے یہ پیرہن دھلیں تو د
ہوا چلے تو چلے بادباں کھلیں تو کھ

منیر نیازی

حرفِ سادہ و رنگیں

اک کلی گلاب کی
کوچۂ چمن میں ہے
یاد ایک خواب کی
شام کے گگن میں ہے
اسم سبز باب کا
پُرفریب بن میں ہے
نقش اک شباب کا
سایۂ کہن میں ہے
اک پکارتی صدا
جبر کے گھمن میں ہے
دور دور تک ہوا
کوہ اور دمن میں ہے

احمد ظفر

رشتے

اداسی مرے سر میں پتھر ہے
آنکھوں میں مٹی
دلِ غمزدہ میں الاؤ
کہ جس سے مرے سر میں وحشت جنم لے رہی ہے
ستارے مری چشمِ تر میں ابھرنے لگے ہیں
الاؤ دہکتے ہوئے سرخ پھولوں میں تبدیل ہونے لگا ہے

اداسی مری آرزوؤں کی قاتل
کبھی سبزہ و گل کی مانند بکھری ہوئی ہے
کبھی تیرے چہرے کی چاندی سی نکھری ہوئی ہے
کبھی زرد پتوں کی مانند ہیں میری آنکھیں
کبھی ہونٹ تیرے
اداسی ازل سے ہے اک مہر جن پہ

ازل سے ابد تک ستاتی رہی ہے اداسی
دیئے سے جلاتی بجھاتی رہی ہے اداسی
اداسی کبھی ابر پاروں سے گرتی ہوئی سرد جھالر
کبھی دھند ہے آنسوؤں کی

اداسی مرا آئنہ ہے
کہ جس میں ترے حسن کے نقش بکھرے ہوئے ہیں
ترا حسن جس نے اداسی کی مشعل کو روشن کیا ہے
وہ مشعل تری رہنما بن گئی ہے
خموشی بھی جیسے صدا بن گئی ہے
کہ جس کے سہارے ازل سے ابد تک چلا جا رہا ہوں
اداسی مری زندگی بھی، مری موت بھی ہے

احمد ظفر

خزاں

سینہ جویا ہے کسی پھول کا، آنکھیں ویراں
دعوتِ رنگ ملے کس سے کہاں سے؟ کیسے؟
سوچتے سوچتے دن رات گذر جاتے ہیں
کتنے تارے مری پلکوں پہ جلاتے ہیں چراغ
کتنے خنجر مرے سینے میں اُتر جاتے ہیں

پھر وہی سعیِ مسلسل ہے، وہی جورِ قدیم
وقت زنجیر بھی، تقصیر بھی، تقدیر بھی ہے
ہاتھ ٹوٹے ہوئے، پھوٹی ہوئی آنکھیں جیسے
آئنہ جیسے شکستہ ہو، شکستہ ہے دماغ
بھیک مانگوں سرِ بازار تو مانگوں کیسے

کون آواز یہاں دے گا کسے تاب ہے یہ
دل پہ جو گذرے اسے کون رقم کرتا ہے
درد کی لہریں لپیٹے ہوئے کتنے انساں،
دیکھتے دیکھتے چپ چاپ گذر جاتے ہیں
زندہ لاشیں ہیں، بگولوں میں سسکتے پتے
خاک بن بن کے سرِ راہ بکھر جاتے ہیں

جمیل ملک

نروان سے پہلے

فضا میں یہ کیسی چھن ہے !
ستارا کوئی اپنے مرکز سے ٹوٹتا ہے
یا میرے دل کی صدا ہے !

یہ موجِ ہوا ہے کہ بجھتا دیا ہے !
پس و پیش سائے لرزتے ہیں
یا میرا دل کانپتا ہے

یہ موہوم سی سرسراہٹ ہے کیسی !
یہ کس کی ادا ہے !
فرشتہ کوئی میرے پہلو سے گزرا ہے
یا تیرے قدموں کی آہٹ ہے، کیا ہے

عجب وسوسوں میں گھرا ہوں
خلا میں خلا تا بہ حدِ نظر ہے
خیالوں میں کتنے بھنور پڑ رہے ہیں !
نہ اپنی خبر ہے نہ تیرا پتہ ہے
میں اُوپر ہی اُوپر اُڑا جا رہا ہوں
میں کس بُرج میں ہوں، یہ کیا مرحلہ ہے
زمیں، چاند، سورج، ستارے
ہر اک چیز میرے تعاقب میں ہے
میں خلاؤں میں چکرا گیا ہوں
مرے سامنے کون سی انتہا ہے !
فنا یا بقا ہے !!

جمیل ملک

نروان

تیری چاہت میں کو بکو، در بدر پھرا ہوں
ر ایک گھر سے مری صدا کا جواب
پ، اِک بسیط چپ تھا
بھی نے پردے گرا دئے تھے، کوئی نہ بولا
میری آشفتگی، مری بیکسی کا دامن بھی چاک تھا، میرے دل
کی صورت

منکتے سِکّوں کا نغمۂ جاں فزا سُنا
ا کھلاتے نوٹوں کا رقصِ پیہم بھی مَیں نے دیکھا
ر یہ وہ خواب تھا کہ جب آنکھ کھل گئی تو وہی خموشی
یب، گھری، اٹوٹ چُپ
ور مَیں
سی خوابِ دلنشیں کی حسین تعبیر ڈھونڈتا تھا

مرے خیالوں میں حشر برپا تھا
خود نمائی کی گونج تھی وہ کہ میرے ہی کان بج اُٹھے تھے؟
کہاں کہاں تھا مقام میرا
ہر اک زباں پر تھا نام میرا
وہ شور تھا کہ مری سماعت بھی سو گئی تھی
پھر ایک قاتل، مہیب چپ تھی جو میرا مقسوم ہو گئی تھی

اور اب
کہ میں خامشی کی لو سے چراغ دل کا جلا چکا ہوں
حجاب سارے اُٹھا چکا ہوں
کہیں بہت دور جا چکا ہوں
تو مجھ کو عورت بھی ڈھونڈتی ہے
تو مجھ کو شہرت بھی ڈھونڈتی ہے
مگر میں واپس نہ آ سکوں گا
مگر میں واپس نہ آ سکوں گا

شاذ تمکنت

دائرہ

پلکیں نیندوں کے جھنور، آنکھیں شبستاں کے چراغ
سخنِ زیرِ لبی مشک کے جھونکے جیسے
لفظ نوشینہ تو لہجہ ہے شکر قند کی طرح
جملے اس چاؤ سے پورے ہوں کہ وعدے جیسے
پیاس کی آنچ سے چٹخے نہ بدن کا بلّور
قوسِ ملبوس میں جلتے ہوں شوالے جیسے
ہر بُنِ مُو ہے ہم آغوشیِ پنہاں کی پکار
تار کس دیں تو کھنک اُٹھتے ہوں پردے جیسے

اے دلِ زود فراموش خبر ہے کہ نہیں
زندگی آپ کو اس طرح بھی دُہراتی ہے
کبھی نارنجی، کبھی سرخ، کبھی سبز قبا
وہی لڑکی ہے جو سو رنگ سے آجاتی ہے

تابش صدیقی

ایک شام

میں آج شام سے بیٹھا ہوں سر جھکائے ہوئے
کسی سے بھی تو نگاہیں ملا نہیں سکتا
وہ سر،
جو پانچ برس سے بلند و بالا تھا
ہوا ہے زینتِ آغوشِ فرش ۔ یوں، جیسے
شفق کے پھول ستاروں کے بام سے گر کر
کثیف خاک کی جھولی میں خاک ہو جائیں
سمٹ گئے تھے جو،
وہ ہاتھ ۔۔ پھر سے پھیل گئے
اندھیری رات میں تِلّی کی پتلیوں کی طرح

رقیبِ بزدل و مکار کی شبِ تیرہ
مسرتوں کے شراروں سے جگمگا اٹھی
گلے میں سوکھے ہوئے قہقہے کھنکنے لگے
گرسنہ، پچکی ہوئی توند سر اٹھانے لگی
رقیبِ زشت خصال
غلیظ دانت نکالے اچھلتا پھرتا ہے
سمجھ رہا ہے کہ میں وہ نہیں
جو کل تک تھا

میں آج ایک زبانِ خموش و ویراں ہوں
میں ایک دیدۂ غم آشنا و حیراں ہوں

میں اس کے چاہنے والوں میں تھا
(اور اب بھی ہوں)
ہزار چاہا، مگر
میں نہ اُس کو روک سکا
بس اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا جیسے
ازل سے میرے مقدر میں تھا یہی شاید
میں اس کا ہنستا ہوا عزم آفریں چہرہ
نگاہِ شوق لیے،
انتہائے شوق بنے،
دیکھتا رہا ۔۔ لیکن
زباں پہ حرفِ محبت بھی آ سکا نہ کوئی

میں آج
شرم سے بیٹھا ہوں
سرنگوں
خاموش

امین راحت چغتائی

سرسراہٹ

دامنِ کوہ میں دیو قامت درختوں کا جنگل
کہ جس سے ہوا کا گزر ہو تو یوں سیٹیاں بجنے لگتی ہیں جیسے
کسی شہر کے کوچۂ خوش نظر سے
کسی بانوئے خوش ادا کا گزر ہو
تو کچھ منچلے بے ارادہ بجانے لگیں سیٹیاں جھوم کر

اِن درختوں کے سائے میں لیٹی ہوئی دوب میں سرسراہٹ سے
اک دختِ دہقاں پریشاں پریشاں
یہی سوچتی جا رہی ہے :
اچانک کسی سمت سے سانپ آ کر نہ ڈس لے ،
کہ جنگل ہے اور ہر طرف ہُو کا عالم
جوانی کا دم خم
کہیں ٹوٹ کر خاک میں مل نہ جائے

مگر یہ بھی خواہش ہے دل کے کسی گوشۂ بے نشاں میں
اگر سانپ ڈس لے تو یہ روز کا خوف جاتا رہے
اور دیکھیں کہ اُٹھتی ہیں ٹیسیں سی کیسی بدن میں
رگوں میں تناؤ سا آتا ہے کیونکر
اثر کس طرح زہر کرتا ہے دل پہ
نمودار کیوں ہونے لگتے ہیں آنکھوں میں نیندوں کے ڈ[illegible]

یہی سوچتی سوچتی راہ میں
رینگتے ، ہانپتے وقت کی پیٹھ پر بیٹھ کر
دیو قامت درختوں کے سائے میں لیٹی ہوئی دوب سے پوچھتی
'یہ لرزا سا طاری ہے کیوں جسم و جاں پہ ؟
بھلا خوف کیسا !
کہ یہ سانپ تو دیکھے بھالے ہیں میرے '

پروین فنا سیّد

ہنسی

چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہم کتنا ہنستے تھے
بے مقصد، بے بات ہنسی کا دھارا پھوٹا
تم نے پوچھا ــــ یہ دیوانہ پن کیسا ہے
اتنی ہنسی تو راس نہیں آتی کلیوں کو
میں نے کہا تھا ــ آج مجھے کھُل کر ہنسنے دو
کھل کر ہنسے تو برسوں گزرے صدیاں بیتیں
لمحہ لمحہ، پل پل، ہم چپ چاپ جلے ہیں
آج تو کھل کر ہنس لیں ــ کل پھر جلنا ہوگا

فریب

آج پھر تم مجھے کس محفلِ غم میں لائے
آج پھر میں نے سرِ بزم اندھیرا دیکھا
رنگ اور نور سے بہکی ہوئی اس دنیا میں
میں نے گمبھیر اداسی کا بسیرا دیکھا
کھلکھلاتے ہوئے چہروں کی صباحت میں چھپے
کتنی سوچوں کے الجھتے ہوئے افسانے تھے
یہ بظاہر جو تمھیں اپنے نظر آتے تھے
اصل میں اپنی حقیقت سے بھی بیگانے تھے

نثری نظم

محمد علوی

پہلا خدا

اندھیرا تھا!
چاروں طرف
موت منڈلا رہی تھی!
نگاہوں میں
مایوسیاں بس گئی تھیں!
دلوں میں
کئی خوف گھر کر گئے تھے!
تو اُس وقت
ہم نے
نہایت عقیدت سے
پہلے خدا کو پکارا
وہ پہلا خدا
جس نے ہم کو
اندھیروں سے باہر نکالا
اجالوں کی نعمت عطا کی
مگر ہم اسے بھول بیٹھے!
کہاں ہے
وہ پہلا خدا اب کہاں ہے؟
ہمیں پھر
ضرورت ہے پہلے خدا کی!!

ریت

سکوں ریت کا ایک ذرہ ہے
جو ریت نے کھا لیا ہے!
اُسے ڈھونڈھنے کی نہ کوشش کرو
اُونٹ پر
اپنی تنہائیاں لاد کر
پا برہنہ
بھٹکتے ہوئے ریگ زاروں میں
بھٹکا کرو!
اور سرابوں کو دیکھو
تو آنکھیں چُرا لو
کہ سب ریت ہی ریت ہے
ریت ہی ریت ہے!
ریت ہے
ریت!!

اریب سہیل

شہرِ استخواں

اب تو ہر جلوۂ شگفتہ پر
جاگ اُٹھتا ہے کرب کا عالم
ناز جس پھول سے بدن پر تھا
وہ فسردہ ہوا ہے بے موسم

شاخِ گرویدگی میں جانے کیوں
سرد مہری کا لگ رہا ہے ثمر
اِک ستم ہے کہ اُس کے پہلو میں
ذہن کو کھینچتا ہے نقشِ دگر

جسمِ رعنا کے خواب دیکھتا ہوں
پیش ہے لیکن استخوان کا شہر
پُرکشش ہے تضاد کے باوصف
مشترک یہ نشاط و غم کا دہر

رہ کر اس عالمِ خزاں میں بھی
تازہ، یادِ بہار کرتا ہوں
بُعد محسوس جب بھی ہوتا ہے
اور شدّت سے پیار کرتا ہوں

فنون، لاہور

رحمان فراز

دوام

ہماری تہذیب کے نئے پھول جب کھلیں گے
تو ہم نہ ہوں گے
ہمارے خوں سے گندھی ہوئی
پائمال رستوں کی زرد مٹی
مہک اُٹھے گی، تو اس کی مہکار ہم بنیں گے

ہمارے جسموں کا سرخ سورج
زمین کو تابناک کر کے
چھُپا، تو اس کی شعاعوں کے یہ حسین ریزے
نکھار دیں گے ترے وطن کے حقیر ذرّے
سنوار دیں گے ترے چمن میں ہزار نغمے

ہماری روحیں بدن کا بوسیدہ پیرہن گر اُتار پھینکیں
تو ایک جوشِ نمو میں ہم بھی
حسین پھولوں سے ڈولتے شاخسار کی طرح لہلہائیں

ہماری قدریں اَمٹ رہیں گی
ہماری تہذیب کے نئے پھول پھر کھلیں گے
تو کیا ہُوا، ہم اگر نہ ہوں گے
وہ تیز مہکار تو اُڑے گی
سراغ دیتی ہوئی پھرے گی
تیری اَنا کا — میری اَنا کا

رحمان فراز

ماں

ہم سے پہلے بھی تو اِس مقتل میں لوگ
آئے تھے نعرہ بلب، شعلہ بجاں
اور رکھ دی اپنے اک اک حرف میں
دل کے دُکھتے زخم کی کھلتی زباں
وقت کے دھارے پہ اُن کے خوں کی سطر
ایک عہدِ نَو کی رنگیں داستاں
اُن کے نقشِ پا کی ہر اُجلی لکیر
عرصۂ شب پر تھی اک خطِ سحر
عہدِ ماضی کی وہ اک صوتِ خموش
اپنی ہم آواز سے تابندہ تر
کاش ہم بھی اپنے خوں میں ڈوب کر
لکھ سکیں ایسی ہی اک سطرِ تپاں،
لوحِ دُنیا پر، باندازِ دگر
اپنے پیکر چند چلتے پھرتے سائے
جن کو کھا جاتی ہے ہر تیرہ شبی
اپنی ہر آواز — آوازِ شکست
اور بڑھ جاتی ہے جس سے خامشی
اپنے سینے پر کہاں وہ تازہ زخم
پھوٹ نکلے جن سے صبحِ زندگی

قہقہے لب پر ہیں، دل افسردہ ہیں
دوستو! ہم زندہ ہیں یا مردہ ہیں

ریاض مجید

رفتگاں کی منازل کی تکریم کر

جانے والے زمانے کے رستے میں آنکھیں بچھا کر
مہ و ساں کی گرد کی تہ میں ڈوبی فراموش یادوں کی آواز سُن
اپنے پیاروں کی مٹی کو کحلِ بصر جان
اُس راہ پہ بیٹھ جا
رفتگاں جس سے ہو کر گئے ہیں
(دعا مانگ وہ جس جگہ پر بھی ہوں خوش رہیں)

رفتگاں کی منازل کی تکریم کر
آنکھ سے حال کی بے مروّت چمک کو نکال اور دیکھ آج بھی ان
منازل میں تیرے لیے کیا خوشی ہے؟

پُرانی رُتوں کے تصوّر سے بھیگی ہوئی آنکھ میں تیرتے اشک سے
قیمتی کوئی شے ہے تو کہہ!
گئے لمحوں کی پُر فضا یاد میں ڈوب کر ایک حسرت بھرے بوڑھے
سینے سے باہر نکلتے ہوئے سانس سے زندگی بخش اگر کوئی اک
سانس ہے تو بتا!

یاد رکھ!
بھولے بسرے ہوئے راستوں کی زیارت سے بڑھ کر نظر
کے لیے کوئی جنّت نہیں ہے!

نظر کے تقاضوں کو پہچاننے کی سزا کون جھیلے

آزمائش کے اِس مرحلے سے گزر جا
ہم اک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں
ہم اک دوسرے کے لیے اجنبی ہی رہیں گے
ہم اک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے تو
مر جائیں گے
پھر بھی اک دوسرے کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے!

نگاہیں اٹھا
سامنے دیکھ
تیرے لیے کس قدر راستے ہیں

لیلیٰ عطاء اللہ

بے بسی

مجھ سے کہتی ہیں روایات کہن
اور بتاتے ہیں بزرگوں کے چلن

شعر کہنا نہیں اچھا ہوتا
دل کی دنیا کا بیاں ٹھیک نہیں
لڑکیاں راز نہ کھولیں اپنے
لڑکیاں خود کو چھپا کر رکھیں

جسم تو خیر چھپا رہتا ہے
ہو سکے گر تو اسے اور چھپاؤ
دل کو بھی اپنی طرح قید رکھو
روح کے چہرے سے پردے نہ اٹھاؤ

لڑکیاں پردوں میں مستور بھلی
مرد کی ذات ہے عنوانِ جلی

میں نے کب شاعری کی — محترمو!
مجھ کو تو اس کا تصور بھی محال
اتنی صدیوں کی چٹانوں کے تلے
کون کر سکتا ہے تخلیقِ جمال

اپنے پردے بھی اٹھاتا ہے کوئی؟
کون ہے، خود کو جو عریاں کر دے
کون ہے! بن کے جو اک موجِ صبا
نکہتِ گل کو پریشاں کر دے
کیوں کہوں، خالقِ اشعار ہوں میں
اپنی سوچوں میں گرفتار ہوں میں

سبط نبی صہیم

شیشوں کا شہر

گلی میں نہ اب تُو، نہ وہ زندگی ہے
دریچوں میں بیٹھی ہوئی خامشی ہے
عجب بات ہے، جانے کیوں آج ہر شے
مجھے حیرتی ہو کے یوں دیکھتی ہے
کہ جیسے میں اس کا شناسا نہیں ہوں
میں اک اجنبی ہوں!

یہی وہ گلی ہے —
جسے سالہا سال سے آرزو تھی
کہ گزرا ہوا میرا اک ایک لمحہ
یہ سینے میں محفوظ کر لے

مگر یہ گلی اب اُسی عکس سے اپنا دامن بچا کر
مرا عکس یوں مجھ کو لوٹا رہی ہے
کہ جیسے مرے چار سُو آئینے ہوں!

شبی فاروقی

رشتہ

ہمارے ابا
زمیں کے پیوند ہو چکے ہیں
ہمیں بھی ہونا ہے دفن اک دن
زمیں کے نیچے
زمین ہی —
جبکہ آنے والی ہماری نسلوں کی
آخری خوابگاہ ٹھہری
تو پھر وہ ہم سے
جو اپنے ماں، باپ، بھائی، بہنوں کے مردہ جسموں کو
آگ، پانی، ہوا میں تحلیل کر رہے ہیں
جو ایک دن،
خود بھی آگ، پانی، ہوا میں تحلیل ہو رہیں گے
یہ کس عداوت میں کہہ رہے ہیں
"تمھارا رشتہ زمیں سے کیا ہے؟"

احمد ندیم قاسمی

کرب

کرب کی آخری حد ایک نہیں

ایک وہ ہیں جو بنے کرب کی شدت سے بُتِ سنگ نژاد

اور اک وہ ہیں جو اس درجہ ہوئے نرم و گداز

کہ کوئی قہقہہ مارے تو لرز جائیں

لرز کر رو دیں

کرب کے صید کچھ ایسے بھی ہیں

تلوے سے اگر خار نکالیں تو پکاریں

کہ بہار آئی ہے

اور وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں

کہ ہم کرب کا کندن ہیں

ہمیں کرب نے مارا ہے کہ ہم زندہ رہیں

اور اک میں ہوں

کہ جس کرب سے گزرا ہوں

اسے دوست بنایا ہے

جہاں جاؤں، اسے ساتھ لیے پھرتا ہوں

ڈاکٹر سید عبداللہ

دادِ سخن

ہماری پرانی تنقید خود بہت کم بولتی رہی۔ اس کا کام سمجھانے تک محدود رہا۔ فیصلے بھی ہوتے رہے اور اکثر صحیح ہوتے رہے لیکن فیصلے کی دلیلوں یا اصولوں کی بحث محض اشاروں اشاروں میں کر دی جاتی تھی۔ خیال شاید یہ تھا کہ باخبر سب کچھ جانتے ہیں اس لئے ان سے کیوں کہا جائے۔ باقی رہے بےخبر سو ان سے کیا کہنا

باخبروں سے کیوں کہوں اور بےخبروں سے کیا کہوں

اس طریق کار سے قدیم زمانے کے طالبانِ علم کو نقصان پہنچا ہوگا مگر ہمیں جو نقصان پہنچا اس کی کوئی حد نہیں۔ اشارے یوں بھی اشارے ہی ہوتے ہیں مگر ان کی نارسائی اس وقت بیکراں ہو جاتی ہے جب ان اشاروں کے جاننے والے ہی ختم ہو گئے ہوں۔

فارسی میں تنقیدی اصولوں کی کتابیں کچھ زیادہ نہیں۔ اگر ہمیں تمام ان اصولیات کو مدون کرنا ہو تو تذکروں کے سوا ہمارے پاس کیا ہے؟ دورِ مغلیہ میں اکبر کے زمانے میں شعر و ادب کا خاصا چرچا تھا۔ نکتہ رسی اور نکتہ دانی کی بھی کمی نہ تھی۔ اس زمانے میں ادب کے بڑے بڑے مسئلے پیدا ہوئے اور بڑی اہم باتیں سامنے آئیں مگر افسوس ان کی تفصیل تو کیا ان کے اجمال تک کے لئے ہم ترس رہے ہیں۔ بعد کے زمانے کا بھی یہی حال ہے۔

ایسے حالات میں اصولِ تنقید کی طرف معمولی سی پیش قدمی بھی غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ فیضی کے خطوط (لطیفۂ فیاضی) اور حکیم ابوالفتح گیلانی کے مکاتیب (چہار باغ) اور ایک حد تک ابوالفضل کے منشآت (انشائے دفتر سوم) کو بنیادی باتوں کے لئے بے حد مفید اجمال سمجھنا چاہئے۔

بعد کے زمانے میں میر محسن اکبرآبادی کی کتاب محاکمات الشعرا (جس کا ایک ناقص نسخہ یونیورسٹی لائبریری میں ہے) اور خان آرزو کا ایک مختصر رسالہ دادِ سخن اسی سلسلہ بندی کی طرف پیش قدمی کی قابلِ قدر کوشش ہے۔

خان آرزو عہد محمد شاہ کے بعد کے بزرگ تھے۔ تاریخ وفات ۱۱۶۹ھ ہے۔ ہندوستانی فارسی کے بڑے حامی اور فارسی دانانِ ہند کے بڑے طرفدار تھے۔ اس زمانے کے اکثر اردو شاعر ان سے فیضیاب اور ان کے علم و فضل کے معترف تھے۔ شعرائے فارسی کا ایک جامع تذکرہ (مجمع النفائس) لکھا۔ فارسی کے دو لغات مدون کئے۔ فقہ اللسان پر مثمر نام کی ایک کتاب لکھی۔ اور ان سب کے علاوہ شعری علوم اور بیان و معانی پر رسالے لکھے ..... انہی میں ایک مختصر سا دادِ سخن بھی ہے جس میں منجملہ دیگر مطالب کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ شعر فہمی کے اصول کیا ہیں:

اس رسالے کی تیسری فصل (مقدمہ سوم) میں خان آرزو نے شعر فہمی کے چھ راستے یا طریقے بتائے ہیں:

۱۔ خان آرزو کے نزدیک پہلا طریقہ یہ طریقِ عامۂ اہلِ زبان ہے یعنی خاص و عام لوگ سبھی فطری طور پر شعر کو سمجھنے کی جتنی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے مطابق مفرد و مرکب الفاظ کے جو معنی ہر شخص پر منکشف ہیں ان تک رسائی خود بخود ہو جاتی ہے۔ شعر کی دوسری لطافتوں کا علم تو مطالعہ اور اکتساب پر منحصر ہے۔

۲۔ دوسرا راستہ دریافتِ اربابِ معانی ہے۔ اربابِ معانی سے علمِ معانی کے ماہرین مراد ہیں اور یہ وہ علم ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلام مقتضائے حال کے مطابق ہے یا نہیں۔ تجربہ یا خیال جس طرح بیان ہونا چاہیے (کامل ابلاغ کے نقطۂ نظر سے) اس طرح بیان ہوا ہے یا نہیں۔ کلام میں قدرتی ترتیب (تقدیم

ی گئی ہے یا نہیں۔ جہاں بیان تفصیل چاہتا ہے تفصیل اور جہاں اختصار و ایجاز کی ضرورت ہے وہاں اختصار و ایجاز ہے یا نہیں۔

خانِ آرزو کا کہنا ہے کہ جو لوگ شعر فہمی کے لیے صرف علم معانی پر انحصار رکھتے ہیں۔ وہ قدرتی طور پر شعر فہمی کے دوسرے ذرائع اور وسائل کی طرف متوجہ نہیں ہو پاتے یں تشبیہ و مجاز مرسل اور کنایہ و استعارہ کے رموز و رطائف سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ غرض یہ طریقہ بھی ناقص رہتا ہے۔

۴۔ اس کے برعکس کچھ اور لوگ ہیں جو شعر میں کنایہ و استعارہ ہی ڈھونڈتے رہتے ہیں اور باقی ہر چیز سے قطع نظر کر لیتے ہیں یہ لوگ شعر کو علم بیان کا غلام سمجھتے ہیں۔ سی طرح کا ایک اور گروہ ہے جو شعر اور صنعت گری کو ایک چیز سمجھتا ہے یہ حضرات صنائع بدائع کی جستجو میں لگے رہتے ہیں اور باقی ہر چیز کو ہیچ خیال کرتے ۔ اس خیال کے ایک نقاد نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے

باگوز شتر بود برابر شعرے کہ نباشد دو محمل

رے دو معنی نہ نکلیں اسے گوز شتر سمجھنا چاہیے) یہ دراصل صنعت ایہام سے غیر معتدل دلچسپی کا نتیجہ ہے اور حالت یہ ہے کہ انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ التفات صنعت لم معانی کا مسئلہ ہے۔ اسی طرح یہ کہ استعارہ علم بدیع سے متعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق علم بیان سے ہے۔

۵۔ خیر یہ لوگ پھر بھی غنیمت ہیں ایک اور طبقہ ایسا بھی ہے جو سابق الذکر سے بھی زیادہ غضب ڈھاتا ہے۔ وہ ہے مدرسوں کا طبقہ۔ یہ لوگ محض زبردستی سے نقاد بن جاتے اپنی منصبی بالادستی سے فائدہ اٹھا کر اپنے قیاس سے ادبی فیصلے صادر کرتے ہیں۔ کیونکہ انھیں یہ معلوم ہے کہ ان کی جہالت کا راز فاش نہیں ہوگا۔ اور وہ جو کچھ کہیں گے شاگرد اس پر اعتراض نہیں کر سکیں گے۔

خانِ آرزو نے اس موقع پر ایک مثال دی ہے۔ ایک مدرس نے سعدی کا یہ شعر پڑھا:

بنامِ خداوند جاں آفریں حکیمِ سخن بر زباں آفریں

س کا دوسرا مصرع غلط ہے اور صحیح یوں ہے کہ

چہ گویم سخن بر زباں آفریں

پہلی صورت اس لئے غلط ہے کہ اگر حکیم اور سخن بر زباں کا آپس میں مضاف مضاف الیہ کا تعلق ہے تو یہ بڑی قبیح بات ہے کیونکہ مضاف مضاف الیہ کے مابین اتنا فاصلہ نہیں ہوتا یکن معترض کو یہ خیال نہیں آیا کہ فاصلے والا اعتراض مان بھی لیا جائے تو بھی یہ کس طرح معلوم ہوا کہ متبادل مصرع بالکل صحیح ہے اور صحیح یہ ہے کہ اصل کے بدلے میں جو مصرع تجویز و بالکل مہمل ہے۔ لیکن طلبہ نے کسی کو اس پر برابر اصرار رہا۔ بہر حال اکثر مدرسوں کی شعر فہمی اسی قبیل کی ہے۔

۶۔ فہم سخن سوا تو مذاقِ شعرا۔ مذاق شعرا سے مراد وہ معیار اور تجربے ہیں جو شعرا کے مدنظر ہوتے ہیں اور جن کی روشنی میں یا جن کی تحریک سے وہ شعر کی تخلیق کرتے ہیں۔

خانِ آرزو نے یہ بڑے کام کا اصول بتایا شعر فہمی کے اصول خود شعروں کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ اس لئے نقاد کو تشریح یا فیصلہ کرتے وقت یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ خود صاحب سخن رکیا ہے؟ مراعات طریقہ کہ صاحب سخن را منظور بود۔

یہاں طریقے سے مراد اسلوب بھی ہے اور جذباتی تجربہ اور شاعرانہ مسلک اور نصب العین بھی چنانچہ خانِ آرزو نے اس کی تشریح کرتے ہوئے خود لکھا ہے اور اگرچہ ان کا زور لفظ و ترکیب پر زیادہ رہا ہے تاہم مثالوں سے اچھی طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ مذاقِ شعرا سے مراد معیار بھی ہیں اور تجربے بھی ہیں۔

خانِ آرزو کے نزدیک مذاقِ شعرا سے باخبر ہونے کے لئے چند باتیں ضروری ہیں مثلاً روزمرہ کا علم۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ شاعر کے اظہار میں لطافتوں کا ایک عنصر سکے ذریعے داخل ہوتا ہے۔ اسی طرح لفظوں کی شناخت بھی لازمی ہے شاعری ایک لحاظ سے لفظوں کا کھیل یا جادو ہے۔ لفظوں کی جذباتی فکری تصویری اور صوتی قیمت ہر شاعر کا انتخاب الفاظ اپنے موضوع اور اپنے مذاق شعر کے مطابق ہوتا ہے۔ نقاد اگر قیمتوں پر نظر نہیں رکھے گا تو وہ ان لطافتوں سے باخبر نہ ہو سکے گا جو شاعر کے

اسی طرح علم بند و بست الفاظ" اور علم ترکیب الفاظ بھی لازمی ہے ..... اور آخر میں طرز اور مسالک کی شناخت یعنی یہ کہ شاعر کا ذوق کسی خاص مسلک کے تابع ہے؟ وہ خیال سے خاص دلچسپی رکھتا ہے یا ادا بندی کا دلدادہ ہے؟ یا تمثیل اور مثالیہ کا عاشق ہے؟

خان آرزو نے اپنے اس رسالے میں قدسی اور شیدا کی مشہور ادبی نزاع کے بارے میں جو محاکمہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر میں ابلاغ دلالت کی کامل رسائی کو لازمی مانتے ہیں۔ جو شعر اپنے سامع کو فوراً اپنے مطلب سے آگاہ نہ کر سکا وہ مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ شعر میں ابہام و خفا کا عنصر آہی جاتا ہے لیکن ابہام وہی دلکش ہوگا جو فوراً منکشف ہو جائے اس علاوہ عقلی قرینہ بھی بے حد ضروری ہے۔ جس مضمون کی تصدیق عقل یا حقیقت واقعی سے نہیں ہوتی اس پر سامع آسانی سے ایمان نہیں لاتا۔ اس کی نظر میں ایسا مضمون محض کسل یا اختراع لایعنی سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔

قرینہ عقلی کی وضاحت کے لئے قدسی کے ایک ہی شعر کے محاکمے کچھ نتیجے نکالے جا سکتے ہیں۔ قدسی نے لکھا تھا ؎

عالم از نالہ من بے تو چناں تنگ فضاست — کہ سپند از سر آتش نتواند برخاست

(ترجمہ: میرے نالہ (و فریاد) کی وجہ سے دنیا اتنی تنگ فضا ہو گئی ہے کہ آگ میں ڈالا ہوا سپند جس کی فطری خاصیت ہی یہ ہے کہ تاؤ کھا کر اچھلے اور باہر نکل آئے مگر فضا اس درجہ تنگ ہو گئی ہے کہ وہ بھی (آگ سے اچھل کر باہر نہیں آسکتا) قدسی جس دور کا شاعر ہے اس میں اس طرح کے معانی عام ہیں۔ مگر ایرانی ہندی جگہ میں ہمارے ہندی اکثر بدنام کئے جاتے تھے کہ ان کے اشعار میں خیال بافی و حقیقت سے دور باتیں بہت ہوتی ہیں۔ مگر قدسی تو مشہد سے آیا تھا۔ اس کے کلام میں یہ خیال بافی کیوں؟

اسی کو بے نقاب کرنے شیدا ہندی (شاہجہاں کے زمانے کا ہندوستانی شاعر) اٹھا اور اس نے قدسی کے اشعار کے بخیے اڑا دیے۔ اس پر بڑی بحث ہوئی۔ ملا ابوالبرکات منیر لاہوری، ملا طباطبائی اور دوسرے لوگوں نے زور شور سے حصہ لیا۔ اور یہ بحث اپنے زمانے سے نکل کر خان آرزو کے زمانے تک آگئی میں نے قدسی کا وہ شعر نقل کیا ہے۔ اس پر شیدا نے اعتراض یہ کیا ہے کہ مضمون میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے۔ وہ عقلی لحاظ سے درست نہیں۔ شیدا نے لکھا ؎

نالہ در سینہ ہوائے است کہ پیچاں شدہ است — چوں ز لب گشت ہوا گیر ہم است جنس ہوا ست

(نالہ تو ایک قسم کی ہوا کا نام ہے جو سینے سے اٹھتی ہے جو لبوں کے توسط سے جب باہر فضا میں پھیل جاتی ہے تو پھر بھی ہوا ہی رہتی ہے)

عالم از دمے تو و تنگ ولیکن ز ملال — اہل عالم گر از و تنگ نشینند رواست

(پس جب یہ ہوا ہے تو ہوائے عالم کیسے تنگ فضا میں ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے اہل عالم افسردہ و ملول و حزیں ہو جائیں)

اعتراض یہ ہے کہ کسی کے آہ و نالہ سے عالم (گنجائش کے معنوں میں) تنگ ہو جائے یہ بیان واقع نہیں یعنی حقیقت واقعی کے خلاف ہے۔ اس پر دوسرے لوگوں کے علاوہ منیر لاہوری نے بھی لکھا اور قدسی کی حمایت میں یہ کہا کہ لفظ تنگ لطف، ایہام آیا ہے اس لئے قدسی کا شعر ٹھیک ہے لیکن خان آرزو کا محاکمہ یہ ہے کہ ایہام میں بھی قرینہ عقلی لازمی ہوتا ہے ورنہ ایہام سے شعر مہمل ہو کر رہ جائے گا۔

اس کے علاوہ کیفیت الگ شے ہے اور کمیت الگ حقیقت، لہذا کیفیات کے لئے کمیات کا اور کمیات کے لئے کیفیات کا استعمال درست نہیں۔

ان تمام بحثوں سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شاعری میں تخیل، استعارہ اور ایہام اپنی جگہ درست اور برحق ہے مگر سامع کے نقطہ نظر سے وہ شاعری ناکام ہے جو مضمون کو سامع تک فوراً پہنچا نہ سکے۔ اور سامع کے دل میں وہی شاعری اترتی ہے جو جذباتی صداقت کے علاوہ عقلی اور واقعی حقیقتوں کے زیادہ قریب ہو۔ خان آرزو نے اس قسم کی بحثیں اپنی اور کتابوں میں بھی اٹھائی ہیں خصوصاً سراج منیر میں ــــ اور ہم ان کے غائر مطالعے سے بہت سے مفید تنقیدی اصولوں کا استخراج کر سکتے ہیں۔

سید علی عباس جلالپوری

رُوحِ عصر

(آخری قسط)

روحِ عصرِ حاضر

بدیہی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سائنس کی ترقی سے انسان کے سوچنے کے انداز بدل گئے ہیں اور صنعتی انقلاب کے شیوع نے
ے کی قدروں اور نصب العینوں کو بدل کر رکھ دیا ہے کیمسٹری اور طبیعیات نے قانون سبب و مسبب کی اہمیت واضح کی ہے اور اس طرح
سیکڑوں توہمات سے نجات دلائی ہے۔ اب یہ حقیقت مسلم ہو چکی ہے کہ کوئی مسبب بغیر سبب کے معرضِ وجود میں نہیں آ سکتا نتیجۃً خوارقِ
و صرف صوفیہ کے تذکروں میں باقی رہ گیا ہے۔ موسمیات نے قدیم ضعیفاتی اوہام کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اب ہم بارش، زلزلے، طوفان وغیرہ
ہوتے ہیں اور انھیں کسی مافوق الطبع ہستی سے منسوب نہیں کرتے۔ علم طبقات الارض نے اُن تبدیلیوں کا انکشاف کیا ہے جو لاکھوں برسوں سے
ہیں واقع ہو رہی ہیں۔ علم الحیوان نے ثابت کر دیا ہے کہ جسمانی ساخت کے لحاظ سے انسان حیوانات کے کنبے سے ہی تعلق رکھتا ہے اور انہی کی
ۃ لوث ہے۔ علم الانسان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اقوام و ملل تاریخ کے کسی نہ کسی دور میں وحشت و بربریت کے احوال سے گذر چکی
و رکی روایات بعد کے تمدنوں کے اجزائے ترکیبی بن چکی ہیں۔ نفسیاتِ جدید نے ذہنی واردات کے متعلق اکثر غلط فہمیوں کو رفع کر دیا ہے
متوہ ذہن کو کسی فوق الفطرت مخلوق کی کارفرمائی نہیں سمجھا جاتا بلکہ دماغی عوارض سمجھ کر ان کا علاج کیا جاتا ہے۔ علم ہیئت کے انکشافات نے آفرینش و
کے قدیم نظریات کا ابطال کیا ہے اور ہمیں بتایا ہے کہ کائنات کی لامتناہی وسعتوں میں کرۂ ارض کو کم و بیش وہی مقام حاصل ہے جو صحرائے
ا کے ایک ذرے کو یا بحر الکاہل میں پانی کے ایک قطرے کو۔ کہکشاں کے بعض ستارے ہم سے اتنی بے پناہ مسافت پر واقع ہیں کہ ان کی روشنی
ی ہزار فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی ہوئی دو لاکھ بیس ہزار "روشنی کے سالوں" میں ہم تک پہنچ سکتی ہے ہمارے نزدیک ترین ستارے کا فاصلہ بھی
روشنی کے سالوں سے زیادہ ہے۔ کہکشاں میں تیس لاکھ ستارے ہیں۔ ایسے ہی تین بلین اور کہکشاں ہیں جو دوربین کی مدد سے دریافت کئے
یک کہکشاں سے دوسرے کہکشاں کی مسافت بیس لاکھ "روشنی کے سال" ہے اور سب برق رفتاری سے ایک دوسرے سے دور ہٹتے
کائنات کی ان ہوشربا وسعتوں کے پیشِ نظر کلیسائے روم کا تصورِ کائنات محض گڑیا کا گھر ہے۔ ڈینٹے کرۂ ارض کو تمام کائنات کا مرکز سمجھتا
ہ دس ہیولی کرے موجود ہیں۔ چنانچہ اس کائنات کی سیر سے وہ صرف چوبیس گھنٹوں میں فارغ ہو جاتا ہے۔ پروٹسٹنٹ مذہب کے
عقیدے کے مطابق کائنات کی تکوین سنہ ۴۰۰۴ ق م میں عمل میں آئی تھی۔ آرچ بشپ اشر نے تو یہ بھی ثابت کر دکھایا ہے کہ کائنات ۲۳ اکتوبر کو
معرضِ وجود میں آئی تھی۔ ڈینٹے کی تحقیق یہ تھی کہ تخلیقِ آدم سنہ ۵۲۰۰ ق م میں ہوئی تھی اور قیامت سنہ ۱۸۰۰ء بعد از مسیح برپا ہو گی۔ آج علم ہیئت
ت کی روشنی میں یہ عقاید مضحکہ خیز دکھائی دیتے ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں سائنس کو خاص طور پر حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ ہوائی جہاز، سینما، بے تار برقی، ایکس رے، ریڈار، ٹیلی ویژن، ایٹمی بم وغیرہ کی ایجادات سے کہیں زیادہ اہم طبیعیات کے انکشافات ہیں۔ لائب نتس نے آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کی پیش قیاسی کی تھی۔ اس نے نیوٹن کے نظریۂ کشش ثقل پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ زمان و مکان محض اضافی علائق پر مشتمل ہیں۔ تمام حقائق ذہنی ہیں اور جس چیز کو ہم مادہ کہتے ہیں وہ نفسیاتی اکائیوں پر مشتمل ہے۔ ان اکائیوں کو اس نے MONADS کا نام دیا تھا۔ آئن سٹائن نے لائب نتس کی تائید کی ہے اور مکان زمان کی وحدت کا اثبات کیا ہے۔

ایٹم کے تجزیے سے مادے کا قدیم تصور بدل گیا ہے۔ شروڈنگر اور ہائزن برگ کی تحقیقات نے جبریت کی نفی کی ہے مادے کے جوہری قوت میں تحلیل ہو جانے اور قوت کی لہروں کی آزادروی نے طبیعیات کی دنیا میں انقلاب برپا کیا ہے۔ پلانک کے نظریہ مقادیر عنصری کی رو سے بھی قدر و اختیار کے تصور کو تقویت بہم پہنچی ہے اور مادیت کے ساتھ جبر کا جو خیال وابستہ تھا وہ ختم ہو گیا ہے۔ بقول برٹرنڈ رسل ٹھوس اشیا محض واقعات کی ہی محسوس و مرئی صورتیں ہیں۔ ڈاکٹر جانسن کے متعلق مشہور ہے کہ اُسے کسی نے بتایا کہ بشپ بار کلے مادے کے وجود کا منکر ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے گلی میں چلتے ہوئے ایک پتھر کو ٹھوکر ماری اور کہا میرے لئے مادے کے وجود کا یہی ثبوت کافی ہے۔" اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے برٹرنڈ رسل کہتے ہیں کہ ڈاکٹر جانسن کو کیا معلوم تھا کہ اُن کا پاؤں اور پتھر جس کو انھوں نے ٹھوکر ماری تھی، دونوں واقعات کے ہی مجموعے تھے۔ اب میز کرسی، اینٹ پتھر وغیرہ اشیاء کو ٹھوس نہیں کہا جا سکتا یہ چیزیں دراصل چند قوانین کی نشان دہی کرتی ہیں جن کے ماتحت یہ واقعات صورت پذیر ہوتے ہیں۔

ان انکشافات کی رو سے ایک طرف مادہ نظام کائنات میں تبدیل ہو گیا ہے تو دوسری طرف نفسیات میں "انا" غائب ہو گئی ہے اور شخصیت واقعات کا ربط سبب و مُسبّب ہو کر رہ گئی ہے۔ مادے اور ذہن کا امتیاز اب ناقابل قبول ہے۔ کائنات جس چیز سے بنی ہے اُسے یا طبیعی کہا جا سکتا ہے یا ذہنی، یا یہ کہ دونوں سے مل کر بنی ہے یا یہ کہ دونوں میں سے کوئی بھی اس کی ساخت و تکوین میں شامل نہیں ہے[1]۔ ہمارے زمانے کے بعض متکلمین نے طبیعیات جدیدہ کے ان انکشافات کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس سے تصوف اور مثالیت کے نظریات و عقائد کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ یہ غلط فہمی ایٹم کے اجزا کو توڑ مروڑ کر پیدا کی جا رہی ہے۔ ان کے خیال میں مادہ کالعدم ہو گیا ہے اور روحانیت کی تصدیق و توثیق کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مادہ کالعدم نہیں ہوا بلکہ اس کے جوہری قوت کی لہروں میں تحلیل ہونے کا راز دریافت کیا گیا ہے اور مادے اور قوت کے باہم تبادل ہونے کا ثبوت ملا ہے۔ متکلمین نظریہ اضافیت سے اس بات کا ثبوت اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اب معروض (objects) کا وجود ختم ہو چکا ہے اور سب حقائق موضوعی ([illegible]) ہیں۔ بے شک جدید طبیعیات کی رو سے مادے کے قدیم اور عمومی خصائص بے شک باقی نہیں رہے لیکن طبیعی عالم کی معروضی حقیقت بدستور برقرار ہے۔ مادہ جوہری قوت کی لہروں میں تحلیل ہو سکنے کے باوجود ایک معروضی حقیقت ہے جو ہمارے ذہن سے علیحدہ اور آزاد طور پر موجود ہے۔ اشیاء کی حقیقت ان کے ظاہر سے مختلف سہی لیکن انسان کے لئے بہرحال ناگزیر ہے کہ وہ اپنے اور فطری مظاہر یا خارجی حقایق کے درمیان مفاہمت پیدا کرے۔ اس کوشش میں اسے طبیعی یا خارجی مظاہر کو تبدیل کرنے پر قدرت حاصل ہو گی اور یہی حقیقت دو گونہ یعنی خارجی اور داخلی یا موضوعی اور معروضی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لارڈ برٹرنڈ رسل لکھتے ہیں:

"جو لوگ مادیت کے حامی ہیں وہ اب بھی ایسا فلسفہ اختیار کر سکتے ہیں جو کم و بیش اُن کے سابقہ موقف کی تائید کرتا ہو۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ طبیعیات کا سلسلۂ سبب و مُسبّب بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور واقعات طبیعی قوانین کے تابع ہیں"

سائنس کے مخالفوں کی طرف سے بسا اوقات یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ سائنس کا تعلق اسباب و علل سے ہے، مقاصد کا تعین اس کے بس کی

---

[1] Outline of Philosophy by Bertrand Russel

ت یہ ہے کہ سائنس والوں نے آج تک مقاصد کے تعین کی کوشش ہی نہیں کیونکہ مقاصد اور نصب العین سائنس والوں کے حلقۂ تحقیق
م فلسفہ کا ہے جو سائنس کے انکشافات کی ترجمانی کر کے مقاصد کا تعین کیا کرتے ہیں۔ اب وہ زمانہ آ گیا ہے کہ جو فلسفی کسی نہ کسی شعبۂ
نامہ نہیں رکھے گا اُسے حقائقِ علمی کی ترجمانی کے قابل ہی نہیں سمجھا جائے گا۔ اب مجرد مصداقوں یا محض حقایق کو فلسفیانہ استدلال کی اساس
اور وہی مقاصد قابلِ قبول اور قابلِ حصول سمجھے جاتے ہیں جو سائنس کے انکشافات کے منافی نہیں ہوتے بلکہ اُن کی تائید کرتے ہیں۔ ان
کنات اور زندگی کے مسائل کو سائنٹفک نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا ہی روحِ عصرِ حاضر ہے۔ اس نقطۂ نظر کو فطری طور پر حقیقت پسندی کے
ہونا چاہیے تھا اور حقیقت پسندی کا تقاضائے اولیں یہ تھا کہ یورپ کے باخبروں کے ساتھ اقوامِ عالم کو سائنس کے برکات سے
اقع بہم پہنچائے جاتے لیکن مغرب کے تاجروں اور ملوکیت پسندوں کی خود غرضی مانع ہوئی اور سائنس کی ترویج و اشاعت سے
صب العین کی عملی ترجمانی کا جو خواب زریں فرانسیسی قاموسیوں نے دیکھا تھا وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور اہلِ مغرب کا تنزل پذیر
قطۂ نظر اور حقیقت پسندانہ نظریۂ حیات کے درمیان علمی اور عمری ربط و تعلق قائم کرنے میں ناکام ثابت ہوا۔ دوسرے الفاظ میں
انہ اور معروضی انداز نظر سے علمی عقدے حل کئے گئے تھے، اُسے معاشرتی مسائل کے سلجھانے میں بروئے کار نہ لایا جا سکا۔ اہلِ مغرب
وں کو حل کرنے کی کوشش میں معروضی طرزِ تحقیق سے کام لے رہے ہیں لیکن معاشرے کے مسائل کو موضوعی انداز نظر سے دیکھنے کے
نتیجۂ مغرب میں موضوع کا رشتہ معروض سے، فرد کا رشتہ جماعت سے، متمدن طبقے کا رشتہ عوام سے اور ادبا، شعرا اور
ستہ ماحول کے جاندار تقاضوں سے منقطع ہو چکا ہے۔ فرد کی ذہنی اور ذوقی صلاحیتوں کو جماعت کے مفاد کے لئے وقف کر دینے
کے مفاد کو فرد کے مفاد کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ فردیت کا آغاز رومانیت کی ترویج سے ہوا تھا۔ مرورِ زمانہ سے
یت، تنوطیت، تشکک، لا عاصلیت، جبریت، داخلیت اور موجودیت کی تنزل پذیر کیفیات پر منتج ہوئی جن کا مطالعہ ہم اہلِ
یات سے لے کر اُن کے فلسفے، ادبیات اور فنونِ لطیفہ میں کر چکے ہیں اور جن کی ترویج نے اہلِ مغرب کی حیات افروز اور تعمیری
ہر سلب کر لیا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر اہلِ مغرب سے یہ توقع وابستہ کرنا وہمِ باطل سے کم نہ ہوگا کہ وہ انسانیت عالیہ کے
إسانی کریں گے یا متعلقہ اخلاقی قدروں کی ترجمانی کر سکیں گے۔ اب روحِ عصرِ حاضر کی عملی ترجمانی یا سائنس کے طرزِ تحقیق اور
نظریۂ حیات کے ربط و تعلق کی بحالی مشرق کے ترقی پذیر معاشرے میں ہی ممکن ہے۔

مورخ کا قول ہے کہ تہذیب ایشیا سے یورپ کو گئی تھی۔ وہاں چند صدیوں کے قیام کے بعد امریکہ کو ہجرت کر گئی اور اب
ور کر کے دوبارہ اپنے وطن کو لوٹ آئی ہے لیکن بعض سادہ لوح ایشیائی ابھی تک تہذیب کے انتظار میں مغرب کی طرف ٹکٹکی
ہے —— اُس عاشقِ شوریدہ سر کی طرح جو اپنے صدر دروازے میں بیٹھا عالمِ خود فراموشی میں اپنی محبوبۂ دلنواز کی آمد کا
اِ ہو اور اس خوش آیند حقیقت سے بے خبر ہو کہ اُس کے قدموں کی ملکہ عقبی دروازے سے اُس کے شبستان میں داخل

جنگل پہ لپک رہے ہیں شعلے
طاؤس کو رقص کی پڑی ہے

نیّر واسطی :

ڈاکٹر وزیر آغا

ایک تازہ ادبی مسئلہ

پچھلے دنوں اردو کے ایک ادیب نے اس بات پر گہری تشویش کا اظہار کیا کہ اردو ادبا ڈیڑھ ہی برس میں جنگ اور اس کے تجربات کو بھول گئے ہیں۔ اور اب اردو ادب اسی ڈگر پر رواں دواں ہے جس پر وہ پچھلے اٹھارہ برس سے گامزن تھا۔ ان کے نزدیک اردو ادبا کی یہ روش ملکی مسائل سے کوتاہی اور بے اعتنائی کے مترادف ہے۔ آخر میں انھوں نے یہ مشورہ دیا ہے کہ اردو ادبا جنگ کے موضوع پر از سرِ نو لکھنا شروع کر دیں۔

میری رائے میں ان صاحب کی یہ تشویش بے بنیاد اور ان کا قیمتی مشورہ ادب کے طریق کار سے ناآشنائی کا مظہر ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ کیسے؟

قصہ یہ ہے کہ جب ستمبر ۱۹۶۵ء میں دشمن کی فوجوں نے کوئی الٹی میٹم دیے بغیر رات کی تاریکی میں ہمارے وطن پر حملہ کیا تو ہم پاکستانی آنِ واحد میں ایک ایسی مستحکم قوم میں تبدیل ہو گئے جو کسی داخلی انتشار سے گویا آشنا ہی نہیں تھی۔ اس اتحاد و اتفاق کے پسِ پشت تحفظِ ذات کی ضرورت کے علاوہ اپنے وطن، اس کی ثقافت اپنے مذہب اور اس کی روایات کو دشمن کی یلغار سے محفوظ رکھنے کا ایک عزم بھی پنہاں تھا۔ گویا جب دشمن نے حملہ کیا تو ہم نے ان تمام اشیا کا بآوازِ بلند نام لیا جو ایک زبردست خطرے کی زد میں تھیں۔ اور اس لئے نام لیا کہ جب کسی شے کے مجروح ہونے یا چھن جانے کا خطرہ درپیش ہو تو اس شے سے جذباتی وابستگی فوراً سطح پر آ جاتی ہے۔ اس ضمن میں ہم نے سیالکوٹ، لاہور، قصور اور سرگودھا کے ترانے گائے کہ ان شہروں کو دشمن سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور ان کے مقابلے میں میانوالی، جھنگ، لائل پور کا اس لئے نام نہ لیا کہ یہ شہر ابھی دشمن کی زد سے محفوظ تھے۔ پھر چونکہ ہمارے وطن کی سالمیت خطرے میں پڑ گئی تھی اس لئے ہم نے حب الوطنی کا بھرپور اظہار کیا اور چونکہ دشمن کی صفوں میں ایسے عناصر موجود تھے جو فتح کی صورت میں ہماری مذہبی روایات سے کسی قسم کی رواداری کا سلوک نہ کرتے اس لئے ہمیں محسوس ہوا کہ یہ حملہ ہمارے وطن کے خلاف ہی نہیں ہمارے مذہب کے خلاف بھی تھا۔ چنانچہ ہم نے بآوازِ بلند پوری شدت سے اپنے مذہب اور اس سے وابستہ تعلیمات کا ذکر کیا کہ یہ سارا بیش بہا سرمایہ دشمن کی یلغار کی زد میں تھا۔ مختصراً یہ کہ ہماری جنگ دفاعی نوعیت کی تھی اور اس جنگ میں جس شے کو سب سے پہلے یا سب سے زیادہ خطرہ لاحق ہوا اسی قدر جلد اور اسی نسبت سے ہم نے ایک مسلّم حقیقت ہے کہ جس طرح عام زندگی میں ماں اپنے بچے کو اکثر کوستی اور بددعائیں دیتی ہے لیکن بچہ ذرا علیل ہو جائے تو ممتا اس کی آنکھوں سے چھلکنے لگتی ہے بعینہ عام حالات میں لوگ امن و آشتی کی فضا میں اس قدر ڈوبے ہوتے ہیں کہ سطحی نظر رکھنے والوں کو ان پر ارضِ وطن سے بے اعتنائی اور کوتاہی کا گمان ہونے لگتا ہے درآں حالیکہ جب وطن کسی بیرونی حملے سے دوچار ہوتا ہے تو یہی قومیں ایک زبردست داخلی استحکام کا مظاہرہ کرتی ہیں اور وطن کے لئے بے پناہ محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر نئی امنگ سے میدانِ عمل میں نکل آتی ہیں۔ ستمبر کی جنگ اس بات کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے کیونکہ ان سترہ دنوں میں ہم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ ارضِ پاکستان اس کی ثقافت اور خود ہمارے مذہب کی بقا اور تحفظ کے لئے ہمارے دلوں میں کیسے ارفع جذبات دبکے پڑے تھے!

دفاعی جنگ کے دوران قوم کا تحفظ اولیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ یہ ایک عام سا کلیہ ہے۔ مگر بات شاید یوں ہے کہ دفاعی جنگ کی صورت میں تمام تر قوتیں داخلی اور بیرونی، دفاع کا جزو لاینفک ہو جاتی ہیں یعنی سپاہی بندوق اور توپ سے لڑتا ہے، ادیب اپنے قلم سے، موسیقار اپنی آواز اور ... اس جنگ میں شریک ہو جاتا ہے۔ اس وقت سپاہی سے کوئی یہ سوال نہیں کرتا کہ کیا اس نے اپنے بوٹوں اور وردی کو چمکایا یا نہیں۔ نہ ادیب سے کوئی پوچھتا ہے کہ اس

دب کے مقتضیات کا احترام مقصود تھا یا نہیں؛ دفاعی جنگ میں قوم اپنی تمام تر توانائی کو مدافعت کا راکر اپنا تحفظ کرتی ہے اور لمحہ بھر کے لئے باقی
یثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ یہی کچھ ہم نے بھی کیا۔ ہمارے شعرا اور ادیب ادیبوں کے سپاہی ہو گئے اور ایک زبردست قومی جذبے کے تحت انھوں نے
رمضامین کے انبار لگا دیئے۔ بعد ازاں حکومت پاکستان نے بھی ادیبوں کی اس قومی خدمت کا اعتراف کیا۔ یہی حال موسیقاروں، ملازموں اور عام شہریوں کا تھا
لی مٹی آوازوں کو توپوں کی گھن گرج میں ملا کر ایک ایسی گمبھیر آواز میں تبدیل کر دیا جو بہت دور تک سنی گئی اور جس نے دشمن کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔
رہ روز کے بعد جنگ ختم ہوئی سپاہی محاذ سے واپس آنے لگے۔ ملک میں بلیک آؤٹ ختم کر دیا گیا، ریڈیو پر جنگی پروگراموں میں جنگ کا تبدیلی آ گئی۔ عوام آہستہ آہستہ زندگی
ت چلنے چلے گئے اور ادیب اور ادیبوں نے بھی قومی ادب پیدا کرنے کے بجائے آہستہ آہستہ عام قسم کا ادب تخلیق کرنے کی طرف اپنی توجہ منعطف کر دی۔
ب ڈیڑھ برس کے بعد اردو کے ادبا دو اہم سوالوں کی زد میں ہیں۔ ان میں سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ جنگ کے ان سترہ دنوں میں انھوں نے جو کچھ تخلیق کیا ادب کے
ں حد تک کارآمد تھا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ یا ادیب اس قدر جلد جنگ اور اس کے تجربات کو فراموش کر کے عام قسم کے ادب کی طرف کیوں راغب ہو گئے۔
سوال کا جواب میں نے اوپر لکھ دیا ہے۔ دراصل ان سترہ دنوں میں ہمارے ادیبوں نے جو کچھ لکھا وہ لمحہ کا ایک قابل قدر اور موثر حربہ تھا اور جنگ
س کی شدید ضرورت تھی۔ اگر اس ادب میں سے ایک سطر تک زندہ نہ رہے تو بھی ہمیں اس کا کوئی افسوس نہ ہوگا۔ دیکھنا تو صرف یہ ہے کہ ایک خاص وقت میں اس نے
رانجام دی یا نہیں؛ سو جنگ کے دوران میں ہمارے ادیبوں نے جو کچھ لکھا وہ ایک مقدس فرض تھا اور اسے تنقیدی خوردبین کے نیچے رکھ کر اس کا جائزہ لینا ہرگز مستحسن نہیں!
سے سوال کا جزوی جواب بھی اوپر آ گیا ہے مگر اس سلسلے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت ابھی باقی ہے۔ بات یہ ہے کہ جنگ کے دوران ایک زبردست قومی لہر
ست اردو کے ادبا اور شعرا نے اپنے جذبات کا اظہار کیا اور یہ اظہار ان کی حب الوطنی کا ایک اہم ثبوت ہے۔ ان جذبات کی حیثیت ایک شعلہ کی سی تھی
ب دشمن سامنے ہو تو شعلے بلند ہو جاتے ہیں اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جائے تو جوش کا مدھم پڑ جانا ناگزیر ہے۔ چنانچہ جنگ کے بعد ہمارے ادبا کے ہاں قومی
اصنافِ ادب کے ذریعے جنگ لڑتے چلے جانے کا رجحان بتدریج کم ہوتا چلا گیا لیکن اس کا یہ مطلب لینا کہ ان کے دل سے وطن اور قوم کی محبت بھی مٹ گئی ہے
ے جنگ کوئی اچھی چیز نہیں اور ہم پاکستانی تو صرف دفاعی جنگ کے قائل ہیں کہ اس سلسلے میں ہمارے مذہبی احکام بالکل واضح ہیں لیکن اگر کبھی آئندہ ہمارے
لاس بات کو طے سمجھنا چاہئے کہ ہمارے ادبا اسی ملی اور قومی جذبے کا اظہار کریں گے جس کا مظاہرہ وہ ستمبر کی جنگ میں کر چکے ہیں جس طرح آج ہمارے فوجی جوان
یں جنگ نہیں لیکن ان کی وطن دوستی اور وفاداری پر کوئی حرف نہیں آ سکتا، اسی طرح اگر آج ہمارے ادبا اور شعرا جنگی نظمیں اور ترانے نہیں کہہ رہے تو اس سے ان کی
رزندگی میں نہیں لائی جا سکتی۔ اور جو شخص ایسا کرتا ہے وہ محض اپنی لیڈری کو چمکانے کی فکر میں ہے، ہمیں اس کے اس کاروبار سے کوئی سروکار نہیں۔
ب رہا سوال کا یہ حصہ کہ آج کے اردو ادبا جنگ کے تجربات کو اپنی تخلیقات میں کیوں نہیں سمو رہے تو اس سلسلے میں جنگ کے واقعہ پہلے سر تو ایک نظر ڈالنے کی
ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ستمبر کی یہ جنگ صرف سترہ روز جاری رہی اور صرف سرحدی علاقے تک محدود تھی۔ ہمارے ادبا میدانِ جنگ سے بہت دور اپنے
میں اقامت پذیر رہے۔ یہاں تک کہ ہم میں سے شاید ایک ادیب بھی ایسا نہیں تھا جو چھٹتے ہوئے گولوں کی زد میں آیا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے لئے یہ جنگ ایک
قومی سطح کا تجربہ تھی اور اس لئے ہم نے جو کچھ لکھا اس میں قومی جذبات کا برملا اظہار ہی غالب حیثیت رکھتا تھا۔ شخصی سطح پر ہم میں سے بہت کم ادبا جنگ کی
اس کی ہولناکی اور کرب سے آشنا ہوئے اور اس لئے شخصی تجربہ ہماری تخلیقات کا جزو لاینفک نہ بن سکا۔ تقسیم ملک کے موقعہ پر جو فسادات ہوئے تھے وہ صرف
یلے ہوئے تھے بلکہ ان کے کربناک مراحل سے ہمارے بیشتر ادبا خود گزرے تھے۔ نتیجہ ان تخلیقات کی صورت میں سامنے آیا جن میں شخصی تجربات، ان کی سچائی اور
ت طور پر جھلکتا دکھائی دیتا ہے مگر اردو ادبا کے لئے ستمبر کی جنگ کا تجربہ شخصی کم اور ملی اور قومی زیادہ تھا۔ ہمارے بیشتر ادبا کے دفتروں کی کھڑکیوں سے جنگ کا نظارہ
ں تو قمہ، خاندان سے خانہ بری ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ جب تک جنگ سے شخصی سطح پر شناسائی حاصل نہ ہو ادبی تخلیقات میں اس کا پرتو نہیں پوری طرح ظاہر

نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جنگ کے بعد جنگ کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کے بارے میں جو ادب تخلیق ہوا اس میں بیشتر . کی پیداوار تھا۔ اصل ادیب کا کام یہ نہیں کہ وہ شعوری طور پر مستعار تجربات کو اپنی تخلیقات میں سمیٹ لے بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنے فن کو تجربات کی اساس پر استوار کرے۔ اگر کسی ادیب کی زندگی میں کوئی تجربہ موجود ہی نہیں تو وہ تخلیق کیا کرے گا۔ فسانہ آزاد میں جب سرشار نے خوجی اور آزاد کو جنگ لڑنے کے لئے سمندر پار بھیجا تو تجربے کے فقدان نے داستان کو بے رنگ کر دیا تھا۔ بالکل اسی طرح جن ادیبوں نے محض مستعار تجربات سے اپنی تخلیقات میں رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے ان کے فن کے انحطاط کے گواہ لفظ نے بھی رہتے ہیں۔ اس ضمن میں فنون کے پچھلے شمارے میں جناب انتظار حسین صاحب کا افسانہ سوعد کے تاثر بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ میں انتظار حسین صاحب کے اس افسانے کا خاص طور پر ذکر نہ کرتا (کیونکہ اپنے موقف کی حمایت میں بعض اور تخلیقات کی طرف بھی اشارہ کر سکتا تھا) مگر چونکہ یہ مضمون فنون کے لئے لکھا گیا ہے اس لئے اس افسانے کا تذکرہ ناگزیر ہو گیا ہے۔ بہرکیف اس افسانے کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ جب ادیب شعوری طور پر کسی ایسے موضوع کو اپنانے کی کوشش کرے جو اس کے تجربے کی دسترس سے باہر ہو تو اس کا نتیجہ بڑا دردناک ہوتا ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، کہنا میں یہ چاہتا تھا کہ کسی تجربے کو تخلیقات میں سمونے کا مشورہ دینے میں ہم حق بجانب نہیں کہ ادیب کا مسلک ہی یہ ہے کہ وہ کسی مشورے کے زیر اثر تخلیق نہیں کرتا بلکہ سدا اپنی ذات کے اظہار کی طرف مائل رہتا ہے اور وہی کچھ لکھتا ہے جس کا حکم اسے اندر سے موصول ہوتا ہے۔ اب اگر اندر کے اس دیار میں کسی شے سے متعلق کوئی تجربہ موجود ہے تو وہ تخلیق میں ظاہر ہو کر رہے گا۔ اسے روکا نہیں جا سکتا۔ اور اگر یہ تجربہ موجود ہی نہیں تو پھر چاہے آپ اس موضوع پر ہزاروں صفحات لکھوا ڈالیں، یہ جذبے کی گرمی اور سچائی کی رمق سے ناآشنا ہی رہیں گے۔

جنگ کے سلسلے میں شخصی تجربے کی کمی کا احساس تو بہرحال ہم سب کو ہے اور اس کی بڑی وجہ محض یہ ہے کہ جنگ مختصر تھی اور ہمارے ادیب اس کے کرب سے گزرنے نہیں پائے۔ دوسری طرف جنگ نے ہمیں ملی اور مذہبی سطح پر متحرک کیا چنانچہ لازم تھا کہ جنگ کے بعد کی تخلیقات میں ایسی علامتیں ابھر آتیں جن کا انسان کی ( ) سے گہرا تعلق ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اجمل صاحب نے خلیل، کلیم اور مسیح کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ستمبر کی جنگ نے ان علامتوں کو معنوی کشادگی عطا کی ہے اور وہ پاکستان کے ہر رخ شعر وادب پر محیط ہو گئی ہیں۔ مگر دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ یہ علامات پہلے ہی سے اردو ادب میں رائج ہیں اور ہر ملک نے اپنی ضرورت کے مطابق ان کے مفاہیم میں کشادگی پیدا کی ہے کبھی یہ صوفیانہ تصورات کے سلسلے میں رائج ہوئیں، کبھی درباری اور جاگیرداری ماحول کے ضمن میں اجاگر ہوئیں اور ابھی کل کی بات ہے کہ علامہ اقبال نے انہیں اپنی فکری پرواز کے سلسلے میں اور ترقی پسند تحریک نے اپنے مسلک کی تشہیر کے لئے استعمال کیا چنانچہ جب جنگ کے سلسلے میں انہیں ایک بار پھر استعمال کیا گیا تو یہ اقدام مستحسن ضرور تھا لیکن نیا ہرگز نہیں تھا۔ پھر علامتوں کو سلسلہ . اکی مختلف پرتیں مثلاً ( ) سے لے کر بلاٹو یا یونگ کی بنیادی جہت تک بھیلا ہوا نظر آتا ہے اور جب یہ سائکی سے ابھرتی ہیں تو خود کو تلمیحات کی صورت میں نہیں بلکہ ( ) کی زبان میں ظاہر کرتی ہیں۔ دراصل سائکی کے کئی مدارج ہیں۔ جب کسی شخص کے داخلی نظام کو کوئی دھچکا لگتا ہے یا کوئی قوم بحران یا جنگ کی زد میں آتی ہے تو دھچکے کی شدت کے مطابق ہی سائکی کے ایک خاص حصے کو بے نقاب کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دھچکا صرف سائکی کی بالائی سطح کو متاثر کرے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سائکی کے سارے تالاب میں ایسی ہلچل اور اضطراب پیدا کر دے کہ اس کی تاریک ترین سطحوں کے خزائن بھی لپک کر بالائی سطح تک آ جائیں۔ بہرکیف یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ ستمبر کی جنگ نے اردو ادبا کے ہاں سائکی کو برانگیختہ کرنے کا کام سرانجام دیا یا نہیں اور اگر سرانجام دیا ہے تو علامتیں سائکی کے کس دیار سے نازل ہوئی ہیں نیز ان کی شکل و صورت اور نوعیت کیا ہے۔ اگر کوئی صاحب ان علامتوں کی نشاندہی کریں اور جنگ سے پہلے کی علامتوں سے انہیں ممیز اور جدا کر کے دکھائیں تو اس سے جنگ کے دوررس اثرات کا کچھ اندازہ ہو مگر یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جسے اخباری کالم میں حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس سے تو کوئی ڈاکٹر اجمل صاحب ایسا ماہر نفسیات ہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

فتح محمد ملک

میراجی کی کتابِ پریشاں

ایک زمانہ ہوا جب میراجی نے انگلستان کی شاعر بہنوں کو اردو دنیا سے متعارف کراتے وقت ادبی نقاد کو خبردار کیا تھا کہ :

"کسی شاعر کے سوانح حیات اس کے کلام کے مطالعے میں اسی حد تک معاون ثابت ہو سکتے ہیں جس حد تک وہ اس کی ذہنی نشوونما کو سمجھنے میں مدد دیں ذاتی حالات میں دلچسپی سے یہ نقصان پہنچ سکتا ہے کہ ہم افسانہ بسند بن کر رفتہ رفتہ اس کے کلام کی حقیقت سے دور ہوتے جائیں گے اور پھر کلام کی صحیح جانچ میں الجھن پیدا ہو جائے گی :

...ی کی شخصیت اسی ہیجان انگیز دھندلکے میں گم ہے جسے برونٹی خاندان کی شخصیات کے اردگرد دیکھ کر وہ تڑپ اٹھے تھے۔ میراجی کی ذاتیات میں ...ما ہوا انہماک رکھنے والے نقادوں کے ہاتھوں یہ دھندلکا روز بروز زیادہ گہرا اور زیادہ ہیجان انگیز ہوتا جا رہا ہے۔ یہ قرار دینے کے بعد ...ی کجرویوں اور جسمانی آلودگیوں کے پجاری تھے اب اردو تنقید میراجی کے ان مفروضہ سماجی جرائم کی سزا تجویز کرنے میں مصروف ہے۔ چنانچہ ...تازہ ترین نقاد اعجاز احمد نے خود کو سارتر جانا اور میراجی کو ژاں ژینے۔ اور پھر وہ سب کچھ اگل ڈالا جو سارتر نے ژینے کی شان میں کہہ رکھا ہے۔ ...کہ سارتر نے بودلیئر کے بارے میں جو کچھ کہہ رکھا ہے وہ میراجی پر کب چسپاں ہوتا ہے :

He was an antisocial male, suffering from syphilis and an overdraft at the bank

...جدید اردو تنقید کی اہم دستاویز" مشرق و مغرب کے نغمے" کے مصنف کے نقطۂ نظر سے اس تنقیدی اندازِ نظر کی سب سے بڑی خامی یہ ہے ...کار اس کے ماحول سے الگ کر کے خلا میں جانچا گیا ہے۔ یہ ستم میراجی پر ڈھایا جائے تو المیہ اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ میراجی نے شعر و ادب ...کے دوران جو فنی نظریات پیش کئے ہیں میراجی کو تختۂ مشق بناتے وقت ان سے قطع نظر کرنا نامناسب بھی ہے اور ...رسال بھی۔ اپنے عہد کی ...وں کا ذکر کرتے ہوئے میراجی لکھتے ہیں :

"حالی نے دیکھا کہ جس ماحول میں اس کی ہستی کا اظہار ہوا اس میں اسے کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جو مکمل سے بری اور اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہو۔ چنانچہ اس کی طبیعت حالات سے برگشتہ ہو گئی اور وہ نیچرل شاعری کا بانی بن گیا۔ اردو کے موجودہ انقلابی شاعر بھی حالات سے بدظن ہو کر اپنی علیحدہ دنیا بسائے بیٹھے ہیں جس میں اشتراکیت ہے، مساوات ہے۔ نہ جانے کیا کچھ ہے۔ وہ دنیا بھی ایسی ہی ناکارہ ہے جیسی کہ پرانے شاعر کی خیالی دنیا کیونکہ اس میں عمل کا فقدان ہے اور باتوں کی کثرت۔ اس لحاظ سے صرف اقبال اردو کا ایک ایسا شاعر ہے جو صحیح راہ پر چلتے ہوئے ایک ہی دنیا بسانا چاہتا ہے کیونکہ وہ ہر وقت

عمل پر مصر رہتا ہے۔"

معصر ادبی رجحانات پران خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرا جی کو اپنے بزرگ معاصرین میں سے اقبال کا شاعرانہ مسلک پسند تھا لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ میرا جی نے اقبال کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہنے کی بجائے اس رَو کا ساتھ دیا جو اقبال کے متوازی چل رہی تھی۔ اس کی وجہ بھی میرا جی اپنے مذکورہ مضمون میں ہی بتا دی ہے۔ ان کا کہنا ہے:

"ماحول کے ناپسندیدہ ہونے کی صورت میں اگر اس کی صورت باغیانہ نہ ہو تو شاعر صوفی یا بیراگی بن جاتا ہے اور باغیانہ صورت میں

عمل کے ساتھ مصلح ملک و قوم بن جاتا ہے۔"

میرا جی کی فطرت باغیانہ نہ تھی اس لیے انھوں نے صوفی بننے کی ٹھانی۔ وہ ایک زندہ اور توانا ذہن رکھتے تھے اس لئے انھوں نے کسی جامد نظریہ کے فریب سکون سے آشنا ہونے کی بجائے اس اضطراب کو اپنایا جو حقیقت کی تلاش میں انہیں نئے سے نئے ویرانوں کی سیر کراتا رہا اور جس کے باعث ان کا مالیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا بن گیا۔ صوفی کی ذہنی کیفیات بیان کرتے ہوئے میرا جی اپنے ایک مضمون میں بتاتے ہیں کہ:

"صوفی یا بیراگی ایک ایسی سرزمین میں بستا ہے جو اس دنیا سے الگ ہوتی ہے۔ وہ زمین تمام تر آسمان کی طرح صاف اور منزہ فضا بھی نہیں ہوتی اور تمامتر اس دنیا کی آلودگی میں بھی نہیں ہوتی اور اس جگہ بستے ہوئے وہ اس جہان کی زبان و بیان اور تصورات اور استعاروں کو مفہوم کی ایک روحانی نفاست کا لباس پہنا کر ان کیفیات کا اظہار کرتا ہے جن کے بیان کے لئے حقیقتاً اس دنیا کی زبان میں الفاظ ہی میسر نہیں آتے ــــ اس بلند درجے تک پہنچنے کے لئے صوفی کو بعض دفعہ مختلف ذرائع سے اپنی ذہنی زندگی میں ایک سادگی پیدا کرنی پڑتی ہے یہ ذرائع فاقہ کشی، عزلت نشینی، منشیات کا استعمال اور اسی طرح کے ذرائع بے خودی ہیں جن کے وسیلے سے ایک بہجت افزا کیفیت ذہن پر چھا جاتی ہے۔ صوفی یا بیراگی کو انتہائی درد یا انتہائی مسرت اس منزل تک پہنچاتی ہے جس کا تعلق کلیتہً نہ جسم سے ہے نہ روح سے ــــ"

اس طرزِ فکر کے علاوہ میرا جی کا طرزِ حیات اور شاعرانہ کمال اس حقیقت کا غماز ہے کہ میرا جی ایک صوفی شاعر ہیں اور انھوں نے ایمیلی کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ خود ان کے بارے میں بھی سچ ہے:

"ایمیلی کی فطرت میں سب سے بڑا تضاد یہ ہے کہ وہ فطرت پرستی طبیعت کے باوجود اپنے دل کی گہرائی میں ایک صوفی تھی ایک بیراگن تھی۔ وہ میرا بائی کی طرح یہ نہیں کہتی کہ "کماں یاں موہے نہ بھاوے"۔ وہ فطرت کی ہر بات میں دلچسپی لیتی ہے لیکن وہ تصور میں ایک احساسِ مذہبی رکھتی ہے۔ اس کے لیے وجد و حال کی کیفیت جانی پہچانی بات ہے . . . ایمیلی اپنے نفس کی خیالی دنیا میں جس محبوب سے ملنے کی مشتاق تھی وہ روحِ ابد تھی۔ یہ سب نظریہ اگرچہ تصور کا کرشمہ ہے لیکن اس کی حقیقت کو اس سائنٹفک زمانے میں بھی آسانی سے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ یہ خدا کا تصور کوئی غیر مری چیز نہیں جسے سادھو سنت خدا کی رحمت سے کبھی کبھار دیکھ لیتے ہیں بلکہ ایک معین تصور ہے جسے ہر طبیعت اپنے لئے از سرِ نو تخلیق کرتی ہے۔"

میرا جی نے اس معین تصور کو اپنے لئے از سرِ نو تخلیق کیا جس کے ثبوت کے طور پر میرا جی کی خوبصورت ترین نظم "خدا" پیش کی جا سکتی ہے۔ یہاں میرا جی نے روحِ ابد سے ہم آہنگ ہونے کی واردات بیان کی ہے:

میں تجھے جان گیا روحِ ابد
تو تصور کی تمازت کے سوا کچھ بھی نہیں

چشمِ ظاہر کے لئے خوف کا سنگیں مرقد
اور میرے دل کی حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
اور میرے دل میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو دیومالا سے دلچسپی اور خاص انداز کی وسیع المشربی کے باوجود میراجی کے اندر شدید مذہبی احساسات ہیں جن پر گہری چھاپ ہے۔ موت سے چند برس پہلے جب میراجی سے ان کے ترکِ اسلام کی وجہ پوچھی گئی تو انھوں نے احتجاجاً کہا تھا:

"یہ بات غلط ہے کہ میں نے اسلام کو ترک کیا۔ میں ایک خدا کو اب بھی مانتا ہوں مگر میں نے حضرت عمر فاروقؓ تک اسلام کو سمجھا ہے اس کے بعد مجھے اسلام کی اصلی شکل نظر نہیں آئی لیکن مجھے قرآن پڑھ اور سن کر اب بھی غش آ جاتا ہے۔"[1]

عزیز ترین آخری تمناؤں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ جرمنی جا کر قرآنی اخلاق پر تحقیق کریں تاکہ دنیا قرآن کے حقیقی مفہوم سے آشنا ہو سکے آخری دور میں جب وہ کرشن چندر کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ کرشن چندر[2] اس انکشاف پر بھنا اُٹھے تھے:

"میراجی مسلمان ہیں بلکہ پکے مسلمان ہیں۔ ان کا ہندو نام ایک دھوکا ہے۔ صبح سویرے وہ جے جے ونتی کا جو راگ الاپتے ہیں وہ بھی محض فریب ہے۔ دراصل وہ مسلمان ہیں۔"

ہندرلے آزاد خیالی اور وسیع المشربی کے جس جرم کی پاداش میں اپنے مہمان کو فریبی اور دھوکے باز کہا ہے، صوفیا اپنے اسی دامن تر پر ہمیشہ رہے ہیں۔ اگر محض نام بدل لینے سے ہندو بدل جاتا تو سولھویں صدی کے مشہور صوفی بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی الکھ داس کے نام سے مانا نہیں لکھتے ——— ہاں تو ہم نے میراجی کے دین و مذہب کا ذکر ان کی نظم 'خدا' کو سمجھنے کے لئے اٹھایا تھا۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے:

میں نے کب دیکھا تجھے روحِ ابد
آنکھ گشتہ گہرے خیالوں میں ہے تیرا مرقد
صبح کا شام کا نظارہ ہے
ذوقِ نظارہ نہیں چشمِ گداگر کو مگر

'صبح کا شام کا نظارہ ہے' ——— اس میں حضرت ابراہیمؑ کے عرفانِ حقیقت کی واردات کو بیان کرنے والی قرآنی حکایت واضح طور ہو رہی ہے۔ جوں جوں نظم آگے بڑھتی ہے تخلیقِ آدم اور تخلیقِ حیات و کائنات کے اسلامی تصورات موج در موج پھیلتے نظر آتے ہیں اور نظم ان مصرعوں پر ختم ہوتی ہے:

اور میرے دل کی حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
اور میرے دل میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

[میر]اجی کے دل میں محبت کے سوا کچھ نہیں لیکن میراجی کو اپنے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا میں یہ محبت، یہ نور ازل کہیں نظر نہ آیا۔ نظم 'سلسلۂ روز و شب' ملاحظہ ہو:

---

1. میراجی از منظر لسانی مطبوعہ 'نقوش' لاہور
2. میراجی کے مشورے از منظر ممتاز مطبوعہ ہم قدم کراچی

خلا نے اسے اوجھل کیا ہوا ہے
اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے
ہر اک سمت اس کے خلا ہی خلا ہے
سلگتے ہوئے دل میں وہ سوچتا ہے
تعجب کہ زر ازل مٹ چکا ہے

بہت دور انسان ٹھٹکا کھڑا ہے
اسے ایک شعلہ نظر آ رہا ہے
مگر اس کے ہر سمت بھی اک خلا ہے
تخیل نے یوں اس کو دھوکا دیا ہے

عدم اس تصور پہ جھنجھلا رہا ہے
نفس دو نفس کا بہانہ بنا ہے
حقیقت کا آئینہ ٹوٹا ہوا ہے
تو پھر کوئی کہہ دے یہ کیا ہے، وہ کیا ہے؟
خلا ہی خلا ہے، خلا ہی خلا ہے

زر ازل کے مٹ جانے کے بعد کی تیرہ و تار فضا میں میرا جی نے حقیقت کی طرف اپنا سفر شروع کیا مگر یہ وہ دنیا ہے جس کا مجازی رنگ پہلے سے کیونکہ بقول میرا جی "سگمنڈ فرائیڈ کے نظریوں نے حضرت یوسف کے لن ترانی کی گتھی کا بات بنا دیا ہے لیکن بیداری کے خوابوں کی دلکشی ابھی ہے"۔ چنانچہ میرا جی کے ہاں بیداری کے خوابوں کے سہارے مجاز سے حقیقت کا سفر شروع ہوتا ہے لیکن جب وہ منزل پہ پہنچتے ہیں تو حقیقت کا جام سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جاتا ہے۔ ان بکھری ہوئی کرچیوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی کوششوں میں میرا جی کی انگلیاں فگار ہوئیں اور تب درد دل لکھنے کا کام موقوف ہوا اور ان کی فسردہ[1] سی ہڈیوں، اور فسردہ سی خاکستر بے نشان نے 'فسردہ فضا' میں جذب ہو کر سکون پایا تو وہ منزل ہے جس کے میرا جی مسافر تھے اور جو بالآخر میرا جی کو ملی اور ہمیں اس وقت ان کے اس صوفیانہ اور شاعرانہ سفر کے احوال جاننے کی آرزو ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں اپنا سفر یہاں سے شروع کرنا پڑے گا کہ میرا جی نے ناساعد حالات سے ڈر کر تصوف کے دامن میں پناہ باغیانہ جذبہ اور عمل کی قوت ہوتی تو وہ اسلام کی ابتدائی سادگی اور پاکیزگی کے متلاشی اقبال کے ہمنوا بن جاتے۔ اس خاص طرح کے خاص طرح کے عمل کے فقدان کی وجہ سے وہ خود اپنے لفظوں میں عشق کے طائر آوارہ کا بہروپ بھرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے نا... ہیں جن سے پنجہ آزما ہونے کی طاقت خود میں نہ پا کر میرا جی راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ میرا جی کا ہندی مسلمان ہونا اس ضمن میں مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ میرا جی کے مصائب سراسر ذاتی ہوتے برطانوی ہندوستان میں رہنے والے عام مسلمان نوجوان کے نمائندہ مصائب ہیں۔ میرا جی ۱۹۱۲ء میں ایک ایسے شخص کے ہاں پیدا ہوئے؛

---

[1] فسردہ سی کچھ ہڈیاں ہیں، فسردہ سی خاکستر بے نشاں ہے
فسردہ سے کچھ کنکر، فسردہ فضا میں سکوں ہے

(تنہائی۔ از میرا جی)

اعتبار سے برطانیہ کی سب سے بڑی کالونی کا وفادار ملازم، مذہباً کٹر مسلمان اور طبعاً شاعر ہے (بحوالہ مولانا صلاح الدین احمد اور جناب کاملی) میں میراجی پیدا ہوئے، سنِ شعور کو پہنچے اور اپنے باپ کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مختلف ریلوے سٹیشنوں پر زندگی کے چل چلاؤ کا مشاہدہ کرنے کی پٹڑیوں کے دونوں جانب پھیلی ہوئی بنجر اداسیوں اور ڈراؤنے سناٹوں میں زندگی کے ہنگاموں سے بھرپور رونقوں کے خواب دیکھنے میں مـ تھے۔ وہ زمانہ ہماری تاریخ کا عجیب و غریب باب ہے۔ سیاسی طور پر یہ عہد ہندو مسلم اتحاد اور ادبی طور پر ہندوستانیت کی بڑھتی ہوئی لے کا کرتا ہے۔ تحریکِ خلافت اور جمعیۃ العلمائے ہند کی رہنمائی میں تمام ہندی مسلمان کانگرس کے دوش بدوش ملکی آزادی کی خاطر لڑ رہے ہیں ادبی محاذ پر بابائے مولانا عبدالحق، مولانا شرر اور تاجور نجیب آبادی کے رسالوں میں اردو نظم و نثر کی اصلاح کے متعلق اس قسم کے پروگرام شائع ہو رہے ہیں:

۱۔ اردو سے عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ نکال کر اسے عام فہم ہندی زبان بنانا۔

۲۔ آئندہ عام ہندوستانی زبان کے مطابق گرامر تیار کرنا۔

۳۔ اردو نظم کو ہندی وزنوں میں منتقل کرنا

۴۔ اردو نظم میں ہندی مضامین، ہندی خیالات اور ہندوستانی واقعات کو بیان کرنا۔

مولانا تاجور کے لفظوں میں اس اصلاح کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اردو شاعری ہندوستانی شاعری بن جائے گی۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ جب بابائے اردو گاندھی جی یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ اردو زبان ہندو مسلمانوں کے ملاپ کا پھل اور اتحاد کی ضامن ہے۔ مگر یہی وہ زمانہ ہے جس میں ہندی مسلمان کے ذہن میں یہ کشمکش عروج پر ہے کہ وہ ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی اس بڑی اسلامی دنیا کا اٹوٹ انگ ہے جو ہندوستان کے مغرب میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسی میں مولانا محمد علی جوہر نے کہا تھا۔

میں بیک وقت ایک ہی قطر کے دو متقارب دائروں میں گھرا ہوا ہوں جن میں سے ایک کا نام ہند ہے اور دوسرے کا اسلامی دنیا!

اس کشمکش کا نتیجہ تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد ہندو مسلم نفاق، مسلمانوں کی پُرمصائب ہجرت اور مسلمانوں کے ذہن کی پیچیدہ ذہنی الجھنوں کی صورت نکلتا ہے۔ سنہ تیس میں مولانا جوہر کی وفات کے بعد مسلمانوں کا کوئی رہنما ہی باقی نہیں رہتا اور ہندوستان کی آزادی یقینی ہو جاتی ہے۔ ایسے میں عام الجھن میں گرفتار ہے کہ مستقبل کے آزاد ہندوستان میں اس کی ہستی کی بقا کیسے ممکن ہے؟ — اقبال جن رجحانات کے نمائندہ تھے وہ سیاست کی ابھی زیرِ زمین کام کر رہے تھے اس لئے اس کشمکش کو حل کرنے کا آسان تر منفی حل ابوالکلام جیسے سیاسی رہنماؤں اور میراجی جیسے شاعروں کو یہ نظر آیا کہ قومیت کے تصور کو اپنا کر ہندوستان میں ضم ہو جائیں چنانچہ میراجی مستقبل کا تصور تک نہیں کر سکتے:

مستقبل سے میرا تعلق بے نام سا ہے۔ میں صرف دو زمانوں کا انسان ہوں۔ ماضی اور حال۔ یہی دو دائرے مجھے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں اور میری عملی زندگی بھی انہی کی پابند ہے۔ (دیباچہ — میراجی کی نظمیں)

خاص ذاتی سطح پر میراجی کے مستقبل سے بے نیاز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسے باپ کے سب سے بڑے فرزند تھے جو ریٹائر تھے اور گھر بھر کی امید بھری نظریں انہی پر مرکوز تھیں مگر ان کی سنگ دل خون سکھاتی ہوئی بیکار سماج محض اس بنا پر انہیں کوئی قابلِ عزت مق سے انکاری تھی کہ ان کے پاس اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے باوجود میٹرک تک کی سند نہ تھی۔ نتیجہ یہ کہ میراجی ایک ایسی سرزمین کی طرف ہجرت پر مجبور ہوا جو اس دنیا سے الگ تھی:

مجھ کو کچھ فکر نہیں آج یہ دنیا مٹ جائے
مجھ کو کچھ فکر نہیں آج یہ بیکار سماج

اپنی پابندی سے دم گھٹ کے فسانہ بن جائے
میری آنکھوں میں تو مرکوز ہے روزن کا سماں
اپنی ہستی کو تباہی سے بچانے کے لئے
میں اسی روزنِ بے رنگ میں گھس جاؤں گا
لیکن ایسے تو وہی بت نہ کہیں بن جاؤں
جو نگاہوں سے ہر اک بات سکے جانچے
چھوڑ کر جس کو صنم خانے کی محبوب فضا
گم کے بے باک، المناک سیہ خانے میں
آرزوؤں پہ ستم دیکھنا ہے گھلنا ہے
میں تو روزن میں نہیں جاؤں گا، دنیا مٹ جائے
اور دم گھٹ کے فسانہ بن جائے
سنگِ دل خون سکھاتی ہوئی بے کار سماج
میں تو اک دھیان کی کروٹ لے کر
عشق کے طائرِ آوارہ کا بہروپ بھروں گا پل میں
اور چلا جاؤں گا اس جنگل میں
جس میں تو چھوڑ کے اک قلب فسردہ کو اکیلے چل دی
راستہ مجھ کو نظر آئے نہ آئے پھر بھی
ان [illegible] پیڑوں کے ہیولاؤں کو
میں تو چھوتا ہی [illegible] جاؤں گا
اور پھر ختم نہ ہوگی یہ تلاش
جستجو روزنِ دیوار کی مرہون نہیں ہو سکتی
میں ہوں آزاد مجھے فکر نہیں ہے کوئی
ایک گھنگھور سکوں، ایک کڑی تنہائی،
میرا اندوختہ ہے (شام کو — راستہ!)

گم کے بے باک، المناک، سیہ خانے میں، آرزوؤں پہ ستم دیکھنے، گھلنے، اور اپنی ہستی کو تباہی سے بچانے کی خاطر میراجی نے عشق کا بہروپ تو بھر لیا مگر اس بہروپ کے نیچے میراجی کا بدن کراہتا رہا، روح تلملاتی رہی۔ اس بہروپ کو اتار کر دیکھا جائے تو میراجی کو ہم دلی کی مسلمان لڑکی، بمبئی کی پارسی لڑکی اور لکھنؤ کی بیوہ خاتون سے بے نیاز دکھائی دیں گے۔ وہ کسی مثالی حسن کے طلبگار نہیں۔ کوئی

نا ہے بشرطیکہ وہ ان کی دلہن بن کر ان کا گھر آباد کرنے پر آمادہ ہو۔ میراجی کے ہاں محبوبہ کا تصور منکوحہ کا تصور ہے۔ اپنی کتاب
سید علی منظور کی بے حد معمولی نظم "برادر نسبتی" کے مطالعہ کے دوران میراجی بڑے جذباتی لہجہ میں اس امر پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں
عر بیاہتا زندگی اور گھریلو محبت میں رومان کی دلکشی کیوں نہیں دیکھ پاتے؟ اسی طرح اپنی غیر مطبوعہ کتاب "اجنتا کے غار"
دیباچہ میں میراجی نے بتایا ہے کہ:

میری ایک عزیزہ ہیں۔ انھیں میرے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہیں۔ ایک روز باتوں باتوں میں انھوں نے عورت کو ستون کہہ کر اپنا مفہوم ظاہر
کیا۔ آج میں غور کرتا ہوں تو اُن کی یہ بات مجھے صحیح معلوم ہوتی ہے۔ خیالی زندگی میں شاعری کرتے ہوئے ہم عورت کو غزل، نظم یا جو کچھ چاہیں
کہہ لیں لیکن عملی زندگی میں تو عورت مرد کے گھر میں ایک ستون ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سے چھت قائم ہے اور آرام کے لئے سر چھپانے
کی جگہ مہیا رہتی ہے۔ اس کے ہونے سے بچے پیدا ہوتے ہیں اور نہ ہونے سے نظمیں۔ خصوصاً میری نظمیں اس لئے پیدا ہوئیں کہ اپنے گھر میں
اس ستون کی غیر موجودگی میں تخلیق کا کام مجھی کو کرنا پڑا۔"

راجی کی شاعری تنہائی، نا آسودگی اور نارسائی کی جن کیفیات کی ترجمان ہے وہ میراجی کے ذاتی المیہ سے پھوٹی ہیں۔ بیداری کے جن خوابوں کے
نہ ہوسکنے سے یہ المیہ وجود میں آیا ہے وہ بے حد عام، عملی اور پیش پا افتادہ قسم کے خواب تھے۔ میراجی زندگی کے سمندر سے صرف ایک قطرہ کے طلبگار تھے۔
نے کے لئے گھر اور گھر کا ستون —— مگر ذاتی و گھریلو زندگی اس بخیلی پر بھی رضامند نہ ہوسکی۔
انچہ میراجی نے اپنی شاعری کی وساطت سے جس خیالی دنیا کو پیدا کیا اس میں زندگی کے عام مظاہر ایک انوکھی دلکشی کے حامل نظر آتے ہیں۔ یہ دنیا
ز کچھ آوازوں اور کچھ سایوں کی دنیا ہے۔ میراجی کے گیتوں اور نظموں میں دلہن، بہن، ماں اور بچوں کے لہجوں اور مکالموں کا آہنگ شنید نہ ہے
، انجان، کنواری دلہن کی تصویر دیدنی ہے۔ یہ دلہن پری زاد نہیں، متوسط طبقے کی عام سی عورت ہے جو ہماری دکھی بھائی ہے اور جس میں ہمیں شاعری
، کوئی ادا نظر نہیں آتی مگر میراجی کے ہاں وہ بے حد دلکش کردار ہے۔ خوشیوں کے جھرمٹ میں جھولنے کی تمناؤں کو سینے میں چھپائے یہ دلہن میراجی کی
ر جگہ موجود ہے کہیں پس منظر میں تو کہیں پیش منظر کے طور پر۔ اس کے کانوں میں بندے ہیں، ماتھے پر بندی، ہاتھ میں گجرا، گلے میں ہار اور زرتار ریک دوپٹہ
آنچل کو قابو میں کئے "روم روم سندر سنگھاروں سے سنوارے سجی بنی سیج پر بیٹھی دولہا کا انتظار کر رہی ہے۔ اس کے پاس ہی بیٹھی ہوئی دولہا کی بہن
نا رہی ہے:

کیوں بہن، ہم نے سنا ہے کہ دلہن کی آنکھیں
آنکھ بھر کر نہیں دیکھی جاتیں
اور کہتی ہے بہن
میرے بھیا کو بڑا چاؤ ہے، کیوں پوچھتا ہے
اب تو دو چار ہی دن میں وہ ترے گھر ہوگی

(تفاوتِ راہ)

؛ دولہا اس دلہن تک نہیں پہنچ سکتا۔ گھر بسانے کے لئے جن مادی وسائل کی ضرورت ہے وہ اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ میراجی کے ایک
ار بھی آ دو دولہا اور دلہن کا فاصلہ دو پربتوں کا فاصلہ ہے۔ یہ پربت ایک دوسرے کو صرف بادل بن کر ہی مل سکتے۔ مگر پربت بادل کیونکر بنے ——
ری میں یہ پربت بادل بن جاتے ہیں اور "آدمی" اور "سنجوگ" سے لے کر "اجنبی انجان عورت رات کی" اور "لب جوئبار" تک برسات بن جاتے۔ لب جوئبار

بھی کی بدنام۔ یہ نظم بے شک مجھے بہ لحاظ اپنی سفاک حقیقت نگاری اور بے رحم بیباکی کے باوجود اس لئے پیاری لگتی ہے کہ میراجی تخیل کی دنیا میں بھی کسی ملاتے حسن کو برتتے ہیں تو پہلے اس کو مظلوم بنالیتے ہیں :

........جس کے اس پار جھلکتا نظر آتا ہے مجھے

منظر انجان انچھوتی سی دُلہن کی مانند

ہاں تصور کو میں اب اپنے بناکر دولہا

اسی پردے کے نہاں خانے میں لے جاؤں گا۔ (لب جوئبارے)

میراجی نے اس الزام کی تردید کرتے وقت کہ زندگی کا محض جنسی پہلو ان کی توجہ کا مرکز رہا تھا کہ وہ جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو قدرت کی سب سے بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی راحت اور برکت سمجھتے ہیں۔ قدرت کی اس سب سے بڑی نعمت اور زندگی کی اس سب سے بڑی راحت اور برکت سے دائمی محرومی کا احساس میراجی کی شاعری میں دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے، چھت پر لٹکتے ہوئے پیراہن اور دور سے نظر آتی ہوئی مسہری، آغوش کی لرزشوں کے مناظر کو لبریز بلاغت کردیتا ہے اور ان میں نئے تلازمات کی ایک دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ تہذیب و تمدن نے جنس کے ارد گرد جو آلودگی بکھر رکھی ہے اور جس کی وجہ سے قدرت کی یہ سب سے بڑی نعمت جنس بازاری بن کر رہ گئی ہے۔ اس پر میراجی کے ہاں بعض اوقات بے انتہا تلخی اور ہیبت سے لبریز تصویریں بھی نظر آجاتی ہیں مگر مجموعی طور پر وہ جنسی جذبات کو عبادت کی حد تک پاکیزہ سپردگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں :

ایک ہی بات جو پہلو میں چھپائے ہوئے سو باتوں کو

رات کو دن کی طرح نور سے بھر دیتی ہے

دل پہ اک سحر سا کر دیتی ہے (اجنتا کے غار)

زندگی کے جنسی پہلوؤں ہی پر تخلیقی طور پر رہنے کے دوران میراجی رات اور دن کے قدیم اور اپنے زمانے میں مقبول عام تلازمات میں کایا کلپ کرلیتے ہیں۔ میراجی کے ہاں دن ظلم کی علامت ہے اور رات تخلیقی جوش و نمو اور انبساط کی علامت ہے۔ "آمد صبح" اور "سنجوگ" جیسی نظموں میں رات اور چاند پریتم اور پریمی ہیں اور سورج رقیب ــــ اور غروب آفتاب سے لے کر طلوع آفتاب تک کے بے حد دلکش وقفۂ زماں میں انسانی عشق کا ڈراما سارے رنج و راحت سمیت دیکھا جاسکتا ہے۔ رات اور دن کی یہ علامات ذاتی اور رومانی ہی نہیں اجتماعی اور سیاسی رنگ بھی رکھتی ہیں :

رات کے سائے سی خاموش رہا کرتے ہیں

دن کے سائے ڈرکہا کرتے ہیں

بیتی رات کی کہانی سب ہے

اور مری ہستی بھی اب دن کا ہی اک سایہ ہے

جس کے ہر ایک کنارے کو متاعِ سوزاں

اتنی شدت سے جلانے پہ، مٹانے پہ تلی بیٹھی ہے

کاش آجائے گھٹا، چھائے گھٹا اور بن جائے

چڑھتے سورج کا زوال (دن کے روپ میں رات کہانی)

ی کے مصرعے ملکۂ معظمۂ انگلستان کے چڑھتے سورج کے زوال کے نئے دست و پا بنے نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ میراجی نے زندگی کی سفاک
اب و خیال کی دنیا کی طرف گریز ہی کے لئے ہنسوں کے جوئے آوارہ کا بہروپ بھرا تھا مگر اس بہروپ کی مصوری کے دوران میراجی نے بیسویں
ادوں کے برطانوی ہند کے بے چین اور بے راہ رو نوجوان کی پوری جذباتی سرگزشت بیان کر دی ہے :

میری آنکھیں ہیں کہ باز و اپنے
جیسے اک پیڑ کے ٹنڈے ہوں کہیں پھیلے ہوئے
جن پہ طائر کا نشیمن کبھی بنتا ہی نہ ہو
سوکھتے جاتے ہوں ٹنڈے غم محرومی سے (سمندر کا بلاوا)

شہری تعلیم اور صنعتی اخلاقیات کا تقاضا ہے وہ گھریلو زندگی کی تخریب کے بعد اندیشہ اور آسودگی کے نت نئے ڈھنگ پیدا کرتی ہے۔ ما
نوجوان زندگی کی دوڑ میں زیادہ سے زیادہ کلرک بن سکتا ہے۔ میراجی نے اس کلرک کا نغمۂ محبت لکھا ہے۔ اس نوجوان کو مشینی زندگی
سے نجات نہ پاسکنے کے غم کو دفتری فائلوں میں غرق کرنا پڑتا ہے مگر افسر ــــ اس کی زندگی ہی اور ہے :

جب آدھا دن ڈھل جاتا ہے تو گھر سے افسر آتا ہے
اور اپنے کمرے میں مجھ کو چپڑاسی سے بلواتا ہے
یوں کہتا ہے وہ کہتا ہے لیکن بیکار ہی رہتا ہے
میں اس کی ایسی باتوں سے تھک جاتا ہوں تھک جاتا ہوں
پل بھر کے لئے اپنے کمرے کو فائل لینے آجاتا ہوں
اور دل میں آگ سلگتی ہے : میں بھی جو کوئی افسر ہوتا
اس شہر کی دھول اور گلیوں سے کچھ دور مرا پھر گھر ہوتا
اور تو ہوتی !
لیکن میں تو اک منشی ہوں، تو اونچے گھر کی رانی ہے
یہ میری پریم کہانی ہے اور دھرتی سے بھی پرانی ہے (کلرک کا نغمۂ محبت)

تشنہ تمنائیں قلم کے پردے پر پوری ہو سکتی ہیں یا عکسِ تخیل سے یا کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اس کی جیب اور طوائف کے دامن کی دوری مٹ
اب آسودہ ہو جاتے ہیں مگر روح کی تیرگی نہیں مٹتی نتیجہ یہ کہ بازار حسن کے اونچے مکان کے سینے میں بھی بیتاب روح منعکس نظر آتی ہے اور
میں بھی بیداد کا جوش اور فریاد کا عکسِ دراز جھلکتا ہے۔ اپنے زمانے کے نوجوان کی اس مجبوری اور بے بسی پر میراجی نے صنعتی تہذیب
لیم پر جو صدائے احتجاج بلند کی ہیں، انہیں سن کر میراجی کے اس دعویٰ کو ماننے بغیر چارہ نہیں کہ فی الحقیقت موجودہ صدی کی
اسی، اقتصادی اور اخلاقی کشمکش ان کا مرکزِ نظر رہی ہے (بحوالہ "میری پسندیدہ نظم" مرتبہ حسن عسکری)۔" اونچا مکان"۔ "اخلاق کے نام"۔
پسند ادب" اور "اداکار" ان کے اس دعویٰ کا مکمل ثبوت ہیں۔
ی ذہنی خیالی دنیا میں گھر بار میں جڑیں پکڑنے اور اپنے لواحقین کی خدمت کا حق ادا کرنے کی حسرتوں کے علاوہ مذکورہ بالا کشمکش کو

دیکھتے ہیں اور اسی کشمکش کے پس منظر میں ذاتی مصائب سے نجات پانے میں سرگرم رہتے ہیں اور ساتھ ہی عشق کے طائر آوارہ کا بہروپ بھی
یہ عشق ان کی ذاتی محرومیوں میں آفاقی وسعتیں سمیٹ لاتا ہے:

میں ہوں اک بھنڈار دکھوں کا، میرے پاس خزانہ ہے
میں نے اوروں کے دکھ میں اپنے دکھ کو پہچانا ہے (دو پہارنی)

بدم نظر اور اپنی ہمشیرہ کے نام جو خط لکھے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غمِ روزگار میراجی کا سب سے بڑا غم ہے۔ منشی مہتاب دین
والد، فوت ہو جانے، میراجی کے ان کی خدمت نہ کر سکنے کے غم اور اس غم کو غلط کرنے کے لیے پڑھنا لکھنا چھوڑ کر جوتوں اور استرون
نے کے منصوبے اور آخر میں اپنی کمال تک پہنچ کر بھائی بہنوں کے حقوق ادا کرنے کی تمنا ہیں ——— یہ اور ایسی ہی دوسری کئی
کو کسی پر ظاہر کرنا میراجی اپنی غیرت کے منافی سمجھتے ہیں لیکن پریشانیاں ان کی شاعری پر اپنا سایہ ڈالے بغیر نہیں رہتیں۔ زندگی سے
اس کشمکش کا نکتۂ عروج نظم "اجنتا کے غار" ہے جس میں اس بات پر غور کرتے کرتے کہ:

کیوں مجھے وقت کی رفتار نے الجھایا ہے؟

حالی میں کپل وستو کی "جلوۂ قلبِ جہاں" دیکھتے ہیں اور ان پر کھلتا ہے کہ نجات کی راہ گوتم کی راہ ہے، سوئی ہوئی منکوحہ کو چھوڑنے اور گھر بار
اور:

دھیان تو آتے ہی آئے گا، مری آنکھوں کو
سب اک اور ہی شے بن کے نظر آتا ہے
اور تو ——— سامنے لیٹی ہوئی سندر سی مورت
چندا سو رو خطوط
جن نے بیتی ہوئی صدیوں میں مجھے الجھایا
تو مری داسی ہے، تو ہی رانی ہے
رات کی مہلت یک لمحہ کو انبار بنا دیتی ہے
رات کے جانے پہ بیزار بنا دیتی ہے
میرے دل کو مرا دل راجہ ہے
اس کنول تال کے پژمردہ کنارے پہ شکستہ ہے مگر
بات اُس کی نہیں سنتا کوئی
اور یہ بیٹھے ہوئے سوچ کی لہروں میں بہا جاتا ہے
تیری بے باک اداؤں کا جلوس
دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے نکل جاتا ہے
اور پھر دھیان مجھے آتا ہے

لیٹے لیٹے جو تری آنکھوں میں نیند آجائے
میں تجھے چھوڑ کے چل دوں — چپ چاپ
اک ابھٹتی سی نظر، جاگ نہ اٹھے، چل دو (اجنتا کے غار)

وبجات پر چلتے چلتے میراجی غار کے اندر پہنچے تو یہ بھید پایا کہ یہاں بھی چین نہیں:

نوعِ انساں بھی تو اک غار کی مانند ہے تاریک مقام
اس کی تاریکی اجالے کو دبا سکتی نہیں ہے لیکن
کیا اسی واسطے کچھ گیانی یہاں آئے تھے
تاکہ ان غاروں میں چپ چاپ — جہاں والوں سے
ہو کے روپوش — سفر طے کرلیں
دوش و فردا کا سفر طے کرلیں
لیکن افسوس یہاں بھی ان کو
نہ ملا پایۂ نروان — یہی دیواریں
ان کے افسردہ دلوں کی غماز
آج تک وحشت میں سرمارتی ہیں (اجنتا کے غار)

[illegible] کی ہے اور اس حقیقت کی غماز کہ میراجی نے اب دنیا میں رہ کر ترکِ دنیا کا فن سیکھ لیا ہے۔ چنانچہ وہ نوعِ انسان کے غار کی مانند تاریک [illegible] پایۂ نروان حاصل کرنے کی جد و جہد کو تیز تر کر لیتے ہیں اور بمبئی جیسے شہر کے ہجوم میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ جب تک میراجی اپنے مجاہدے سے فارغ [illegible]ں قوم نے اپنی ہستی کی بقا کا مسئلہ حل کر لیا جس کے متعلق وہ کہا کرتے تھے کہ اس کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ اور میراجی کے دوست اور ناگر جن کی [illegible] کو میراجی ذاتی مسئلہ سمجھتے تھے۔ پاکستان کے مراکزِ طلاعات و نشریات کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے خوشحالی کی زندگی بسر کرنے لگے تھے۔
پاکستان کا قیام میراجی کے ہاں ایک بہت بڑا جذباتی تجربہ بن گیا اور انھوں نے قومی نظر کو لکھا:

"یہ دیکھنا [illegible] : رابطِ دلی ہے کہ میراجی اس آتشیں ہنگامے سے سمندر کی مانند حیاتِ تازہ لے کر ایک بار پھر زندگی کی کشمکش کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں"[1]

[illegible] وہ میراجی کو بمبئی کے تاریک غار سے باہر اور دنیا کی روشن فضاؤں سے رابطہ قائم کرنے پر اکساتی ہے۔ "خیال" منظرِ عام پر آتا ہے اور میراجی "خدا" [illegible] زدہ شب"، "یگانگت"، "تنہائی" اور "عدم کا خلا" جیسی نئی نظمیں تخلیق کرتے ہیں۔ یہ نظمیں اس قدر نئی ہیں کہ خود میراجی کے ہاں رنگِ تازہ کی نمود [illegible] ان میں حرف و معنی، ہر دو اعتبار سے میراجی کے ہاں ابتدائی ہندی نواز شاعری سے عجمی اسلامی شعری روایت کی طرف گریز کا منظر دکھائی دیتا [illegible]ر میں میراجی نہ صرف نئی پابند نظمیں اور غزلیں لکھتے ہیں بلکہ پرانی پابند نظموں اور غزلوں کو شائع کرنے کے لئے بھی بے قرار نظر آتے ہیں۔ [illegible] کے ساتھ ساتھ عمر خیام کا ترجمہ بھی کرتے ہیں اور دامودر گپت کی نظم شائع کرتے وقت "خیال" کے اداریے میں یہ لکھنا نہیں بھولتے:

---

[1] [illegible] کے چند خطوط" از الطاف گوہر مطبوعہ "نئی تحریریں" نمبر ۴

"وامو ورکپٹ کی پیروی میں آج ہم ایسی چیز ہرگز نہ لکھیں گے لیکن ایسی چیز پڑھیں گے ضرور تاکہ ہماری دنیا میں وہ ماحول ہی نہ بننے پائے جو محض اذیت کو حیات بتاتا ہے۔"

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں گھر یاد آنے لگتا ہے، ماں کی آواز سنائی دیتی ہے:

یہ سرگوشیاں کہہ رہی ہیں اب آؤ کہ برسوں سے تم کو بلاتے بلاتے
مرے دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
کبھی ایک پل کو، کبھی ایک عرصہ صدائیں سنی ہیں مگر یہ انوکھی
ندا آ رہی ہے
بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے نہ آئندہ شاید
تھکے گا
"مرے پیارے بچے" "مجھے تم سے کتنی محبت ہے" "دیکھو
اگر یوں کیا تو بُرا مجھ سے بڑھ کر نہ کوئی بھی ہوگا"
"خدایا خدایا!"
کبھی ایک سسکی، کبھی اک تبسم، کبھی صرف تیوری
مگر یہ صدائیں تو آتی رہی ہیں
انہی سے حیاتِ دو روزہ ابد سے ملی ہے
مگر یہ انوکھی ندا جس پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
یہ ہر اک صدا کو مٹانے [illegible] رہی ہے

(سمندر کا بلاوا)

یہ وہ زمانہ ہے جب میراجی کا جسم جواب دے چکا تھا اور وہ "کتاب پریشاں" کے عنوان سے ہمیں اپنے ادبی فنی، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی نظریات سے روشناس کرانے کا سلسلہ منقطع کرنے پر مجبور ہو گئے تھے اور لاہور آکر اپنا علاج کرانے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ مگر ان کی بجائے صرف یہ خبر لاہور پہنچ سکی[۵]۔ بسترِ مرگ پر دم توڑتے ہوئے میراجی کے ہاتھ میں جو کتاب تھی اُس کا نام ہے:

The Defeat of Baudelaire

(بودلیئر کی شکست)

---

۵ "میراجی کے آخری لمحات" از اختر الایمان مطبوعہ نقوش لاہور

منیر احمد شیخ

تنقید کی اخلاقی اقدار

اردو تنقید کے بنیادی مسائل میں اخلاقی اقدار کے تعین کا مسئلہ ایک مدت سے ادب میں ادبی تنقید کا دلچسپ موضوع رہا۔ ہمارے ہاں بیشتر خاص طور پر جدید تنقید کا انداز نظر مغرب کے تنقیدی نظریات کے زیر اثر مرتب ہوا۔ اردو ادب کے نقادوں نے جانچنے پرکھنے کے ڈھب ہی سے مستعار لئے اور نقد و نظر کا خالصتاً مشرقی نقطۂ نظر جو مشرق کی اخلاقیات سے پیدا ہوا تھا، محل نظر ٹھہرا۔ تنقید کے اخلاقی پیمانے معاشرے اور سماجی حالات سے جنم لیتے ہیں۔ مغربی تنقید کا نظریہ مغربی معاشرے کی تہذیبی اقدار کا حامل ہے اور مشرق کے جانچ پرکھ کے پیمانے مشرق کی مذہبی روایت سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارے یہاں جدید تنقید نے یہ ٹریجیڈی عرصے سے اردو ادب کے ساتھ روا رکھی ہوئی ہے کہ ایک معاشرے کی تنقیدی اقدار کو جوں کا توں اٹھا کر ایک مختلف معاشرے کے ادب پر عاید کر دی جاتی ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ نہ صرف ناانصافی ہے بلکہ ایک لحاظ سے جہالت اور گمراہی کی دلیل ہے۔ ہمارا اپنا اخلاقی نقطۂ نظر جو مشرق کی بصیرت سے نکلا ہے، کم از کم تنقید کی حد تک اس کی پہچان میں سراسر غائب نظر آتا ہے۔

مولانا حالی سے پہلے اردو تنقید، ادب کی ایک الگ صنف کی حیثیت نہ رکھتی تاہم شعر و ادب کی جانچ پرکھ کا ایک انداز ضرور تھا۔ یہ تنقید سینے سے، خطوط کے ذریعے یا تذکروں میں کسی نہ کسی صورت موجود تھی، اگرچہ کسی شاعر اور ادیب کا کوئی مکمل اور تفصیلی جائزہ ان میں نہ ہوتا تھا مگر رمز و کنایہ میں تنقیدی آرا کا اظہار ضرور ہوتا تھا۔ اس دور میں تنقید ذات سے الگ نہ تھی یعنی رائے دینے والے کے یہاں پہلے سے کوئی نظریات نہ ہوتے تھے۔ جن کی روشنی میں وہ ہمعصر تخلیقات کو جانچتا۔ تنقید ابھی تک پیشہ نہیں بنی تھی اور کسی شاعر کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اس کی ذات کو اس کے کلام سے الگ نہ کرتے تھے بلکہ اکثر اوقات تو جانچ پرکھ میں ذاتی تعصبات یا کبھی کبھی تعلقات بھی در آتے تھے۔ گویا تنقید شاعر کی پوری شخصیت اور اس کے کلام پر تبصرے کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ ایک لحاظ سے خوبی بھی تھی اور ایک لحاظ سے کمزوری بھی۔ خوبی اس لئے کہ تنقیدی اخلاقیات سب بنائے اصولوں اور نظریات کی محکوم نہ تھی۔ شاعر اور اس کا کلام مل کر ایک تہذیبی علامت بنتے تھے اور روایت کا متحرک عنصر۔ خرابی کی بات صرف یہ تھی کہ بعض اوقات تعصبات اور معاصرانہ چشمک کلام کی خوبیوں کو سامنے نہ آنے دیتے۔ اردو تنقید میں تعصب اور چند مروجہ اخلاقی نظریات نے ایک مدت تک ادبی روایت میں نئے عناصر کو تسلیم نہ کیا۔ نظیر اکبر آبادی اس ضمن میں شامل ہیں۔ ان کی شاعری جو ادب کی مروجہ روایت سے الگ تھی، تنقید ادب کے مروجہ اخلاقی نظام کی نذر ہو گئی۔ یوں کہئے کہ تنقید ادب کا نقطۂ نظر روایت سے انحراف کا متحمل نہ ہو سکا اور ایک اچھے بھلے باندار شاعر کو تاریخ ادب کی اخلاقیات نے شہر بدر کر دیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا تنقید ادب میں صرف خارجی پیمانے ہی ہونے چاہئیں یا اس میں داخلیت کی بھی کچھ نہ کچھ کارفرمائی ضروری ہے۔ یہ مسئلہ تنقید کا

بیادی مسئلہ ہے اور اس معاملے میں محض داخلیت اور محض خارجیت کی دو انتہائیں دکھنے میں آتی ہیں۔ اس معاملے میں ہمیں تخلیق ادب کے نظریے
ت رجوع کرنا پڑے گا۔ "تخلیق ذات سے شروع ہوتی ہے"، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ذاتی حوالے کے بغیر ادب، ادب نہیں بنتا لفظی بازی گری رہ جاتا ہے۔
حوالے سے میری مراد ادیب کی اپنی ذات اور اس کے اردگرد کی فضا ہے جس میں وہ جیتا ہے اور اس کے وہ مسائل ہیں جن کا اسے سامنا کرنا پڑتا ہے
مائل تہذیبی، اقتصادی اور تاریخی عوامل سے وجود میں آتے ہیں اور ادب کا حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر انہی مسائل میں سے پیدا ہوتا ہے۔ غالب کی
ی کو اس کے تہذیبی، تاریخی اور اقتصادی پس منظر میں رکھیے اور دیکھیے کہ پڑھنے والے کے سامنے کیا آتا ہے؟ یہ صرف غالب ہی کی بات نہیں، ہر ادبی
ی لکھنے والے کے دور ہی میں موجود ہوتی ہے۔ اسے اپنے دور سے الگ نہیں کیا جا سکتا یعنی تنقیدی اقدار کی ترتیب میں ادیب کا ذاتی حوالہ ادبی
اور اس کے تخلیقی شعور کو سمجھنے میں بہت اہم ہے۔ ایک دور کا انفرادی اور اجتماعی شعور تخلیق ادب کے راستے سے اظہار پاتا ہے اسی لئے ادب اپنے
کا آئینہ کہا جاتا ہے کہ اس میں پورے عہد کی جذباتی اور ذہنی کشمکش اور اس کے اخلاقی تقاضے موجود ہوتے ہیں۔ یہ ایک دور کا ذاتی حوالہ ہے۔ چنانچہ
طرح تخلیق ادب میں ذات تخلیق سے جدا نہیں ہوتی اسی طرح اس کے پرکھنے کے معیار متعین کرتے وقت لکھنے والے کی ذات اور اس کے زمانے کا شعور
یدی اقدار کا لازمی حصہ ہوتا ہے تخلیق ادب اور تنقید ادب دراصل ایک ہی اخلاقی نظام کے تابع ہوتی ہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ ادب کی تخلیق تو
اخلاقی نظام کے تحت ہو رہی ہے اور اس کی قدر و قیمت کے معیار ایک اور اخلاقی نظام سے متعین ہوں۔ یہی اخلاقی قدر باہم اخلاقی نظام ہی پیدا کرتا
اور یہیں سے اس دور کے ادبی شعور کی بنا پڑتی ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا قدیم طرز تنقید، جدید طرز تنقید سے افضل ہے کہ وہ اس شعور سے عاری نہیں۔

میں نے شروع میں مولانا حالی کا حوالہ دیا تھا کہ اردو تنقید میں انہوں نے ایک باقاعدہ شعوری سطح پر ادب کو جانچنے پرکھنے کے معیار متعین کرنے کی
ڈالی۔ حالی اگرچہ اسی دور سے تعلق رکھتے تھے جس میں تذکرہ نویسی تنقید ادب کا موثر ذریعہ تھی مگر انہوں نے بھی خالصتاً داخلی معیارات کو شعور
کے لئے کافی نہ سمجھا اور کچھ خارجی پیمانے بھی بنائے جو ان کی شاعری کی طرح اخلاقیات کے چند مخصوص سانچوں میں ڈھلے ہوئے تھے۔ ہر چند کہ تنقید
میں اخلاقی اقدار کا تعین کوئی گالی نہیں لیکن ہمارے جدید ناقدین نے مولانا حالی کی اخلاقیات ہی کو نشانہ بنایا اور ان کی شاعری اور ان کی تنقید
حوالے سے زیر عتاب رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ حالی نے اردو تنقید میں جس نئے دور کی بنیاد رکھی وہ خارجیت کے ساتھ ساتھ داخلی عناصر کی یکسر نفی نہیں
اگر ایسی بات ہوتی اور وہ ذاتی پسند اور ناپسند کو تخلیق ادب میں منہا کر دیتے تو یادگار غالب، حیات سعدی اور حیات جاوید جیسی کتابیں نہ لکھی جاتیں۔
حالی کا کام یہ ہے کہ انہوں نے ذاتی تعصبات کے عناصر کو تنقید میں ختم کیا اور چند خارجی معیاروں کی طرف اشارے کئے کہ تنقید ادب کو اپنی معیاری
عمارت تعمیر کرنا تھی تاکہ یہ ایک الگ صنف کی حیثیت سے پہچانی جا سکے۔ اس کام کا فائدہ یہیں ہوا کہ حالی کے بعد محض ادب ہی نہیں، ادیب کی ذات بھی
ع ادب بن گئی۔ جدید تنقید میں ادب کے تہذیبی و اقتصادی پس منظر کے علاوہ اس کے نفسیاتی تجزیے بھی ہونے لگے اور نفسیاتی تنقید بھی نقد و نظر کا
جزو قرار پائی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے ناقدین علم نفسیات کے کچے پکے شعور کی وجہ سے بہت سی بوالعجبیاں کر جاتے ہیں اور ادب و شعر کو لیبے گورکھ دھندے
ے جاتے ہیں کہ ادبی ذوق کی تربیت کہیں بہت پیچھے رہ جاتی ہے

بہرحال اب آہستہ آہستہ بات یہاں تک پہنچی ہے کہ ادبی تنقید بہت سے اخلاقی نظریات میں سے گزرتی ہوئی ایسے مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں ادیب کی
اور اس کا ادب "لفظ عظیم" کے چکر سے نکل آئے ہیں۔ اب لکھنے والے کا پورا تجزیہ، اس کی گرائیں اور اس کی کمزوریاں صحیح ادبی شعور کے لئے اتنی ہی اہم
ا ہیں جتنی کسی زمانے میں اس کی خوبیاں، نیکیاں اور تقدس اہم ہوا کرتا تھا۔ جدید تنقید ادب، ادیب کے احترام سے ہٹ کر حقیقت پسندی کے زیادہ
ہو گئی ہے۔ اب اخلاقی قدریں جدید اقتصادی، سماجی اور نفسیاتی عناصر ہی کے زیر اثر مرتب ہوتی ہیں اور انہی کے حوالے سے نئے ادبی محاکمات دیکھنے میں

ملے ہیں

ہماری ادبی نگارشات کو جانچنے پرکھنے کے مغربی معیاروں کے سلسلے میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ ہمارے جدید لکھنے والے فن تخلیق میں مغرب ہی کی
ی کرتے ہیں مثلاً فن افسانہ نویسی ہے۔ ۱۹۵۳ء کے بعد کی پود مغرب کی دی ہوئی لائنوں پر ہی کہانی کے خطوط بناتی رہی گویا ان سب کے پیر و مرشد امریکہ،
، انگلستان اور روس ہی تھے۔ منٹو کی مثال اس ضمن میں دی جاتی ہے کہ اس نے او ہنری اور موپساں کے تتبع میں لکھا چنانچہ منٹو کے افسانوں کو پرکھنے کے
ل بھی وہی ہوں گے جو مغرب میں رائج ہیں۔ یہ استدلال بظاہر بہت اپیل کرتا ہے اور الزام کو ناقدین سے ہٹا کر ادیبوں کے سر پر تھوپ دیتا ہے لیکن دیکھا جا
اعتراض صرف تکنیک کے تتبع کی حد تک درست ہے۔ اردو افسانہ تکنیک کے اعتبار سے مغرب کی افسانہ نویسی کی روایت میں لکھا گیا لیکن اردو افسانے
وضوعات اور ان کی بُنت مشرق ہی کے ماحول میں ہوئی ان میں تمام تر جذباتی اور ذہنی مسائل اپنے یہاں کے انفرادی اور اجتماعی مسائل ہیں ہمارے
نگار کی تحریک کا مرکز مغرب نہیں مشرق ہی رہا ہے اور اسی پس منظر میں لکھنے والوں کی تخلیقی صلاحیتوں نے جنم لیا ہے۔ لہٰذا اپنے افسانے کے
مشرقی موضوعات کو محض اس لئے مغربی پیمانوں سے ناپنا کہ ان موضوعات کو برتنے میں مغربی افسانے کی تکنیک کو استعمال کیا گیا ہے کچھ ایسا صح
عمل نہیں ہے۔

تنقید کی اخلاقی اقدار کے سلسلے میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ جدید ناقدین کو کوئی ادبی محاکمہ دینے سے پہلے اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا ہے کہ
ے والوں نے اپنے دور کی اخلاقی قدروں کو کس حد تک قبول کیا اور کس حد تک رد کیا۔ رد و قبول سے اس عہد کے لکھنے والوں کی جذباتی اور شعوری کیفیات
پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک مخصوص وقت میں ادبی نہج کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ لکھنے والوں نے مروجہ اخلاقی قدروں کو کبھی جوں کا توں قبول نہیں کیا
ے بغاوت کی ہے یا ان میں تبدیلیاں لائے ہیں۔ بغاوت کی صورت میں ادیب کو مروجہ اخلاقی اقدار کے مقابلے میں ایک دوسرا اخلاقی نظام
کرنا پڑتا ہے جیسے مارکسی ادیبوں نے روحانی اقدار کے متبادل مادی اقدار کی اخلاقیات کا نظام پیش کیا۔ یہ متبادل اور مخالف قوتیں اخلاقیات کی شکست و
ت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور ادبی رجحانات انہی قوتوں کے حوالے سے جانچے اور پرکھے جاتے ہیں۔ مروجہ اخلاقی نظام کو من و عن قبول کرنے میں لکھنے والا
ا روایت کا حصہ بن کر رہ جاتا ہے اور اپنی انفرادیت قائم نہیں رکھ پاتا۔ روایت اسی طرح آگے بڑھتی ہے کہ اس میں سے مردہ حصوں کو رد کر دیا جائے
زندہ اور جاندار حصوں کو قبول کر کے انھیں آگے [illegible] اور بڑھایا جائے

ممتاز احمد

اقبال کا اصل کارنامہ

یہ مضمون یقیناً مصنف کے وسیع اور گہرے مطالعے کا نتیجہ ہے اور اقبال کے کارناموں کو ایک نئے زاویے سے سمجھنے کی عالمانہ کوشش ہے، مگر ہماری رائے میں مصنف نے سرسید کی تحریک کے بارے میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ محل نظر ہے اسی طرح یہ مسئلہ بھی مزید بحث کا مستحق ہے کہ اقبال نے فقہ اور اسلامی الٰہیات کی تشکیل نو کے سلسلہ میں سید سلیمان ندوی اور مولانا انور شاہ کے علاوہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی بھی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس مضمون کا آخری فقرہ بھی ایک مفید اور تعمیری بحث کا موضوع بن سکتا ہے۔

اہل قلم سے اور خاص طور سے ماہرین اقبالیات سے گزارش ہے کہ وہ اس مضمون کو مذاکرے کا موضوع قرار دے کر اپنے ارشادات سے "فنون" کو نوازیں۔۔۔۔۔ ادارہ

ایک فرانسیسی نقاد کا قول ہے کہ ہر بڑا شاعر اپنے زمانے سے بلند بھی ہوتا ہے لیکن اپنے زمانے کے چیلنج کا جواب بھی ہوتا ہے۔ یہ بات دنیا کے دوسرے شاعروں کی طرح اقبال کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ پس ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اقبال کے فکر و فن کو سمجھنے کے لئے اُن حالات کو بھی نگاہ میں رکھیں جو اُن کے دور میں برصغیر اور برصغیر سے باہر نئی دنیا کی تشکیل میں ایک اہم حصہ ادا کر رہے تھے۔ ان حالات کے حوالے سے ہی اقبال کا اصل کارنامہ اپنی واضح ترین صورت میں سامنے آ سکتا ہے۔

آج بیسویں صدی کے آخری سرے پر کھڑے ہو کر جب ہم اس صدی کے آغاز میں برصغیر اور دوسرے اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی حالت پر اعادۂ نظر کرتے ہیں تو ہمیں اقبال کے ساتھ ہمنوا ہو کر یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کی ناکامی کے نتیجے میں برصغیر میں مسلمانوں کا بچا کھچا سیاسی اقتدار بھی ختم کیا جا چکا تھا اور انگریز پوری طرح ہندوستان کے سیاہ سپید کے مختار بن چکے تھے تاہم مسلمانوں کا معاشی و مادی ابتلاء کا شکار ہو جانا کوئی اتنا بڑا حادثہ نہ تھا جو بطور امت کے ان کے اجتماعی شعور میں بنیادی تبدیلیوں کا سبب بنتا۔ اس طرح کے حادثات قوموں کی زندگی میں ہوتے ہی رہتے ہیں اور زندہ قومیں بحرانوں سے مضمحل اور ضعیف نہیں ہوتیں بلکہ انہیں اپنی قوت و شوکت کے لئے ایک چیلنج سمجھ کر عروج کے لئے بحرانوں کو بطور زینے کے استعمال کرتی ہیں۔ اصل حادثہ اور اصل المیہ معاشی و مادی نقصانات کے علاوہ تھا اور وہ المیہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے اختتام اور انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے آغاز کی درمیانی مدت میں مسلمانوں کے اندر سے کوئی ایسا رجل رشید پیدا نہیں ہوا جو ایک کی تعمیر اور دوسرے کی تخریب کے اصل وجوہ سے باخبر ہوتا اور تہذیبی انتشار کی اس فضا میں مسلمانوں کو

لائحہ عمل تجویز کرتا جو انھیں غیر ملکی استحصال کے خلاف سینہ سپر ہونے اور دینِ حق کا علمبردار ہونے کی راہ دکھاتا۔ برعکس اس کے اس دور میں مسلمانوں
سے جو افراد اٹھے انھوں نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو انگریز کی سیاسی غلامی سے سمجھوتہ کرنے کا مشورہ دیا بلکہ تہذیبی دائرے میں بھی ہتھیار ڈال دینے
کی۔ سر سید اور ان کے رفقاء کی کوششوں سے اس دور کے مسلمان نوجوان کو ڈگری اور اس ڈگری کے نتیجے میں کلرکی اور پھر اس کے نتیجے میں
ٹی تو حاصل ہو گئی لیکن یہ نوجوان اس انقلابی روح سے محروم ہو گیا جو ستاروں پر کمندیں ڈالنے کے لئے مہمیز بنتی تھی۔ میکالے نے کہا تھا کہ ہم
ن میں ایک ایسا نظام تعلیم رائج کریں گے جو نام کے مسلمان تو باقی رکھے گا لیکن ان کی روح انگریزوں جیسی ہوگی۔ سر سید نے کہا کہ ایک غیر قوم ہمارے
کا جھٹکا کیوں کرے، ہم خود ہی انھیں ذبح کئے دیتے ہیں، چنانچہ علی گڑھ تعلیمی تحریک نے جو نسل تیار کی وہ تخلیقی صلاحیتوں سے محروم اور زندگی
رے میں مغربی تہذیب کی مقلد تھی۔

دوسری طرف مسلمان قوم کی سب سے زندہ جاندار، بھرپور اور عمل کے میدان میں سرگرم کار رکھنے والی روایت جہاد کی تھی جسے انگریزوں کے
لیے مستقل تحفظ کی خاطر ختم کرنے کی بھی ایک کوشش کی گئی۔ اس سیاسی و تہذیبی انتشار نے زندگی کے مختلف شعبوں میں جس طرح اظہار کیا
۔ ایک طرف تو سیاسی فلسفے پر مغرب کا پوری طرح غلبہ ہو گیا اور مغربی تصورِ قومیت اور لادینی جمہوریت مسلمانوں کے آئیڈیل قرار پائے۔ دوسری
ترقی شکلوں میں بھی بنیادی تبدیلیاں عمل میں آنے لگیں۔ لباس، رہن سہن، زبان ہر چیز پر مغربیت کا غلبہ ہو گیا اور مادیت نے اخلاقی اور روحانی
بدل لی۔ ان حالات نے بیسویں صدی کے آغاز ہی سے برصغیر کے مسلمانوں میں تہذیبی انتشار کی جو کیفیت پیدا کرنی شروع کر دی تھی اس کا نتیجہ
کے ایک شعر میں یہ تھا :

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے　　　مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

برصغیر سے باہر مسلمانوں کی حالت اس سے کچھ بہتر نہ تھی۔ ایران پر رضا شاہ اور افغانستان میں امان اللہ خاں کی آمریت مسلط تھی، عرب دنیا
ے سیاسی استحصال کے آگے دم توڑ رہی تھی اور ترکی میں مصطفٰے کمال اوجِ ثریا کی قربت کا عزم رکھنے والی قوم کو مغرب سے قریب ہونے کا حکم دے
۔۔ عالم اسلام کے علاوہ دنیا کے دوسرے ممالک اور بالخصوص مغربی ممالک بھی وطنی قومیت کے متعصبانہ نظریئے کی پیروی کے نتیجے میں ایک
ے کے غار کے دہانے پر کھڑے تھے طبیعی علوم میں نئے نئے انکشافات قدیم نظریاتی سانچوں کو ڈھا کر ایک نئی دنیا کے طلوع کی خبر دے رہے تھے۔
میں کانٹ چھانٹ کا ایک وسیع سلسلہ جاری تھا۔ فرد کی بے قید آزادی کے ردِعمل کے طور پر اشتراکی اور فاشی نظریات جنم لے رہے تھے۔ غرضیکہ
یب کا ایک وسیع سلسلہ تھا جو سارے یورپ پر چھایا ہوا تھا۔

یہ تھے وہ حالات جن کے درمیان اور جن کے مقابلے میں اقبال نے اپنی فکر کا چراغ روشن کیا۔ اقبال خود مشنری اسکول اور مغرب کے تعلیمی
کے تعلیم یافتہ تھے لیکن ان کے دل و نگاہ مسلمان تھے اور مغربی افکار کا وسیع و عمیق مطالعہ کرنے کے باوجود وہ اس دور کے دوسرے نوجوانوں کی
کے طلسم کا شکار نہ ہو سکے۔ اسلام کے عالمگیر پیغام نے ان کے دل میں اس طرح گھر کر لیا کہ پھر اس کے بعد ان کی شاعری اسلام اور مسلمانوں کے
کی ترجمان بن گئی۔ مغرب میں ایک نئے دور کی تعمیر اور مغربی ممالک کی مادی ترقی جہاں دوسرے مسلمانوں کو مرعوب اور مسلمانوں کے اندر پائی جانے
کی انتشار کی کیفیت انھیں مایوس کر رہی تھی، وہاں اقبال ان حالات سے مایوسی کے بجائے رجائیت کا سبق لیتا ہے اور علیٰ وجہ البصیرت
پر یقین رکھتا ہے کہ یہ حالات مسلمانوں میں ایک بڑی تبدیلی کا سبب بننے والے ہیں :

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے　　　عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

دیکھ چکا المنی، شورشِ اصلاحِ دیں — جس نے نہ چھوڑے کہیں عہدِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت — اور ہوئی عقل کی کشتیِ نازک رواں
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب — جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملتِ رومی نژاد، کہنہ پرستی سے پیر — لذّتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب — رازِ خدائی ہے یہ، کہہ نہیں سکتی زباں

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

اسلام کے لئے اقبال کے دل میں بے پناہ تڑپ اور ایک شدید جذبہ موجود تھا لیکن ابتدا میں اس جذبے نے باقاعدہ ایک آئیڈیالوجی اختیار نہیں کی تھی۔ اسلام کو بطور ایک آئیڈیالوجی کے پیش کرنے کا آغاز اُن کی "بانگِ درا" کی آخری طویل نظموں "شکوہ"، "جوابِ شکوہ" "طلوعِ اسلام" اور "شاعر" سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد کا دور اُن کی فکر کی تشکیل کا دور ہے جس میں وہ اسلام کو بطور ایک عالمگیر صداقت اور مکمل نظریۂ حیات کے لاتے ہیں۔ یہی وہ دور ہے جس میں اُنھوں نے "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" جیسی معرکۃ الآرا کتابیں لکھیں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنی فکر کے اظہار کے لئے شعر ہی کو ذریعہ بنانا کیوں پسند کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نزدیک مسلمانوں کی بنیادی ایمانیات تو اپنی خالص شکل میں موجود تھیں لیکن اُن کا خیال تھا کہ بطور امتِ وسط کے، مسلمانوں پر جو فرائض عائد کئے گئے تھے اور تاریخِ عالم میں امت کو جس مشن کی تکمیل کرنی تھی، ان فرائض اور مشن کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کا اصل مرض جمود اور سکون کا مرض تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان اس وقت تک دوسروں کی سیاسی اور فکری غلامی سے آزاد نہیں ہو سکتے جب تک وہ ایمان کا ایک گہرا، مضبوط اور اٹوٹ رشتہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں سے استوار نہ کریں۔ گویا مسلمانوں کو اس وقت ایمان کی ضرورت نہ تھی بلکہ سرچشمۂ ایمان سے زندگی کو متحرک کرنے والے پیغام کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ زندگی بخش اور حرکت و جد و جہد پر اُبھارنے والا پیغام فکری بحثوں سے نہیں بلکہ جذباتی اپیل کے ذریعے ہی پہنچایا جا سکتا تھا اور یہ جذباتی اپیل صرف شعر ہی میں ممکن ہے۔ التشبیہ بلا مشبہ، یہ سامنے رکھنی چاہیئے کہ قرآن پاک کو شعر تو نہیں لیکن شعری نثر کا وہ اعلیٰ ترین نمونہ ضرور ہے جو آج تک انسان نے دیکھا ہے۔ قرآن پاک کی شعری نثر سے تفلسف کے بجائے عملیت پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک کی آیات پڑھ کر آدمی کو منطقی اور عقلی نکتہ طرازیوں کی بلکہ اس کے دل میں کچھ کر گزرنے کا عزم بیدار ہوتا ہے۔ اقبال نے بھی مسلمانوں کو حرکت اور جد و جہد پر اکسانے کے لئے اپنے محدود دائرے میں اس اسلوب کو اپنانے کی کوشش کی۔

"اسرارِ خودی" فرد کی بازیافت اور "رموزِ بے خودی" امت کی بازیافت کی نہایت کامیاب کوششیں ہیں۔ ان میں اقبال نے اپنے خودی اور بے خودی کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ رائج الوقت تصوف پر، جو مسلمانوں کو بے عملی اور رہبانیت کی طرف لے جا رہا تھا، اُن انفرادی اور اجتماعی صفاتِ عالیہ کی نشان دہی کی جو حالات کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کو اپنانا ضروری تھیں۔ ساتھ انسان کے وضع کئے ہوئے باطل نظریات پر غالب کرنے کے لئے اجتماعی جد و جہد پر زور دیا۔ اقبال کی فکر میں یہی دو کتابیں بنیادی حامل ہیں۔ اُن کے دوسرے مجموعوں میں انہی کے خیالات کو مزید توضیح و تشریح کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اقبال نے بتایا کہ اسلام

رجامد اور ساکن کرنا نہیں بلکہ متحرک اور سرگرم کار رکھنا ہے اور جد و جہد اور کشمکش کے شعلوں کی آنچ ہی میں زندگی تخلیقی، موثر اور
ناصر کو پروان چڑھا سکتی ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز — سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی
کشاکش زم و گرما، تپ و تراش و خراش — ز خاک تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی
اسی کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام — یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی

اس انقلابی دعوت اور جذباتی اپیل کو بہت جلد ہی اپنے اظہار کا موقع مل گیا۔ خلافت تحریک برصغیر پاک و ہند میں اس جوش و خروش سے اٹھی کہ جس کا
نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اس تحریک کے بہت جلد ہی ناکام ہو جانے سے جو دور رس اثرات مسلمانوں پر مترتب ہوئے، وہ بھی کچھ کم نقصان دہ نہ تھے۔
فت کی ناکامی نے پوری مسلمان قوم کو مضمحل اور مایوس کر دیا۔ انتشار اور تہذیبی خلا کی اس کیفیت نے اقبال کو اس پر مجبور کیا کہ وہ اپنے طریق علاج
Re[illegible] کرے۔ خلافت تحریک سے اقبال نے جو سبق سیکھا اس کے مطابق اس نے جذبات سے قوم کو اٹھانے کے ساتھ ساتھ ایمان کی بنی
رو دینا شروع کر دیا۔ اس کے بعد سے اقبال مسلمانوں کی فکری بنیادوں کی مضبوطی کے لئے ٹھوس کام کا آغاز کرتے ہیں۔ نئے کام کے آغاز میں سب سے
یت وہ برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی مسئلے کو دیتے ہیں، متحدہ قومیت کے نظریئے پر ضرب کاری لگاتے ہیں اور ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس
لہ آباد میں مسلمانوں کے تہذیبی تشخص کے تحفظ کے لئے ایک الگ خطہ زمین کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی وہ دوسرا اہم کام جو انجام دیتے ہیں، وہ فقہ اور اسلامی الٰہیات کی تشکیل نو کا کام ہے۔ اس کے لئے وہ سید سلیمان ندوی
رشاہ کاشمیری اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس دور میں ان کا اہم ترین کام ان کے وہ خطبات
ہ تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ Reconstruction of Religious Thought in Islam کے نام سے شائع ہوئے ان خطبات
ی نقطہ یہ ہے کہ ان میں اقبال نے مذہبی تجربے کو وجدان سے بلند ہو کر سائنسی تجربے کی اصطلاحات میں بیان کیا، اسلامی فکر کے بعض پہلوؤں
ے حکیمانہ انداز میں تشریح کی اور اس بات پر زور دیا کہ دین و دانش، مذہب و سائنس میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ اسلام کی الٰہیاتی فکر کی
ور اسلامی فقہ کی تشکیل جدید کے سلسلے میں اقبال کی کوششیں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں کم از کم فقہ کی تدوین نو کی ضرورت کا احساس تو
ں وقت ہو گیا تھا جب انھوں نے مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ایک دوست کے مطابق اگر اقبال
بنے اور پاکستان کے سربراہ بنتے تو چھٹے خلیفۂ راشد کہلاتے کیونکہ دیکھا جائے تو اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ ہی خلافت کی بازیافت
سلم ممالک میں بادشاہت، آمریت، جمہوریت، سب کچھ ہے لیکن خلافت کہیں نہیں ہے۔ اقبال نے اس کام کو اپنی عمر کے بالکل آخری
شروع کیا تھا۔ افسوس کہ عمر نے انھیں مہلت نہ دی اور یہ اہم کام ادھورا اور غیر منظم رہ گیا لیکن اقبال جو کام کر گئے تھے، بعد میں اٹھنے
والوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اگر اقبال کے کارنامے کے دو حصے کرنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ اقبال کی جذباتی
قائد اعظمؒ نے اور اقبال کی فکری تحریک سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے احیائے اسلام کے کام کو آگے بڑھایا۔

ڈاکٹر نبی ہادی

اکبر اعظم کا دوسرا ملک الشعراء — شیخ فیضی

— ۲ —

اس بات کو خاطر میں رکھنا پڑے گا کہ یہ پوری نسل تیموری دور کے فنون لطیفہ کی وارث تھی۔ تیموری شاہزادوں کی بدولت جمالیہ زیبائی سے تعلق رکھنے والے تمام ہنر ہرات، کابل، بدخشاں اور خراسان کے مختلف شہروں میں پروان چڑھے۔ تیموری عہد کے مشہور شاعر جامی نے بعد کی نسل کے ذوقِ سخن کو تربیت دی۔ فغانی، ہلالی چغتائی، امیر شاہی سبزواری، وحشی یزدی وغیرہ شمار ہوتے ہیں۔ فغانی نے تمام پر بلاشبہ گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ ایران کے بعد معاصر دانشوروں کے نزدیک فغانی غزل کے جداگانہ مکتب کا بانی ہے اور مغل عہد کے سارے اسی مکتب کے پیرو رہے ہیں۔ مگر دوسرے شاعروں کی دی ہوئی روایات کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ہلالی چغتائی کی ایک غزل پوری نسل کے ذہن میں منعکس نظر آتی ہے۔ ابوالفضل کشمیر کے عبادت خانے کے لئے کتبہ لکھتا ہے اور اسی غزل کا سہارا لے کر عبارت تراشتا ہے:

"پروردگارا بہر جائے کہ می روم جویائے تواند و بہر خانہ کہ می نگرم گویائے تو:

اے تیرِ غمت را دلِ عشاق نشانہ   خلقے بتو مشغول تو غائب زمیانہ

گہ معتکفِ دیرم وگہ ساکنِ کعبہ   یعنی کہ ترا می طلبم خانہ بخانہ"[1]

اس غزل کا ایک اور شعر ہے:

مقصود من از کعبہ و بتخانہ توئی تو   مقصود توئی کعبہ و بتخانہ بہانہ

وحشی یزدی ایک طولانی ترجیع بند کہتا ہے۔ ہلالی کی غزل کا تاثر اور انعکاس صاف نمایاں ہے۔ (۱) شاعر کی انانیت بلبل کے محبت کے جہان کی سیر کے لئے پرواز کرتی ہے اور تیرِ غم کا نشانہ بن جاتی ہے۔ (۲) دنیا کے تماشے سب قصے ہی قصے ہیں۔ کس کے زمانے میں جانتا ہے اور کون سنتا ہے):

جز عشق و محبت گنہم چیست کہ کردم   "اے تیرِ غمت را دلِ عشاق نشانہ"

بلبل ہدفِ تیر نمودن کہ پسندند   خاصا کہ بود بلبلِ مشہورِ زمانہ

در دورِ کہ بودست وکہ یکبار شنودست   تاریخ زماں ہست فسانہ بفسانہ

کامل جہرمی جہانگیری عہد کا شاعر ہے۔ وہ بھی اپنے مضمون کے لئے یہی قافیے مستعار لیتا ہے۔ افکار اس کے شخصی تجربے

---

[1] ملا حظہ مقدمہ آئین اکبری بحوالہ تذکرہ دُرّ المنثور تالیف محمد عسکری حسینی بلگرامی ص ۵۵

اس کے ذہن میں ایک ایسی نا گوار دنیا کی تصویر ہے جہاں کوئی کسی کا نہیں سب حرص و ہوس کے دیوانے ہیں۔ مگر زبان کا لہجہ اس سے زیادہ شیریں اور دلکش کیا ہوگا:

از حرص و آز ہست جہاں زاہلِ زمانہ — پُر عربدہ و شور چو حمّامِ زنانہ
خود رائی خود و باش کہ کس را غمِ کس نیست — با اہلِ زمانہ ست ہمہ عذر و بہانہ
از اہلِ جہاں ہیچ تمتع نتواں یافت — گفتم بتو ایں حرف کہ تیر است و نشانہ[1]

مندرجہ بالا اشعار یہ دکھانے کے لئے انتخاب کئے گئے کہ مغل دور کی روشن فکر جماعت کا ذہنی رجحان کس طرف تھا۔ ان اشعار میں تنگ اور جامد تصورات کو مسترد کرنے کا اشارہ موجود ہے۔ کعبہ اور بت خانہ دونوں کو حقیقت تک رسائی کا وسیلہ کہا جا رہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان لوگوں کے پاس زندگی کا ایک عرفان اور ایک بصیرت نظر آتی ہے۔ ان کی نظر میں دنیا کے تمام انقلابات انفرادی ہوں یا اجتماعی، ایک عبرت انگیز فسانے کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ بے اعتقادی اور تشکیک کے مرحلے سے چل کر یہ لوگ اعتقاد کی منزل تک رسائی میں کامیاب ہو جاتے ہیں

گفتم بتو ایں حرف کہ تیر است و نشانہ

دنیا کے ہر معاشرے میں بعض افراد کی مثال فضاؤں کے آوارہ شہاب کی سی ہوتی ہے جو بظاہر کون و مکاں کے نظام سے بالکل بے تعلق، بیگانہ، و آزاد گھومتے ہیں۔ ویسے ان کا کوئی ترتیب اور کوئی مقام و مدار نہیں ہوتا۔ مگر وہی لوگ اجتماعی خیالات کی تبلیغ کا سب سے موثر وسیلہ ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے آہنگ میں قلبِ روزگار کی دھڑکن کہیں زیادہ صاف سنائی دیتی ہے۔ نمونے کے طور پر اکبری عہد کا ایک شاعر جس کی بابت معاصرین کہتے ہیں کہ درویش بہرام کے نام سے مشہور ہے، کسی مخصوص جماعت اور مخصوص حلقے سے تعلق نہیں رکھتا۔ پورے ہندوستان میں آزادی سے سیاحت کرتا پھرتا ہے۔ انداز بیان کی بیباکی اور صفائی توجہ کے قابل ہے:

اساس پارسائی را شکستم تا چہ پیش آید — سرِ بازار رسوائی نشستم تا چہ پیش آید
بہ ترسا زادۂ دل دادم و سرگشتۂ دیرم — درین پیرانہ سر زنار بستم تا چہ پیش آید[2]

(۳)

فیضی کے سوانح میں ابو الفضل کی داستانِ حیات اس طرح پیوستہ اور مربوط ہے کہ دونوں کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دونوں بھائی ایک ہی منزلِ مقصود کے رہ نورد اور نصب العین کے اعتبار سے ہر قدم پر ایک دوسرے کے شریک تھے۔ عقاید کی یکجہتی میں دونوں کا میدان ایک۔ البتہ طریقۂ کار میں دونوں کی روش جداگانہ یعنی ایک بھائی سیاستدار اور مدبر تو دوسرا بھائی مفکر و شاعر کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آیا۔ ایک نے فلسفہ و شعر کے مشاغل میں زندگی بسر کی۔ دوسرا جہانبانی کے امور اور ملک گیری کے مسایل میں لگا رہا۔ مفکر کا منصب یہ ہے نئے نظام کی جستجو، پرانے مسلمات کی تنقید، اور تازہ عقاید کی تشکیل میں مشغول رہے۔ اس کی شخصیت میں وہ پرانا آدم جلوہ افروز ہوتا ہے جو ہنوز جنت کی شاداب فضا سے باہر نہیں آیا تھا۔ زندگی کا نقشہ اور نصاب اس کے لئے صرف اتنا ہے کہ ؎

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

صدیوں کی عقل و دانش کے معطر گلدستے ہر وقت اس کے چاروں طرف بکھرے اور پھیلے پڑے رہتے ہیں۔ کتابیں ایک لمحہ اس کا

---

[1] میخانہ۔ عبد النبی فخر الزمانی ص ۵۰۴، مطبوعہ لاہور

[2] طبقات اکبری، نظام الدین احمد ص ۵۰۹ ج ۲

بخوبی جانتا ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور لب و لہجہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آستین کی آڑ میں مسکرا رہا ہے۔ کہتا ہے، لوگ مجھے خوشامدی بن گئے کہ ذکر ہوں اس لیے آقا کی قصیدہ خوانی کر رہا ہوں۔ کاش ذکر نہ ہوتا پھر دیکھتا اگر میرا قلم اس برگزیدہ الٰہی کے کمالات صوری و معنوی کی مدح میں کیا گل افشانی کرتا ہے: "کاشکے در سلک ملازمان ظاہر مسلک نگشتمے تا ہر چہ گفتمے و نوشتمے ظاہر بینان کور باطن ایں کس را از گروہ خوشامد گویان ندانستندے"[51]

ابوالفضل کی شخصیت کو باریک نکتہ یہ ہے کہ ظاہری طمطراق کے پردے میں ایک فنکار کی روح مصروف عمل نظر آتی ہے۔ اس کا ذہن امور سیاسی میں مبتلا رہنے کے باوجود تخلیقی عمل سے غافل نہیں ہوتا۔ فنکار کی یہ عادت ہوتی ہے کہ عرصہ مروز کی رستاخیز میں رہنے کے باوجود اپنے کرادبیت میں گم کئے رہتا ہے اور بقول معروف جریدۂ عالم پر اپنے نام کا نقش دوام کرنے کی آرزو اسے ایک لمحہ عافیت اور چین نہیں دیتی۔ اس زاویہ نظر سے ابوالفضل کو دیکھیے۔ اس کو اقتدار کی آخری بلندی نصیب تھی۔ اکبر کا ہر شخصی اقدام اس کے مشورے کا رہین تھا۔ امورِ سلطنت کی ہر گرہ اس کے ناخن سے کھلتی تھی۔ دارالوزارت میں اس کی زبان کا ہر جملہ قول فیصل کا حکم رکھتا تھا۔ اس کا گھر خاص و عام کی نگاہوں کا مرکز اور اہل حاجت کی سب سے بڑی آماجگاہ تھا۔ قدرت نے اس کے جسم کو خستگی ناپذیر توانائی بخشی تھی۔ اس کے فرائض منصبی میں فوجوں کی سپہ سالاری اور جنگی مہمات کے کام بھی شامل تھے۔ بظاہر اس کی سیمابی شخصیت دیوان خاص سے لے کر لشکرگاہ کے خیمے تک ہر جگہ نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود شیخ کا دل اکبرنامے کی تالیف میں مشغول ہے۔ یہ کاوش اس کی غیر معمولی استعداد کا زبردست ثبوت ہے۔ اکبرنامے کا ہر جملہ اس بات کی شہادت ہے کہ شیخ ابوالفضل پیدائشی طور سے ایک اہل قلم اور فنکار تھا جس کو اتفاقات کی دستبرد نے علم و تحقیق کے گوشۂ عزلت سے نکال کر دربار سیاست اور امورِ سلطنت کے ہنگاموں میں جا پھینکا۔

اکبرنامہ شیخ کے سیاسی اور اخلاقی افکار کا ایک صحیفہ ہے جس میں زندگی کے نشیب و فراز کا ہر منظر موجود ہے۔ وہ کتاب کے ابتدائی حصے میں جہانبانی کے اصول ہشتگانہ پیش کرتا ہے اور ان اصولوں کو مثالی مملکت کی اساس اور ضمانت قرار دیتا ہے: "اول بخت بلند، دوم ہمت بلند، سوم قدرت کشورکشائی، چہارم ملک داری، پنجم کوشش در معموری بلاد، ششم صرف نیت بر فاہیت عباد، ہفتم خوش دل ساختن سپاہی، ہشتم باز داشتن ایشاں از تباہی"۔ شیخ کا دعویٰ ہے کہ یہ آٹھ اصول ملحوظ رکھے جائیں تو یقیناً خلق خدا کے لیے امن، آسودگی، آسائش اور خوشحالی فراہم کی جا سکتی ہے۔ مسلمانوں میں مثالی مملکت کا تصور خلافت راشدہ کے ساتھ وابستہ ہے جس کو خلافت الٰہیہ کا لقب دیا گیا، مگر وہ تیس برس سے آگے نہ چل سکی۔ اس کے بعد دو راستے تھے۔ ایک یونان کے سیاسی عقاید اور مغربی رومۃ الکبریٰ کے قوانین و روایات کی راہ جس تک مسلمانوں کی رسائی نہ ہو سکی۔ دوسری ایران اور بازنطین کا نظام شاہنشاہیت جس کو انھوں نے اختیار کر لیا۔ ابتدا میں کچھ آوازیں جو قیصر و کسریٰ کی سنت اختیار کرنے کے خلاف بلند ہوئیں، خاموش کر دی گئیں۔ بلاشبہ یہ ایک خونی راستہ تھا جس پر چلنے کی پاداش میں مسلمانوں کی تاریخ بقول شخصے قصاب کی دوکان کا نقشہ بن گئی۔ شاہنشاہیت کا ادارہ ایک فرد واحد یعنی بادشاہ کے گرد وجود میں آتا ہے۔ بادشاہ کی ذات قدیم ایرانی عقاید کے مطابق "فرِ الٰہی" و "شکوہ ایزدی" کا مظہر تھی۔ ابوالفضل ان اصطلاحوں کو بار بار استعمال کرتا ہے۔ یا خدا اور رعایا کی تشبیہات جو رعیت اور بادشاہ کا رابطہ ظاہر کرنے کے لیے مروج تھیں اکبرنامے میں تکرار کے ساتھ ملتی ہیں۔ وہ شاہنشاہیت کے نظام کا دل کھول کے حامی ہے اور ایک سیاسی عملداری کی حیثیت سے اس کے نفاذ اور استحکام میں اپنی پوری قوت لگا دیتا ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے: "بادشاہان را با اعیانی نسبت آدم اند

---

[51] اکبرنامہ ص ۳۳۰ ج ۲ [52] اکبرنامہ ص ۱۰۸ ج ۱ [53] اکبرنامہ ص ۳۳۲ ج ۲

شیخ کے نزدیک بادشاہ کی اولین ذمہ داری اور سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ "آسودگی رعایا و ترفیہ حال زیردستان و شکستہ پایاں" کی خاطر اپنی پوری کوشش استعمال لگائے۔ اس کے ذہن میں رعایا کی آسودگی کا تصور ایک مرکزی نکتہ ہے جو اس کے ہر اقدام کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ بار بار تاکید کے ساتھ کہتا ہے کہ عوام اللہ کی امانت ہیں: "بدایع و ودایع حضرت جہاں آفرین اند"[1] البتہ یہ بھی اصرار کرتا ہے کہ امور ملکی اور مسائل جہانبانی میں جمہور کی رائے اور جماعتی اقدام پر کبھی زیادہ اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ لوگ "مگسان دوکانچہ حلوائی اند"[2]

ابوالفضل کی نظر میں مجموعی طور پر جہانبانی اور حکمرانی کے دو مقصد ہیں: "تا درمیان خلایق سر بلندی حاصل آید و موجب گرد آوری رضائے ایزدی گردد"[3] حکومت گویا خدا کی خوشنودی اور بندوں کے درمیان بزرگی حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ اہل اقتدار کے عمل کا معیار یہ ہے کہ خدا کی خلقت سچے دل سے خرد و کلاں کی عزت کرے۔ شیخ نصیحت کرتا ہے کہ اہل اقتدار کو چاہئے کہ ان دو نکتوں کو دستور العمل قرار دیں۔

ایک مدبر کی حیثیت سے ابوالفضل کا شایستہ کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے دیرینہ اخلاقی نظریات کو ہندوستان کی سیاست پر عاید کرنے کی تدبیر نکالی اور بادشاہ کو ایک عملی مذہب کی طرف توجہ دلائی۔ مسلمان مفکرین بہت پہلے سے اس عقیدے کا اظہار کرتے آرہے تھے کہ اجتماعی تعمیر کی ہر کوشش باہمی اعتماد کے بغیر بیکار اور انسانی رواداری و خلوص و یگانگت کی بنیاد کے بغیر بے ثمر ہوتا ہے۔ "گر بنائے محبت کہ خالی از خلل است" ہم کہہ سکتے ہیں اور اکبر نامے کا مطالعہ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ ابوالفضل پہلا آدمی ہے جس کے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ فقط طاقت کا استعمال کسی پائیدار نتیجے پر نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے افکار کی بدولت سلاطین کی حکمت عملی اور روش بدلتی ہے اور عام مسلمانوں میں ہندوستان کو دارالحرب سمجھنے کا تصور اپنی جگہ سے جنبش کھاتا ہے۔ رفاہ عام اور بہبودی کل کی ضمانت یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بلا امتیاز دین و مسلک سلطنت کی دی ہوئی نعمتوں میں شریک بنایا جائے۔ اور یہ کہ عوام کا تعاون جتنا زیادہ حاصل ہو مملکت کی بنیاد اتنی ہی زیادہ مضبوط ہوگی۔ یہ تازہ عقیدہ صلح کل کے نام سے پیش کیا گیا: "ہمین عشق ز کونین صلح کل کردیم"۔ مسلمانوں کی اب تک کی کیفیت یہ تھی کہ ہندوستان کے بارے میں دارالحرب والے نظریے کو آسانی سے بدلنے کے لئے تیار نہ تھے۔ شیخ کو اس مشکل کا احساس تھا۔ کہتا ہے کہ کلمہ حق اکثر تلخ ہوتا ہے اور حلق سے نیچے نہیں اترتا: "کلمہ حق ہیں تلخ باشد و در مذاق طبایع اکثر ناگوار می آید"[4]۔ یہ دو عقیدے ایک دوسرے کے حریف کی حیثیت سے میدان میں موجود تھے۔ حالات کی صورت یہ ہوئی کہ نیا عقیدہ حکمت عملی کی شکل اختیار کرنے لگا۔ یہ حکمت عملی جن لوگوں کے ہاتھوں تشکیل پا رہی تھی ان کے خلاف اعتراضات کا طوفان ایک لازمی نتیجہ تھا۔ بدایونی ایک رات کا واقعہ بیان کرتا ہے کہ میں نے ابوالفضل سے پوچھا "آخر تمہارا کوئی دین دھرم بھی ہے" اور اس نے جواب دیا کہ میں تو ابھی تک الحاد کی وادی کا سیاح ہوں: "شبے با شیخ ابوالفضل مرا مجالست روی داد ... پرسیدم کہ میل شما ازیں مذاہب مشہورہ بکدام بیشتر باشد؟ گفت می خواہم روزے چند در وادی الحاد سیرے بکنم"[5]

شیخ اپنے ذہن میں ایک متحرک دنیا کا تصور رکھتا ہے جو بہت جلد بدلتی اور آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے اور جس میں نہ خوشی رکتی ہے اور نہ غم ٹھہرتا ہے "نہ شادی را مجال لختے درنگ اندوہ را در آن رخصت اقامت"[6]۔ اس کے سیاسی افکار کا ماحول اس اصول پر مرتب ہوتا ہے کہ دنیا کا ہر حادثہ انسانی علم اور تجربے کے خزانے میں ایک نقد اضافے کی حیثیت رکھتا ہے: "ہر سیم [illegible] مید آگاہی و تنبیہ احرار است"[7]۔ اب یہ احرار کی ذمہ داری ہے کہ آگاہی اور تنبیہ قبول کرنے میں ذرا بھی غافل نہ رہیں۔ مصایب اور محرومیوں سے عبرت حاصل کرکے نئے تعمیری منصوبے تشکیل کرنا اور خلق خدا کو فلاح و بہبودی کی طرف لے جانا "احرار" کا منصب ہے۔ شیخ کے نزدیک مثالی انسان وہ ہے جس کی ذات میں دو صفات یعنی "مردانگی و فرزانگی" باہم موجود ہوں۔ معاشرہ اپنے دوام و استحکام کی تہ

---

[1] اکبر نامہ ص ۲۵۶ ج ۱ — [2] ایضاً ص ۲۵۹ ج ۱ — [3] ایضاً ص ۱۰۸ ج ۱

[4] ایضاً ص ۱۰۱ ج ۲ — [5] منتخب ص ۲۰۲ ج ۲ — [6] اکبر نامہ ص ۳۱۳ ج ۲

[7] اکبر نامہ ص ۱۲۵ ج ۱

بھی مثالی افراد کا محتاج ہوتا ہے۔ ابوالفضل اس مقصد کے لئے بار بار "مردانگی و فرزانگی" کے جامع خصایل پر زور دیتا ہے۔

یا کے سارے ہنگامے انسان کے باطنی تضاد اور جدلیت کا کرشمہ ہیں۔ "آدمی زادہ دو امر غریب در نہاد داشت اول طبیعت کہ تیز دانہ دوم چشم رہین کار شناس[1]" آدمی کی سیرت "نہاد" کے یہ دو "امر غریب" ہیں جن کی بدولت تاریخ کا تمام تماشا نظر آتا ہے۔ واقعات کو عرق ریزی کے ساتھ مد کرنے کا مقصد شیخ کی نظر میں یہ ہے کہ انسانی شعور بیدار ہو، لوگ عبرت قبول کریں، زندگی کو ہشیاری سے گذاریں اور مجموعی طور پر نیک عمل کو ار دیں: "تا جویائے آگہی پذیرائے عبرت گشتہ بہ نیروئے بخت بیدار زندگانی راہ ہشیار دلی و نیک عملی سپری کند[4]"

بد کی سطریں ابوالفضل کی شخصیت اور افکار کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کرتی ہیں۔ مگر یہ جستجو رہ جاتی ہے کہ اس کی شخصیت کے خد و خال کس طرح مرتب یہ ہے کہ اسلام اور اثر قبول کرنے کے لئے تاریخ کی کون سی ہستیاں شیخ کی نظر میں رہی ہوں گی۔ اکبر نامے کی تدوین کے ضمن میں ایک جگہ دیباچ تگی اور تبحر کا دعوی کرتا ہے اور نہایت معذرت کے لہجے میں کہتا ہے کہ دراصل مجھے عربی زبان کی عادت ہو گئی تھی۔ فقط اس کتاب کی سبب فارسی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ بدایونی کا قول اگرچہ بر سبیل شکایت ہے۔ مگر کم از کم ایک عرب فاضل سے ابوالفضل کے روابط کا ثبوت ناہے۔ وہ شیخ حسن علی موصلی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: "چندگاہ شیخ ابوالفضل نیز خفیہ ازو تعلیم فن ریاضی . . . . . و دقایق و غوامض علوم ادرجہ ایں ہرگز بہ نظیر او ندیدہ بود[5]" یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ خود شیخ مبارک ہی عربی زبان کی مہارت میں اہل کمال سے ل سرا سر عبث ہوگا کہ ابوالفضل نے محض خود ستائی اور فضیلت نمائی کی خاطر یہ کہہ دیا کہ "آغاز آگہی بتازی زبان خوئے گرفت، زبان پارسی کمتر اکبر نامہ شیخ کے دعوے کی بولتی ہوئی شہادت ہے یقین اس بات کا ہے کہ عرب مورخین کے آثار ضرور اس کی نظر میں رہے ہوں گے۔ کیا بعید کی تالیف کے محرکات وہیں سے فراہم ہوئے ہوں۔ عربی نثر کا انتہائی قیمتی ذخیرہ مورخین کے آثار پر مشتمل ہے، ناممکن ہے کہ ابوالفضل جیسا و کہ بقول خود عربی زبان کی عادت بھی رکھتا ہو، عرب مورخین کے اس دستے متاثر ہوئے بغیر رہ جائے گا۔ شوق کے سمند ناز کو تازیانہ چاہیے یہ کہ مغل سلطنت کی ذمے داریوں کا بوجھ الگ مجبور کئے تھا کہ تقلید اور مثال کے لئے نظریں تاریخ کی نامور ہستیوں پر جمی رہیں۔ المقریزی کے ابق وزیر کا عہدہ بنی عباس کے زمانے میں وجود میں آیا یحیی برمکی پہلا بڑا وزیر ہے جس نے تدبر اور دانش مندی کی روایات کو قایم لملک طوسی کا نام ایک ضرب المثل بن گیا۔ اس کی کتاب "سیاست نامہ" اصول جہانبانی اور تدبیر ملکی پر ایک اہم دستاویز شمار کی جاتی ہے نقصد اس بات کا جایزہ لینا ہے کہ اخذ و اکتساب کے معاملے میں صاحب اکبر نامہ کا ذہن کم و بیش کہاں تک گیا ہوگا۔ دراصل ابوالفضل رے پڑھنے کے لئے بھی مہینوں کا وقت چاہیے۔ کوئی اس کام پر ذرا سا جم جائے تب محسوس ہوتا ہے کہ شیخ کے آہنگ میں جگہ جگہ عرب ہارمنادید کی آوازیں گونجتی ہیں۔ البتہ زبان کے اعتبار سے کمال کی بات یہ ہے کہ اکبر نامہ خالص فارسی نثر کا ایک نادر نمونہ ہے۔

ہر جملے میں عربی کلمات و ترکیبات کے بجائے قدیم پہلوی زبان کے لفظ اور بندشیں جڑاؤ نگینوں کی طرح چمکتے نظر آئیں گے۔ یہ اس کی بیعت کا کرشمہ تھا یا پھر فیضی کی صحبت کا فیض سمجھئے۔ اس لئے کہ بقول خود جو کچھ لکھتا تھا وہ برادر گرامی کو دکھاتا تھا اور برادر گرامی عبارت تے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ نادر اسلوب برادر گرامی کی خاطر دشوار پسند کا نتیجہ ہو "تا سال دہم نگاہ ہے برنگاشتۂ ہیچمدان مقبل دانائی فرمود تا آنچنانکہ دل آسمان پیوند ما فیاں تسلی واخست کہ زمانہ چنیں نیرنگی نمودے[6]"

ص ۱۰۹ ج ۲ — [4] اکبر نامہ ص ۱۹۵ ج ۱ — [5] منتخب ص ۱۳۷ ج ۳

ص ۳۰۷ ج ۲ — [6] اکبر نامہ ص ۳۰۳ ج ۲

ہندی مسلمان کی تاریخ کا حیرت انگیز نکتہ یہ ہے کہ صدیوں کا جائزہ لیتے چلے جائیے فکر و عمل کے کسی میدان میں باوقار ہستیاں شاذ و نادر ہی ملیں گی۔ ادب کے ساتھ ملحوظ رہے کہ اس جائزے سے وہ بزرگ مستثنیٰ ہیں جن کے ناموں کے ساتھ زہد و عرفان اور کشف و کرامات کے کارنامے وابستہ ہیں۔ فطرت اپنی فیاضی کے اظہار میں زمان و مکان کی قید سے بالکل آزاد ہے۔ کرۂ ارض پر بے شمار ہرے بھرے نقاط دہ ہیں جہاں انسان تھوڑی سی جدوجہد میں زندگی کے ہر عیش اور فراوانی سے دامن بھر لیتا ہے اور ایسے خطے بھی نظر آتے ہیں جہاں آدم کی اولاد کے لئے زندگی سراسر جہنم اور عذاب بنی ہوئی ہے۔ بیشتر مقامات پر آج تک آدمی اپنے تمام وحشیانہ خصائل کو تمدن کی ہلکی سی پوست کے نیچے چھپائے پھرتا ہے۔ اس وسیع پس منظر میں برصغیر کے مسلمان کی اجتماعی سیرت اور کارناموں پر نظر کیجئے۔ گستاخی نہ ہوگی اگر سوال کیا جائے کہ صدیوں تک معاشی وسائل کی زبردست فراوانی اور سیاسی استحکام کے باوجود یہاں وہ روایات کیوں نہ بن سکیں جو مثال کے طور پر ہسپانوی عربوں کے ہاتھوں تھوڑی مہلت میں قائم ہو گئیں۔ ترکستان میں سامانی خاندان کے اقتدار کی بدولت بخارا صدیوں تک علم و دانش کا مرکز بنا رہا۔ مصر میں فاطمی سلسلے کا استحکام الازہر کی تاسیس اور قاہرہ کی مرکزیت کا باعث بن گیا۔ ہندی مسلمانوں کو فطری طور پر دوسری فوقیت یہ حاصل تھی کہ اس برصغیر میں قدیم زمانے سے علمی اور فکری روایات موجود تھیں۔ یہ روایات بھی یہاں کے مسلمان نہ پکڑ سکے اور ان سے استفادہ یا تقلید کا سلسلہ بھی قائم نہ رہ پایا۔ سوال یہ ہے کہ وہ ابن سینا اور وہ ابن رشد جو بخارا اور اندلس میں پیدا ہوئے یا آمدنی آگرہ اور لاہور میں کیوں نہ پیدا ہوئے۔ ہندی مسلمانوں میں امیر خسرو کے بعد فیضی اور ابوالفضل ہی ایسے افراد نظر آتے ہیں جن کے کردار میں زرا بہت تاریخ کے بڑے لوگوں کی جھلک ملتی ہے۔ حکمائے متقدمین کا وقار اگر کسی کے تیور میں نمایاں ہے تو وہ فیضی ہے اس کی شخصیت میں علوم کے تنوع اور کمالات کی جامعیت کی وہی شان ہے جو قدیم مشائین کی امتیازی خصوصیت تھی۔ علمی انہماک میں جفاکشی اور شدید عرق ریزی قرون وسطیٰ کے عالموں کا وصف تھا۔ فیضی نے اس میراث کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ سواطع الالہام اسی جفا اور عرق ریزی کی عادت کا نتیجہ ہے۔ اس کی عجیب و غریب فکری تربیت اور توانائی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ایک نامعلوم کے ساتھ وہ شاعری سے حکمت اور حکمت سے الہیات و تفسیر کی متفاوت راہوں میں گھومتا پھرتا ہے اور جس میدان میں قدم رکھتا وہاں تمکین و کمال کی یہ شان ہے کہ مولانا جامی کا قول ہر جگہ صادق نظر آتا ہے ؎

گر صعب نگل پیشہ کنی گل باشی

واقعہ یہ ہے کہ عظیم ہستیوں کے فقدان کا احساس اس سے پہلے بھی موجود تھا بدایونی نہایت سپاٹ زبان میں اس بات کا اقرار کرتا ہے: "از آں زمانے بنائے اسلام در ہندوستان واقع شدہ حق سبحانہ اعیان و اشراف ایں دیار را ہمیشہ رعیت سرشت محکوم طبیعت و پست فطرت آفریدہ است" پھر یہ کہ ان لوگوں میں وہ اعلیٰ درجے کا جنگی سلیقہ اور عسکری مزاج بھی پیدا نہیں ہوا جو مجموعی طور سے اسلامی ایشیا کی دوسری قوموں کا شعار رہا ہے۔ بڑی اور فیصلہ کن لڑائیاں صرف عربوں اور ترکوں نے لڑی ہیں۔ بدایونی کا خیال اس معاملہ میں بھی غلط نہیں ہے "جاہ و جلال و دولت ایشاں بضرب شمشیر نبود جز بہ تزویر و مکر و نفاق ...... بدنامی ..." ممکن ہے بدایونی کے نظریات میں تھوڑا بہت مبالغہ ہو۔ وہ ایک شدید رجحان کا آدمی تھا باتیں غور کرنے کے قابل ہیں "ہمانا سروری و سرداری بر قامت ہمت ایشاں کوتاہ آمدہ است"[۲] ابوالفضل نہایت متین اور سنجیدہ آدمی ہے وہ بھی اسی قسم کے اشارے کرتا ہے۔ شیخ کی نظر اس طبقے کی طرف گئی جو مدد معاش کی مفت خوری کا عادی تھا: "اگرچہ ایں گروہ در ہر ملکے باشند و ہیچ اقلیمے خالی نباشد اما در ولایت ہندوستان از ہمہ جا بیشتر اند"[۳]

(مسلسل)

۱؎ منتخب ... ص ۲۹ ج ۲

۳؎ اکبر نامہ ص ۲۷۰ ج ۲

ڈاکٹر سید محمد عقیل

اُردو میں ہمزہ کا استعمال

...الہ ... ہندوستان کی ... یونیورسٹی سے منسلک ہیں۔ انھوں نے اردو میں ہمزہ کے استعمال کے مسئلے پر ہندوستان میں اردو کی صورت حال کے حوالے سے بحث کی ہے ... رسم الخط کی مروجہ ہیئت کو بدلنے کے حامی پاکستان میں بھی موجود ہیں اور یہ بحث ان کے لئے بھی مفید ہے —— مدیر

...ہوئے ... تعلیمی سیمینار میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اردو میں ہمزہ کا استعمال بے معنی اور فضول ہوتا ہے۔ روایتی لکھنے والے اپنی پرانی عادت ...ت کو لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی کہی گئی کہ ہمزہ کا کام صرف کسرہ یا "ی" سے لیا جا سکتا ہے لیکن روایتی طور پر لکھنے والے استعمال کرتے ہیں اور دوسری طرف "ی" میں نقطے ... اس بات کی تحریک ان چند ہوشیار اور لسانیات سے واقفیت رکھنے والے ...ن امریکہ سے صوتیات (PHONOLOGY) کی تربیت حاصل کر کے آئے ہیں۔ اپنی بحث میں انھوں نے بچوں اور آوازوں کی ساخت کے ...ا ہوئے بھی بیان کئے اور زبان کو سائنٹفک ڈھنگ سے پڑھانے کا مطالبہ بھی کیا۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سی باتیں اردو والوں کے لئے بالکل نئی ... طرز تعلیم میں صوتی آہنگ، زیر و بم، لفظوں کے اتار چڑھاؤ سے عبارت میں جو ایک حسن پیدا ہوتا ہے، ان سب باریکیوں اور خوبیوں سے باخبر ...ہ صرف کارآمد بلکہ اور دلچسپ بنا سکتا ہے لیکن اردو طرز تحریر سے ... کو الگ کر لینے سے اور بہت سی صوتی، تحریری اور مخرج کی الجھنیں پیدا ... دانشمندوں نے ان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔

...ت ہے کہ اردو کے حروف تہجی کا نظام صوتی ترتیب پر قائم نہیں ہے اور اگر اسے صوتی ترتیب پر کسی طرح لے آیا جائے تو تبدیلیوں کے لئے ...نیاں بھی نکل آئیں لیکن ہمزہ کو نکال دینے پر بعض لفظوں کو صحیح طور پر لکھنا اور انھیں آوازوں کے ساتھ جو کہ ان کے تلفظ کی ... آوازیں ہیں پڑھنا ...ے گا اور خاص طور پر شعر میں ایسے الفاظ نظم کرتے وقت صوتی آہنگ اور وزن کے قیام دونوں میں سخت مشکل پیش آئے گی۔ عربی زبان میں ...طرح ہوتا ہے اس کا بدل تو ممکن ہی نہیں لیکن اردو میں بھی یہ دقت تقریباً ... طرح کی ہوگی۔

...ہمزہ کی واضح صورتوں کا استعمال دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ پہلا طریقہ بندشی POLOSIVE CONSONANT کا ہے اور دوسرا حلقی بندشی ... GLOTTAL کا لیکن اردو میں ہمزہ کا کام مصوتہ کا ہے جو کبھی اکیلے اور کبھی جڑواں مصوتہ DIPTHONGIC ... استعمال ہوتا ہے۔ ہمزۃ القطع ...تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ ایسی صورتوں میں اسے بالکل عربی ... آواز اختیار کرنی پڑتی ہے اکثر پرانی اردو میں ایسے نمونے بھی ... القاطع اضافت کے لئے بھی لکھا جاتا تھا جیسے خلفائے اسلام کے بجائے خلفاء اسلام بھی لکھ دیا جاتا تھا۔ ہمزہ کی اس کثرت استعمال

---

(1) The Phonetics of Arabic by W. H. T. Gairdner P. 30–31, ...

ختم ہو جائے اور ایک وقت وہ آئے کہ ہر حرف الگ الگ ہو کر اپنی ملاوٹ کا اصول ہی فراموش کر دے۔ پھر ایسی زبان کے لئے جس کی احتیاج، طباعت اور قوت خرید میں انگریزی اور ہندی جیسا ازدحام بھی نہیں۔ وقت اور کاغذ کے کثرت استعمال کا خرچ کیوں برداشت کیا جائے گا کیونکہ بیشتر اپنے خرچ اور منافع پر نظر رکھتا ہے اردو کی اشاعت یا رسم تحریر سے اسے کم دلچسپی یا بالکل دلچسپی نہیں ہوتی یہی نہیں بلکہ پھر اردو کو جس کی اشاعت روز بروز یونہی ایک مسئلہ بنتی جاتی ہے اس طرز تحریر کے لئے نئے کاتب (اگر مصنف کو ٹائپ پسند نہیں اور زیادہ تر مصنفین اور قارئین ایسے ہی ہوتے ہیں) تربیت کرنے پڑیں گے جو اس طرز املا و انشا سے واقف ہوں۔ بچوں کو پڑھانے کے لئے عام معلم نہیں بلکہ اصول صوتیات کے ماہر پروفیسر تلاش کرنے ہوں گے جو سب کے بس کا کام نہیں۔ اپنے بچوں کو دو چار روپے دے کر اس دور میں ایک غیر منافع بخش زبان پڑھانے والا ذوق نہ اس کا دماغ رکھتا ہے اور نہ وسعت (کیونکہ زبانی بغیر لوگوں کے پڑھے ہوئے صرف اصولوں کی بنیاد پر نہیں بڑھتی) اور اس طرح املا و انشا کا طریقہ صرف مدرسہ اور طریقہ تعلیم کا مسئلہ نہیں رہ جاتا بلکہ معاشی اور اقتصادی مسئلہ بھی بن جاتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب اس نئی طرز تعلیم سے واقف ہو کر لوگ نکلیں گے تو پرانا سابقہ املا و انشا خود بخود ختم ہوتا جائے گا۔ دوسری زبانوں کے لئے یہ خیال شاید صحیح ہو (حالانکہ امریکی طرز تحریر آج تک ہجے کے معاملے میں انگریزی دنیا کو زیادہ متاثر نہیں کر سکی) لیکن اردو جس دور سے ہندوستان میں گذر رہی ہے، وہاں سکولوں میں اردو کی معمولی تعلیم کا تو ٹھیک انتظام ہوتا نہیں، بھلا یہ سائنٹفک لسانی اصول کون سکھائے گا (ابھی تک جو کتابیں پاکستان سے چھپی ہیں ان میں بھی ایسی رسم تحریر دیکھنے میں نہیں آئی جہاں اردو کے لئے یہ مجبوریاں اور دقتیں نہیں ہیں)

اردو میں اس طریقہ جدید کی ترویج و تبلیغ کی کوشش خاص اس وقت پر غالباً اس مسئلے سے شروع ہوتی ہے جو آج کل دو چار غیر ملکی طالب علم کبھی کبھی بھولے بھٹکے اردو پڑھنے آ جاتے ہیں اور جو عام طور پر ایسی یورپی زبانوں کے بولنے والے ہوتے ہیں جن کا رسم خط اور زبان کا کینڈا زیادہ سائنٹفک سمجھا جاتا ہے۔ ہندی والوں نے بھی اپنے طرز نگارش کو تبدیل کیا ہے لیکن ہم اردو والوں کا مسئلہ بالکل مختلف ہے۔ یہ کہاں کی عقلمندی ہوگی کہ چند غیر ملکی طلبا کی آسانی کی خاطر اپنے ملکی محبان اردو کو آسانیوں سے محروم کر دیا جائے جو وقت، معاشیات اور اقتصادیات کی کشاکش نے ان کو محدود طریقے پہلے رکھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ رسم تحریر جس کی ایک روایت رہی ہے اور جو اپنا سفر آج بھی دور دور سے طے کرتا ہے اس کے ڈھانچے کو بھی متزلزل کر دیا جائے۔ ترقی کی راہیں نکالنا بڑی اچھی بات ہے لیکن ترقی کے ایسے راستے جو اور مشکلوں میں پھنسا دیں انہیں صرف ایڈونچر سمجھنا چاہیئے اور اردو جس منزل سے گزر رہی ہے اسے اپنی روایات چھوڑ کر ایڈونچر کرنے کا ہرگز موقع نہیں جس ڈھرے پر وہ چل رہی ہے فی الحال وہی اس کے لئے سب سے بہتر اور سیدھا راستہ ہے۔

اسی بحث کے ساتھ ایک سوال اور اٹھتا ہے۔ دنیا میں اس رسم خط کے جاننے والے جس میں اردو لکھی جاتی ہے، جزیرۂ عرب کے علاوہ مراقش، مصر، ترکی، الجیریا، سوڈان، ایتھوپیا، سومالی لینڈ، زنجبار، لبنان، شام، عراق، افغانستان، ایران، کردستان، ملایا، جاوا، روس کے چند حصے، اسرائیل اور چین کے کچھ حصے ہیں۔ سب کی رسم تحریر کم و بیش یہی ہے۔ ابھی تک ایران[1] و عرب کے چھاپے خانوں سے جو کتابیں شائع ہو کر آ رہی ہیں وہ بھی تقریباً اسی طرز املا و انشا کے ساتھ ہیں۔ تو کیا ہمارے ہمزہ کو چھوڑ دینے سے، تمام ملک جو سامی رسم خط رکھتے ہیں اپنا رسم خط بدل دیں گے؟ اگر نہیں تو ہم اپنے بچوں پر سامی علوم کے دروازے بند کر دیں گے (مصری رو رگ کی تبدیلی نئی بات نہیں ہے) یا پھر بچوں کو ہمزہ کا استعمال بھی بتایا جائے اور جدید طرز انشا بھی تو اتنا آسان کام نہیں جتنی آسانی سے سوچا جاتا ہے۔ کیونکہ جدید طرز انشا اور املا کا عادی آسانی کے ساتھ نہ قرآن تحریرات کو پڑھ سکے گا اور نہ ان الفاظ

---

[1] ایران میں بھی ایک مرتبہ ہمزہ ہٹانے کی تحریک چلی تھی مگر کامیاب نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر شوکت جہاں تیموری

ہمارا تہذیبی ورثہ

برصغیر پاکستان و ہند تاریخ عالم میں تہذیب و تمدن کے قدیم گہواروں میں شمار ہوتا ہے چین اور مصر کی طرح اس کے تہذیبی کارنامے بھی ماضی کے دھندلکوں میں ہزاروں سال کی تاریخ میں جھلکتے ہیں۔ موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے آثار بتاتے ہیں کہ آج سے کم و بیش پانچ ہزار سال پہلے جو لوگ ان بستیوں میں آباد تھے ان میں اجتماعی زندگی کا شعور پوری طرح موجود تھا۔ وہ زراعت پیشہ تھے اور صنعت و حرفت کو بھی انھوں نے جلا دی تھی۔ ان میں لوہار بھی تھے اور سنار بھی اور وہ صناع بھی جو آج سے پانچ ہزار سال پہلے کی حسیناؤں کی زینت و آرائش کے لئے سونے، چاندی، اور ہاتھی دانت کے زیور اور دیگر لوازم تیار کرتے تھے۔ ان میں رقاص بھی تھے اور مصور بھی۔ ان کی بنائی ہوئی رقاصاؤں کی مورتیاں اور مہروں پر کھدے ہوئے نقوش ان کی فنکاری کی سند ہیں۔ ان کی کوزہ گری ایک اعلیٰ تہذیبی دور کی ترجمان ہے۔ ان کی بستیوں اور مکانوں کی ترتیب و تعمیر، شہر میں پانی کے نکاس کے لئے زمین دوز نالیاں اور نالے۔ اجتماعی تقریبات کے لئے بڑے بڑے کمرے اور تالاب اس دور کی مکمل تہذیب کی یادگار ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ابھی تک تسلی بخش طور پر وادی سندھ کی تہذیب کا رسم الخط پڑھا نہیں جا سکا اور بہت سے آثار قدیمہ ابھی دریافت کے منتظر ہیں۔ اگر ہمارے حالات نے اجازت دی اور بازیافت کا یہ تحقیقی سلسلہ شروع ہوا تو مزید انکشافات کا پورا امکان ہے۔

وادی سندھ کی تہذیب کے وارث وہ آریا تھے جو برصغیر میں آج سے کوئی چار ہزار سال پہلے داخل ہوئے۔ ان کے تہذیبی کمالات کا اندازہ ان ویدوں سے ہوتا ہے جن کی ابتدائی تدوین کوئی ساڑھے تین ہزار سال پہلے شروع ہوئی اور صدیوں تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ یہ آریا وادی سندھ و پنجاب سے گزر کر گنگا اور جمنا کے دوآبہ تک پہنچ گئے اور یہ مدھ دیش ان کی تہذیب و ثقافت کا مرکز قرار پایا۔ یہی آریائی تہذیب ہے جو برصغیر کی تہذیب و ثقافت کی اساس و بنیاد ہے۔ آریوں کے بعد مختصر وقفوں کے لئے اور بیرونی تہذیبی اثرات نے بھی اس تہذیب و ثقافت کے پروان چڑھانے میں حصہ لیا ہے۔ مثلاً سکندر اعظم کے حملے کے بعد جب برصغیر کے شمال اور شمال مغربی علاقوں میں کچھ مدت کے لئے یونانی سرداروں کی حکومت قائم رہی اور ان کے تہذیبی اثرات نے مقامی عناصر میں دخل پایا تو اس ہندی تہذیب و ثقافت کو یونانی ثقافت کی آمیزش و آویزش سے توانائی و تقویت نصیب ہوئی۔ یونانیوں کا یہ سیاسی اقتدار دیرپا نہ تھا لیکن ان کے تہذیبی اثرات بہت نتیجہ خیز اور دور رس ثابت ہوئے۔ آج بھی سوات، اور کافرستان، گلگت اور آس پاس کے علاقوں میں آثار قدیمہ کی دریافت سے جو کھدائی ہوئی ہے اس سے ان یونانی اثرات کی تصدیق ہوتی ہے۔ خاص طور پر مجسمہ سازی میں یونانی اثر صاف جھلکتا ہے۔

برصغیر پاکستان و ہند کی تہذیب و ثقافت کی تاریخ میں مسلمانوں کی آمد غالباً سب سے اہم واقعہ ہے۔ پچھلے ایک ہزار سال میں اس تہذیب و ثقافت کو جو فروغ نصیب ہوا ہے وہ ان ہی مسلمانوں کا رہین منت ہے۔ مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات سندھ سے لے کر دہلی میں مسلمانوں کی سلطنت

حکومت کے مستقل قیام اور استحکام تک یہ اثرات آہستہ آہستہ یہاں کی تہذیبی زندگی میں سرایت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں کے دور میں یہ اثرات ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی ہندلمانی تہذیب کے انتہائی عروج کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ یہ تہذیب ہندوانہ ہے نہ خالص مسلمانی بلکہ دو تہذیبوں اور ثقافتوں کی صحت مند آمیزش کا نتیجہ ہے۔ یہی تہذیب و ثقافت ہمارا تہذیبی ورثہ ہے مطالعہ ہماری تہذیب و معاشرت کا تاریخی مطالعہ ہے اس طرح کی مختلف تہذیبوں اور معاشرتوں کی آمیزش ارادی اور جبری نہیں اس کی رفتار ابتدا میں سست ہوتی ہے۔ بعض ادوار ایسے آتے ہیں جب سیاسی اثرات اس رفتار کو تیز کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی اس تبدیلی سے گریز اور احیاء کی تحریکیں بھی زور پکڑتی ہیں اور ثقافتی تبدیلیوں کا رخ موڑنے یا قدیم تہذیب کی طرف رجعت کرنے کا جذبہ بھی ہوتا لیکن یہ تحریکات اور جذبات دیرپا نہیں ہوتے اور نہ اس قوت کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو نئی جنم لیتی ہوئی تہذیب میں موجود ہوتی ہے زیر نہیں کیا جا سکتا، نہ رجعت پسندی اس کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روک سکتی ہے۔ نہ ماتم کرنے والوں کے نوحے اس کو متاثر کر تبدیلی اور تجدید سے توانائی حاصل کرنا تہذیب کا مزاج ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بعض بنیادی اختلافات کے برصغیر پاکستان و ہند میں ایک ایسی تہذیب نے جنم لیا جس میں دونوں کے تہذیبی عناصر اور عوامل کار فرما تھے۔

ان عوامل کا تجزیہ کرنے کے لئے ہند و مسلم ثقافت کے بعض بنیادی اختلافات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ ان میں اہم ترین عنصر مذہب ہے۔ ہندو مذہب کثرت پرستی اور اصنام پرستی کا مذہب ہے۔ دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش سے بڑھ کر جانوروں، درختوں اور زمین تک کی پرستش جزو مذہب ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے اور اصنام پرستی کی اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ ہندوؤں میں برہمنوں کا ایک طبقہ اس مذہب کا اجارہ دار ہے اور بغیر ان کے واسطے اور وسیلے کے کسی زندہ انسان کی دعا اور عبادت مقبول نہیں نہ کسی مردے کے نجات کی توقع ہو سکتی ہے۔ بتوں اور مورتیوں کے لئے ایک پر اسرار ماحول پیدا کرنے کی کوشش میں ہندو مندر، دل اس کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا کہ جگہ تنگ و تاریک ہو اور روشنی کا گزر یا کم یا بالکل نہ ہو یا اس طرح دکر نیم تاریکی یا نیم روشنی کی آنکھ مچولی فضا پر اسرار بن جائے اور پھر ان مندروں کے پجاری جو قربانیاں اور چڑھاوے وصول کر کے اسے دیوتاؤں اور دیویوں کی خدمت میں انسانوں کے ان گھروں کے نگہبان سمجھے جاتے تھے، لیکن نگہبانی کی بجائے یہ اپنی خیام گاہوں کو اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے اڈے بنا لیتے تھے مندر اپنے فن تعمیر کے اعتبار سے ایک قسم کی بند بند گھٹی گھٹی فضا پیش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی مساجد جو عام داخلے کے ہیں، دراصل مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کے ایک سماجی مرکز کا کام دیتی ہیں۔ نماز باجماعت کے لئے جو مسلمان ان مسجدوں میں جمع ہوتے ہیں پانچ وقت آپس میں ملتے اور تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ ہر مسجد میں ایک درمیانی گنبد ہوتا ہے اور اس کے چاروں طرف دالان ہوتے ہیں اور جلو رکشادہ صحن اس میں شامل ہوتا ہے۔ فراخی، کشادگی، روشنی مسجد کے فن تعمیر کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ ان کی خوبصورتی مورتیوں اور بتوں کی نہیں ہوتی، بلکہ ان کا حسن سادہ اور پرشکوہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ بلند مینار ہوتے ہیں جن پر مؤذن پانچ وقت خدا کے نیک بندوں کو فلاح کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہے۔ چونکہ مسجد مسلمانوں کے فن تعمیر میں ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے اس لئے مساجد کی تعمیر کے فن نے بالا کے فن تعمیر کو متاثر کیا ہے۔ محرابیں، گنبد، مینار وغیرہ ایسی امتیازی خصوصیات ہیں جو ایک ہی نظر میں مسلمانوں کی تعمیر کردہ عمارات کو غیر مسلم تعمیرات سے ممیز و ممتاز کر دیتی ہیں۔

عمارتوں کی اندرونی تزئین و آرائش کے لئے نقش و نگار سے کام لینے کا رواج بہت قدیم ہے۔ انسانی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں

قدرتی غاروں میں رہتا تھا اور مکان بنانے کا فن اس نے نہیں سیکھا تھا۔ وہ ان قدرتی غاروں کو سادہ نقوش سے مزین کرتا تھا۔ یہ نقوش اپنی اولین صورت میں ہند حجری میں ملتے ہیں اور اس طرح ان کے آغاز کی تاریخ میں کم و بیش بیس ہزار ق م قرار پائی ہے۔ اس قسم کے نقوش میں ارگینا کے نمونے قابلِ ذکر ہیں جو فرانس میں واقع اس نام کے غار سے منسوب ہیں۔ اسی دور میں آہستہ آہستہ ہڈیوں اور پتھروں سے بنائے ہوئے چھوٹے چھوٹے مجسمے بھی ملنے لگتے ہیں۔ غرض صناعی کے اس فن نے جس قدر ترقی کی، اس کا ایک اندازہ ان یونانی مجسموں سے ہی کیا جا سکتا ہے جو آج تک دنیا کے عجائب خانوں میں اپنے فن کاروں کی صناعی کی داد دے رہے ہیں۔ مسلمان نہ شبیہ پرست ہو سکتے ہیں، نہ بت گر، اس لئے ان کی عمارتوں کی تعمیر میں تزئین و آرائش کے دیگر ذرائع اور وسائل استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً بجائے انسانوں اور جانوروں کی شبیہیں اور مجسمے تیار کرنے کے مسلمان صناعوں اور فن کاروں نے گلکاری کے فن کو ترقی دے کر اسے اس معراجِ کمال کو پہنچایا جس کا ایک نمونہ تاج محل کی لاثانی اور لافانی گلکاری میں موجود ہے۔ منبت کاری اور پچی کاری کے فنون کا ارتقا مسلمانوں کے اسی ذوقِ جمال کی تسکین کی راہیں تلاش کرنے کا مرہونِ منت ہے۔ اسی طرح مسجدوں، مقبروں اور دوسری یادگار عمارتوں پر آیاتِ قرآنی کندہ کرنے یا ان کے لکھنے کے فنون کو ترقی دی۔ جو مسلمانوں کے فنِ خطاطی کی ترقی کا ایک پہلو ہے۔ مسلمانوں نے اپنے ابتدائی دور میں مصوری کی طرف توجہ نہیں کی لیکن اس کی کمی انہوں نے خطاطی میں کمال حاصل کر کے پوری کر دی۔ خطاطی کی تاریخ میں کوئی دوسری قوم اس فن میں مسلمانوں کے مقابلہ کا دعویٰ نہیں کر سکتی اور ایران و ہندوستان کے مشہور خطاطوں کی لکھی ہوئی وصلیاں، قطعات، کتابیں اور متفرق تحریریں آج بھی ہیروں کے مول بکتی ہیں۔ افسوس ہے کہ طباعت کے جدید میکانیکی ذرائع نے مسلمانوں کے اس قدیم فن کو بڑا صدمہ پہنچایا ہے۔ اب اس کے فن کاروں کو اپنے اسلاف سے کوئی نسبت نہیں رہ گئی ہے اور شاید اس نسل کے ساتھ ہی یہ فن بھی رخصت ہو جائے گا لیکن اپنی چودہ سو سالہ تاریخ میں مسلمانوں نے اس میں جن کمالات کا اظہار کیا وہ کتب خانوں اور عجائب گھروں میں مستقبل کے نقادانِ فن کی دلچسپی اور توصیف کا مرکز رہیں گے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کا تہذیبی فرق اور بھی بہت سی چیزوں میں نمایاں ہے۔ ان میں سب سے اہم ذات پات کی تمیز ہے جو ہندو سماج کی اساس ہے اور جس کے لئے مسلمانوں میں کوئی گنجائش نہیں۔ اگرچہ آریوں کے ہندوستان میں داخلے سے پہلے ذاتوں کی واضح تقسیم کا پتہ نہیں چلتا ہندوستان میں داخلے کے بعد بھی آہستہ آہستہ تقسیم صرف تقسیمِ کار کے اصولوں پر مبنی تھی لیکن رفتہ رفتہ برہمن، چھتری، ویش اور شودر ایسی سماجی اکائیاں بن گئے جو ایک ہی ملک کے باشندے ہونے اور ایک ساتھ رہنے سہنے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ شودروں کا تو ذکر ہی کیا ان کا وجود مطلق ناپاک تھا، خود چھتری اور ویش برہمنوں سے نیچے درجے کی مخلوق سمجھے جاتے تھے اس لئے برہمنوں کو ہی سماج میں سب سے بلند مرتبہ حاصل تھا۔ چھتریوں کا فریضہ دفاع اور جنگی خدمت گذاری تھا۔ ویش، زراعت، تجارت اور کاروبار کے ذمہ دار تھے اس لئے صرف برہمن ہی علوم و فنون کے سرپرست بن سکتے تھے۔ اور یہ روایت اس حد تک بڑھی کہ بالآخر وہی آریوں کی مقدس زبان سنسکرت کے محافظ اور اجارہ دار قرار پائے۔ برہمنوں نے صدیوں کی کوششوں سے اپنی اس اجارہ داری کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا لیکن اس کا نتیجہ تھا کہ بہت جلد سنسکرت زبان ایک زندہ اور بولی جانے والی زبان کی حیثیت سے ختم ہو گئی اور اس کی جگہ ان پراکرتوں نے لے لی جو عوامی بولیاں تھیں اور جن پر آگے چل کر برصغیر پاک و ہند کی جدید ہند آریائی زبانوں اور بولیوں کی بنیاد رکھی جانے والی تھی۔ ان حالات کے برعکس مسلمانوں میں ذات پات کی اس طرح کی کوئی تفریق نہ تھی۔ قرآن حکیم میں مسلمانوں سے صاف کہا گیا ہے کہ بزرگی اور بڑائی کا اصل معیار تقویٰ اور نیکی ہے اور اللہ کے نزدیک وہی سب سے بڑا ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ انسانیت اور اخوت، مساوات اور برابری کی اسلامی تعلیم محض کتابی نہ تھی۔ مسلمانوں نے عملاً اسے قول و فعل سے ثابت کیا تھا۔ چنانچہ خود برصغیر پاک و ہند کی ابتدائی تاریخ میں پہلی باقاعدہ سلطنت قائم ہوئی تو اکثر ان لوگوں کو بادشاہت

اور حکومت سونپی گئی جو غلام تھے اور ان ہی کی نسبت سے اس خاندان کو جو اصلاً نسلاً ترک خاندان تھا' غلام خاندان کہتے ہیں
تھے جو اپنی خداداد صلاحیت کے بل بوتے کار لائق صاحب اقتدار بنے تھے۔ مسلمانوں میں آزادی اور مساوات کی یہی روح تھی جو ان کے تہذیبی
بڑی پہچان ہے۔ شاعری ہو یا ادب کی کوئی دوسری صنف فن تعمیر ہو یا خطاطی۔ مسلمانوں کا آرٹ ان کی اجتماعی کوششوں کا مرہون منت
ہے جس میں زندگی کی ایسی وسعت، ہمہ گیری اور ولولہ پایا جاتا ہے جو انسانیت کو خانوں میں تقسیم کرنے سے کمزور پڑ جاتا ہے اور فنی تخلیقا
بے اثر بنا دیتا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیبی فرق کو ظاہر کرنے کے لئے کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندو گائے کی پرستش کرتا ہے اور مسلمان
ذبح کر کے کھا جاتا ہے۔ اگرچہ ہندوؤں میں بھی جانوروں خصوصاً بیل اور گھوڑے کی قربانی کا پتہ چلتا ہے اور ابتدائی ویدک دور میں اس کا
تھا لیکن آگے چل کر ہندو بنیادی طور پر ایک سبزی خور قوم بن گئے تھے۔ مسلمانوں میں گوشت خوری کا رواج عام تھا اس لئے قدرتی طور پر
مسلمانوں کے کھانوں اور ان کے آب و رنگ میں بہت فرق پیدا ہو گیا اگرچہ اسلام میں صرف ایک احتیاط لازمی ہے کہ جن چیزوں کو واضح
دیا گیا ہے ان سے پرہیز کیا جائے لیکن اس کے علاوہ ان کو دنیاوی نعمتوں سے پوری طرح متمتع ہونے کی اجازت دی گئی ہے اور قرآن حکیم نے
کہ کھاؤ پیو اور اسراف نہ کرو۔ اس کھانے پینے کے سلسلے میں مسلمانوں نے اسے بھی ایک فن بنا دیا تھا۔ مسلمانوں کے دور میں روٹی، چاول
تیار ہونے والے ہزاروں کھانے تیار ہو گئے کہ ان کی لطافت اور نفاست اب صرف ادبی دستاویزوں میں باقی رہ گئی ہے اور جن کی تفص
کی کتابوں میں بھی نہیں چلتا۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس تہذیبی ورثہ کو محفوظ کر لیا جائے ورنہ کچھ زمانہ اور گزر گیا تو پھر ان کی تشریح اور توضیح
باقی نہ رہے گی۔

بابر کا وہ قول بہت مشہور ہے جو اس نے اپنی تزک میں اپنے عہد کے ہندوستان کی تہذیبی حالت کے بارے میں لکھا ہے۔ وہ لکھتا
ہے یہاں اچھے گھوڑے نہیں ہوتے۔ اچھے پھل نہیں ملتے، اچھے لباس کی طرف لوگوں کو توجہ نہیں، اچھی غذا اور کھانوں کا پتہ نہیں چلتا ٹھنڈا پانی نہیں
انگور نہیں ملتے۔" اس سلسلے میں بابر نے آخری بات بڑی پرلطف کہی ہے۔ وہ لکھتا ہے "یہاں فانوس نہیں شمع نہیں، شمعدان نہیں بلکہ دیو
ہے جو شاہی محلسرا میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جب کبھی راجہ یا مہاراجہ کو قریب سے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے یہی ڈیوٹ اس کے
جاتا ہے۔ اس پر سرسوں کے تیل کا ایک چراغ روشن ہوتا ہے۔ بقول بابر اس کا دھواں دربد بو دماغ پریشان کرنے کے لئے کافی
حال تھا کہ عام طور پر لوگ درختوں کے پتوں پر کھا لیتے تھے۔ سبب اس کا یہ تھا کہ چھوت چھات کی وجہ سے جو برتن ایک مرتبہ استعمال م
ہو جائے اس کا دوبارہ استعمال ممکن نہ تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں کسی قسم کے قیمتی ظروف کا استعمال غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ زیادہ
کے چند برتن کافی سمجھے جاتے تھے جن کو استعمال کے بعد پھینک دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے جہاں انواع و اقسام کے کھانوں کی ایجاد میں ا
یہاں ان کے کھانے کے لئے برتنوں اور متعلقہ سامان کو بھی رواج دیا اور اس اعتبار سے ہمارے اکثر و بیشتر ملازم کے استعمال کے
تہذیبی دور کی یادگار ہیں جن سے ان لوگوں کی نفاست طبع، سلیقہ اور رکھ رکھاؤ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہی حال لباس کا تھا۔ کچھ یہاں کے موسم اور آب و ہوا کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ سیاسی یا تہذیبی اعتبار سے ایک مدت
ہند میں ایک قومی وحدت کا تصور بھی پیدا نہیں ہوا تھا، عام طور پر ایک لنگوٹی مردوں کے لئے کافی تھی اور عورتوں کے لئے ایک لم
یا ساڑھی کی طرح بدن پر لپیٹ لیا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے لباس پر بھی ایسی توجہ کی اور اس میں ایسے ایجادات سے کام لیا کہ اسے بھی ایک

نے کپڑوں کی بہت سی نئی قسمیں رائج کیں۔ ان میں سے کچھ ایسے کپڑے تھے جو وہ ایران سے اپنے ساتھ لائے تھے لیکن بہت بڑی تعداد ایسے کپڑوں
موں نے اس ملک میں آکر رائج کئے۔ پورے ملک میں مسلمان کاریگروں کی بڑی بڑی بستیاں پھیلی ہوئی تھیں اور ان کی صناعی اس درجہ کی تھی کہ ان کے
ے کپڑے دور دراز ملکوں میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ غیر ملکی تجار جو یہاں آتے تھے یہاں کے گرم مصالحوں اور نیل کے ساتھ یہاں کے کپڑے
رغات لے جاتے تھے اور یورپ کے شاہی خاندانوں اور امراء کے محلوں میں منہ مانگے دام پاتے تھے۔ برطانوی دور اقتدار کے آغاز
ں کا یہ فن ترقی کرتا رہا لیکن یورپ میں کپڑا بننے کی کل ایجاد ہونے پر جب سستا کپڑا بننا شروع ہوا اور انگریزوں کو اپنی مصنوعات کے لئے منڈیاں
روع ہوئی تو ان صناعوں اور کاریگروں کو مٹانے کے لئے باضابطہ کوششیں کی گئیں اور اب یہ داستانیں تو آپ بہت مشہور ہیں کہ ڈھاکہ کی ململ
والے کاریگروں کے ہاتھ قلم کر دیئے گئے۔ اس طرح اعلیٰ درجے کے کپڑے کے لئے بہت جلد برصغیر پاک و ہند کے لوگ یورپ کی سستی
ں کے محتاج ہو گئے۔ اب یہ کپڑے کہیں کہیں عجائب گھروں میں ہی نظر آتے ہیں اور وہ بھی آزادی کے بعد بھارت میں رہ گئے ہیں۔ ہمارے
ب خانوں میں بھی ان کے نمونے باقی نہیں۔ ہاں زبان، شاعری اور ادب میں ان کے نام محفوظ ہیں اور شاید اسی ذریعے سے یہ تاریخ میں
گے۔

مذہبی زندگی میں میلوں ٹھیلوں اور تہواروں کو بھی ایک نمایاں حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے بڑے تہوار صرف دو ہیں
۔ ایک عید رمضان اور ایک عید قربان۔ یہ دونوں عیدیں مسلمانوں کے مذہبی نقطۂ نظر کی ترجمان ہیں کہ دونوں کا مقصد ایک فرض کی ادائیگی پر
ور اظہار مسرت ہے۔ عید رمضان سے پہلے خدا کے نیک بندے اس کے احکام کی تعمیل میں پورے ایک مہینہ طلوع آفتاب سے غروب
، بغیر کھائے پیئے رہ کر تہذیب و تزکیۂ نفس کرتے ہیں۔ اسلام میں رہبانیت کی گنجائش نہیں اس لئے ترک دنیا اور فقر و فاقہ نہ مذہبی نقطۂ نظر سے
ں اور تہذیبی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی زندگی داخل ہو سکتے ہیں لیکن رمضان کے تیس روزوں کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی ہر طرح
ے متمتع ہوتے ہیں۔ ان کو ایک طرف تو ان معمولی کھانے اور پینے کی نعمتوں کی اہمیت کا احساس ہو سکے تاکہ وہ ان نعمتوں کے مہیا کرنے
لے پر ادا کر سکیں۔ دوسری طرف ان میں کچھ احساس اس تکلیف اور تنگی کا بھی پیدا ہو سکے جو ان چیزوں کی محرومی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے
ں جو لوگ زیادہ خوش قسمت نہیں ہیں ان کی تکالیف اور درد دکھ کا احساس انسان کو سماجی بہبود کے کاموں کی طرف متوجہ کرے۔ اسلام
زکوٰۃ کا بھی مقصد یہی ہے اور خاص طور پر رمضان کا مبارک مہینہ ہی زکوٰۃ اور صدقات کی تقسیم کے لئے موزوں سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح یہ
ادی طور پر اظہار تشکر اور اعتراف کرم ہے اور عملی طور پر ایک ایسی اجتماعی تقریب جس میں چھوٹے بڑے، امیر غریب سب شریک ہوتے
ں لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں اور کرم ہے وہ اپنے حاجتمند بھائیوں کی اعانت اور دستگیری کر کے انھیں بھی اس خوشی میں
نے کا موقع بخشتے ہیں

وسری عید۔ عید قربان ہے جو ایک تاریخی واقعہ کی یادگار ہے۔ یہ واقعہ جو حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی سے متعلق ہے، حضرت ابراہیم کو حکم ملتا ہے
بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کریں۔ یہ وقت بڑے ضبط، صبر و استقلال اور امتحان و آزمائش کا ہے کہ ایک بوڑھے باپ سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے
اپنے ہی ہاتھ سے قربان کر دے لیکن ابراہیمؑ اور اسمٰعیل خدا کے نیک بندوں میں تھے اور انھوں نے فرمان الٰہی کے سامنے سر جھکا دیا۔ لیکن اصل
ن ایمان کے استحکام کی آزمائش تھی جس میں دونوں باپ بیٹے پورے اترے۔ یہ اسی مبارک دن کی یادگار ہے کہ صاحب نصاب صاحب
ن اس روز خدا کی راہ میں کوئی جانور قربان کرتے ہیں۔ خدا کو ان جانوروں کا گوشت پوست اور خون یا ہڈی نہیں پہنچتی بلکہ اس طرح قربانی کرنے

والے اپنے جذبۂ ایمانی کی تجدید کرتے ہیں اور اس طرح سنتِ ابراہیمی کو فروغ دیتے ہیں۔ ایثار اور قربانی کی یہی بنیادی رسم ہے جس کی تائید
کی بکثرت مثالیں تاریخِ اسلام میں ملتی ہیں جن میں ایک واقعۂ کربلا بھی ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی قربانی کی اس مثال کو بے نظیر اور بے عدیل سمجھا
خود برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ہو یا ۱۹۴۷ء کا انقلاب، ٹیپو سلطان شہید کے معرکے ہوں، یا سراج الدولہ کی شہا
بہادر شاہ ظفر ہوں یا مولانا محمد علی اور مولانا حسرت موہانی اس قربانی اور ایثار کی روایت کے نشانات مسلسل ملتے ہیں۔

تو یہ تو دو تہوار مسلمانوں کے مذہبی تہوار رہے لیکن عام تہوار اور تقریبات مختلف ملکوں میں موسمی فصلوں یا تاریخی واقعات کی یادگار کے طور پر من
ہیں۔ ان میں سے سوائے ان تہواروں کے جو خالص غیر اسلامی تھے، مسلمانوں نے ہندی تہواروں اور تقریبوں میں بلاتکلف حصہ لیا اور انہیں اپنی مع
جزو بنا لیا۔ بلکہ ایسے تہوار جن میں ہندو دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی، ان کی بھی پوجا کو چھوڑ کر تفریحی عنصر کو قبول کر لیا۔ ان تہواروں اور تقریبوں میں
کی شرکت کا اندازہ اردو ادب کی تاریخ سے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اردو زبان خود بھی برصغیر میں ہندی اور اسلامی تہذیب کی آمیزش اور آویزش سے
آئی تھی۔ حضرت امیر خسرو کی ابتدائی نعت ہندی اور نعت فارسی شاعری سے لے کر دکن میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام تک (جس میں
اور تقریبوں پر کئی نظمیں شامل ہیں) اور پھر نظیر اکبر آبادی کی کلیات میں اس کلچر کی بڑی نمایاں تصاویر موجود ہیں جس کو ہندلمانی
کا نام دیا جا سکتا ہے

یہ ہندلمانی کلچر مسلمانوں اور ہندوؤں کے کلچر کے میل جول اور ایک پر دوسرے کے عمل اور ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوا لیکن خود مسلمانوں
مختلف عناصر موجود تھے کیونکہ تمام مسلمان جو اس ملک میں کسی نہ کسی حیثیت سے پہنچے ہیں، ایک ہی شہر یا ملک کے رہنے والے نہ تھے اور نہ ایک وقت
میں داخل ہوئے تھے۔ محمد بن قاسم سے لے کر بابر تک فاتحین کا ایک طویل سلسلہ ہے جو اصلاً اور نسلاً ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں عرب
ایرانی بھی، افغانی بھی، مغل بھی، اور ان میں ہر ایک اپنی ایک الگ کلچر اور ثقافت کا نقیب ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خالص مسلمانی کلچر بھی مختلف
اور ثقافتوں کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ البتہ درست ہے کہ اس تہذیب و ثقافت پر جسے مسلمانی کلچر کہہ سکتے ہیں، شباب اور نکھار مغلوں کے دور
آیا ہے کیونکہ سیاسی اور تاریخی اعتبار سے بھی یہی دور ان کی حکومت اور سلطنت کے شباب اور عروج کا دور ہے۔ اس دور میں تان سین جیسا مغنی
تاج محل جیسی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ دلی کا لال قلعہ، دیوانِ خاص، ایوانِ عام، لاہور کا شالامار باغ اور شاہی مسجد وجود میں آتے ہیں۔ اسی د
زبان مغلوں اور ایرانیوں کے کلچر کا سب سے بڑا نشان، اس ملک کی سرکاری، عدالتی اور تہذیبی زبان قرار پاتی ہے اور اسی دور میں مغلوں
پرستی کی داستانیں سن سن کر عالمِ اسلام سے اربابِ علم و فن کشاں کشاں دہلی چلے آتے ہیں اور بلاشبہ دہلی مرحوم کو فخر البلاد بنا دیتے ہیں
کہ یہ فاتح کلچر کی چھاپ تو [illegible] یہاں کے تمدن پر بھی لگ جاتی ہے اور دوسری طرف اس ملک میں رہتے رہتے میل ملاپ سے یہاں کے تمدن او
سے مغائرت اور اجنبیت بہت جلد انس و محبت میں بدل جاتی ہے خاص طور پر اکبر کے زمانے جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیاسی او
بہت بڑھتا ہے اور ہندو شہزادیاں مغل حرم سرا میں داخل ہوتی ہیں تو یہ اثرات اور بھی زیادہ واضح اور نمایاں ہو جاتے ہیں چنانچہ ان ہی
تہذیب جنم لیتی ہے جو دورِ آخر میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت ہے جس میں مسلمانی اور ہندی دونوں عناصر شامل ہیں۔
مسلمانوں نے تو اس طرح کے تہذیبی اور ثقافتی میل ملاپ کو آسانی سے قبول کر لیا لیکن بدقسمتی سے ہندو اس ردِ عمل کو قبول کرنے کے
تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہندوؤں میں ذات پات اور چھوت چھات نے جو شدت اختیار کر لی تھی وہ عام سطح پر ہندوؤں اور مسلمانوں
میل ملاپ کے لئے بھی کوئی مفید صورت پیدا نہیں کر سکی۔ جو ہندو مسلمان کے ہاتھ کا کھانا نہ کھا سکے۔ اس برتن کو ناپاک سمجھے جسے مسلمان نے چھوا

کنویں سے مسلمان کو پانی نہ بھرنے دیتے، وہ ثقافتی اور تہذیبی ادغام کو کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ چنانچہ صدیوں کی کوششوں کے باوجود مسلمان اس ملک میں مشترک کلچر اور ثقافت کی بنیادوں کو استوار نہ کر سکے۔ انھوں نے اپنی زبان (عربی۔ ترکی۔ فارسی) کو چھوڑ کر یہاں کی اردو، اور دوسری علاقائی زبانیں اختیار کر لیا۔ اپنے لباس اور وضع قطع میں وہ ہندی کہلانے لگے۔ ان کے تہواروں، تقریبوں، میلوں ٹھیلوں میں مشترک تہذیب کے آثار ملنے لگے لیکن ہندوؤں نے اپنے آپ کو الگ تھلگ ہی رکھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی سلطنت میں ضعف آتے ہی یہ قومیں مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو گئیں۔ شمالی ہند میں سکھوں اور جاٹوں نے مغلیہ سلطنت کا شیرازہ برہم کرنے کا منصوبہ بنایا اور دکن سے مرہٹوں نے اس کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلیہ سلطنت کمزور پڑ گئی لیکن کسی ہندوستانی قوم کو اس سلطنت کی وراثت نصیب نہیں ہوئی اور یہ ملک کم و بیش دو سو سال کے لئے انگریزوں کی غلامی پر راضی رہا۔ اس طویل عرصہ میں یہ بات روز بروز واضح ہوتی چلی گئی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا راستہ الگ الگ ہے اور اگرچہ سیاسی اتحاد کے لئے بہت سی کوششیں کی جاتی رہیں لیکن اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اختلاف کی یہ خلیج بڑھتی ہی چلی گئی۔ کیونکہ اس کی بنیاد دو ایسی ثقافتوں پر تھی جن میں سے کوئی ایک دوسرے کو قبول کرنے یا سمجھوتہ کرنے پر تیار نہ تھی۔ یہی تہذیبی اور ثقافتی اختلاف دو قومی نظریے کی اصل اساس اور بنیاد ہے اور اسی نے مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ برصغیر میں مسلمانوں کی آبادی کی اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ایک وطن کا مطالبہ کریں۔ یہ وطن انھیں پاکستان کی صورت میں ملا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس تہذیب اور ثقافت کے تحفظ کے لئے پاکستان پیش کیا گیا تھا، اس کے لئے ہم نے کیا کیا اور کیا کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد

ارتقائے اِنسان

پچھلی صدی کے نصف آخر میں جب ڈارون نے "ارتقائے انواعِ حیات" اور پھر نسبِ انسان پر اپنی کتابیں شائع کیں
کا وضعدار اور باوقار طبقہ بلبلا اٹھا۔ بہت سے جلسے جلوس اس کے خیالات کی تردید اور مذمت میں برپا کئے گئے۔ ڈارون خو
مزاج کا آدمی تھا، خود تو پبلک جلسوں اور مناظروں میں شامل نہ ہوتا تھا لیکن اس کی طرفداری میں ٹامس ہنری ہکسلے اکثر ان بحثوں کے مب
اٹھایا کرتا تھا۔ ان مناظروں کی تلخی کا کچھ اندازہ اس ایک واقعے سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ جب ہکسلے کا مقابل اوکسفورڈ کا لاٹ
بیموئل ولبرفورس تھا تو ولبرفورس نے کہا "ہکسلے صاحب یہ تو میں نے مان لیا کہ بندر ہی آپ کا مورثِ اعلیٰ تھا لیکن یہ بھی تو فرما
ئے آپ کا رشتہ ننھیال کی طرف سے ملتا ہے یا ددھیال کی جانب سے؟"

ڈارون کا نظریۂ ارتقا چاہے کچھ بھی ہو، اس کے مخالفوں کے پاس یہ حربہ بڑا کارگر تھا کہ اس کے حلیفوں پر وہ بندر کی اولا
پھبتیاں اڑاتے اور ان کا منہ بند کر دیتے۔ اصل بات یہ تھی کہ انسان قدیم زمانوں سے اپنے آپ کو کائنات کا مرکز سمجھتا رہا تھا۔ جب سائنس نے
کہ وہ بھی دوسری چیزوں کی طرح قوانینِ فطرت کا تابع ہے تو لوگوں کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا ان کی مسندِ توقیر و سیادت چھین لی گئی ہے۔ جب ا
ہمارے ہاں آئی تو روحِ انسانی کی مزعومہ تذلیل کا یہی پروپیگنڈہ یہاں بھی اثر انداز ہوا۔ لوگوں کو یہی سمجھایا گیا کہ اگر انسان نے بندر سے ارتقا
تو پھر روحانی بلندی اس کو حصہ کبھی نہیں ہو سکے گی۔ اکبر الہ آبادی جن کا اثر ہمارے قدامت پسند طبقے پر بہت گہرا تھا۔ فرماتے ہیں:

کہا منصور نے خدا ہوں میں ڈارون بولا بوزنا ہوں میں
سن کے کہنے لگے مرے اک دوست فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

حالانکہ یہی دلیل دوسری طرف بھی لے جا سکتی تھی۔ کہا جا سکتا تھا کہ اگر عرصۂ امکان میں اتنی ترقی ہو سکتی ہے کہ بندر بڑھ کر انسان بن جائے ا
کیا نہیں ہو سکے گا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ دلیل بڑی قوت کے ساتھ دی بھی جا چکی ہے۔ مولانا روم کے خاصے مشہور شعر ہیں جو انسانی ارتقا
کرتے ہیں اور یوں شروع ہوتے ہیں ؎

آمدہ اول بہ اقلیمِ جماد وز جمادی در نباتی اوفتاد

یعنی ہم پہلے جمادی سے نباتی میں اور پھر نباتی سے اقلیمِ حیوانی میں آئے اور آخر کار حیاتِ انسانی میں داخل ہوئے۔ دلیل مولانا روم کی یہ ہے
مقام پہنچتا ہے ارفع ہے۔ پس پیچھے دیکھنا ہمیں بکار آمد نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم آگے چل کیا ہو جائیں گے۔ میں یہاں صرف یہی کہہ سکتا ہو
روحانی مدارج کے خیالات کے بارے میں ہمیں اکبر الہ آبادی یا مولانا روم میں سے کسی ایک کی بات ماننی پڑے تو کم از کم میں تو مولانا روم
ترجیح دوں گا۔ [illegible] شریعت تک کی جگہ نہیں آیا کہ انسان جو زمین پر خلیفۃ اللہ ہے اس کی اصل اور پیدائش ایک گندگی سے ہے تو پھر کیا ہم اپنی اصل ہی

حقیقت سمجھیں، اس سے تو لازم آئے گا کہ ہمیں ہر طرح گندہ ہی رہنا چاہیئے، گندے افکار، گندی گفتار اور گندے عمل ـــــ تو میرے کہنے کا ماحصل یہ ہے کہ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ ہماری ابتدا ادنیٰ تھی تو اس سے بدکنا نہیں چاہیئے بلکہ یہ تو ایک خوبی ہے کہ عملِ ارتقا ہمیں سطحِ ادنیٰ سے سطحِ اعلیٰ کی طرف لے جا رہا ہے۔

انسان کے تدریجی ارتقا کے نظریے کے خلاف اہلِ مذہب تو تھے ہی، شروع میں کچھ اہلِ سائنس بھی اس کے خلاف رہے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں لینیوس کا، جو ذوالحیات کی سائنسی قسم بندی کا باوا آدم مانا جاتا ہے، یہ حتمی فیصلہ تھا کہ انواعِ حیات، بالکل الگ الگ ہے۔ کسی ایک کا کسی دوسری سے کوئی رشتہ نہیں، بلکہ ان کی تعداد بعینہٖ اتنی ہے جتنی کہ کبھی کشتیِ نوح میں داخل ہوئی تھی۔ چنانچہ انسان بھی بطور ایک الگ نوع کے پیدا ہوا تھا اور دوسری انواع سے اس کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انسان کا پورا بدن اس نظریے کے خلاف ایک شہادت ہے۔ اگر انسان سچ مچ ایک الگ مخلوق پیدا کیا گیا تھا تو اس کے بدن میں کوئی ایسی فالتو شے نہ ہونی چاہیئے جو اس کے تو کسی کام کی نہ ہو لیکن اس کے نزدیکی جانوروں میں بکار آمد ہو۔ انسان میں دم نہیں ہوتی تو پھر کیوں دُم کی ہڈی کچھ مہروں کی صورت میں اس کی ریڑھ کے نچلے سرے پر موجود رہے؟ انسان اپنے کان نہیں ہلا سکتا اور اس کی اسے کوئی ضرورت بھی نہیں تو پھر کیوں کانوں کے ہلانے والے سارے عضلات اس کے سر کی طرفوں پر موجود ہیں؟ کچھ اسی طرح کی شے عقل ڈاڑھ ہے جو پچیس سال انسان کی عمرِ عزیز کے گذر جانے پر تب یہ نمودار ہوتی ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ اب کیا اسے لوہے کے چنے چبانے تھے جو یہ نکل آئی ہے تو کوئی جواب نہیں ـــ اور یہ بال کیا وبال ہیں، ہمارے کس حیاتیاتی مصرف کے ہیں؟ دوسرے جانوروں میں تو وہ سردی روکنے کا ذریعہ تھے۔ کیا ہماری سردی بھی ان سے رُک سکتی ہے؟ انسانی جنین کا مطالعہ کریں تو وہاں بیکار چیزوں کا ٹھکانہ نہیں بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ وہ ایک ایسا مکان ہے جو بیکار چیزوں کا ٹھکانہ ہے۔ انسانی جنین کو دیکھیں تو وہاں مچھلی کے سے گلپھڑے دکھائی دیں گے، لمبی دم ہو گی اور سارا جسم بالوں سے ڈھنپا ہوا ہو گا۔ آخر ان سب بے مصرف اور بیکار چیزوں کے وجود کی کوئی معقول توجیہہ بھی ہے؟ اگر ہے تو صرف یہی کہ انسان بھی دوسری مخلوق کی طرح بتدریج اپنی موجودہ شکل اور عقل کو پہنچا ہے اور وہ ان سے الگ نہیں بلکہ وہ سب ایک ہی خون کے وارث ہیں۔

انسان کے بندروں سے خونی رشتہ رکھنے کی دوسری دلیل ان کی باہمی مماثلت ہے۔ مماثلت کی دلیل دوسرے ذوالحیات کے رشتوں کے بارے میں تو دی جا چکی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ یہاں وہ قبول نہ کی جائے۔ دور نہ جایئے صرف چڑیا گھر تک چلیئے۔ تماشائیوں کی بھیڑ سب سے زیادہ بندروں، لنگوروں اور بن مانسوں کے کٹہروں کے گرد آپ کو نظر آئے گی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ صرف ان جانوروں کی جسمانی ساخت بلکہ ان کی حرکات و سکنات اور عادات بھی تماشائیوں کو اپنی جیسی دکھائی دیتی ہیں۔ چمپنزی کی ماں نہ صرف اپنے بچے کو گود میں لے کے بیٹھتی ہے بلکہ انسانی ماؤں کی طرح کسی وقت اسے جھلاتی بھی ہے، اس کا منہ چومتی ہے اور اس کے سر پر ہاتھ بھی پھیرتی ہے۔ پھر چمپنزی اور گوریلوں کے ہاتھ اور ان کی انگلیاں انسانی ہاتھوں اور انگلیوں سے اور ان سے جو کام لئے جاتے ہیں ان سے بے مماثل ہیں۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ کتوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کو سدھایا اور بہت کچھ سکھایا جا سکتا ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ خود کوئی نئی بات پیدا نہیں کر سکتے۔ ان کا دماغ ایک حد تک چلتا ہے، اس سے آگے نہیں جاتا۔ لیکن چمپنزی کئی دفعہ انسان کی طرح بغیر کسی پرانے تجربے کے نئی چیز اپنے تخیل سے پیدا کر سکتا ہے۔ پروفیسر کوہلر نے ایک چمپنزی کو دو ایسی چھڑیاں دیں جن کے سرے آپس میں جڑ سکتے تھے۔ پھر کوئی کھانے کی مرغوب شے چمپنزی کی ایک چھڑی کی دسترس سے باہر رکھ دی۔ کچھ دیر کی الٹ پھیر کے بعد چمپنزی نے ایک چھڑی میں دوسری چھڑی لگا لی اور اس کی مدد سے اس کھانے والی شے کو اپنے تک کھینچ لیا۔ بالغ انسان اور بالغ چمپنزی میں جو مماثلت بیان کی گئی ہے، ان کے جنین کی مماثلت اس سے بھی زیادہ ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا جنین بہت چمپنزی نما اور چمپنزی کا جنین بہت انسان نما ہے۔

شاید کوئی کہے کہ انسان کی غایت درجہ مشابہت چمپنزی وغیرہ سے تو ہم مان لیتے ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان ان سے پیدا ہوا کیونکہ مشابہت سے دلیل دوسری طرف بھی جا سکتی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ انسانوں سے پیدا ہوئے ہوں۔ اس شبہے کے رد کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ یہ ہے

کہ معلوم کیا جائے کہ کون پہلے وجود میں آئے انسان یا ایپس، وا گرا، راق الارض کے مطالعہ ایپس ہمیں پہلے نظر آئیں اور اس وقت انسان کا کہیں ذکر
معقول نتیجہ یہی نکالا جائے گا کہ انسان اپنے مشابہ ترین ایپس سے نکلا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج تک یہ کھوج نہیں لگایا جاسکا کہ وہ کون سی نوا
کی تبدیلی اور ارتقاء سے انسان بنا۔ سائنس نے کبھی یہ نہیں کہا کہ بندروں کی موجودہ انواع میں سے کوئی ایک نوع، نوع انسان کی مورث ہے۔ سائنس
ایپس کو انسان کے بچھڑے بھائیوں کی مثال سمجھنا چاہئے۔ یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ مختلف ایپس اور انسان کسی ایک ہی بڑے تنے سے ابھرے ہیں لیکن اس
خاص شاخ تھی جس سے انسان نکلا ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ بندروں اور ایپس کی شاخیں اس کے پاس کی شاخیں ہیں۔ پس انھی سے کچھ یہ اند
ہے کہ خود اس کی رفتہ وگزشتہ شاخ کی شکل وصورت رکھتی ہوگی لیکن براہ راست ابھی تک اس کے متحجر آثار نہیں دیکھے گئے۔

محققین کے نزدیک قدیم ایپس اور نوع انسان کے درمیان واقعی ایک کڑی تھی جسے وہ PITHECAN THROPS کے نام سے
PITHECAN THROPS آج سے کئی لاکھ سال پہلے زندہ تھا۔ اسے انسان تو نہیں کہا جاسکتا لیکن وہ اپنی شکل وصورت، قد کاٹھ اور چال ڈھال
سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اس کی کھوپڑی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا دماغ ایپس سے بڑا تھا اور اس کا قد بھی سیدھا تھا ۔۔ وہ ایپس کی طرح آگے کو جھک

مجھے توقع ہے کہ آپ جینس اور اسپیشیز کا فرق جانتے ہیں۔ اب تک جن مختلف بن مانسوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ابھی تک اس جینس کو
کہا جاتا ہے جینس ہومو کی تین انواع یا اسپیشیز تھیں جو معدوم ہو چکی ہیں۔ ایک جرمنی کی ہومو اور دوسری جنوبی افریقہ کی RHODIMENSIS
تیسری ویسی Homo Neanderthal یا انسانی اینڈرتھل تھی۔ یہ تینوں انواع پچھلے پانچ لاکھ سال کے اندر اس دنیا میں موجود تھیں۔ ان میں سے
ایسی معدوم انسانی نوع ہے کہ اس کی بہت سی باقیات ہمارے پاس ہیں۔ اس نوع کی یہ ایک عجیب وغریب رسم تھی کہ وہ اپنے مردوں کو بجائے یونہی پھی
دفن کیا کرتے تھے۔ اور ان کی قبریں ان کے پتھر کے بنے ہوئے اوزار اور دوسری چیزیں رکھ دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سے ظ
استعمال کی بہت سی چیزیں آج کل بھی ملتی ہیں۔ اگرچہ ان کے ایک قسم کے انسان ہونے میں شبہ نہیں لیکن ان کی شکل وصورت موجودہ انسان یعنی ہم
درجہ مختلف تھی۔ ان کی بھوؤں کی ہڈی بڑی نمایاں ہوتی تھی اور ٹھوڑی تقریباً غائب تھی۔ گردن بڑی موٹی اور ذرا آگے کو بڑھی ہوئی اور ٹانگیں
ذرا باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ وہ یقیناً ہم سے زیادہ طاقتور جسم رکھتے ہوں گے کیونکہ ان کے ہتھیار اتنے بھاری ہیں کہ ہم انھیں بس چوم کر چھوڑ دیں
ہے کہ ہماری اپنی نوع یعنی ہومو سیپینز ان انسانوں کے ساتھ بھی کچھ عرصہ رہی ہے اور ان کا کچھ نہ کچھ خون ہماری رگوں میں بھی چلتا ہے جیسا کہ
ہماری موجودہ نوع انسانی جینس ہومو ہی کی ایک نوع ہے اور اس کا سائنسی نام محققوں نے ہومو سیپینز رکھا ہے جس کا اردو ترجمہ عقل والا ا
ہے۔ یہ نام اس خیال سے ہمیں عطا ہوا ہے کہ ہم اور ہماری نوع میں وہ محقق بھی شامل ہیں جنھوں نے یہ نام رکھا ہے۔

بہرحال موجودہ نسل انسانی کی عمر زیادہ نہیں۔ بہت ہوگی تو پانچ لاکھ سال ہوگی ورنہ دو ایک لاکھ سال، جو حیوانات مثلاً
اور ہمالیہ کی پندرہ کروڑ سالہ عمر کے سامنے کچھ بھی تو نہیں۔ اور باقاعدہ بستیوں میں رہنے اور دھات کاری اور زراعت کاری
ہزار سال سے زیادہ نہیں۔ آنے والے وقت کا کوئی انت نہیں۔ ذہن کی سطح کے حالات سازگار ہیں اور ارتقاء کا سلسلہ بند نہیں ہو
تھوڑی سی عمر دیکھ کر نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں کیا کیا امکانات پوشیدہ ہیں۔ نہیں کہا جاسکتا کہ انسان کی رسائی کہاں تک ہوگی ا
بن جائے گا سائنس اور شعر میں بڑا فاصلہ ہے لیکن آج کی بات اقبال کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

ڈاکٹر محمد اجمل

نفسیات — ایک سائنس

آخر یہ نفسیات ہے کیا؟ بلاد عوام کے لئے اور بہت سے طلباء کے لئے نفسیات "جادو" کی طرح کوئی "کالا علم" ہے۔ بہت سے لوگوں کے لئے نفسیات لوگوں کو تنویم کی کیفیت میں لانے کے ملکہ کا نام ہے۔ بہت سے لوگ ماہرین نفسیات سے ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں پہلی ہی ملاقات میں وہ ہمارے خیالات کا اندازہ نہ کرلیں یا ہمارے سینے کے راز ہائے سربستہ معلوم نہ کرلیں۔ کچھ لوگ نفسیات اور روزمرہ کی سوجھ بوجھ میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ وہ محض کونین کی گولی پر شکر کا لیپ دینے کو نفسیات تصور کرتے ہیں۔ پھر ہر کار آگاہ اور کار پرداز اپنے آپ کو ماہر نفسیات سمجھتا ہے اور اس لئے ماہر نفسیات کو یا تو ایک بیکار اور فاضل وجود سمجھا جاتا ہے یا اسے ایک شعبدہ باز کا مقام عطا کردیا جاتا ہے۔

آج ہم جس نفسیات کا ذکر کرنے والے ہیں وہ ایک سائنسی علم ہے جو نہ جادوگری ہے، نہ شعبدہ بازی۔ ماہرین نفسیات جب نفسیات کو سائنس کہتے ہیں تو وہ خوب جانتے ہیں کہ نفسیات کو سائنس کا درجہ دینے کا کیا مطلب ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس علم کے نتائج قطعی ہیں اور اس کے اطلاق سے وہی معرکہ آرا کرشمے ظہور پذیر ہوں گے جو طبیعیات اور کیمیا کے اطلاق سے پیدا ہوئے ہوں۔ نفسیات کو ہم سائنس اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے اسالیب مطالعہ، سائنس کے اسالیب ہیں۔ ان اسالیب کی بنیادیں دو ہیں۔ ایک مشاہدہ، دوم تجربہ۔ ان اسالیب کے اصولوں کو ہم یوں بیان کرسکتے ہیں۔

ہر ذہنی کیفیت اور خارجی عمل کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔

انسان اس امر کی صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ ان اسباب کا مشاہدہ کرسکے، ان کا تجزیہ کرسکے، ان کی پیمائش کرسکے اور ایسے کلیے قائم کرسکے جن کی مدد سے ہم انسانی اور حیوانی کردار کے متعلق پیش گوئی کرسکیں۔

وہ کلیات جو ہم اس کردار کے بارے میں قائم کرتے ہیں وہ اس آسان پیرائے میں بیان ہوسکتے ہیں جس کی وہ توجیہہ کرتے ہیں۔

یہ اصول تمام سائنس کے اصول ہیں۔ ان اصولوں کی پیروی میں ضروری ہے کہ کچھ مفروضے بنائے جائیں اور پھر مشاہدے اور تجربے کے ذریعے ان مفروضوں کی صحت یا عدم صحت کا تعین کیا جائے۔ مثلاً چند ماہرین نفسیات نے یہ مفروضہ بنایا کہ غیر ملکی زبانیں پڑھانے کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ جب طلبا تنویم کی حالت میں ہوں تو ٹیپ ریکارڈ انھیں کسی غیر ملکی زبان کا درس دیا کرے۔ چنانچہ اس مفروضے کی صحت کے تعین کے لئے یہ تجربہ کیا گیا کہ چند طلبا پر تجربہ گاہ میں تنویم کی حالت طاری کردی گئی اور انھیں کسی غیر ملکی زبان کا درس دیا گیا۔ تنویم کی حالت سے ابھرنے پر ان سے اس زبان کے متعلق سوالات کئے گئے۔ لیکن یہ دیکھا گیا کہ طلبا اس تنویمی درس و تدریس کے باوجود اس زبان سے نابلد رہے چنانچہ یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا۔

جہاں مفروضوں کے صحیح ہونے کی تاریخ ہے وہاں سائنس اور نفسیات کی تاریخ بہت سے مفروضوں کے غلط ثابت ہونے کی تاریخ بھی ہے۔ کسی سائنس نے اس طرح [illegible] نہیں کی کہ ترقی کے صراط مستقیم پر گامزن رہی ہو۔ راہ میں ہزاروں نشیب و فراز آئے، پائے تجسس کو ہزاروں ٹھوکریں لگیں اور پھر کہیں حقیقت نے اپنا ایک رخ بے نقاب کیا۔ سائنسدان جب پیش گوئی کا ذکر کرتے ہیں تو اس تصور پر کئی پابندیاں عاید کرتے ہیں۔ یہ پیش گوئی قطعی اور مطلق کبھی نہیں ہوتی۔ اس میں ساتھ ساتھ کچھ شرائط

بھی لگا دی جاتی ہیں کہ اگر حالات یوں ہوئے تو ممکن ہے یہ واقعہ رونما ہو، اگر حالات یوں نہ ہوئے تو ممکن ہے یہ واقعہ یوں رونما نہ ہو۔ پھر نفسیات دا
علم ہے جو پیش گوئی کے تصور کے علاوہ "پس گوئی" کے تصور سے بھی کام لیتا ہے۔ مثلاً آپ کسی بالغ شخص میں حد سے زیادہ اکڑ فوں یا تکبر دیکھتے ہیں، اس کی
کیفیت کے متعلق پوری اطلاعات حاصل کر کے آپ یہ فرض کرتے ہیں کہ اس شخص کے بچپن میں ضرور ایک دو ایسے واقعات ہوئے ہیں جن کی وجہ سے وہ
کمتری میں مبتلا ہو گیا تھا چنانچہ آپ اس "پس گوئی" کی تصدیق کے لئے اس سے یا اس کے اعزہ و اقارب سے اس کے بچپن کے حالات معلوم کرتے ہیں
واقعات مل جائیں تو یہ پس گوئی صحیح ثابت ہوئی اگر نہ ملیں تو غلط۔ نفسیات کی ایک شاخ جسے ہم بچوں کی نفسیات کہہ سکتے ہیں "پس گوئی کی تصدیق کے عمل ہی
کچھ دیر تو لوگوں نے بلوغت کی کیفیات ہی سے بچپن کے حالات کا اندازہ لگانے کو کافی سمجھا لیکن اس کے بعد ضرورت یہ محسوس ہوئی کہ بچپن کا بھی بر
مطالعہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ برطانیہ اور امریکہ میں کئی جگہ ماہرین نفسیات، بچے کی پیدائش ہی سے نفسیاتی مطالعہ شروع کر دیتے ہیں "تاکہ اگر بعد میں کوئی بچہ ا
بن جائے تو ہمیں اس کے سوانح نویسوں کے تخیل کا رہین منت نہ بننا پڑے" اور اگر وہ کوئی مجرم بن جائے تو دستاویزوں میں اس کا سبب موجود ہ

فطرت کا مطالعہ کسی قدر آسان ہے کیونکہ فطرت ایک خارجی حقیقت ہے اور انسان اس کا خارجی مشاہدہ کرتا ہے لیکن انسان جب انسانی ذہن کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ
اور خود ہی مشہود۔ اس لئے اس کے مطالعہ میں کچھ الجھنیں پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن بعض ماہرین نفسیات ان مشکلات سے بالکل پریشان نہیں ہوئے بلکہ
سے ان کی ہمت اور تجسس کو ایک تازیانہ لگا اور انھوں نے انسانی ذہن کے متعلق بہت نادر اور قیمتی انکشافات کئے۔ فرائیڈ کے بارے میں کہا جا
انسانی ذہن کے متعلق جیسے بھی انکشافات کئے وہ اپنے آپ کے مشاہدات کئے اس نے پہلے اپنے خوابوں کا تجزیہ کیا، اپنی ذہنی بیماریوں کا مطا
مشاہدے سے پیدا شدہ مفروضوں کو اپنے مریضوں پر بھی آزمایا لیکن کچھ ماہرین نفسیات ایسے بھی تھے جنھوں نے ان مشکلات کا حل یہ نکالا کہ ا
مشاہدہ بالکل نہ کرے، بلکہ دوسرے انسانوں کا مشاہدہ کرے اور اس کے ساتھ حیوانوں کا بھی مطالعہ کرے اور جو نتائج اس مطالعے سے مرتب
آپ پر عائد کرے۔ اس طرز فکر کا موجد واٹسن تھا جو طبیعیات اور کیمیا کی چکا چوند سے بہت متاثر تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ نفسیات بھی ستاروں پر کمند پھینک
شاید یہ نہیں جانتا تھا کہ یزداں پر کمند پھینکنے کے لئے پہلا اسلوب مشاہدہ بہتر ہے۔

نفسیات کے لئے مشاہدہ کی وہی شرائط ہیں جو کسی اور سائنس میں ہیں۔ مثلاً یہ کہ مشاہدہ غیر جانبدار اور حتی الامکان تعصب سے ا
لیکن مصیبت یہ ہے کہ ایک ہی عمل کا بار بار مشاہدہ ناممکن ہے کیونکہ قدرت اتنی فیاض نہیں ہے کہ ایک ہی واقعہ کو جوں کا توں دہرائے اس لئے
پڑتا ہے۔ نفسیات میں تجربے کی نوعیت یہ ہے کہ ایک شخص شاہد بنتا ہے اور دوسرا مشہود۔ شاہد یا عامل، معمول کو کوئی خاص کام کرنے کو کہتا ہے
بے معنی آوازوں کو یاد کرے۔ پھر وہ یہ دیکھتا ہے کہ کتنی مرتبہ کی تکرار سے وہ بے معنی الفاظ کی ایک فہرست یاد کرتا ہے۔ اس تجربے سے یہ پتہ چلتا
کے حافظے کی قوت کیسی ہے۔ افراد سے گذر کر اجتماع پر بھی تجربے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی پچاس آدمیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر کے ایک ہی مقام پر
کا موقع دیا۔ اس کے بعد ان گروہوں کو مختلف قسم کے لباس پہنا دیئے۔ ان کے علیحدہ علیحدہ نام بھی مقرر کر دیئے۔ ان کے رہنے کی جگہوں کو مختلف
سے آراستہ کر دیا۔ اس کے بعد ان کے آپس میں پیچ کرائے حتیٰ کہ ان میں باہمی مخالفت اور عناد کے جتنے بھی بیج بوئے جا سکتے تھے بو دیئے۔
ہے کہ پھر یہ لوگ ذرا ذرا سی بات پر لڑ پڑتے ہیں۔ اس قسم کے تجربات سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ تعصب اور عناد کیوں کر پیدا ہوتے ہیں۔ اور کیسے
ہیں۔ اب تو نفسیات کی ہر شاخ میں تجربے ہونے لگے ہیں۔ ولیم جیمز نے کہا تھا کہ نفسیات ابھی سائنس نہیں ہے محض سائنس کی امید ہے لیکن یہ با
اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نفسیات بہت حد تک سائنس بن چکی ہے۔

منٹو بھائی

عطیہ فیضی

کہتے ہیں کہ ایک بار ایک پٹواری کی بڑی چہیتی گھوڑی مر گئی۔ اس گھوڑی کا افسوس کرنے کے لئے دور دراز سے لوگ آئے۔ سات روز تک صفیں بچھی رہیں، پر ایک روز خود پٹواری فوت ہو گیا مگر گھوڑی کی زندگی پر افسوس کرنے والوں میں سے کوئی بھی ماتم پرسی کو نہ آیا کیونکہ بدقسمتی سے اسی روز تحصیلدار کی گھوڑی مر گئی تھی۔

مذکورہ بالا حکایت کا مندرجہ ذیل حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے

بیگم عطیہ فیضی انتقال کر گئیں

مگر صرف عطیہ بیگم ہی فوت نہیں ہوئیں۔

علم و ادب کی ایک صدی بھی ختم ہو گئی ہے۔

فنون لطیفہ کا ایک ادارہ بھی ویران ہو گیا ہے۔

علم و حکمت کی ایک دانش گاہ بھی اُجڑ گئی ہے

مشرق کا ایک افتخار بھی لٹ گیا ہے

برصغیر کا ایک اعزاز بھی چھن گیا ہے۔

۴ جنوری کو کراچی کے ایک ہسپتال میں اتنے سارے المیے ایک دم اور ایک ساتھ کیسے رونما ہو گئے؟ میری محدود علم اور مختصر عمر کی نسل میں سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اسے تو شاید ان حادثات کے رونما ہونے کی خبر اور ان نقصانات کا احساس بھی نہیں ہے۔

اس سوال کا جواب علامہ اقبال، مولانا شبلی نعمانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور قائد اعظم محمد علی جناح جیسی احسان مند ہستیاں کے آنسو ہی دے سکتے تھے۔ عطیہ بیگم کی موت کی قسمت میں نہیں تھے۔

اس سوال کا جواب استنبول کے رئیس حسن علی فیضی دے سکتے تھے جنہوں نے اپنی روشن دماغ بیٹیوں کو مغربی اور مشرقی علم و ادب اور فن کی دولت سے مالا مال کیا وہ غروب آفتاب کی خونی رنگ شفق کا منظر نہ دیکھ سکے۔

اس سوال کا جواب سلطان عبدالحمید دے سکتے تھے جنہوں نے اپنے ہاتھ سے عطیہ بیگم، خواتین کا سب سے بڑا اعزاز "شفقت نشان" عطا کیا تھا مگر وہ بانی شفقت نشان کی قبر پر پھول نہیں چڑھا سکتے۔

اس سوال کا جواب ہیڈل برگ، میونک، لندن اور کیمبرج کی وہ علمی ادبی اور ثقافتی مجلسیں دے سکتی تھیں جو کہ روح رواں عطیہ بیگم تھیں اور جن محفلوں میں فلسفے اور قوموں کے فلسفے، شاعری، موسیقی اور مصوری پر بحث کی جاتی تھی یہی مجلسیں تھیں جن سے علامہ اقبال نے فکر و نظر کی گہرائی اور گیرائی، لطافت، گداز اور گرمی خیال کی گرانمایہ

کا اب عطیہ بیگم کی کتاب "اقبال" اور عطیہ اور اقبال کے چند خطوط کے سوا اللہ کوئی نشان باقی نہیں رہا۔

اس سوال کا جواب فکری رجحانات کی انقلابی تبدیلیوں کے سوال کا جائزہ لینے والے وہ ماہرینِ ادب دے سکتے ہیں جنہیں جاننا چاہیئے کہ لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
لکھنے والے بانگِ درا کے مصنف اقبال کو پیامِ مشرق اور جاوید نامہ کا خالق علامہ اقبال کس نے بنایا، اور مولانا شبلی جیسے علم و فضل کے بوجھ تلے دبے ہوئے انتہائی سنجیدہ مفکر
فارسی کی انتہائی شگفتہ غزلیں لکھنے پر کس نے مجبور کیا۔ مگر یہ ماہرین گندے اور ناپاک جنسی ہیکنڈوں سے مسموم فضا میں عورت اور مرد کے درمیان جسمانی رشتے کے علاوہ ا
تعلق کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اس سوال کا جواب مولانا شبلی کا وہ مضمون ہی دے سکتا ہے جس میں عطیہ بیگم کو پرستش کے لائق قرار دینے میں صرف ایک رکاوٹ محسوس کی گئی تھی اور وہ یہ کہ ا
میں خدا کے علاوہ اور کوئی پرستش کے لائق نہیں۔ مگر یہ مضمون شبلی کی حیاتِ معاشقہ کے مصنف کی .... قدر ناشناسی اور احسان فراموشی کی نذر ہو گیا۔

اس سوال کا جواب امریکہ کی وہ دانش گاہیں دے سکتی ہیں جہاں بیگم عطیہ نے مشرقی تہذیب و ثقافت پر وہ لیکچر دیئے یا پھر پیرس کی سوربون یونیورسٹی
عطیہ بیگم کے لیکچرز علمی خزانے میں نوادر کی حیثیت سے محفوظ ہیں مگر ہماری دانش گاہیں ان علمی خزانوں سے محروم ہیں۔

اس سوال کا جواب بمبئی کا لاکھوں کی مالیت کا ایوانِ رفعت دے سکتا ہے۔ جسے عطیہ بیگم قائد اعظم کے ایک اشارے پر قربان کر کے کراچی تشریف لے آئیں
یہاں انہوں نے وطن میں نیا "ایوانِ رفعت" قائم کیا جو عالموں، سیاست دانوں، ادیبوں اور فن کاروں کا مرکز بن سکتی تھا۔ مگر آج کراچی کا ایوان بھی بمبئی کے ایوان کی طرح ویران ہے

اس سوال کا جواب قربانی کا وہ جذبہ دے سکتا ہے جس کے تحت عطیہ بیگم نے ۱۹۵۷ء میں اپنا تمام اثاثہ حکومت پاکستان کے حوالے کر دیا تھا مگر قربانی کے ا
جذبے کی کوئی قدر و قیمت ہمارے دلوں میں نہیں ہے۔

اس سوال کا جواب وہ مائیں دے سکتی ہیں جو اپنی بچیوں کا نام عطیہ محض اس امید پر رکھتی تھیں کہ ان میں عطیہ بیگم کی صفات کی کوئی جھلک آ جائے، مگر وہ
بھی اب قصۂ پارینہ بن چکی ہیں۔

اس سوال کا جواب بارٹرنڈ رسل شاید ہی دے سکتے تھے جنہوں نے مشرق کو عطیہ بیگم جیسی عظیم خاتون پیدا کرنے پر خوش قسمت قرار دیا تھا۔
خوش قسمتی سے مغرب کا یہ عظیم دانشور جو کسی کی تعریف کرنے میں انتہائی کنجوس تصور کیا جاتا ہے۔ آج اس دنیا میں نہیں ہے ورنہ وہ اس مشرق کی اس نسل
ضرور بدقسمت قرار دیتا جو صدر کینیڈی کے قاتل اوسوالڈ کو قتل کرنے والے جیک روبی کے بارے میں عطیہ بیگم سے زیادہ معلومات رکھتی ہے۔ موت بہت ظالم
مگر اتنی ظالم نہیں جتنی احساسِ زیاں سے محرومی!

(بشکریہ "اخبارِ جہاں")

افضل منہاس

(نذر شکیبؔ)

○

خوں بھرے ہاتھوں کو جانے کون آکر دھو گیا
ایک چہرہ سرخ پانی کی تہوں میں کھو گیا

چار جانب سے لگے پتھر تو ٹوٹی شاخ شاخ
پیڑ یوں گھائل ہوا، زخموں سے دُہرا ہو گیا

پہلے موجوں کی فصیلیں ہر طرف تھیں مُستعد
ایک کشتی ڈوبتے ہی کیوں سمندر سو گیا

دام جب پھیلے ہوئے دیکھے زمیں پر چار سُو
ایک طائر آسماں کی وسعتوں میں کھو گیا

ایسی پتھرائی ہوئی آنکھیں کبھی دیکھی نہ تھیں
جس نے بھی جا کر انھیں دیکھا وہ پتھر ہو گیا

میں نے رو رو کر پڑھی ہے آخری اس کی غزل[1]
جس کو سوچا تک نہ تھا وہ حادثہ بھی ہو گیا

آج سرگودھا کی مٹی کتنی افضل ہو گئی
اُس کے دامن میں شکیبؔ ایسا سخنور سو گیا

[1] مطبوعہ فنون

ملیت اور ابتذال کے اس اُمڈتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھنے کے لئے شکیب کی توانا اور صحت مند آواز اُبھری اور لفظوں کے جادوئی کے بعد معرضِ زوال میں آنے والی غزل کے سنبھلنے کے امکانات واضح ہونا شروع ہوئے اس دور کے متعلق جناب احمد ندیم قاسمی کی اس رائے میں بڑا وزن ہے کہ "اگر اس دور میں شکیب جیسا شاعر پیدا نہ ہوتے تو یہ ممکن تھا کہ اردو غزل ایک دم دو سو سال پیچھے چلی جاتی اور آئندہ نسل میں اس کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہتا۔ شکیب کی غزل نے اردو شعر و ادب کے قاری کو بتایا کہ غزل کو بیسویں صدی کے نصف آخر کا ایک باشعور ذہن کس طرح غزل کہہ سکتا ہے اور ایسی غزل کہہ سکتا ہے جس میں عصرِ رواں کی روح بول رہی ہو اور جو اس کے باوجود غزل ہو۔"

جہاں تک غزل کے روایتی فنی لوازمات کا تعلق ہے شکیب کے ہاں ایسے کسی فنی انحراف یا بغاوت کی مثال نہیں ملتی لیکن اس التزام کے باوجود روایتی غزل کے پرستاروں کو شکیب کی غزل یقیناً مایوس کرے گی۔ وہ اس لئے کہ انہیں یہاں نہ تو پرانے موضوعات کی تکرار ملے گی اور نہ ہی لب و رخسار، زلفِ عنبریں کا گل و بلبل کا شکوہ گریہ یا، گل و بلبل کی بھرمار۔ شکیب کے ہاں ان سب چیزوں کی تلاش سعیِ لاحاصل کے مترادف ہے۔ روایتی غزل کے پرستاروں کے لئے میرے پاس وہی جواب ہے جو نامور مفکر برٹرانڈ رسل نے اپنی اولین کتاب کی اشاعت کے وقت اپنے معترضین کو دیا تھا جب جبران کی کتاب "پاگل" شائع ہوئی تو دنیائے ادب میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ جبران کی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو نظر انداز کر کے اسے پاگل ٹھہرایا گیا۔ منفی تنقید کے اس بپھرے ہوئے اور بے ہنگم طوفان میں جبران کی آواز گونجی :

"میں اس دور کے ہر باشعور فرد سے پچاس پچاس گز اونچا ہوں "

یہی بات شکیب کی غزل کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ اس وقت جبکہ بحیثیت مجموعی غزل تقلید کی زد میں ہے شکیب یقیناً اپنے ہم عصر غزل گو شعراء میں پچاس پچاس گز اونچا نظر آتا ہے اور یہ کیفیت اس منفرد طرزِ احساس کی مرہونِ منت ہے جو اسے ودیعت کی گئی تھی اس وقت جبکہ نظریات میں ہم آہنگی اور نصب العین کا فقدان دل کو کشمکش اور بیزاری کے ایک عجیب سنگم پر لے آیا تھا۔ شکیب نے اسے بے کیف اور بے رنگ فضاؤں سے نکالنے کی بھرپور جدوجہد کا آغاز کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا نام تخریب کے دور میں تعمیر کی علامت بن گیا۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے جدید دور کا محاسبہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے "جدید شاعری کا آہنگ انجنوں کے شور کے مترادف ہے" انجنوں کا شور دراصل صنعتی انقلاب اور اس کے پس منظر سے ابھرنے والے ان گنت اور پیچیدہ مسائل کی طرف لے جاتا ہے مشینی دور کے مسائل آج کے انسان کا سب سے بڑا المیہ ہیں اور کوئی بھی شعور رکھنے والا انہیں نظر انداز کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن جہاں تک اردو غزل کا تعلق ہے اس کے دروبست بدلے بغیر نیا اسلوب کر کے افکار کے اظہار کے لئے استعمال کرنا کچھ آسان نہیں تھا اس کے لئے غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کی ضرورت تھی جو بد قسمتی سے بہت کم جدید غزل گو شعراء کو میسر تھی۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ جب آغاز میں اردو غزل نے میکانکیت کے پس منظر سے ابھرنے والے مسائل کو سمونے کی کوشش کی تو اس کی روایتی رومانیت، غنائیت اور دھیما پن، بوجھل بھاری بھرکم اور ثقیل الفاظ سے الجھ کر اپنا سوتی ہی ترتیب کھو بیٹھا۔ غزل میں مشینی دور کے مسائل کو نبھانے کا تجربہ ناکام رہا تو غزل کے مخالفین نے ایک بار پھر اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صدائے احتجاج بلند کی۔ غزل پر پے در پے حملوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر غزل گو شعراء نے تھک ہار کر قدیم متغزلین کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ وہ سن یا کسی روایتی اور صدیوں پرانی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گئے۔ کسمپرسی کے اس دور میں شکیب نے غزل میں کامیاب تجربے کئے اور اس کا تر و تازہ ذہن ایسے اشعار کی تخلیق میں کامیاب رہا جن کا آج کے جیتے جاگتے انسان کی روز مرہ زندگی اور اس کے داخلی اور خارجی مسائل سے گہرا ربط و ضبط ہے۔ شکیب کے ان اشعار پر غور کیجئے۔ ظاہری حیثیت کے لحاظ سے قطعی مختلف ہوتے ہوئے بھی یہ اشعار غزل ہی کے اشعار ہیں شکیب کے مخصوص اسلوبِ فکر نے غزل کو ایک نیا پیرہن بخشا ہے ؎

ملبوس خوشنما ہیں مگر جسم کھوکھلے　　چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دکان پر

ہر موڑ پر ملیں گے کئی رہزن شکیب　　چلیے چھپا کے غم بھی زر و مال کی طرح!

اس شورِ تلاطم میں کوئی کس کو پکارے　　کانوں میں یہاں اپنی صدا تک نہیں آتی

کب سے ہیں ایک حرف پہ نظریں جمی ہوئی　　وہ پڑھ رہا ہوں جو نہیں لکھا کتاب میں

سماجی سطح پر یہ میکانکی دور ہزاروں برس پرانی اخلاقی قدروں کے زوال کا دور ہے۔ آج دنیا کی آبادی پہلے سے کہیں زیادہ ہے اور تیز رفتاری کی وجہ سے فاصلے سمٹ آئے ہیں لیکن جہاں تک تنہائی کے احساس کا تعلق ہے وہ پہلے سے کہیں زیادہ کربناک ہے۔ آج کا انسان ایک دوسرے سے ہوتے ہوئے بھی کوسوں دور ہے۔ جب ہم شخصی غم کے علاج کے لئے گہما گہمی کے امڈتے ہوئے سیلاب میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ راز آشکار ہوتا ہے بازاروں اور گلیوں میں رینگنے والے یہ انسان محض سائے ہیں۔ شکیب کے ہاں جب یہی تاثر شعر کے سانچوں میں ڈھلتا ہے تو اجتماعی محسوسات کا امین

یہ آدمی ہیں کہ سائے ہیں آدمیت کے　　گزر ہوا ہے مرا کس اُجاڑ بستی میں

زمانہ ملتفت لوگوں کی عیب جوئی کا　　انہیں تو دن کا بھی سایا دکھائی دیتا ہے

مگر دفعتاً شکیب کی سوچ کے دھارے بدلتے ہیں اور وہ ایک تلخ حقیقت کی طرف بھرپور اشارہ کرتا ہے۔ یہ تلخ حقیقت ہوتے ہوئے بھی مضطرب احساس بخشتی ہے اور اس طرح جذباتی دھچکے کا اثر بڑی حد تک کم ہو جاتا ہے:

بٹ سکے ہیں پڑوسی کسی کا درد کبھی　　یہی بہت ہے کہ چہرے سے آشنا ہے کوئی

بس ایک رات ٹھہرنا ہے کیا گلہ کیجئے　　مسافروں کو غنیمت ہے یہ سرائے بہت

جہاں شجر پہ لگا تھا تبر کا زخم شکیب　　وہیں پہ دیکھ لے کونپل نئی نکلنے لگی

مجموعی طور پر شکیب کی غزل میں یاسیت کا عنصر زیادہ ہے لیکن یہ رجحان قنوطیت کی سرحدوں کو نہیں چھوتا۔ شکست خوردگی پیدا نہیں کرتا۔ شکیب کے ہاں اتنی دیر نہیں کہ روشنی دب جائے۔ قاری ان شعروں کو پڑھنے کے بعد وہی تاثر قبول کرتا ہے جو موسمِ گرما کی چلچلاتی ہوئی دھوپ اور جھلسا دینے والی لو میں سیاہ بادلوں کے چھا جانے سے کرتا ہے۔ شکیب اپنے قاری کو یہ امید بندھاتا ہے کہ یاسیت کے یہ بھیانک اور تاریک بادل باران رحمت کی نوید

ادھر سے بارہا گزرا مگر خبر نہ ہوئی　　کہ زیرِ سنگ خنک پانیوں کا چشمہ تھا۔

وہ دوریوں کا رہِ آب پر نشاں کھلا　　وہ رینگنے لگی کشتی وہ بادبان کھلا

وہاں پہنچ کے گرائیں گے بادباں اب تو　　وہ دور کوئی جزیرہ دکھائی دیتا ہے

جب بھی نکلا ستارۂ امید　　　　کہر کے درمیان سے نکلا

کیوں رو رہے ہو راہ کے اندھے چراغ کو　　　　کیا بجھ گیا ہوا سے لہو کا شرار بھی

شکیب کی غزل محض ریزہ خیالی نہیں بلکہ اس کی غزل کے بکھرے ہوئے شعروں میں ایک مربوط نظریۂ حیات ملتا ہے۔ شکیب کے نزدیک زندگی ایک مسلسل حرکت ہے۔ اسی چیز کے فقدان کو وہ موت کا نام دیتا ہے۔ اسی فلسفے کی رو سے ایک مردہ انسان کا متحرک نام بھی زندگی کی علامت اور ایک زندہ کی غیر متحرک زندگی موت کی دلیل بن جاتی ہے۔ شکیب کے ہاں کسی مخصوص منزل کا حصول ایک نئے سفر کا پیش خیمہ ہے:

اتر کے ناؤ سے بھی کب سفر تمام ہوا　　　　زمیں پہ پاؤں دھرا تو زمین چلنے لگی

ان فاصلوں کے دشت میں رہبر وہی بنے　　　　جس کی نگاہ دیکھ لے صدیوں کے پار بھی

عرصۂ حیات پر پھیلے ہوئے سایے مہیب ہونے لگتے ہیں تو شکیب کی آواز ایک نئے زاویے سے ابھرتی ہے وہ علائم و رموز کے سہارے وہ بات بڑی آسانی سے کہہ جاتا ہے جو سب کے دلوں کی آواز ہے:

پھر ہوا سے سلگ اٹھے پتے　　　　پھر دھواں گلستاں سے نکلا

رستہ بھی واپسی کا کہیں بن میں کھو گیا　　　　اوجھل ہوئی نگاہ سے ہرنوں کی ڈار بھی

کیا جانیے منزل ہے کہاں جاتے ہیں کس سمت　　　　بھٹکی ہوئی اس بھیڑ میں سب سوچ رہے ہیں

ان مشکل حالات میں شکیب کی سوچ شکست قبول نہیں کرتی بلکہ ایک نئے عزم کے ساتھ کروٹ لیتی ہے:

ہم ابھرے بھی ڈوبے بھی سیاہی کے بھنور میں　　　　ہم سوئے نہیں شب ہمہ شب سوچ رہے ہیں

ٹھوکر سے میرا پاؤں تو زخمی ہوا ضرور　　　　رستے میں جو کھڑا تھا وہ کہسار ہٹ گیا

علامتیں شکیب کی غزل کی آبرو ہیں۔ جہاں تک اردو غزل میں علامتوں کے استعمال کی روایت کا تعلق ہے شکیب نے اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جدت کا ثبوت دیا ہے۔ شکیب کی علامتیں الفاظ کے حقیقی مفہوم اور ان کے تاثر کو مجروح نہیں کرتیں بلکہ قاری کے ذہن میں موجود کسی خاکے کے نقش و نگار کو واضح کر دیتی ہیں۔ نئی نسل کے شعرا جنسی جذبے کے اظہار کے لئے علامتوں کا جو مضحکہ خیز اظہار کر رہے ہیں شکیب نے اس کے خلاف بھرپور احتجاج کیا اور اشعار سے یہ ثابت کر دیا کہ غزل میں علامتوں کا صحت مندانہ استعمال سوچ کے نئے دروازے کھول سکتا ہے۔ اس لحاظ سے میں شکیب کو جدید اردو غزل میں صحت مند علامت پسندی کا محرک کہوں گا۔ شکیب کی اسی منفرد خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی نے "فنون" میں لکھا تھا "شکیب کا سب سے موثر ہتھیار اس کی علامتیں ہیں۔ شکیب کے سمبلوں میں نہ وہ ابہام ہے کہ چھوڑو تو بھول جائیں، نہ وہ جدت (برائے جدت) کہ شاعر حسن آفرینی کی ذمہ داری سے الگ ہو کر صرف چونکا دینے کے لئے گرانمایہ ہو سکے۔ یہ سمبل قاری کے ذہن میں ایک مکمل تصویر لے آتے ہیں اور اس تصویر کے پس منظر میں چھپا ہوا خیال یا جذبہ پورے حسن سے جگمگا اٹھتا ہے"

اگرچہ شکیب کے ہاں علامتوں کی بہتات ہے لیکن اُس کے اشعار میں دو علامتیں بار بار اُبھرتی ہیں۔ یہ علامتیں "صحرا" اور "پانی" سے عبارت ہیں۔ شکیب کی شاعری میں موجودہ مادی دَور کی پیدا کردہ گھٹن اور فرد کی بے بسی کے اظہار کے طور پر اُبھرتی ہے اور پانی کی علامت تی و دق صحرا میں تلاش کی علامت بن جاتی ہے۔ ان علامتوں میں نہ صرف شاعر کا ذاتی احساس تنہائی سمٹا ہوا نظر آتا ہے بلکہ ان کے پس منظر میں آج کے ہر انسان کا اپنا وجود جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے:

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے　　مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے

عجب نہیں جو اُگیں یاں درخت پانی کے　　کہ اشک بوئے ہیں شب بھر کسی نے دھرتی میں

وہ کون تھا جو تمہارا سراغ پا نہ سکا　　کہ میں تو اپنے ہی صحرا کے پار جا نہ سکا

گزری ہے بار بار مرے سر سے موجِ خشک　　اُبھرا ہوں ڈوب ڈوب کے تصویرِ آب میں

جینے کے ساتھ موت کا ڈر ہے لگا ہوا　　خشکی دکھائی دی ہے سمندر کو خواب میں

ترقی پسند تحریک کے آغاز میں اردو شاعری پر جو اعتراضات ہوئے ان میں سے مجتبیٰ حسین کا اعتراض سب سے زیادہ چونکا دینے والا ہے کہ "اردو میں سنہ ۱۹۳۶ء کے بعد شاعری نے سوچنا چھوڑ دیا۔" اس اعتراض نے مجھے اکثر اردو کی قدیم شاعری میں سوچ کے عنصر کی تلاش پر اُکسایا ہے۔ دھارے چوٹی، کمر، زلف، مانگ، لب، ناف وغیرہ سے بھٹکتے ہیں تو پھر مجتبیٰ حسین کا اعتراض فی الواقع صحیح ہے۔ اس اعتراض کی ضرورت غالباً یوں ہوئی جب فلسفیانہ خیالات کے زیرِ اثر غزل کی شعریت کے مجروح ہونے کا خدشہ پیدا ہوا۔ چونکہ غزل کی صدیوں پرانی روایت میں یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اجنبیت کا احساس فطری بات تھی۔ غالب کے سے قادر الکلام شاعر نے غزل کی تنگی کا شکوہ شاید اسی لئے کیا ہوگا کہ ذہن کی عمیق سلوٹوں میں پلنے والے افکار کا اظہار غزل میں اُن کے لئے ممکن نہیں تھا۔ خیال اور اظہار کی درمیانی خلیج کو پاٹنے کے لئے اجتہاد کی ضرورت تھی اور اس اجتہاد سے ذہنوں کا دوچار ہونا گزیر تھا۔ شکیب کی غزل میں خیال اور اظہار کے درمیانی بُعد کو سمیٹنے کا عمل بڑا واضح ہے۔ وہ عہد حاضر کے فلسفیانہ خیالات کو اپنے شعر میں بڑی خوبصورتی سے منتقل کرتے ہیں۔ بوجھل خیالات کے باوجود ان کی شاعری کہیں بھی معمہ بنتی نظر نہیں آتی یا ان کے فلسفیانہ اشعار اتنے بوجھل نہیں ہوتے کہ ان پر گنجلک ہونے کا گمان ہونے لگے۔ رمزیت و اشاریت جو بنیادی شعری حسن ہے شکیب کے ہاں ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ شکیب کے شعر میں جب فلسفیانہ خیالات کو سموتا ہے تو ان کا رنگِ تغزل کچھ اور بھی نکھرنے لگتا ہے۔ انسانی روح کا سراپا ذہن و فکر کے لئے ایک معمہ بنا ہوا ہے۔ شاید ہمیں شکیب کے خیال سے اتفاق نہ ہو لیکن اس ضمن میں اُس کا نقطہ ہمیں سوچنے پر مجبور ضرور کرتا ہے:

کب تک رہے گا روح پہ پیراہنِ بدن　　کب تک ہوا اسیر رہے گی حباب میں

یا پھر ان اشعار پر غور کیجئے:

یہ کون بتائے عدم آباد ہے کیسا!　　ٹوٹی ہوئی قبروں سے صدا تک نہیں آتی

عالم میں جس کی دھوم تھی اُس شاہکار پر   دیمک نے جو لکھے کبھی وہ تبصرے بھی دیکھ

کیا کہوں دیدۂ تر یہ تو مرا چہرہ ہے   سنگ کٹ جاتے ہیں بارش کی اگر دھار گرے

ان اشعار کی روشنی میں شکیب کی شاعری منطقی استدلال کی شاعری کے طور پر اُبھرتی ہے۔ شکیب کے آخری دور کی غزلوں پر اس نظامِ فکر کی خاص طور پر بہت نمایاں نظر آتی ہے لیکن یہاں بھی شعر و ادب کی جمالیاتی قدروں کا مکمل احترام ہے اور کہیں بھی کھردرے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ شاید اسے

تیشے کا کام ریشۂ گل سے لیا شکیب   ہم سے پہاڑ کاٹنے والے بھی ہیں کہیں

تشبیہیں، استعارے اور کنائے اردو غزل کی روایت کا خاص جزو ہیں۔ شکیب نے عصرِ جدید کے بیشتر شعراء کی طرح اس روایت سے انحراف نہ کیا بلکہ اس کے دامن کو وسیع کرنے کے لئے نئے استعاروں اور کنایوں کا استعمال بڑی چابکدستی کے ساتھ کیا ہے۔ بخصوصاً جاندار تشبیہیں شکیب کا خاص ہیں۔ ان اشعار پر ایک لمحے کے لئے غور کیجیے۔ شاعر کے ذہن میں جھلملانے والا تصور ایک تصویر کی شکل میں آپ کی نگاہوں کے سامنے اُبھرنے لگے گا:

اک یاد ہے کہ چھین رہی ہے لبوں سے جام   اک عکس ہے کہ کانپ رہا ہے شراب میں

اک یاد ہے کہ دامنِ دل چھوڑتی نہیں   اک بیل ہے کہ لپٹی ہوئی ہے شجر کے ساتھ

وہ اس کا عکسِ بدن تھا کہ چاندنی کا کنول   وہ نیلی جھیل تھی یا آسمان کا ٹکڑا تھا

ہوا نے توڑ کے پتا زمیں پہ پھینکا ہے   کہ شب کی جھیل میں پتھر گرا دیا ہے کوئی

شکیب کی غزل میں منظر نگاری خاص طور پر دیدنی ہے:

وہی جھکی ہوئی بیلیں وہی دریچہ تھا   مگر وہ پھول سا چہرہ نظر نہ آتا تھا

قریب تیر رہا تھا بطوں کا اک جوڑا   میں آبجو کے کنارے اداس بیٹھا تھا

وہ الوداع کا منظر وہ بھیگتی پلکیں   پسِ غبار بھی کیا کیا دکھائی دیتا ہے

منظر کو دیکھ کر پس منظر بھی دیکھیے   بستی نئی بسی ہے پرانے کھنڈر کے ساتھ!

شکیب کی غزل ایک غیور اور خوددار انسان کی غزل ہے۔

مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں پہ گروں   جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

خوددار ہوں کیوں آؤں درِ اہلِ کرم تک   کھیتی کبھی خود چل کے گھٹا تک نہیں آتی!

رگ کہتے ہیں کہ شکیب نے خودکشی کرلی۔ اختلاف کا حق محفوظ رکھتے ہوئے میں اس خیال سے اتفاق نہیں کروں گا۔ میرے نزدیک انسان کی موت ایک حادثے کا نتیجہ تھی۔ اس حادثے کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے؟ — یہ ایک الگ سوال ہے۔ شکیب کی بے وقت پس منظر سے واقف ہوتے ہوئے بھی میں اس بحث میں نہیں الجھوں گا مجھے تو صرف یہ کہنا ہے کہ شکیب کا انجام اس کی موت سے بہت غزل میں جھلکنے لگا تھا:

فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں — حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

لہو لہو ہوں سلاخوں سے سر کو ٹکرا کر — شکیب باب قفس کیا کھولوں کس آن کھلا

اُڑ کر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر — تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

مجھی چٹان پھسلتی گرفت جھولتا جسم — میں اب گرا ہی گرا تنگ و تار گھاٹی میں

غزل کی نشاۃ الثانیہ کے بعد اس کے دورِ زوال کے آغاز میں پروفیسر حمید احمد خاں نے غزل سے متعلق اپنے ایک پُرمغ لکھا تھا، متمدن دنیا پر ایک ہزار سال کی فرمانروائی کے بعد غزل آج تنقید کے دربار میں جواب دہ ہے۔" میں پورے وثوق اور اعتم کہہ سکتا ہوں کہ اگر شکیب کو جو بقول احمد ندیم قاسمی غزل کی "امید گاہ" ہے، تنقید کے دربار میں طلب کیا جائے تو غزل شرمندہ نہیں ہو

انور سدید

ایک اور شہید

جب بھی کسی ادیب کے مرنے کی خبر آتی ہے میرا دل یکبارگی دھڑک کر خاموش ہو جاتا ہے۔ شریانوں میں دوڑتا ہوا سیال لہو رکتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے میری اپنی زندگی کے درخت سے ایک پتا سوکھ کر نیچے گر گیا ہے۔ ہر ادیب کی موت سوچ کے ایک ناویے پر مہر سکوت ثبت کر دیتی ہے۔ حسن کی جستجو اور سچائی کی تلاش کا ایک سلسلہ رک جاتا ہے۔ ایک سقراط زہر کا جام تھام لیتا ہے اور ایک منصور سولی پر چڑھ جاتا ہے۔

شاد امرتسری بھی ایک سقراط تھا جس نے برسوں سے زہر کا جام ہاتھ میں تھام رکھا تھا اور وہ دنیا سے اپنے دکھوں اور غموں کا انتقام لینے کے لئے اس زہر کا قطرہ قطرہ اپنی شریانوں میں اتار رہا تھا۔ شاد امرتسری وہ منصور تھا جو ہر شام سولی پر چڑھتا اور ہر صبح ہنستی مسکراتی زندگی کا سواگت کرنے کے لئے بیدار ہو جاتا ___ لیکن کل ایک ایسا ہیبت ناک لمحہ آیا کہ وہ حسب معمول سولی پر چڑھا تو سولی اسے چاٹ گئی۔ اس کی رگوں میں زہر تو برسوں سے دوڑ رہا تھا لیکن کل اس زہر نے کالے سانپ کا روپ دھارا اور اس کے دل ہی کو ڈس لیا۔

بارہ اکتوبر کی صبح کتنی سوگوار تھی!

میں انگریزی اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کا ایک ایک گوشہ قتل و غارت، چوری اور ڈکیتی، اغوا اور عصمت دری، ریاست اور سیاست کی چٹپٹی خبروں سے منور تھا۔ اسی اخبار کے ایک گوشے میں لاوارث لاشوں کا ایک چھوٹا سا قبرستان بھی ہے۔ نئی قبروں پر پھول چڑھانے کے لئے میں روزانہ اس قبرستان کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتا ہوں لیکن اس روز میرا دل اداس تھا اور فرار حاصل کرنے کے لئے میں موٹی موٹی سرخیوں کے تحت ان میں کھو کر اس قبرستان کو بھول گیا تھا۔ شام کو ڈاکٹر وزیر آغا سے ملاقات ہوئی تو وہ بے طرح پریشان تھے۔

"سنا تم نے ___ شاد امرتسری ....."

یہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی لیکن میں مفہوم سمجھ گیا۔ پھر سجاد نقوی اور نسیم شمائل پوری آئے اور وہ بھی خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ہم سب ایک دوسرے کے غم میں شریک تھے۔

شاد امرتسری کئی دنوں سے بیمار تھا۔ اس کے پاؤں سوج گئے تھے اور وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ شاید کثرت سے نشی رنگ لائی تھی کہ اس کا جگر اپنا بنیادی کام کرنے سے عاری ہو چکا تھا۔ ابھی چند روز ہوئے میں لاہور گیا تو خواجہ بشیر سے شاد کا پوچھا کہنے لگے "حیدرآباد سے آگیا ہے۔ صعیف ہو رہا ہے۔ اسے مزدور کر جاتا ہے۔ کوئی پتہ نہیں کب ہمیں چھوڑ جائے۔"

میں اسے ملنے کے لئے دل محمد روڈ والے مکان پر چلا گیا۔ بیماری نے اسے نڈھال کر رکھا تھا لیکن آنکھوں میں چمک تھی۔ پوتن اندر گھر پڑی تھی اور زندگی کی بشاشت اس کے چہرے پر پوری طرح سے افروز تھی۔ مجھ کو دیکھا، کھلکھلا کر ہنسا اور کہنے لگا: "میں نے توبہ کر لی ہے۔ اب پوری کیسوئی سے علاج کروا رہا ہوں۔ بس

ذرا ٹھیک ہو لوں تو سرگودھے آؤں گا۔ وہاں سے اکٹھے آغا صاحب کے فارم پر چلیں گے۔"

پرسوں شاد امرتسری کی بیماری اسے ادھ موا کر چکی تھی اور وہ پوری طرح صحت یاب ہو چکا تھا لیکن وہ پروگرام جو اس نے میرے ساتھ بنایا نہیں چڑھ سکا وہ اس سے پہلے ہی ایک اور لمبے سفر پر روانہ ہو چکا تھا اور جاتے جاتے پیغام دے گیا کہ:

ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کرے گی دنیا

اس روز میں ابھی سو رہا تھا کہ ساتھ کے کمرے میں زور کا چھناکا ہوا اور کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ ساتھ ہی پہلے بیوی کی زوردار آواز گونجی۔ پھر منجھلے بچے کی سنائی دی۔ میں ہڑبڑا گیا تھا اور اس قیامت کو دیکھنے کے لئے دوسرے کمرے کی طرف دوڑا۔ معلوم ہوا کہ بچے نے بلور کا ایک جگ توڑ ڈالا ہے اور بیوی نقصانِ مایہ پر برس رہی ہیں کہ حادثے کی اطلاع پڑوس میں ہو جائے اور شماتتِ ہمسایہ کی تقریب ضائع نہ ہو۔ میں نے کہا "بیگم! جگ ہی ٹوٹا ہے کوئی گیا۔ اس مار دھاڑ اور چیخ پکار کا فائدہ؟"

"رو کر کہنے لگی: "آپ کو کیا پتہ، یہ جگ مجھے نسرین نے تحفہ دیا تھا، جو اب اس دنیا میں نہیں!"

مجھے واقعی پتہ نہیں تھا کہ یہ جگ بیوی کو کیوں عزیز تھا لیکن اس شام جب سوگوار اور مغموم وزیر آغا نے مجھے "داغِ فراق" کا وہ نسخہ دکھایا جس کے اولیں ورق پر شاد امرتسری کے دستخط ثبت تھے تو مجھے پتہ لگ گیا کہ بچھڑ جانے والوں کے تحفے کیوں اتنے عزیز ہوتے ہیں۔

"داغِ فراق" کے سرورق پر شعلوں میں لپٹی ہوئی ایک دوشیزۂ جمال کا چہرہ ہے جس کی مغموم آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ شاد اسی دوشیزہ کی آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک آنسو تھا۔ یہ لڑکی اس کے دھیان کی سطح پر ابھری اور ایک لمحے میں اپنی چھب دکھا کر اوجھل ہو گئی اور اسے آوارگی کے صحرا میں چھوڑ گئی۔ شاد امرتسری کی ساری زندگی کا سرمایہ اسی لڑکی کی یاد ہے جس کے تعاقب میں دکھوں سے چور، زخموں سے معمور، شکستہ آرزوؤں سے ناآسودہ تمناؤں سے ہمکنار وہ تمام عمر سرگرداں رہا۔ اس البیلی چھب اور نیاری شوبھا والی لڑکی کا تعارف اس نے یوں کرایا ہے:

لمبی چوٹی والی لڑکی جس کی آنکھیں کالی ہیں
اس کے گورے گال اور بھوری آنکھیں دیکھنے والی ہیں
خود کالج میں پڑھتی ہے اور بچوں کی استانی ہے
موسیقی کی رسیا ہے اور شعروں کی دیوانی ہے
شعروں اور نغموں کی دھنیں وہ اکثر خود ہی بناتی ہے
مجھ سے ملنے آتی ہے تو اپنی دھنیں سناتی ہے
گاتے گاتے وہ میری آنکھوں کو تکتی رہتی ہے
میرا دل یہ کہتا ہے وہ دل کی باتیں کہتی ہے
گا تا گا کر پھر وہ ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے
اور پھر مجھ سے بائرن شیلے کیٹس کی باتیں کرتی ہے

اسے احساس تھا کہ:

محبت اک سفر ہے تند خو دریا کی موجوں کا
یہ موجیں اپنے سینوں میں کر ڈوبتی تنکوں کو

جنم دیتی ہیں خود ہی توڑتی ہیں حیلہ سازی سے
کرشمے پھوٹتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں رہ رہ کر
مگر موجیں کہ جن کی برق پائی برق رفتاری
چٹانوں کی سلوں کو ریزہ ریزہ کرتی رہتی ہیں

وہ ساری عمر اس تند خو دریا کی تیز موجوں سے سر ٹکراتا رہا۔ اسی مجبت نے اس کے ذوقِ تجسس کو ابھارا اور نروان کی تلاش میں جستجو کے راستے پر یا۔ تلاش شاد امرتسری کی شاعری کا محور ہے۔ اس تلاش میں اس کے تلوے راستے کے خاروں سے چھلنی ہو جاتے ہیں۔ ہمت ساتھ چھوڑ دیتی ہے بنتِ عنب کا سہارا لے لیتا ہے:

بزمِ گیتی سے بھاگنے والو   ٹھہرو ٹھہرو شراب باقی ہے

ب اس کے دکھوں کا مداوا بنتی ہے تو وہ خود فراموشی کے عالم کو قائم رکھنے کے لئے زندگی کی موم بتی کو دونوں سے جلا دیتا ہے اور بے تحاشا ا ہے اور بالآخر اپنی آگ میں خود ہی جل جاتا ہے۔ مرنے کو تو وہ اسی روز مر گیا تھا جس روز کالی زلفوں والی لڑکی ایک جاوداں لمحے کو سے کر اس کی زندگی کو سوگوار کر گئی تھی لیکن جسم و جان کا رشتہ بہرحال برقرار رہا اور سانس کی آمد و شد جاری رہی اور وہ فلک شگاف لگا کر کہتا رہا:

شاد امرتسری کو دیکھئے گا   اک نہ اک دن شہید سے ہوگا

میں نے انگریزی اخبار پھر اٹھا لیا ہے۔ پانچویں صفحے کے قبرستان میں ایک نئی قبر تعمیر ہوئی ہے جس پر کوئی کتبہ نہیں۔ میں اس قبر کی مٹی کو رہا ہوں مجھے اس سے شاد امرتسری کی خوشبو آ رہی ہے اور میرے آنسو بہہ رہے ہیں اور بہتے ہی جا رہے ہیں۔

دیویندر اِسّر

پاپ آرٹ — اِشتہار یا نئی حقیقت پرستی؟

پھلوں کے رس اور سوپ کے ڈبے، کوکا کولا، وہسکی اور بیئر کی بوتلیں، مارلن منرو کی تصویریں، کومکس، اشتہاری بورڈ اور روزمرہ کے استعمال کی بے شمار چیزیں اور مختلف رنگ جب کینوس پر ایک مخصوص انداز اور توازن (اور غیر متوازن انداز) سے یکجا کر دیئے جائیں تو یہ پاپ (POP) آرٹ ہے۔

کوکا کولا کی بڑی بڑی بوتلیں، کئی فٹ لمبے سوپ کے ڈبے (مصوّر: اینڈی وارہول) ۲۹۶ فٹ لمبی اور ۱۰ فٹ اونچی تصویر (مصوّر: جیمز روزن کوئسٹ) اور ریت میں گھاس کاٹنے والی مشین (مصوّر: کلیز اولڈن برگ) پاپ آرٹ کے ہی تو نمونے ہیں۔

جدید دور اشتہار کا دور ہے۔ روزمرہ کی ضرورت اور غیر ضروری سی چیزوں کے بڑے بڑے اشتہار بڑے پیمانے پر نشر و اشاعت کے ذرائع سے ہر وقت ہماری نظر کے سامنے جھلملاتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے احساس و فکر کے لازمی اجزا بن چکے ہیں۔ ان اشیا کی تصویریں ہمارے ذہن میں نئے نئے نمونوں اور نئی نئی علامتوں کو جنم دیتی ہیں۔ بس اسٹاپ اور ریلوے اسٹیشنوں پر، بازاروں اور عام گزرگاہوں پر ہر جگہ بڑے بڑے اشتہار ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اس کشش کے جادو سے بچنا مشکل ہو گیا ہے۔ فلم اسٹاروں کی بڑی بڑی نیم عریاں اور شہوت انگیز تصویریں، کوکا کولا (سافٹ ڈرنکس) کی بڑی بڑی بوتلیں، ٹیوبوں میں ٹوتھ پیسٹ، صابن، پاؤڈر، سوپ اور رس اور آرائش و زیبائش کی طرح طرح کی پرکشش چیزیں۔ ہر شے پہلے اشتہار بن کر ہماری نظر کا مرکز بنتی ہے۔ ایک بڑی شکل اختیار کر کے — اور پھر ان چیزوں کے تصورات ایک دوسرے میں شامل ہو کر ہمارے ذہن میں کئی طرح کے پیٹرن (PATTERN) کا روپ دھار لیتے ہیں۔ پاپ مصوّر ان کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ کچھ نقاد پاپ آرٹ کو فن اشتہار بازی ہی کی ایک شکل قرار دیتے ہیں۔

کیا پاپ آرٹ اشتہاری فن ہے؟ شاید پاپ مصوّر بھی اس سے انکار نہیں کرتے کیونکہ یہ دور اشتہار کا دور ہے۔ اشتہاری بورڈ، اخبار، رسالے، ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم وغیرہ نے اشتہار کو فن کا درجہ دے دیا ہے۔ پاپ فن کاروں نے ان سب سے اور کومکس، فوٹوگرافس اور سپر مارکٹ اور ٹریڈ مارک سے اپنے موضوعات اور انداز حاصل کیا ہے۔ اس آرٹ نے اپنے تصورات کو ہر دلعزیز تجارتی اور اشتہاری آرٹ سے حاصل کئے ہیں۔ اس لئے پاپ آرٹ ایک ایسا طرزِ فن ہے جو فنون لطیفہ سے کسی حد تک مختلف ہے کیونکہ یہ روزمرہ کی اشیا کو ہی فن کا مواد بناتا ہے یا ان کو فن کی سطح پر لا کر پیش کرتا ہے۔ ان کو فن کی تمثیل تسلیم کر کے ان کی پرستش کرتا ہے۔

جب بھی پاپ آرٹ کی کوئی بھی نمائش ہوئی آرٹ کی دنیا میں ہلچل پیدا ہو گئی اور اس کے حق اور مخالفت میں دلیلیں پیش کی جانے لگیں۔ ایسی ہی ہلچل اس وقت پیدا ہوئی تھی جب دادازم اور سرریلزم اور کیوبزم کے مداح فن کاروں نے آرٹ کی دنیا میں سنسنی پیدا کر دی تھی۔ پاپ آرٹ نے بھی دادازم اور سرریلزم سے انسپریشن لی ہے اور ان سے متاثر ہو کر حقیقت کو نئے روپ اور معنی میں منعکس کرنے کی کوشش کی ہے اس لئے اسے نئی حقیقت پرستی، نیا آرٹ، نیا دادازم یا نیا سرریلزم، کا پیش رو تسلیم کیا گیا ہے کیونکہ پاپ آرٹ حقیقت اور رومان کا ایک نیا امتزاج پیش کرتا ہے۔

آرٹ کی دنیا میں دو رجحان مختلف سمتوں میں جاری ہیں۔ ایک رجحان ہے فنون لطیفہ کا اور دوسرا مقبول عام فن کا جس کو ماس کمیونی (MASS COMMUNICATION) اور ماس پروڈکشن (MASS PRODUCTION) سے بڑی تقویت ملی اور انہی کے عکس نئے آرٹ میں ملتے ہیں۔ اس کا انسپریشن فنون لطیفہ نہیں اشتہاری کلچر ہے۔ یہی باعث ہے کہ کچھ نقادانِ فن اسے آرٹ کی مملکت سے جلا وطن کرنے پر مصر ہیں۔ محض اس لئے نہیں کہ پاپ آرٹ اشتہار ہے یا حقیقی اشیا کا مجموعہ، بلکہ اس لئے کہ اس میں مصور کی کوئی ذہنی یا جذباتی شمولیت نہیں کیونکہ میکانکی از سرِ نو تشکیل کی غیر ذاتی تکنیک کا استعمال کرتے ہیں۔

ان فن کاروں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کمرشل فن کار رہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو فنون لطیفہ کے ماہر ہیں۔ جیسا کہ جاسپر جانس لیکن نقادوں میں اس بات پر اختلاف رائے ہے کہ جاسپر جانس پاپ آرٹسٹ ہے یا نہیں، البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پہلا فن کار ہے جس نے فن کاروں کو کچھ اشیا کی عکاسی کی قید سے آزاد کیا۔ اس نے بتایا کہ فن کا مواد کوئی بھی شے ہو سکتی ہے۔ نہ صرف رنگوں اور خطوط کے توازن تک ہی محدود نہیں۔ جاسپر جانس اور رابرٹ روشن برگ پاپ آرٹ کے صفِ اول کے فن کار سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ انڈی وارہول، رائے لکسٹن سٹائن، جیمز روزن کوسٹ، کلاس اولڈن برگ اور ٹوم ویسلمین جیسے مشہور فن کار بھی اس گروہ میں شامل ہیں اور اس تحریک کے پیروکار آج ہر ملک میں موجود ہیں۔

ان فن کاروں کی تصویروں سے صاف واضح ہے کہ پاپ آرٹ کیا ہے لیکن صحیح نہیں کہ پاپ آرٹسٹ حقیقی اشیا کو ہی ان کی اصل شکل میں پیش کرتے ہیں، چاہے وہ سوپ کا ڈبہ ہو یا کسی ماڈل لڑکی کی تصویر (شاید کبھی زندہ ماڈل بھی کینوس پر آ جائے) یا بیئر کی بوتل یا یہ کہ وہ ان اشیا ہی کو فن کا کام سمجھتے ہیں۔ پاپ آرٹ تو اشیا کی ماس کمیونی کیشن کی تمثیلوں پر مبنی ہے۔ ان تمثیلوں سے حقیقت کا نیا احساس پیدا ہوتا ہے جو خارجی چیزوں ہی کی طرح حقیقی ہے یا اُس سے بھی زیادہ سچا۔ اس لئے ان کے نزدیک سامان خارجی دنیا کی اشیا سے زیادہ حقیقت کا شعور دے سکتا ہے۔ خاص کر اس حالت میں جبکہ پہلے جذبات اور خیالات دقیانوسی روایت بن چکے ہیں۔

پاپ آرٹ کوئی منظم تحریک نہیں۔ ان فن کاروں کا کوئی مشترکہ منشور نہیں۔ ان سب نے آزادانہ طور پر اپنا کام شروع کیا۔ وہ ایک دوسرے سے اپنے مزاج، نقطۂ نظر، پسند، صلاحیت اور طرزِ فن میں مختلف ہیں لیکن ان سب میں کچھ ایسی باتیں مشترک طور پر ملتی ہیں جن کے باعث وہ پاپ آرٹسٹ مانے جاتے ہیں۔ ان میں اظہار اور طرز کا تنوع ہے۔ مثلاً جیمز روزن کوسٹ کے فنی نمونے دیکھئے۔ ان کے نزدیک اشیا کے مکمل روپ بجائے ان کے اجزا یا حصوں کے زیادہ اہم ہیں۔ اس کی ایک بہت بڑی تصویر کی ٹھوڑی اور پیشانی میں اکیس فٹ کا فاصلہ ہے۔ اس تصویر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ چہرہ عجیب جغرافیہ بن گیا ہے اور ناک یوگوسلاویہ کے نقشے کی طرح دکھائی دیتی ہے اور ہم بڑی بڑی صورتوں میں اشیا کے صرف ٹکڑے ہی دیکھتے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ ہم زندگی کی مکمل تصویر نہیں دیکھ پاتے بلکہ ان کے کچھ ٹکڑوں کو ہی دیکھتے ہیں۔ اگر ہم کسی آسمانی قوت کے باعث زندگی کا مکمل اور جامع روپ دیکھ سکیں تو شاید فن کی تخلیق ہی ختم ہو جائے۔ روزن کوسٹ نے اپنی تصویروں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پاپ آرٹ کمرشل آرٹ کی نقل یا بازگشت نہیں بلکہ کامل تمثیلی تخلیق ہے۔ یہ آرٹ کا نیا بعد ہے۔ اس نے فنون لطیفہ اور کمرشل آرٹ کی حدوں کو مٹا دیا ہے اور ایک نئے طرزِ فن کو جنم دیا ہے۔

ماس کمیونی کیشن اور اشتہار کے اس دور میں پاپ آرٹ کی تحریک ناگزیر تھی۔ یہ جدید سرمایہ پرست دور کی پیداوار ہے۔ اس نے آرٹ کی دنیا کو نئے موضوعات اور مواد اور اشکال سے روشناس کرایا ہے۔ ایک نقاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس وقت سوال یہ نہیں کہ کیا پاپ آرٹ عظیم آرٹ ہے بلکہ یہ ہے کہ کیا یہ آرٹ اس دور کے نازک جذبات، شعور اور ماحول کی نمائندگی کرتا ہے یا نہیں یا یہ کہ اس فن کا مواد اور موضوع اور تکنیک فن کے نقطۂ نظر سے موزوں اور جائز ہیں یا نہیں۔ پاپ آرٹ کمتر فن نہیں، اس کی کوئی آخری قدر متعین نہیں کی جا سکتی۔ یہی کیا کم ہے کہ پاپ آرٹ نے انسانی پہلو کو پھر سے

اہمیت دینا شروع کر دیا ہے۔ لیو نرمن کے قول کے مطابق پاپ آرٹ میں وہی انسانی اقدار موجود ہیں جو کسی امن مورچے یا ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف اور بکیوں سے دہشت زدہ دنیا کے خلاف احتجاج اور بغاوت میں ہے۔

پاپ آرٹ کی پرورش شہری تہذیب میں ہوئی ہے۔ شہری اثرات ہی اس تحریک کا سرچشمہ ہیں اس لئے اس کی معنویت سے انکار نہیں لیکن کئی پاپ فن کار، اس تکنیک کو محض سنسنی پھیلانے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور وہ اس فن کی کافی مضحکہ خیز صورتیں پیش کرتے ہیں جن میں شور زیادہ ہے اور معنی کی گہرائی کم۔ ان کا فن سماجی تنقید یا طنز کے ناکام اور غیر دلچسپ نمونے پیش کرتا ہے۔ جیرالڈ نوز لینڈ نے پاپ آرٹ پر اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ غیر مربوط اشیا کو ایک دوسرے سے جوڑ دینا فن کی تعمیری تخلیق کے لئے کافی نہیں۔ فن کار کو یہ اشیاء اس طرح دیکھنے والے کو ان کے ایک دوسرے کے ساتھ آنے سے تحیر اور تسکین کا احساس ہو۔ اگر ہمارے فن کی تخلیق خارجی شعور کے لئے انسانی احساس کے لئے ہوتی ہے جیسا کہ میں مانتا ہوں، تو پاپ آرٹ حقیر آرٹ ہے کیونکہ اس پر لفظی خیالات حاوی ہیں۔ اس میں ہمدردی اور تنقید نہیں اور طور یا بلاغ کی خوبی سے عاری ہے۔

پاپ آرٹ ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ تہذیب کے موجودہ لمحے میں زندہ رہنے سے کیا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس تہذیب کے ثبوت کا محض ہے۔ اس کا سماجی اثر صرف یہی ہے کہ ہم بجائے حقیر اور غیر شائستہ دنیا سے سمجھوتا کر لیں، جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کا اثر اشتہاری فن ہے۔ بلنٹ کی نظر میں یہ ایک ایسا سمجھوتا ہے جسے آج سب سے زیادہ رد کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی ایک راستہ ہے جس سے فن اور خود زندگی عام تمثیلوں اور ریاکارانہ تجارت سے بچایا جا سکتا ہے۔

پاپ آرٹ کا شور ہر سو سنائی دے رہا ہے۔ اس کے کئی مداح بھی ہیں اور کٹر مخالف بھی۔ خطرہ یہ ہے کہ پاپ آرٹ نئی حقیقت پرستی میں کمرشل فن کا شکار ہو کر نہ رہ جائے اور جدیدیت کے نام پر سنسنی پھیلانے کا سٹنٹ ثابت نہ ہو۔ اس لئے ایسے فن کاروں سے بچنے کی ضرورت ہے جو وفادار نہیں اور نہ ہی سنجیدہ ہیں۔ جو محض نقالی پر اپنا کاروبار چمکائے ہوئے ہیں۔ اس صورت میں اس فن کی رو میں کبھی نئے سنجیدہ اور نمائندہ فن کی نشوونما ہو سکتی ہے جو اپنے دور کی زندگی اور فن میں ایک نیا توازن اور ربط قائم کر سکے گا۔

هدایت اللہ اختر

کشمیری فنون پر عربی اور ایرانی اثرات

طلوعِ اسلام سے قبل ہندوستان کی طرح کشمیر ہم رنگ معاشرے کی دولت سے محروم ضرور تھا لیکن کشمیریوں کے محنتی اور جفاکش ہو
میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہرگز نہیں۔ کشمیریوں کی جفاکشی اور جاں فشانی ہی کا نتیجہ تھا جس نے ہندستان اور ہندوستان کے ملک بوس پہا
کے دامنوں میں اشوک اور بدھ مت کے پرچار کے لئے دیوہیکل مت تراشے، مندر کھڑے کئے اور بڑی بڑی چٹانوں پر تختے تراش کران پر
کندہ کر ڈالے جنھیں ریت کے طوفان اور باد وباراں کے تھپیڑے نہ مٹا سکے اور جو آج بھی کشمیریوں کے فنِ تعمیر کا پتہ دیتے ہوئے چین کی سرحد
تک بکثرت ملتے ہیں کشمیری فن کار جب تیشہ لے کر پہاڑ پر چڑھتے تو یہ پہاڑ ہوتا اور جب اترتے تو پہاڑ دیوتاؤں کی آماجگاہ میں تبدیل ہوگیا ہوتا
یہی عالم پانی کے تہہ خانوں میں تھا۔ جھیل وولر کی تہوں میں سلطان زین العابدین بڈشاہ نے جب غوطہ خور بھیج کر مندروں کا کھوج لگایا تو
کی تہہ میں کئی ایک مندر اور کتنی ہی مورتیاں برآمد ہوئیں یہ سب کشمیریوں کے فنِ گراں بہا کے نمونے تھے۔ بعد ازاں اس جگہ کے درمیان ایک
کھڑی کردی گئی جس کا نام "زینہ لنک" تھا۔

کشمیریوں نے ظہورِ اسلام سے پیشتر سنگ تراشی، مصوری، رقص وموسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ میں جو کمال حاصل کر رکھا تھا وہ زیا
ہندو دھرم، سنیاس، سادھنا اور ترکِ دنیا کی جانب بہت زیادہ مائل تھا۔ لیکن اسلام کے مبلغ اور عرب کے جفاکش جب اس خطہ حسین
وارد ہوئے تو انھوں نے اس ملک کے محنت کشوں کو ایک حقیقت سے آشکار کردیا کھیتی باڑی کے ڈھنگ سکھائے صنعت وحرفت سے روشنا
کرایا۔ فنون کے عروج اور تجارت کے اصول بتائے۔ ہندوستان، ایران، افغانستان اور عرب ممالک سے رابطے قائم کئے۔ برہمنوں
اقتدار علم چھینا اور تعلیم ہر فرد پر لازم کردی۔ دیوتاؤں کی زبان سنسکرت ان کھنڈروں میں دفن ہوتی گئی جنھیں کشمیریوں نے کندہ کیا تھا
اس کی جگہ فارسی نے لے لی اور کشمیر کی مقامی زبان کشمیری کے لئے رسم الخط بھی فارسی ہی سے لیا گیا۔ مندروں کی جگہ مسجدوں نے لی ا
بت تراشی ختم ہوگئی مسجدوں کی دیواروں پر قرآن کی آیات کندہ ہونے لگیں۔ شعر و نغمہ پر بھی ایرانیت چھاگئی۔

مصوری میں شہزادوں اور پری زادوں کی تصاویر کی بجائے خوبصورت بیل بوٹے بلنے لگے اور خطاطی ہونے لگی۔ تلوار کے پھلو
توپ کے دھانوں اور خنجروں کے دستوں پر جہاں خونخوار درندے اور برہنہ راکھشس بنائے جاتے تھے، پھول پتیاں کندہ کی جا
لگیں اور عربی حروف میں اشعار صیقل ہونے لگے۔ ان میں زر و جواہر سے مرصع ہتھیار مثلاً خنجر، زرہ، کٹار، خود، تلوار، جو اثرات
ہیں ان سے ایرانی سلاحِ جنگ کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ لباس میں ڈھیلا فرغل، سر پر پگڑی، ٹانگوں میں شرعی پاجامہ، کاندھے پ
ہند و مسلمان سبھی یہی لباس اپنانے لگے کہیں کہیں کٹر ہندو لنگوٹی میں نظر آتے ہیں ورنہ کشمیر کا ٹھیٹھ لباس اوپر بیان کردیا گیا ہے اور یہی

کا قومی لباس ہے جو قطعی طور پر قدیم ایران سے ملتا ہے۔ عربی اور ایرانی تمدن کے اپنائے جانے پر ساگ پات کی جگہ ک
اور گوشت کے پکوان اب تک خاص طور پر ایرانی اور عربی چلے آتے ہیں جس طرح عرب ایک ہی تھال پر بیٹھ کر کھاتے ہیں
کی قالین اور گدوں پر نشست ہوتی ہے بالکل وہی طور طریق کشمیریوں کے ہیں غرضیکہ کشمیری معاشرے کے جس شعبے کا تجزیہ کیا جا
پتہ چلتا ہے کہ کشمیر نے زندگی کے ہر شعبے میں عربی تمدن اور ایرانیت کو اپنایا ہے اسی لئے کشمیر کو ایران صغیر بھی کہا جاتا ہے۔ افغان عہد حا
صنعت کا یہ عالم تھا کہ یہاں کی بنی ہوئی شالیں، افغانستان، ایران، ترکستان اور روس تک جاتی تھیں۔

جارج فاسٹر اپنے [illegible] کے سفرنامے میں کہتا ہے کہ کشمیر میں نہ صرف شمالی ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں سے آ
اور تجارت پیشہ لوگ نظر آتے ہیں بلکہ تاتار، ایران اور ترکی کے سوداگر بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں جو خوب پیسہ کمانے کے ساتھ ساتھ
اور دلکش مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

کشمیر کی مشہور لل دید شومت کی پیرو ایک درویش خاتون تھی جو وحدت الوجود کے فلسفہ کی قائل تھی۔ حضرت شاہ ہمدانؒ کی کشمیر میں
سیرت خاتون نے اسلام کی تعلیمات کو اپنایا۔ وادی میں اسلام کے آغاز کا اثر یہ تھا کہ لل عارفہ کا صوفیانہ کلام جسے اس نے کشمیری زبان کا
بچہ بچہ کی زبان پر آ گیا اور اس کے دوہے گوشے گوشے میں گائے جانے لگے کشمیری عوام شروع شروع میں فارسی اور عربی سے نابلد تھے
کشمیری تھی لیکن شاہ ہمدانؒ کے ہمراہ آئے ہوئے سات سو مبلغین اور معلمین نے بڑی جلدی کشمیری زبان میں مہارت حاصل کی اور اسی ز
بنا کر کشمیریوں کو عربی، فارسی اور ترکی الفاظ و تراکیب سے روشناس کرا دیا، آہستہ آہستہ سنسکرت جو سرکاری زبان تھی متروک ہو گئی ا
میں اسلامی علوم اور اسلامی تعلیمات کا عروج شروع ہو گیا۔

یہ دور کشمیری شاعری کا دور اول کہلاتا ہے۔ اور اس دور کے نمائندوں میں ہشتی کنمٹ، لل عارفہ اور شیخ نور الدین ولی قابل ا
مغل عہد کی آمد آمد تک کئی عرب اور کتنے ہی ایرانی فاضل سرزمین کشمیر میں آکر اپنے علم کا کمال اور حکمت کے موتی بکھیر چکے تھے
نے تاریخ رشیدی کشمیر ہی میں لکھی۔

امیر فتح اللہ شیرازی خوراک کی بے اعتدالی سے بیمار ہوئے اور [illegible] میں سری نگر میں انتقال ہوا اور کوہ سلیمان پر دفن
شہنشاہ اکبر اعظم کو امیر کی وفات سے بہت صدمہ ہوا ابوالفضل فیضی نے مرثیہ لکھا :

> دگر ہنگام آں آمد کہ عالم از نظام افتد
> جہاں عقل را در نیم روز علم شام افتد

[illegible] سری نگر ہی میں اکبر نے جمال الدین حسین انجو کو فارسی میں لغت مرتب کرنے کو کہا۔ یہ فرہنگ اکبر کے زمانے میں ش
عہد جہانگیری میں مکمل ہوئی۔ بارہ برس کی محنت نے تمام قدیم شعراء کے کلام میں سے تمام تر الفاظ یکجا کئے گئے۔ تزک جہانگیری میں د
جمال الدین حسین انجو کو شہنشاہ نے "عضد الدولہ کا لقب دیا اور جمال الدین حسین انجو بہار کے گورنر ہوئے"

اس طرح ملا محمد علی کاشمیری کشمیر سے احمد نگر آ گئے پہلے نظام شاہی میں ملازم رہے۔ پھر سلطان برہان الملک کے دربار سے و
عبدالرحیم خانخاناں کو متاثر کیا چنانچہ خانخاناں نے عربی کی مشہور کتاب "علامۃ العلما خواجہ حسین الدین" کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔ ا
کشمیری جہانگیر کے دربار سے وابستہ تھے۔ ملا محمد یوسف کشمیری ہمدانی ایک مشہور شاعر اور انشاپرداز تھے۔ ملا یوسف ایک نامور سپاہ

مشہور عالم محمد صادق کشمیری کے بھائی تھے، جو طبقات شاہجہانی کے مصنف تھے۔ غرضیکہ ایران اور کشمیر کے باہمی روابط نہ صرف مذہبی اور روحانی بلکہ علمی اور لسانی بھی تھے، کیونکہ ایران اور کشمیر کے مذہبی، روحانی اور ثقافتی ربط و ضبط کا ذریعہ فارسی زبان تھی، جو وسط ایشیا کی سب سے عظیم علمی اور تہذیبی زبان تھی۔

کشمیریوں نے نہ صرف اسے اپنایا بلکہ غنی کشمیری جیسے نامور شعرا پیدا کئے جن سے ایران کے مشہور شعرا صائب اور کلیم فارسی اشعار کا مفہوم سمجھنے کشمیر آتے تھے۔

یہی عالم موسیقی کا ہے کشمیری مغنی اپنے کمال کی وجہ سے اتنی شہرت رکھتے تھے کہ اکبر جیسے جلیل القدر بادشاہ کے دربار میں ہندی، ایرانی، تورانی اور تان سین جیسے باکمال ہنرمند مغنیوں کے ساتھ وہ بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں چونکہ ہندی موسیقار کثرت سے تھے اس لئے کشمیری مغنی ان کی صحبت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ ان کشمیری مغنیوں نے اپنے وطن واپس آکر جب ہندوستانی راگ راگنیاں بیان کیں تو کشمیری موسیقی ہندی اور ایرانی موسیقی کے اشتراک سے ایک جدید قالب اختیار کرتی چلی گئی

اکبر اعظم سے ڈیڑھ صدی قبل زین العابدین بڈشاہ شہنشاہ کشمیر نے ملا عودی اور ملا جمیل جو علم موسیقی میں صاحب تصانیف اور کئی راگ راگنیوں کے بانی تھے، خراسان سے بلوائے اور ان کو انعامات سے سرفراز کیا۔ ایران کی راگنیاں جو کشمیر کے سازندوں اور مطربوں نے اختیار کرلیں۔ ان کے نام ساگاماست، نوا، نے ریز چوراغ وغیرہ ہیں۔

محمد ایوب اولیاء

برٹش میوزیم میں ایشیائی مخطوطات کی نمائش

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم نے جس دور آزمائش میں یہ شعر لکھا تھا وہ واقعی ابتلا اور ذہنی کشمکش کا زمانہ تھا — یہ ایک غلام طبقے کے خلاف رجز تھا — اپنی محرومیوں اور حسرتوں کو دل پذیر انداز میں بیان کرنے کا ذریعہ تھا — اب کہ الحمد للہ ہم آزاد اور خود مختار ہیں وہ گرفت اور گداز ان قدر سے کم پایا جاتا ہے جو اس کے زمانۂ تحریر میں تھا — اب بھی لاکھوں، کروڑوں مسودے مخطوطے، شاہی فرامین، شبیہیں، قلمی تصویریں اور کتابیں یورپ کے عجائب گھروں اور لائبریریوں میں موجود ہیں لیکن ہم ان کی بازیابی کے لئے وہ واویلا اور رنگ کہ جو تقسیم ملک اور حصول آزادی سے قبل ہمارا نعرہ تھا — شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ع

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

ہمارے دل میں دکھوں شکائتیں اور ہزاروں تلخیاں ہی کیوں نہ ہوں لیکن اس بات سے کسی منصف کو بھی انکار نہ ہوگا کہ جس طرح یورپین اقوام انگریزوں نے ہمارے علمی ذخائر اور قلمی و ادبی شہپاروں کی نگہداشت اور حفاظت کی ہے وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی — اس بات کی میوزیم میں ایشیائی مخطوطوں کی نمائش واضح اور مناسب طور پر دے سکتی ہے ؎

غنی! روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن ... کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

لندن کے رسل سکوئر میں لندن یونیورسٹی سے گزریں تو سامنے برٹش میوزیم کی عظیم اور جہازی عمارت پڑتی ہے۔ اس کے شمالی دروازے ہو کر آگے بڑھیں تو کنگز روم آتا ہے جس میں یہ نمائش ترتیب دی گئی ہے — اس کا آغاز سامی حروف تہجی اور رسم الخط سے ہوتا ہے۔ جس کے PALAEO عبرانی، سامری، آرامی، پہلوی، مینڈے اِک، سیریاک اور عربی وغیرہ زبانیں آتی ہیں۔ اس کیس میں پہلا مخطوطہ چھٹی صدی قبل مسیح کی زبان میں دیکھا جا سکتا ہے جو خاص طور کی جیز ہے اور بائول کے طالب علم کے لئے نہایت دلچسپی کا باعث ہے۔ اس کے بعد عربی زبان مروجہ عربی زبان دراصل شمالی عربی ہے۔ جو NABATAEANS لوگوں کے حروف تہجی سے اختراع کی گئی تھی۔ یہ لوگ کوہ سینا کے شمال مشرق میں رہائش پذیر تھے۔ قدیم ترین عربی نسخہ جو NABATAEANS رسم الخط میں پایا جاتا ہے، ۲۹۰ء بعد از مسیح کا ہے۔

دراصل اہل عرب تحریر میں بہت کم دلچسپی لیتے تھے۔ اور اس کرۂ ارض پر وہ واحد مثال ہیں جو از حد لسان اور زبان دان اور دانا ہوتے ہوئے بھی گونگا ان پڑھ تھے — عربی شعراء جو دوسری اقوام کو عجمی یعنی گونگا سمجھتے تھے، اپنی نظمیں زبانی ۔۔۔ زندہ الفاظ سے دوسرا

تھے اور یہی وجہ ہے کہ ہر شاعر اپنے ساتھ دو راویوں کو رکھتا تھا تاکہ وہ اُن کے کلام کو ازبر کر سکیں۔ مگر اسلام کی عالمگیر تحریک اور مذہب نے ان کو فنِ خطاطی سے روشناس کرایا۔ چونکہ اسلام میں انسانی مصوری کی ممانعت تھی اس لئے مسلم خطاطوں اور کاتبوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو حسنِ قلم پر صرف کیا۔ اور دو سو سال سے بھی کم عرصہ میں وہ اس فنِ شریف میں اس قدر مشاق اور ماہر ہو گئے کہ آج تک ان کا کوئی مثیل و ہمسر نہیں۔ تحریر کی تزئین و آرائش کے لئے بہت سے انداز وضع کئے گئے جن میں مکی، مدنی، کوفی اور بصری خط خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

سنہ ۷۵۰ء میں جب بغداد میں عباسیوں کی خلافت قائم ہوگئی تو فنِ خطاطی اسلامی فنونِ لطیفہ میں سے نمایاں ترین سمجھا جانے لگا۔ اس دور کے مشہور خوش نویس ابنِ مقلہ، ابن البواب اور یاقوت تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں اعلیٰ پایہ کے خطاط پیدا ہوئے۔ افریقہ کا خطِ مغربی بھی اپنے جلو میں اپنی تمامتر رعنائیاں رکھتا ہے۔

عربی زبان کا قدیم ترین قلمی نسخہ جو یہاں دیکھا جا سکتا ہے وہ PAPYRUS کے پتوں پر لکھا ہوا پاسپورٹ ہے۔ بھیڑ کے چمڑے کی جلد پر لکھا ہوا قرآنِ کریم کی رسم الخط میں ہے۔ اس کے علاوہ خطِ نسخ اور دیگر اسالیب میں بھی لکھے ہوئے قرآن کریم کے نسخے قلب و نظر کو تازگی بخشتے ہیں۔

فارسی زبان اور خطِ نستعلیق میں لکھے ہوئے ادب پارے اپنی نظیر آپ ہیں۔ یہاں روغنی مجلد خمسہ نظامی خطِ نستعلیق میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ نایاب نسخہ چالیس ہزار پونڈ مالیت کا بتایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں دیوانِ خاقانی (نسخ میں)، دیوان سلمان ساوجی (نستعلیق میں) اور عشق وامق و عذرا از نامی خطِ شکست میں لکھے ہوئے موجود ہیں۔

اردو کا قلمی نسخہ رتن سین اور پدماوتی کا عشق از ہنس بھی آپ یہاں دیکھیں گے جو اٹھارویں صدی عیسوی میں خطِ نسخ میں لکھا گیا تھا۔ پنجاب کا جغرافیہ پنجابی گورمکھی میں، ہولی بائبل ملتانی زبان اور رسم الخط میں، گجراتی میں دی ٹسٹامنٹ، مراٹھی زبان میں بیتال پچیسی بھی آپ کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گی۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور کی تصنیف پالی پراکرت کا کلکتہ کا چھپا ہوا بنگالی زبان میں نسخہ بھی یہاں رکھا ہے جو ۱۷۷۸ء میں طبع ہوا۔ اٹھارویں صدی کا لکھا ہوا بنگالی میں مہا بھارت کا نسخہ بھی قابلِ قدر ہے۔

علاوہ ازیں ترکی، ملائی، پشتو، سندھی اور اردو کے مخطوطے عربی خطِ تحریر میں لکھے ہوئے موجود ہیں، جو اعلیٰ انسانی ذوق، محنت اور لگن کی غمازی کرتے ہیں۔

یہ تو رہی افقی رسم الخط کی بات ——— اب آیئے ذرا عمودی خطِ تحریر کا جائزہ لیں جس کے تحت چینی اور جاپانی زبانیں آتی ہیں۔ چینی طرزِ تحریر کی ابتدا سادہ تصویروں کے ذریعے ہوئی جو زندگی کی روزمرہ کی چیزوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ یہ زیادہ طور پر اسما ہوتے تھے فعل کے لئے دو اشاروں یا نشانوں کو مجتمع کرنا پڑتا تھا جس سے کسی کام کا ہونا پایا جاتا تھا۔ اس بات سے اس زبان کے اشکال کو سمجھا جا سکتا ہے ہزاروں قسم کے اشاروں تصویروں اور ان ملی ہوئی شکلوں کو یاد کرنا پڑتا ہے ——— جاپانی گو بنیادی طور پر اس زبان سے مختلف ہے۔ بایں ہمہ جاپانیوں نے رسم الخط چینیوں سے مستعار لیا ہے اور بعد کو اس میں ایزاد و ترمیم کی ہے۔ چینی خط میں سب سے پرانی تحریر ایک ہڈی پر دیکھی جا سکتی ہے جو ایک ہزار سال قبل مسیح کی ہے۔ اور جاپانی زبان کی ٹائپ میں چھپی ہوئی (متحرک بلاک کے ذریعہ) سترھویں اور اٹھارویں صدی کی کتابیں بھی آپ یہاں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

قاضی عبدالقادر

تجریدی مصوری اور تفہیم کا مسئلہ

(۱)

مصوری، صورت گری، مجسمہ سازی اور سنگتراشی کی یہ کم نصیبی رہی ہے کہ فنونِ لطیفہ کی ان اصناف پر تنقید مصوروں اور مجسمہ سازوں کی ماہرینِ نفسیات، ادیبوں اور شاعروں کے ہاتھوں میں رہی جو اپنی تنقیدوں اور تبصروں میں اپنے منتخب میدان کے خیالات اور تصورات لے آئے منطق سے، ریاضی سے، نفسیات و تحلیلِ نفسی سے، ادب و شعر سے۔ اور اس طرح فنی تنقید یعنی صورت گری کی مختلف اصناف پر تنقید کو سائنسی، فلسفیانہ، نفسیاتی، ادبی اور شاعرانہ بنا دیا گیا۔

افلاطون سے لے کر جان ڈیوی اور کولنگ وڈ تک سوائے دو ایک کے ایسی مثالیں نہیں ملتیں جہاں خود مصور بھی نقاد ہو۔ میری مراد لیونارڈو، ری پال کلے سے ہے۔ یہ مصور بھی تھے اور نقادِ فن بھی۔ ان کے علاوہ ایسی قابلِ ذکر مثال نہیں ملتی جہاں ایک اچھا نقاد اعلیٰ درجہ کا مصور بھی ہو، یا ایک بلند ایک اچھا نقادِ فن بھی ہو۔ ہمیں سروکار دوسرے درجہ کے مصور نقادوں سے نہیں جن کی تعداد یقیناً خاصی ہوگی۔ انھوں نے نہ ہی تو فن کو کچھ دیا اور نہ تنقید کیا، اگر کچھ دیا بھی ہے تو وہ اختلالِ ذہنی سے مختلف نہیں۔

مصوری اور تجریدی مصوری کے بارے میں جو خیالات ایک عرصے سے پھیل رہے ہیں اور فنونِ لطیفہ کے اس پہلو پر ایک مدت سے جو بحث ہو رہی ہے اس کی تاریخ نصف صدی سے زیادہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہی خیالات اب اس ملک میں پھیلتے نظر آ رہے ہیں اور یہاں بھی اس گفتگو کا آغاز انھی سے ہوا ہے جو خود مصور نہیں اور اسی سبب سے مصوری کے مقصد، تصویر اور مجسمے کی غرض و غایت، اور "معنی و مفہوم" کے بارے میں جو کچھ ایک مختلف عالمِ تخلیق میں رہ کر کہا گیا ہے جو کسی اعتبار سے مصوری و صورت گری پر منطبق نہیں ہوتا۔

واقعہ تو یہ ہے کہ مصوری پر یہ بحث، موضوعِ بحث سے عدمِ واقفیت کی صورت میں ہوئی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی یہ کہے کہ یہ ساری گفتگو بے غلط نہ ہوگا۔ صورت گری پر تنقید کے پیچھے یہ تصور ہے اور غالباً اس پر سب متفق ہیں کہ فن یا مصوری ایک لسان و زبان ہے اور چونکہ زبان افہام ذریعہ ہے اور خود اس کی تفہیم بھی ممکن ہے۔ لہٰذا اگر کسی تصویر میں یہ دو قولی عنصر نہ ہو یا کم ہو تو اسی اعتبار سے وہ تصویر کم اہم، بے معنی اور بے مد تجریدی مصوری پر جو اعتراضات ہوتے رہے ہیں اسی خیال کے تحت ہوئے ہیں کہ وہ سمجھ میں نہیں آتی۔ غرض روایتاً مصوری لسان و ابلاغ سمجھی جاتی رہی ہے لیکن یہ روایت نادرست بنیادوں پر استوار ہوئی ہے۔ مجھے بہرحال اس تصور کو قبول کرنے میں تامل ہے کہ مصوری ایک ز اس سے قبل کہ اس تصور پر تنقید کی جائے مناسب یہ ہے کہ خود اس تصور کی توضیح کر دی جائے۔

(۲)

شہرت ہو کہ مصوری ایک زبان ہے بلکہ اکثر یہ تو کہا جاتا ہے کہ ہر مصور کی اپنی زبان، اپنی ابجد اور اپنا طرزِ تحریر بھی ہوتا ہے۔ ایک

وہ اپنی تصویر میں زیادہ مقام دیتا ہے، دوسرا زرد کو، تیسرا گلابی کو زیادہ استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح بعض مصور خاص موضوعات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ کوئی پیلے تھیلوں کی تصویریں بناتا ہے، تو کوئی نوجوان لڑکیوں کی۔ اسی طرح مختلف فن کاروں کی تکنیک مختلف ہوتی ہے۔ اب کہا جاتا ہے کہ وہ مخصوص رنگ جو ایک مصور استعمال کرتا ہے، موضوعات جن کا وہ انتخاب کرتا ہے، تکنیک جو وہ برتتا ہے اس کی زبان کے الف بے ہیں جس مخصوص انداز میں مصور کاغذ یا کپڑے پر خطوط کھینچتا ہے، برش چلاتا ہے اور رنگ پھیلاتا ہے وہ اس مصور کی "تحریر" ہے۔ مثال کے طور پر چند تصویریں جو ایک عرصے تک پکاسو اور میرو کی سمجھی جاتی رہی تھیں۔ ان کے بارے میں ماہرین نے جب یہ فیصلہ سنایا کہ یہ فی الحقیقت پکاسو اور میرو کی نہیں ہیں تو یہ فیصلہ انھیں نکات کے پیش نظر دیا گیا تھا کہ ماہرین نے پکاسو کی تصویری "تحریر" اور ان جعلی تصویروں کے نقوش میں کوئی مماثلت نہیں پائی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ تصویریں جو اب تک پکاسو کی کہلاتی تھیں، پکاسو کی نہیں ہیں کیونکہ ان میں پکاسو کی تحریر کی "شوخی" نہیں۔

اس قسم کی باتوں سے کہنے والے کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ہر فن کار مختلف صورتوں اور رنگوں یا خطوط کو نقش کرتے ہوئے ایک مخصوص وزن دیتا ہے جو اس کی تمام تخلیقات میں مشترک پایا جاتا ہے اور جب کبھی اس مصور کی تصویروں کے اصلی ہونے کے بارے میں سوال اٹھے تو صرف انھیں چیزوں کی روشنی میں یہ مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ یہ گویا ادبیات سے "اسٹائل بیان" کے طریقہ کا فنی تحقیق میں اطلاق ہے جہاں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ایک تحریر فلاں شخص کی تحریر ہے یا نہیں شخص مذکور کی تسلیم شدہ تحریروں کی طرز نگارش، جملوں کی ساخت وغیرہ اور تحریر زیر بحث کی ہیئت کا مقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ہے ادبیاتی تحقیق" اور "مصورانہ تحقیق" کی اس مماثلت میں یہی تصور کام کرتا ہے کہ مصوری ایک زبان ہے اور تصویر ایک تحریر ہے اور جس طرح ادبی تحریر کی قدر و قیمت کا انحصار اس کی "خیال آفرینی" میں ہے بعینہٖ ایک تصویر کی خوبی اس کے خیال و فکر میں مضمر ہے۔

مصوری سے گذر کر کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ مصوری ہی نہیں بلکہ فنون لطیفہ کی دوسری اصناف مثلاً موسیقی، مجسمہ سازی وغیرہ بھی مختلف زبانیں ہیں اور جو خیال ایک صنف میں ادا کیا گیا ہے اس کا اظہار یا ترجمہ، دوسری میں ہو سکتا ہے۔ تازی بربریت کا اظہار ایک مجسمہ میں بھی ہو سکتا ہے۔ اسی بات کو ساز و آواز کے آہنگ میں بیان کیا جا سکتا ہے، کاغذ پر رنگ روپ میں مقید کیا جا سکتا ہے اور الفاظ و اوزان کا پابند بنا کر نظم میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایک تصویر اور مجسمے میں کچھ کہا گیا ہے تو اس کا اظہار نظم و شعر میں، یا نثر و تقریر میں ہونا چاہیئے اور اگر یہ ممکن نہیں اور ایک زبان کے "خیالات" دوسری میں بیان نہ ہو سکیں تو دونوں میں سے ایک زبان ناقص، کم ترقی یافتہ اور اسی اعتبار سے کم قدر و اہمیت کی حامل قرار دی جائے گی یا پھر یہ کہا جائے گا کہ ایک زبان میں بات ہی بے معنی کہی گئی ہے ورنہ دوسری زبان اور دوسرے پیرایئے میں اس کا اظہار ہو سکتا تھا۔

اہل ریاضی، ریاضی کی مختلف اصناف کے مابین اسی قسم کا تعلق بتاتے ہیں۔ ان کے خیال میں جو کچھ اقلیدس میں کہا جائے وہ کلاسیکی الجبرا کے قضایا میں بیان ہو سکتا ہے اور الجبرا کے مسائل کو ہندسہ کی زبان میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح افلاطون نے ان تصورات و خیالات کو اعلیٰ قدر دینے کی سفارش کی تھی جو ریاضیاتی خصوصیات رکھتے ہوں اور وہ خیالات اور اصناف فن جو کسی قسم ریاضیاتی تحلیل کی متحمل نہیں ہو سکتیں معقولیت کے دائرہ سے خارج متصور کی جائیں گی۔ غالباً اسی سبب سے افلاطون نے موسیقی کو مصوری اور مجسمہ سازی سے اعلیٰ قرار دیا تھا کیونکہ موسیقی کی اساس ریاضیاتی ہے جبکہ مجسمہ کے خد و خال ریاضیاتی اور ہندسی صورات میں احسن طور پر تحویل پذیر نہیں۔

دور جدید میں غیر تشبیہی، یا تجریدی مصوری کو اسی وجہ سے ہدف ملامت بنایا جاتا ہے لیکن اس پر اعتراض اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ یہ ریاضیاتی نہیں، بلکہ یہ ایسی زبان ہے جس کی تعبیر نہایت موضوعی ہے اور روایتی اصولوں سے آزاد ہے۔ ماہرین نفسیات البتہ تجریدی مصوری کو ایک اعتبار سے اہمیت دیتے ہیں۔ یہ اہمیت وقدر طبی اور نفسیاتی ہے۔ ان کے لئے ایسی تصویریں نفسیاتی رپورٹیں ہیں جن میں ماہر نفسیات مصور کی شخصیت کے ارتقاء کے خطوط

پڑھتا ہے۔

لیکن مصوری اور تجریدی مصوری کے بارے میں یہ خیالات اور نظریات کسی اعتبار سے بھی اس شے کا حق ادا نہیں کرتے۔ اس طرف اشارہ آج سے نصف صدی قبل (۱۹۱۳ء) پکاسو اپنے مخصوص انداز میں کر چکا تھا جب نقادوں نے اس کی مکعبی تصویروں کے رنگ روپ کے امتزاج پر تنقید کے بجائے ان میں حکمت کے نکات اور ریاضی و منطق کے تصورات اور تحلیل نفسی کے حقائق پڑھنے چاہے تھے۔ پکاسو نے بتایا کہ مکعبیت کی آسان توجیہ کرنے کے لئے اگر نے اسے ریاضی، موسیقی، تحلیل نفسی، کیمیا اور نہ جانے کس کس سے متعلق کرنا چاہا ہے۔ ان ساری کوششوں کو اگر نا قص نہ کہا جائے تو ادب محض کہہ لیجئے بہر حال اس طرز فکر نے کوئی بہت عمدہ نتائج نہیں نکلے اور ان کئی نظریات نے لوگوں کی آنکھیں چندھیا دیں۔ لیکن ایک مصور کے اس احتجاج کے باوجود نقاد اس کی اور اس جیسے دوسرے فن کاروں کی تخلیقات میں فلسفہ و حکمت کے مسائل، دیا دب و اخلاق کے اصول تلاش کرتا رہا اور مصر رہا کہ مصوری تجربے کا اظہار ہے، وہ اشارتی ہے اور اس کی حقیقت لسانیتی ہے۔

اس ساری گفتگو سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ معترضین کے لئے تصویر ایک قسم کی فلسفیانہ یا لفظیاتی تصنیف ہے اور اس کے بارے میں اسی طرح رد و قدح ہونی چاہیئے جو ایک عالمانہ تحریر پر ہو سکتی ہے اور جب جدید نقاد تجریدی مصوری پر تنقید کرتے ہیں تو اسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ تجریدی مصوری ایک مبہم اظہار ہے۔ اس کے منطقی محاسن کے بارے میں گفتگو نہیں ہو سکتی اور کیونکہ تجریدی تصویر کو اس قسم کی بحث کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا لہذا وہ کسی طرح سے لائق اعتنا نہیں۔

یہ کہ تجریدی مصوری معقول گفتگو کا موضوع نہیں بن سکتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ نہایت مغلق زبان ہے۔" اس کی ابجد عجیب ہے"۔ جو کچھ اس میں کہا جاتا ہے اسے معقول پیرائے میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔" یہ غیر معقول و لایعنی ہے اور یہ سارا عمل تضیع اوقات ہے"۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہ مصوری سماجی قدر و اہمیت کی حامل نہیں۔ یہ تصویریں ضائع کرنے کے ہی لائق ہیں اور وہ جو ایسی تصویریں بناتے ہیں، اگر قابل گردن زدنی نہ بھی ہوں تو کم از کم ان کی کوشش قطعی ناقابل ستائش ضرور ہیں۔

(۳)

مصوری کے مندرجہ بالا نظریات اور مصوری پر ساری تنقید، جیسا کہ ہم نے دیکھا، اس بنیادی غلطی کا شکار ہیں کہ مصوری ایک زبان ہے۔ اس غلطی کو میں "معقولاتی مغالطہ" کہوں گا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بحث جو ایک تصور کے تحت ہونی چاہیئے' وہ بے محل ہو جاتی ہے۔ یہ مغالطہ میرے خیال میں تحریری زبان کو فن تحریر یا خطاطی سے خلط ملط کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ نکتہ وضاحت چاہتا ہے۔

زبان اشاروں اور علامتوں کے برتنے کا وظیفہ ہے۔ عام طور پر زبان کے لئے یہی کہا جاتا ہے کہ وہ اشاری ہے اور اشاروں کا نظام ہے جو علامات افراد کی حرکات و سکنات، انسان و حیوان کی آواز، کاغذ یا تختہ پر بنائے ہوئے نقوش اور خطوط اپنے سے سوا کسی اور شے یا تصور کی اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کو دیکھ کر یکلخت ہاتھ کا ماتھے تک اٹھ جانا "جذبات خیر سگالی کا اظہار ہے۔ اسی طرح چوراہے پر سرخ، سبز اور زرد روشنیاں شہر میں اضافہ حسن کے لئے نہیں لگائی جاتیں۔ ان کی اہمیت اشارتی ہے۔

اگر قدیم مصری زبان کا مطالعہ کریں تو ہم وہاں یہی دیکھتے ہیں۔ یہ تصویری زبان کی کلاسیکی مثال ہے۔ اس زبان میں لکھنے کے لئے "کربلی چٹائی پر بیٹھی

---

۱۵ ملاحظہ ہو میری تصنیف: تعارف منطق جدید (باب دو: زبان اور منطق)، شائع کردہ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی ۱۹۶۵ء

سو یر پر بلی کی ایک تصویر بنا کر دکھانا پڑتا ہے کہ یہاں کس خیال یا ماتھ کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے یعنی ہر تصویر اپنے سے سوا ہر خیال یا
شارہ کرتی ہے اور اس اعتبار سے ہر تصویر اشاری ہے لیکن رفتہ رفتہ مکمل تصویر کی جگہ ایک نشان یا خفیف سی علامت خیالات کے اظہار
جانے لگی اور اسی سے ہماری ترقی یافتہ تحریری زبان کا تصور سامنے آیا جس کی مثال اس مضمون کی تحریر و زبان پیش کرتے ہیں ۔

جب تصویری زبان کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں و صرف یہ کہتے ہیں کہ کون سے نقوش اور خطوط کن حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہاں زبان
، زبان کے اشارات تصویری ہیں۔ ان کی حیثیت عملی اور وظائفی ہے جو ہر زبان کا خاصہ ہے لیکن تصویریں جن پر یہ زبان مشتمل ہے ہمیں ان
کے سروکار نہیں ہم ان تصویروں کا بحیثیت تصویر کے مطالعہ نہیں کرتے یہاں ہم وہی فرق قائم کرتے ہیں جو صوت و آواز کے دو مختلف پہلوؤں کے
یں۔ آواز کو نظریہ و خیالات کی ترسیل کا ذریعہ بھی سمجھا جا سکتا ہے اور آواز کا مطالعہ اس کی اپنی طور پر بھی ہو سکتا ہے موسیقی میں ہم آواز کو اسی انداز
ع بنانے ہیں یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم تحریری زبان میں "تحریر" اور "زبان" کو ایک دوسرے سے جدا کر کے تحریر بحیثیت ایک صنعت
ات کی ترسیل کے ذریعہ کی حیثیت سے امتیاز قائم کر لیں گے اور یہ مطالعہ کے دو مختلف اور ایک دوسرے سے قطعی آزاد موضوع قرار دیئے جائیں گے۔
جب ہم موضوع گفتگو بناتے ہیں یا جب ہم خطاطی کے نمونوں کے بارے میں حکم لگاتے ہیں تو ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں ہوتی کہ خطاطی
یا کہا گیا ہے بلکہ یہ کیسے لگ رہے ہیں مسئلہ یہ نہیں ہے کہ تحریر کیا ہے بلکہ وہ کیسی نظر آتی ہے بعینہ جب ہم کلاسیکی موسیقی یا آواز بحیثیت
مطالعہ بناتے ہیں تو یہ جاننا نہیں چاہتے کہ اس میں کیا کہا گیا ہے بلکہ یہ کان کو کیسی لگ رہی ہے سماعت پر بار تو نہیں ہے
ہمارا سارا دار و مدار صوت، آواز کے آہنگ اور سماعت پر ہے مصوری کی کل کائنات خطوط، رنگ اور صورتیں نیز ان کی ترتیب امتزاج ہے
خیالات و تصورات کا کوئی گزر نہیں اور اسی وجہ سے ان کی افہام و تفہیم کی بات ہے۔ سوال کرنا مصوری کی حقیقت سے عدم واقفیت کا اظہار کرنا

(۴)

ب یہ ہے کہ مصوری اور تصویر کی حقیقت کیا ہے؟ اس بیان سے کیا مراد لی جائے کہ تصویر کے معنی و مفہوم کے بارے میں سوال ہی نظر انداز
بحث کا دشوار گذار پہلو ہے ۔

کی ایک ایسی تعریف دینا جو تحلیلی اور لفظی نہ ہو بلکہ معلوماتی بھی ہو اور جس پر سب متفق ہوں مشکل کام ہے لیکن اپنے وسیع ترین معنوں میں مصوری
کے خالص نظری (Visual) عناصر یعنی رنگ خطوط اور بناوٹ (Texture) کو ان کی یک سطحی اور دو جہتی (طول و
برتنا ہے۔ انھیں نظری عناصر کے اجتماع کو نظری صورت (Visual) کہتے ہیں۔ اگر اس میں طول و عرض ہے تو دو تعد
رائی کا عنصر بھی شامل ہو گیا تو پھر گفتگو تصویر یا مصوری سے نکل کر مجسمہ اور سہ جہتی صورتوں میں داخل ہو جائے گی۔ یہیں فی الوقت بحث صرف
پر رہے ہے۔ مصوری کی تعریف کے بعد اب تصویر کے لئے یہ کہا جائے گا کہ وہ رنگ، خطوط اور بناوٹ کا تفاعل (Function)
صر پر تصویر مشتمل ہوتی ہے اور انہیں کے تفاعل کا نام فن ہے۔ ایک تصویر میں سے رنگ خطوط وغیرہ کو نکال دیجئے تو سادہ کاغذ رہ جانے کا
دریافت کرنا کہ ان عناصر کی ترکیب کیوں کر ہوتی ہے و تصویر کے اصول ترتیب کے بارے میں سوال کرنا ہے جو تضاد، تکرار اور مشابہت یا مماثلت
صویروں میں اصول تضاد نمایاں ہے جبکہ کلاسیکی مصوری میں مشابہت کا اصول کارفرما ہے اور قرون وسطیٰ کی تصویروں میں تکرار کا اصول غالب
سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ تاریخ مصوری کو اس طرح معین و واضح ادوار اور اصولوں کی روشنی ہی میں سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ انسان کے ادوار و تہذیب
ں میں بھی مستثنیات ملتے ہیں ۔

یہ بحث قطعی مختلف ہوگی کہ تصویر میں تضاد ہویا تکرار۔ ہمارے سامنے مسئلہ صرف تصویر کی ہیئت ترکیبی کا ہے۔ اور ہم نے یہ دیکھا ہے کہ نظری عناصر نظری صورت کا نام ہے۔ اب یہ کہنا کہ یہ نظری صورت کسی شکل سے مشابہت رکھتی ہے یا نہیں، یہ نظری صورت گلاب کے پھول جیسی ہے یا مکان جیسی معلوم ہوتی ہے۔ دراصل ایک نظری صورت میں اپنے سابقہ تجربے کی جھلک دیکھنے کی کوشش ہے اور اس کی تمام تر ذمہ داری تصویر دیکھنے والے پر آتی ہے۔

ایک تصویر جو ممکن ہے ایک سے زیادہ نظری صورتوں پر مشتمل ہو اگر اس میں کوئی جانی پہچانی شکل وصورت نظر آئے تو بھی اس سے تصویر کی قدر میں نہ اضافہ ہوتا ہے نہ کمی۔ یہ اتفاق ہے کہ ایک نظری صورت جانی پہچانی بن جائے لیکن اس کے لئے یہ کسی طور بھی ضروری نہیں کہ اسے کسی سابقہ تجربے سے منسوب بھی کیا جائے۔

مصوری کے تاثیریتی اور بعد تاثریت مدرسوں میں غالباً اسی سبب سے "مشابہتوں کی تصویر کشی" کے خلاف جنگ نظر آتی ہے[1] پچھلی صدی کے آخر میں کیمرے کی ایجاد کے بعد مصوروں نے یہی کہا تھا کہ جہاں تک تجربے کی ہو بہو عکاسی مطلوب ہے یہ کام کیمرہ بھی کر سکتا ہے لیکن مصور کو سروکار نظری تجربے کی ابتدائی اور اساسی صورت سے ہے جہاں نظری عناصر اپنی حقیقی صورت میں نظر آتے ہیں یعنی مصور کا موضوع وہ رنگ اور خطوط اور ان کا امتزاج اور ہے جنھیں ابھی ہم نے اپنی نفسیات میں نہیں رنگا ہے اور جو ہماری موضوعیت سے پاک ہیں۔ فلسفہ میں یہی چیز ہسرل کی مظہریت کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ جدید مصوری اسی تصور کی روشنی میں دیکھی جانی چاہیئے۔

اس کل بحث سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تصویر اپنی حقیقت میں نہ اشاری ہے نہ وہ خیال اور تصور کی علامت ہی ہے۔ اس کے بارے میں یہ سوال کرنا مناسب نہیں کہ "اس تصویر کا کیا مطلب ہے؟" "اس تصویر میں کیا خیال پیش کیا گیا ہے"۔ اور تصویر زبان یا اشارہ نہیں حیثیت نہ عملی ہے نہ وظائفی۔ تصویر کا اساسی طور پر کوئی وظیفہ نہیں۔ یوں تصویر کو مختلف مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن تصویر کا تصویر ہونے کے لئے یہ قطعی ضروری نہیں کہ وہ کسی مقصد کے لئے استعمال بھی کی جائے۔

لہٰذا مصوری چاہے وہ تجریدی ہو یا حقیقی (اور اس بحث کے بعد تو یہ فرق بھی لغو معلوم ہوتا ہے)، اس پر اس اعتبار سے تنقید کرنا کہ اس سے زندگی کے کون کون سے مسئلے حل ہو سکتے ہیں، ایک بے معنی بات کرنا ہے۔ اور اسی طرح ایک "تجریدی تصویر" میں کسی جانی پہچانی شکل (انار، انسان، کتاب) کو تلاش کرنا اور اسے نہ دیکھ کر اعتراض کرنا کہ اس میں کوئی جانی پہچانی شکل نظر نہیں آتی، دراصل تصویر میں اس چیز کو دیکھنے کی سعی ہے جو نہ تصویر میں ہے اور نہ مصور نے وہاں بنانی چاہی تھی[2]۔

---

[1] ملاحظہ ہوں میرے مضامین ...wn Karachi 24 Nov. 1964: What is abstract Art? ...ghber Mail (Peshawar) 22 Feb. 1965: Pioneers of Modern Art.

[2] اسی سبب سے بیشتر جدید مصور اپنی تصویروں کو کسی قسم کے عنوان نہیں دیتے اور اگر تصویر کو عنوان دیا گیا تو اس کا مقصد دیکھنے والے کو یہ بتانا ہوتا ہے کہ کس پہلو کی نظری تحلیل (Visual Analysis) اس تصویر کا سبب بنی۔

فراق گورکھپوری

○

اوروں سے کیا کہہ پاؤ گے، کیا بیان کر پاؤ گے
وہ چہرہ دیکھو گے تو یارو، دیکھتے ہی رہ جاؤ گے

ان کو دیکھ کے آنے والو، باخبری کی تم کو قسم
کیسے ہیں وہ اور کہاں ہیں، اتنا بھی نہ بتاؤ گے؟

داہ کے کاروبار میں یارو، ہشیاری ہی خطرہ ہے
عقل و ہوش سے کام نہ لینا، اک دن دھوکا کھاؤ گے

میرا قرب غنیمت جانو، ورنہ کچھ ہی دنوں کے بعد
دور دور تک ڈھونڈو گے لیکن تم مجھ کو نہ پاؤ گے

وہ نغمے چھوڑے جاتا ہوں بعد رہے اے ہم نفسو
دیر دیر تک سر دھن دھن کر اوروں کو بھی سناؤ گے

میرے جیتے جی تم سن لو، سازِ غزل کے یہ نغمے
اور بھی شاعر آئیں گے لیکن کہاں فراق کو پاؤ گے

فراق گورکھپوری

○

دارالسلطنتوں کو بنایا دولت مند انسانوں نے — نغموں کا اک شہر بسایا میرے دل کے دیوانوں نے

عشق کے تکیے میں آئے ہو با ادب اہلِ عزت و جاہ — اس مٹی کو سلام کیا ہے بڑے بڑے ایوانوں نے

آج وہی دل گلیوں گلیوں مارا مارا پھرتا ہے — وہ دل جس کا طواف کیا ہے کعبوں نے بت خانوں نے

لاعلمی، ناواقفیت، ناتجربہ کاری، معصومی — سوچو تو، کیا کیا نہ دیا داناؤں کو نادانوں نے

وہم و یقین، ایمان و تشکک، اقرار و انکار و سکوت — کیا کیا مجھ کو سکھایا تیری ان آنکھوں کے بہانوں نے

شعر و شاعری بڑی پرانی چیزیں ہیں، لیکن مجھ کو — اپنی طرف بلایا تھا اس فن کے نئے عنوانوں نے

کرشن و محمدؐ و عیسےؑ نے کس ظلمت میں آنکھیں کھولیں — کیسے کیسے چراغ جلائے دنیا کے غم خانوں نے

جن کو حجاب اکبر کہیے، جن تک ہاتھ پہنچ نہ سکے — وہ پردے بھی چاک کیے، کیا غضب کیا انسانوں نے

اوروں کی آنکھوں کو ملی ہے کب وہ دولتِ نظارہ — شاہدِ ہستی کو دیکھا تو دیکھا ہم حیرانوں نے

کچھ غمِ دوراں، کچھ غمِ جاناں، کچھ غمِ انساں، کچھ غمِ عشق — ایک مہابھارت لکھ ڈالی ان دو چار افسانوں نے

نا گھر تیرا، نا گھر میرا، چڑیا رین بسیرا ہے — یادِ رفتگاں کی تصویریں کھینچی ہیں کاشانوں نے

دھرتی کے لے البیلو! تم اس فراق کی قدر کرو
نغمۂ خلد سنایا تم کو آج اسی کے ترانوں نے

فیض احمد فیض

○

کئے آرزو سے پیماں جو مآل تک نہ پہنچے
شب و روزِ آشنائی مہ و سال تک نہ پہنچے

وہ نظر بہم نہ پہنچی کہ محیطِ حسن کرتے
تری دید کے وسیلے خد و خال تک نہ پہنچے

وہی چشمۂ بقا تھا جسے سب سراب سمجھے
وہی خواب معتبر تھے جو خیال تک نہ پہنچے

ترا لطف وجہِ تسکیں، نہ قرارِ شرحِ غم سے
کہ ہیں دل میں وہ گلے بھی جو ملال تک نہ پہنچے

کوئی یار جاں سے گزرا، کوئی ہوش سے نہ گزرا
یہ ندیمِ یک دو ساغر مرے حال تک نہ پہنچے

چلو فیض دل جلائیں کریں پھر سے عرضِ جاناں
وہ سخن جو لب تک آئے پہ سوال تک نہ پہنچے

فارغ بخاری

○

کفر کا رنگ جھلکتا ہے نہ اسلام کا رنگ
کچھ عجب ہے میرے افکار کے اصنام کا رنگ

چند افراد یہاں رنگوں کے سوداگر ہیں
کتنے چہرے ہیں کہ جن پر ہے فقط نام کا رنگ

منجمد عمر کی فصیلوں میں گھرے ہیں ہم لوگ
دل کے آئینے میں ہے حسرتِ ناکام کا رنگ

وہ بھی زندوں میں گنے جاتے ہیں جن کے دل میں
کسی چلمن کی ہے خوشبو نہ کسی بام کا رنگ

گردشِ جام نے رنگین بنا رکھا ہے
ورنہ بے رنگ سا ہے گردشِ ایام کا رنگ

حسنِ سلمائے حقیقت کا کوئی رنگ نہیں
جو مئے ناب کا ہے رنگ، وہی جام کا رنگ

کتنے افسانے حوادث سے جنم لیتے ہیں
ہے میرے نام میں فارغ میری ہمنام کا رنگ

قتیل شفائی

○

تہہ میں جو رہ گئے وہ صدف بھی نکالیے
طغیانیوں کا ہاتھ سمندر میں ڈالیے

اپنا سمندروں میں رہے کہ رہ جائے آبرو
اوپر جو دیکھنا ہے تو پگڑی سنبھالیے

خوشبو تو مدتوں کی زمیں دوز ہو چکی
اب صرف پتیوں کو ہوا میں اچھالیے

آہیں جو بچ رہی ہیں انھی اُنھی کی خیر ہے
نغموں کی موت پر بہت آنسو بہا لیے

صدیوں کا فرق پڑتا ہے لمحوں کے پھیر میں
جو غم ہے آج کا اُسے کل پر نہ ٹالیے

کہہ دو طبیبِ شب سے کہ اپنی منائے خیر
ہم نے تو پھر چراغ سروں تک بچا لیے

آیا ہی تھا ابھی مرے لب پہ وفا کا نام
کچھ دوستوں نے ہاتھ میں پتھر اُٹھا لیے

دنیا کی نفرتیں مجھے تلاش کر گئیں
اک پیار کی نظر مرے کاسے میں ڈالیے

ساحل کے انتظار میں چکرا گیا ہوں میں
تجھ کو مری وفا کے بھنور سے نکالیے

رسوائیوں کا آپ کو آیا ہے اب خیال
ہم نے تو اپنے دوست بھی دشمن بنا لیے

محسوس ہو رہا ہے کچھ ایسا مجھے قتیل
نیندوں نے جیسے آج کا شب پر لگا لیے

قتیل شفائی

○

یہ مانا پیار اب بھی جان کا آزار ہے یارو
مگر یہ زہر پینے پر مجھے اصرار ہے یارو

میں اُتروں بھی تو میدانِ وفا میں کس طرح اُتروں
مقابل دوستوں کا لشکرِ جرار ہے یارو

میسّر جس کو صحرا ہو وہ کیوں دریا تلک جائے
بگولا بھی تو اک اُڑتا ہوا منجدھار ہے یارو

نہیں ہے کوئی سدِ راہ اطمینان سے بڑھ کر
نہ ہو ساحل اگر کوئی تو بیڑا پار ہے یارو

یہ منظر بھی کوئی دیکھے شبستانِ تحیّر کا
مقدّر سو رہا ہے آدمی بیدار ہے یارو

بھروسہ کر ہی لو اپنے مخاطب کی ذہانت پہ
خموشی بھی تو اک پیرایۂ اظہار ہے یارو

کہاں تک حسنِ یوسف اپنی مجبوری پہ روئے گا
یہاں تو ہر قدم پر مصر کا بازار ہے یارو

گئی رُت میں بھی جو اکثر ہمیں پہنائی جاتی تھی
اب اس زنجیر میں شامل نئی جھنکار ہے یارو

بہکنے میں قتیلؔ اپنی الگ اک شان رکھتا ہے
وگرنہ میکدے میں ہر کوئی مے خوار ہے یارو

ادا جعفری

○

سچ کو زہر کہتے ہیں زہر پی لیا ہم نے
راہ میں کہاں چھوڑا دل سا رہنما ہم نے
تنگ و تیرہ گلیوں میں شہر کھو دیا ہم نے
ظرف اپنا اپنا ہے منہ سے کچھ کہا ہم نے!
خواب دل کا سرمایہ اور لٹا دیا ہم نے
ہٹ گئے ہیں رستے سے کچھ کہا سنا ہم نے!
یاد آنے والوں کا نام بھی لیا ہم نے؟
دیکھنے کو دیکھا تھا کوئی خواب سا ہم نے
برگِ گل سے کیوں پوچھا دل کا راستہ ہم نے
کر لیا ہے کس دل سے
اپنا سامنا ہم نے

افضل پرویز

○

مجزین اُس کی سبھا میں کیا کسی کو چارہ تھا
ملں تو ہر شوریدہ کے سر پہ چمکتا آرہ تھا

ہائے وہ دن جب کسی فریاد پہ قدغن نہ تھی
درد کی ہر لہر زخمہ اور میں اکتارہ تھا

اُس نے دل میں جھانکنے کی مجھ کو مہلت ہی نہ دی
شوخ کے طرزِ تکلم ہی میں کیا چٹخارہ تھا

شاہ کے دربار میں ٹوڈی کے سُر محبوس تھے
آہوئے دل اُس گھڑی صحراؤں میں آوارہ تھا

حُسن تیرا برگِ گُل تھا یا پرِ طاؤس تھا
دل مرا دینِ مبینِ عشق کا سیپارہ تھا

وصل اک لمحہ تھا لیکن نقش ہو کر رہ گیا
ورنہ کہنے کو غزالِ دشت کا طرّارہ تھا

کتنے چاؤ سے کیا تھا ہم نے آغازِ سفر
زادِ رہ معصوم آشاؤں کا اک پشتارہ تھا

گاؤں کو پرویز نے تیاگا تو پھر لوٹا نہیں
ایک جھونکا تھا کہ جوگی تھا یا بنجارہ تھا

، ایک راگنی جس کے متعلق روایت ہے کہ اس کے اثر سے آہوانِ صحرا کھچے آتے ہیں۔

مظفر علی سیّد

O

آگ سی ایک دل میں لگی چاہیے
زندگی چاہیے، روشنی چاہیے

قہقہوں میں ہمارے فقط زہر ہے
مسکراہٹ ہمیں آپ کی چاہیے

اک طلب ہو تو اللہ سے مانگیں دعا
کچھ بھی ملتا نہیں، اور سبھی چاہیے

سج گئے تم سے جب اس کے دیوار و در
غیر کو اور کیسی خوشی چاہیے

دل جلا شن کے عشاق کی گفتگو
عشق بھی آج کل سرسری چاہیے

جس کو دیکھوں اُسے میں ہی چاہا کروں
آپ بھی تو کسی کو کبھی چاہیے

اور کچھ مے سے یاروں کو مطلب نہیں
بس رگ و پے میں اک سنسنی چاہیے

تم تو سیّد فقیری میں خوش ہو گئے
وہ بھی ہیں جن کو آسودگی چاہیے

[illegible]

مظفر ا، سیّد

○

تراشو اینٹ پتھر کی پناہیں
مساجد، مدرسے اور خانقاہیں

ہمارے سر پہ سایہ ہے فلک کا
غنیمت ہیں یہ مٹیالی سی راہیں

سنبھل کر بیٹھیے گا میکدے میں
یہاں پیہم اُچھلتی ہیں کلاہیں

حکومت کیا چلے مٹی پہ اُس کی
کہ جس کی آسماں پر جلوہ گاہیں

کجا دوزخ، کہ جنت میں بھی ہم نے
دبی آہیں سُنیں، زخمی کراہیں

نہیں دولت کبھی ملنے کی ہم کو
ملے کیسے کہ جب تک ہم نہ چاہیں

وہاں کیجے تو کیسے پیار کیجے
جہاں پل میں بدلتی ہوں نگاہیں

نہ اُن کے ہاتھ آؤں گا میں سیّد
بُلایا ہی کریں گی اب وہ باہیں

صہبا اختر

○

بہر عالم برابر لکھ رہا ہوں
میں پیاسا ہوں، سمندر لکھ رہا ہوں

نہ جانے کیا بلا ہے حرفِ زندہ
غمِ جاں سے گزر کر لکھ رہا ہوں

نظر پروازِ آدم پر جمی ہے
ستاروں کا مقدر لکھ رہا ہوں

سلامت ہے یہ کیوں تجھ سے بچھڑ کر
میں اپنے دل کو پتھر لکھ رہا ہوں

مئے لب سے مجھے خوش کرنے والو
تمہارے نام کوثر لکھ رہا ہوں

[illegible]

صہبا اختر

○

اُن کو مرے علوئے سخن سے ہے کیوں حسد
ماچس کی تیلیوں کے برابر ہیں جن کے قد

سینے میں ناچتی ہے زمیں، دل میں آسماں
چھوتا ہے دستِ فکر مہ و مہر کے جسد

مجھ کو یہ فخر ہے کہ میں فرزندِ خاک ہوں
خورشید و ماہتاب نہیں میرے اب و جد

آغاز بھی حیات ہے انجام بھی حیات
اک روشنی ازل ہے تو اک روشنی ابد

صہبا نثار اُس پہ سخن کے ہزار رنگ
جس نے مری غزل کو دیے ہیں یہ خال و خد

سجاد باقر رضوی

○

راہوں کے اُونچ نیچ ذرا دیکھ بھال کے
ہاں رہروِ مراد، قدم رکھ سنبھ

فتنوں کو دیکھ، اپنے قدم روک، بیٹھ جا
راتیں یہ آفتوں کی ہیں، یہ دن و

لمحوں کی لَے پہ گزری ہیں راتیں نشاط کی
کس دھن میں دن کٹیں گے یہ رن

میں سرگراں تھا ہجر کی راتوں کے قرض سے
مایوس ہو کے لوٹ گئے دن وص

کچھ یہ نہ تھا کہ میں نے نہ سمجھی بساطِ دہر
میں خود ہی کھیل ہار گیا دیکھ بھ

سامانِ دل کو بے سر و سامانیاں ملیں!
کچھ اور بھی جواب تھے میرے

تخلیق ہے مری، تری تخلیق سے الگ
میں بھی بناتا رہتا ہوں پیکر

پیاسی زمینِ دل ہے، پڑا قحطِ فصلِ شوق
ہاں اے ہوا، کدھر گئے دن برشگ

باقرؔ بہ دانت نیچ زباں بند کیوں ہوئی
قائل تو آپ بھی تھے بہت قیل و قال کے

نمونہ

سجاد باقر رضوی

○

ظرفِ عالی ہوں کہ بھر کر بھی کبھی چھلکا نہیں
ہوں وہ دریا جو کناروں پہ کبھی بہتا نہ

ہوں وہ پیمانہ کہ محفل جس کو ہاتھوں ہاتھ لے
میں وہ نشہ ہوں جو سر چڑھ کر کبھی اترا نہ

کشتِ ہستی! تُو مجھے پہچان، تیری آس ہوں
میں وہ بادل ہوں جو اب تک ٹوٹ کر برسا نہ

خواب ہوں لیکن اگر تعبیر خود اپنی کروں
میں نہیں باہر مری دنیا کا یہ نقشہ نہ

دوں کسے آواز! اپنے آپ کو کیسے جگاؤں
تو مرے دل میں تو ہے لیکن مری سُنتا نہ

اس فقیری میں بھی للچاتی ہے دُنیا کی جھلک
میں کہوں کیسے کہ اُس کے پاس سے گزرا نہ

تھا ہواؤں میں مگر پہنچی تھی کچھ ایسی اُڑان
میں یہ سمجھا دل پہ اُترے گا، مگر اُترا نہ

فاصلے قربت بنے اب قربتیں ہیں فاصلہ
وہ جو پہلو میں ہے میرے دھیان میں آتا نہ

دیکھتے ہو تم جسے ہر آن میرے ساتھ ساتھ
وہ مری آشفتگی ہے، وہ مرا سایہ نہ

عزّتِ سادات ہے محفوظ باقرؔ میرے پاس
میں وہ عاشق ہوں جو اب تک شہر میں رسوا نہیں

صادق نسیم

○

ہر لفظ میں مہتابِ معانی کی ضیا ہوں
نادیدہ نگارانِ تصوّر کی ادا ہو
احساس کے غنچوں کی چٹک ہے مری آواز
میں سینۂ آفاق میں دھڑکن کی صدا ہو
ادراک کے شعلوں کا چمن ہے مرا آہنگ
میں برگِ خزاں ہو کے بھی گلزار نما ہو
ہر تلخ حکایت پہ ہے شیریں مرا لہجہ
میں زہر کے ساغر میں بھی رس گھول رہا ہو
محدود ہے کیوں حدِ طلب تک مری آواز
میں موجِ صبا ہو کے بھی زنجیر بپا ہو
جب دشتِ الم سے کوئی جھونکا کبھی آیا
میں لالۂ خود رَو کی طرح اور کھِلا
اب قصرِ تمنّا کے دریچے ہیں مرے زخم
میں خوں میں نہایا ہوں تو شہکار رہا
اک نغمۂ رنگیں ہوں لبِ سازِ مژہ پر
صادق جو بہ غنچہ ہوں تصویرِ صدا ہوں

صادق نسیم

○

بیدل کا تخیل ہوں نہ غالب کی نوا ہوں
اُس قافلۂ رفتہ کا نقشِ کفِ پا ہوں

رقصاں ہے چراغانِ تمنا مرے ہر سُو
وہ روشنیاں ہیں کہ میں سائے سے جدا ہوں

ہر عکسِ مقابل سے نمایاں ہے مرا نقش
دنیا میں ہوں یا آئینہ خانے میں کھڑا ہوں

ظلمات اماں بھی ہوں، اجالوں کا امیں بھی
میں صبح کے تارے کی طرح ڈوب رہا ہوں

افلاک رسی سے بھی تلافی نہیں ہوتی
کس عزم کی اَن دیکھی چٹانوں سے گرا ہوں

ہر چند کہ نس نس میں نہاں برقِ تپاں ہے
کھل کر بھی برستا ہوں کہ گھنگھور گھٹا ہوں

ایک ایک کرن میں مجھے سو رنگ نظر آئے
جب پچھلے پہر چاند کے ہمراہ چلا ہوں

خود اپنے تصور سے لرز اُٹھتا ہوں صادق
کس کاکلِ پُرخم کی جنوں خیز ہوا ہوں

جاوید شاہین

○

اب یہاں لوگوں کے دکھ سکھ کا پتا کیا آئے
بند ہوں گھر تو مکینوں کی صدا کیا آئے

ڈوبتے دن کے جلو میں نہ سکوں ہے نہ فراغ
شفقِ شام سے چہروں پہ ضیا کیا آئے

سرد سینوں میں پنپتے ہی نہیں درد کے بیج
ان خرابوں پہ برسنے کو گھٹا کیا آئے

دور ہو کیسے ترے جسم، تری جاں کی گھٹن
تنگ، بے روزن و در گھر میں ہوا کیا آئے

خشک پتے ہیں کہ جھڑتے ہی نہیں پیڑوں سے
کیسے تبدیل ہو رُت، رنگ نیا کیا آئے

کھو چکے لطفِ سحر خیزی، گراں خواب مکیں
صبحدم، بند دریچوں میں صبا کیا آئے

گرم ہنگامہ کرے کون رگوں میں شاہیں
خشک ندیوں میں کوئی موجِ بلا کیا آئے

محمد علوی

○

ین لوگوں سے ڈر گئی ہے
سمندروں میں اتر گئی ہے

وشیوں میں صدا گجر کی
یال کے پر کتر گئی ہے

ڑے ہیں بے برگ سر جھکائے
ا درختوں کو چر گئی ہے

ں تو نیند آئے گی نہ لیکن
رات بھی تو ٹھہر گئی ہے

ں بھٹکتے پھرو گے علوی
رک سے پوچھو کدھر گئی ہے

○

خرابے میں تنہائی کے کیوں پھروں
ملے جسم کا شہر تو جا رہوں

ابھی ساتھ چلتا ہوں ٹھہرو ذرا
جدائی کی پوشاک تو جھاڑ لوں

سنوں بند کمروں کی سرگوشیاں
کواڑوں کی درزوں سے جھانکا کروں

نئی نظم تو لے اڑے چھوکرے
میں بوڑھی غزل سے ہی جی خوش کروں

پتا نام چاہو تو لکھ لو میاں
میرا نام علوی ہے گجراتی چھوں

محسن احسان

○

کتنی کڑی سزا ملی ہے دل کی بھول پر
اب قہقہے لگاتا ہوں اپنے اصول پر

غم کی مہیب آندھیاں چلنے کے باوجود
یادوں کا خون جم گیا لمحوں کی دھول پر

اب کے برس بہار نے ہر وار سہہ لیا
دستِ خزاں کا کوئی نشاں تھا نہ پھول پر

پاؤ گے اور کچھ نہ بجز زخمِ زندگی
انگور کو چڑھا کے نہ دیکھو ببول پر[1]

آئی ہوائے شوق تو سب نقش مٹ گئے
تحریر کوئی بھی نہ ملی دل کی دھول پر

محسنؔ کبھی نہ آئیں گی اڑ اڑ کے تتلیاں
گلدان میں سجے ہوئے کاغذ کے پھول پر

[1] بگڑتے انگور چڑھایا ہر گچھا زخیا

نمونۂ کلام

محسن احسان

○

سمجھ میں آتا نہیں، انتظار کیسا ہے
وہ پاس بھی ہے، پہ دل بے قرار کیسا ہے

امیرِ قافلۂ شہر! کچھ بتا تو سہی
جبینِ رہرواں پر غبار کیسا ہے

ق
نہ برق ہی کہیں تڑپی، نہ آگ ہی بھڑکی
مگر دھواں سا سرِ شاخسار کیسا ہے

نہ کارواں کوئی بھٹکا، نہ کوئی دل دھڑکا
مگر یہ شور سرِ رہگزار کیسا ہے

ہر ایک بات میں پنہاں ہے طنز کی تلوار
مجھے خبر ہے مرا غمگسار کیسا ہے

پرو دیے مری پلکوں پہ جس نے پیار کے پھول
خدا ہی جانے وہ جانِ بہار کیسا ہے

ہوا لیے دشتِ محبت اسنادِ محسن کی
وہ بے مراد، غریب الدیار کیسا ہے

سیف زلفی

○

جو لوگ شور کرتے نہیں، ڈھول کی طرح
ذہنوں میں گونجتے ہیں، بڑے بول کی طرح

کھل کر بھی منتظر، کہ ملے زندگی کی بھیک
ہر گل ہے شاخسار پہ، کشکول کی طرح

اتنا گھنا ہے ذہن کہ پل بھر سکوں نہیں
شور اپنی سوچ کا ہے کسی غول کی طرح

جھانکا جو دل کے بیچ تو عریاں تھیں خواہشیں
اُوپر سے اوڑھ لی تھی انا، خول کی طرح

یہ جان لے کہ سستا نہیں ہے ہر ایک شخص
میں بھی بہت گراں ہوں ترے مول کی طرح

ہیں ذہن کھوکھلے کہ ذرا نغمگی نہیں
پڑتے ہی تھاپ بجنے لگیں ڈھول کی طرح

اُس ان سُنی سی شکل کی تعبیر کیا کروں
دل میں اُتر گئی جو نئے بول کی طرح

زلفی وہاں وہ چاہ کا دریا بھی خشک ہے
میں بھی یہاں ہوں سوکھے ہوئے ڈول کی طرح

سیف زلفی

○

ب تک یہ التفات، یہ پتھراؤ دوستو — پھر تم نہ گِن سکو گے مِرے گھاؤ دوستو

بنہ سپر ہوں میں بھی سرِ مقتلِ حیات — اب تم بھی خندقوں سے نکل آؤ دوستو

ں موجِ تند و تیز ہوں، ہٹ جاؤ راہ سے — کاغذ کی کھے رہے ہو کہاں ناؤ دوستو

ا ہے تم نے اپنا خریدار بھی کوئی — پوچھا ہے تم نے اپنا کبھی بھاؤ دوستو

ے تم اپنے اپنے گریباں میں جھانک لو — پھر داغِ ماہتاب کے گِنواؤ دوستو

ں ستائشوں کے کنوئیں میں مگن رہو — خود اپنی عظمتوں کے بھجن گاؤ دوستو

چپ رہو تو اس میں تمھارا بھرم بھی ہے — یوں سب کے سامنے تو نہ ہکلاؤ دوستو

ز بدست آج تو بگڑے گئے ہو تم — اپنے کیے پہ آج تو شرماؤ دوستو

ں نہیں ہے ذہن پہ کائی جمی ہوئی — ہے مرگِ آب، جھیل کا ٹھہراؤ دوستو

تے ہیں جن کو شعلۂ احساسِ آگہی — اس کو لہو کی آنچ سے بھڑکاؤ دوستو

سوچ جس سے گوہرِ انسانیت ملے — اس سوچ کے بھنور میں اتر جاؤ دوستو

عطر جس کا نام خلوصِ حیات ہے — اُس عطر سے مزاج کو مہکاؤ دوستو

سوچ جس سے ذہن کے گوشے دمک اُٹھیں — اُس سوچ کی کرن سے لپٹ جاؤ دوستو

زلفی کے دل میں گردِ کدورت ذرا نہیں
تم بھی اِسی اصول کو اپناؤ دوستو

تخت سنگھ

○

ہر آنکھ تری، جھیل ہے نِتھرے ہوئے جل کی
ہر جھیل میں خوشبو ہے اُجالے کے کنول کی

ہر اور دہکتی ہیں تجھے گھورتی آنکھیں
کیوں خیر مناؤں نہ ترے رُوپ سجَل کی

چاندی کی ڈلی بن کے مری رُوح میں جھلکی
مُسکان تری نین کٹوروں سے جو چھلکی

ہوتا ہے تری چاپ کا دھوکا جو کہیں سے
پڑتی ہے بھنک کان میں ہلکی سے بھی ہلکی

دھوپ "آج" کی ہر چند کڑی ہے، پر ابھی تک
سپنوں کے گھنے پیڑ تلے چھاؤں ہے کل کی

رہ جائیں نہ آشاؤں کے یہ پھول جھُلس کر
حالات کے جھونکوں میں تپی ریت ہے تھل کی

لگتا ہے، ہری ہونے کو ہے ڈال سمے کی
کونپل سی تو پھُوٹی ہے نئی بھور کے پل کی

کشور ناہید

○

نا بھی نہ کر، احساس مرجھا جائے گا   سرخ گالوں کا چمکتا رنگ زردا جائے گا

ں ہے سوچ کا انداز، دن یا رات ہو   لاکھ کیجے ترکِ صحبت، ربط بڑھتا جائے گا

ے لوگوں کی چاہت نے اُسے دھندلا دیا   وہ کہاں تک اپنی صورت کو بدلتا جائے گا

ں تشنہ رہے گی ریگِ ساحل کی طرح   جسم بھی شوقِ تعلق میں اُجڑتا جائے گا

جائے گا سورج ایک دن جل جل کے آپ   چاند پتوں کی طرح آخر کو مرجھا جائے گا

م جس سے ملو پہروں وہ یاد آئے گا پھر   ہاں مگر کچھ دن میں وہ چہرا بھی دھندلا جائے گا

ے اس سے بچھڑ کے بھول جائیں گے اسے   کب مگر اپنی طبیعت ہی کو بدلا جائے گا

ں خوئے تلون کے کھلے صحرا میں ہوں   مجھ سے ہی کب تیرے گھر کا رستہ ڈھونڈا جائے گا

ھلائے گا کچھ آخر شکستوں کا شمار   ہونٹ سی لوگی تو آنکھوں میں اُبھرتا جائے گا

ر یہ بھی مدت سے، تماشہ ہوں ترا   تو کہاں تک اپنے سائے سے الجھتا جائے گا

اندمالِ غم بھی ہے ناہید طرحِ تازۂ غم
تشنگی جتنی بڑھے، شعلہ بھڑکتا جائے گا

اسلم انصاری

○

درسِ آدابِ جنوں یاد دلانے والے
آ گئے پھر مری زنجیر ہلانے والے

کس طرح کھوئے گئے عکسِ رواں کی صورت
شہرِ ہجراں میں ترا کھوج لگانے والے

خمِ محراب پہ صدیوں کی سیہ گرد بھی دیکھ
طاقِ ویراں میں لہو اپنا جلانے والے

غور سے دیکھ، کوئی ہے پسِ تصویرِ خزاں
ورنہ کس سمت گئے رنگ جمانے والے

فصلِ بے برگ کچھ ایسی بھی تو بے رنگ نہیں
داستاں عہدِ بہاراں کی سنانے والے!

زہراب زہر ہے، بکتا نہیں کا پہ تریاک
مر گئے زہر کو تریاک بنانے والے

دفِ گُل ٹوٹ گئی دستِ صبا میں لیکن
رقص کرتے ہی رہے وجد میں آنے والے

بجھ گئے شوخ دریچوں میں سلگتے مہتاب
سو گئے رات کی تقدیر جگانے والے

منتظر سب ہیں، مگر سب کو یہی دھڑکا ہے
اس خرابے کو پلٹتے نہیں جانے والے

اسلم انصاری

○

لِ ناتواں ٹھہر ہی نہ جائے فراقِ ساز، کہیں روحِ نغمہ مر ہی نہ جائے

شیشے میں ساعتِ نغمہ صدائے قافلۂ گل کہیں بکھر ہی نہ جائے

بسی گل کو فسونِ تنہائی رہِ خیال سے یہ کارواں گزر ہی نہ جائے

ہستی بھی دے غمِ جاناں یہ کیا کہ آئے کوئی تو پلٹ کے گھر ہی نہ جائے

خوں قریۂ جنوں سے ادھر یہاں جو آئے کوئی اس کی پھر خبر ہی نہ جائے

جاں گسل کا کیا ہوگا ترے کرم سے نصیبِ فا سنور ہی نہ جائے

ہے اس کو الم سے کیا نسبت سنا نہ عشق کا غم، عشق سے وہ ڈر ہی نہ جائے

گزرنا بہت کٹھن ہے، اگر ترے نثار، کوئی ایسا کام کر ہی نہ جائے

بہا دے آج کچھ آنسو، کہ پھر غنیمت ہیں

چڑھا ہے آج جو دریا، وہ کل اُتر ہی نہ جائے

سلیم شاہد

○

کھُلتی ہے گفتگو سے گرہ پیچ و تاب کی
پر کس سے کھُل کے بات کریں اضطراب کی

کافی نہیں ہے چشمِ تماشا کو رنگِ گُل
لائیں کہاں سے زخم میں خوشبو گلاب کی

اپنی برہنگی کو بچا تیز دھوپ سے
کرنوں میں بُو ہے جلتے ہوئے آفتاب کی

کچھ مَیں شجر سے ٹوٹ کے بے خانماں ہوا
ہاں کچھ ہوا نے بھی مری مٹی خراب کی

اک عمر ہو گئی ہے کہ میں جاں کنی میں ہوں
ایسی ٹھہر گئی ہے یہ ساعت عذاب کی

آہٹ نہ کر کہ میں تجھے جی بھر کے دیکھ لوں
ایسا نہ ہو کہ گر پڑے دیوارِ خواب کی

احساسِ تیرگی ہے تو سورج اچھال دے
ورنہ دعا نہ مانگ یہاں انقلاب کی

محکوم بستیوں سے سرکنے لگی ہے دھوپ
وہ عہد ہوں کہ جس نے شفق بے نقاب کی

بجلی چلی گئی تو وہ آنکھوں میں رہ گیا
اب چھُو کے پڑھ رہا ہوں عبارت کتاب کی

شاہد کہاں سے ہو کے گزرتی ہے آبِ جُو
رنگت تمام سرخ ہے کیوں سطحِ آب کی

بشیر احمد بشیر

○

، دن میں پلک تک کوئی خونِ جگر آیا　　برسوں میں کہیں چشمِ رواں کو ہنر آیا

اہی بس اب ربط ہے، وحشت ہوئی جب بھی　　دیکھ آیا در و بام کو، اک آہ بھر آیا

لون یہ اس دشت میں کس کی ہو یہ آواز　　آفت زدہ ہوگا کوئی، آیا ٹھہر آیا

ق

وس ہوئی چاپ سی آتی ہوئی نزدیک　　دیوار پہ سایہ سا لرزتا نظر آیا

ما جو پلٹ کر تو ہے وا در نہ دریچہ　　ہنستا ہوں میں اب رات مگر کتنا ڈر آیا

بت و سیار کی گردش رہی موقوف　　پھر ماہِ مبیں فرشِ زمیں پر اُتر آیا

ق

ا گیا پھر اذنِ سفر ہر سفری کو　　پھر قافلۂ صبحِ ازل موج پہ آیا

ہوئے، کامل ہوئے افسانہ گری میں　　اچھا ہوا یارو، تمھیں یہ بھی ہنر آیا

ماعتِ رفتہ، مری امید نہ دیکھیو　　گزرا ہوا لمحہ بھی کبھی لوٹ کر آیا

پہلے تو بشیر اک یونہی سادہ سی لگی بات

پرکھا تو سخن گنجِ جواہر نظر آیا

جون ایلیا

○

حال یہ ہے کہ خواہشِ پرسشِ حال بھی نہیں
اپنا خیال بھی نہیں، اُس کا خیال بھی نہیں

اے شجرِ حیاتِ شوق، ایسی خزاں رسیدگی
چادرِ برگ و گل تو کیا، جسم پہ چھال بھی نہیں

تو مرا حوصلہ تو دیکھ، داد تو دے کہ اب مجھے
شوقِ کمال بھی نہیں، فکرِ زوال بھی نہیں

مجھ میں وہ شخص مر چکا جس کا کوئی ثبوت تھا
سود ہے کیا، زیاں ہے کیا، اس کا سوال بھی نہیں

خیمہ گہِ نگاہ کو لوٹ لیا گیا ہے کیا ؟
آج افق کے دوش پہ گرد کی شال بھی نہیں

اُف یہ فضائے احتیاط، تاکہیں اُڑ نہ جائیں ہم
بادِ جنوب بھی نہیں، بادِ شمال بھی نہیں

مست ہیں اپنے حال میں دل زدگان و دلبراں
صلح و سلام تو کجا، جنگ و جدال بھی نہیں

وجہِ معاشِ بیدلاں یاس ہے اب، مگر کہاں
تیرے ورود کا گماں فرضِ محال بھی نہیں

پہلے ہمارے ذہن میں حسن کی اک مثال تھی
اب تو ہمارے ذہن میں کوئی مثال بھی نہیں

میرے زمان و ذات کا ہے یہ معاملہ کہ اب
صبحِ فراق بھی نہیں، شامِ وصال بھی نہیں

غارتِ روز و شب تو دیکھ، وقت کا یہ غضب تو دیکھ
کل تو نڈھال بھی تھا میں، آج نڈھال بھی نہیں

میں بھی بہت عجیب ہوں، اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

انور شعور

○

کیا چاہیے نہ تھا یہ کبھی پوچھنا تمھیں　　کیسے ہو تم شعور یہ کیا ہو گیا تمھیں

ماتھا جلا ہوا ہے کڑی دھوپ سے، اور آنکھ　　کہتی ہے رات رات کا جاگا ہوا تمھیں

کیا اضطراب تھا کہ سکوں چھین لے گیا　　کیا انقلاب تھا جو نہ راس آ سکا تمھیں

کس سمت سے چلی تھی کس آنگن سے آئی تھی　　بادِ سموم، جس نے پریشاں کیا تمھیں

کیوں گرد گرد ہے یہ قبا جس کے باب میں　　تھا ناگوار لمسِ لطیفِ صبا تمھیں

عرصے سے کیوں غزل کوئی شائع نہیں ہوئی　　کیوں نشر گاہ سے نہ کسی نے سنا تمھیں

وہ جمگھٹا وہ بھیڑ وہ جلسے کہاں گئے　　چھوڑا تمھارے چاہنے والوں نے کیا تمھیں

رہتے ہو کیوں اکیلے اکیلے اُداس اُداس　　کیا دوستوں سے آنے لگی ہے حیا تمھیں

میں نے تو کوئی دکھ تمھیں ہرگز دیا نہیں　　پھر دورِ جہاں کا کون سا غم کھا گیا تمھیں

میں سامنے ہوں جان ذرا آنکھ تو اٹھاؤ
مُدت ہوئی ہے دیکھے ہوئے آئینہ تمھیں

اقبال ساجد

○

غار سے سنگ ہٹایا تو وہ خالی نکلا
کسی قیدی کا نہ کردار مثالی نکلا

چڑھتے سورج نے ہر اک ہاتھ میں کشکول دیا
صبح ہوتے ہی ہر اک گھر سے سوالی نکلا

سب کی شکلوں میں تری شکل نظر آئی مجھے
قرعۂ فال مرے نام پہ گالی نکلا

راس آئے مجھے مرجھائے ہوئے زرد گلاب
غم کا پرتو مرے چہرے کی بحالی نکلا

کٹ گیا جسم مگر سائے تو محفوظ رہے
میرا شیرازہ بکھر کر بھی مثالی نکلا

رات جب گذری تو پھر صبح حنا رنگ ہوئی
آسماں جاگی ہوئی آنکھ کی لالی نکلا

رات مجھ سے بھی تو ہر گھر کے در و بام سجے
چاند کی طرح مرا عکسِ خیالی نکلا

آہ پھنکار کی مانند دلوں سے نکلی
کوئی بھی گھر نہ یہاں سانپ سے خالی نکلا

تخت خالی ہی رہا دل کا ہمیشہ ساجد
اس ریاست کا تو کوئی بھی نہ والی نکلا

ٹھٹھہ

صمد انصاری

○

محرابِ جنوں میں سرِ منبر نہیں پہنچے
جو لوگ غمِ ذات سے باہر نہیں پہنچے

گزرے ہیں کسی راہ سے مقتل کے مسافر
پہنچے ہیں سرِ دار تو اُڑ کر نہیں پہنچے

گرتا ہے جہاں تازگیِ فکر کا جھرنا
اُس چشمۂ حیواں پہ سکندر نہیں پہنچے

وہ تیر بھی سینے میں کھٹکتے ہیں ہدف کے
وہ تیر جو ترکش سے کماں پر نہیں پہنچے

الفاظ کو دیتے ہیں جو الہام کی صورت
بازارِ سخن میں وہ پیمبر نہیں پہنچے

مہکے ہیں وہی رات گلابوں سے زیادہ
وہ داغ جو زخموں کے برابر نہیں پہنچے

جو دل میں اُتر جاتے ہیں بے لفظ معانی
فن تک وہ صمدؔ حسن کے تیور نہیں پہنچے

صدیق افغانی

○

بوالہوس ہم ہی نہ تھا، وہ بُت بھی ہرجائی نہ تھا
پھر بھی ہم بہروپیوں کو خوفِ رسوائی نہ تھا

آندھیوں نے سب مٹا ڈالے نقوشِ رہگزر
ریت کے سینے پہ داغِ آبلہ پائی نہ تھا

رات کے کالے کنوئیں میں چھپ گیا سایہ مرا
اس سے پہلے تو کبھی یہ رنگِ تنہائی نہ تھا

درد کا گرداب، موجِ اشک، سیلِ آرزو
دل میں اک ناسور تھا زخمِ شناسائی نہ تھا

وہم کا پیکر تھا آویزاں در و دیوار پہ،
کھڑکیوں میں چاند، محوِ جلوہ آرائی نہ تھا

سبز پیڑوں کے تنے کٹ کٹ کے کیوں گرنے لگے
اے ہوا! میں قتل و غارت کا تمنائی نہ تھا

کیا تر و تازہ تھا آبِ صبح سے نخلِ شفق
بجھتے سورج میں تو یہ اندازِ رعنائی نہ تھا

ایک اک کردار تھا اپنی اداکاری میں گم
اس تماشا گاہ میں کوئی تماشائی نہ تھا

مرگیا صدیق کوہِ غم سے ٹکر مار کر
سر میں سودا تھا، مگر ذوقِ جبیں سائی نہ تھا

صدیق افغانی

○

تھا یا حقیقت، ذہن تاریکی میں تھا

جل رہا تھا آگ میں جنگل، دھواں پانی میں تھا

ں پہ جما تھا قطرۂ خونِ گلاب

لوگ یہ سمجھے کہ سونے کا اثر مٹی میں تھا

رج ہوا سے چھڑ گیا سازِ شمیم

ورنہ ہر گُل مضطرب زندانِ خاموشی میں تھا

جب انگلیاں کتنی پشیمانی ہوئی

بند اک پھیلا ہوا صحرا مری مٹھی میں تھا

آ کر بجھا، میری طبیعت کا چراغ

میں کہ صدیوں سے فروزاں کنجِ تنہائی میں تھا

ب میں نے وہ پیکر تو میلا ہو گیا

اب کھلا یہ راز۔ چاہت کا مزا دوری میں تھا

میں نے جب صدیق دوڑائی زمانوں پہ نظر

اک جہاں سمٹا ہوا لمحے کی پہنائی میں تھا

ریاض مجید

○

چھوڑ میرا ساتھ، خود کو ختم کرنے دے مجھے
زندگی اے زندگی! مت روک، مرنے دے مجھے

منزلوں کی راہ تکتے تکتے آنکھیں بجھ گئیں
چلتے چلتے تھک گیا ہوں، اب ٹھہرنے دے مجھے

روزِ پیدائش سے زنجیرِ سفر میں قید ہوں
اے دلِ آوارہ! اب آرام کرنے دے مجھے

ہو گیا ہے ختم کھارے پانیوں کا سلسلہ
دیکھ، دھرتی آ گئی ہے، اب اترنے دے مجھے

مجھ کو اَن دیکھی زمینیں دیکھنے کا شوق ہے
میں ہواؤں کی امانت ہوں، بکھرنے دے مجھے

سب مرے بوسیدہ خدّ و خال سے بیزار ہیں
اے بدن! اب اور کوئی سوانگ بھرنے دے مجھے

روح کا کانٹا ہے، ناآسودہ خواہش کی خلش
جو مرا دل چاہتا ہے، کر گزرنے دے مجھے

میرے مردہ جسم سے کچھ اور پتھر باندھ دے
موج ابھارے بھی اگر تو مت ابھرنے دے مجھے

اے گلی کوچوں کے شور و غل! مرے پیچھے نہ آ
اپنے اندر کی صدا پر کان دھرنے دے مجھے

سہہ چکا ہوں ہر سمے کا قہر اپنی جان پر
اے ریاضؔ! اب اپنے بال و پر کترنے دے مجھے

ریاض مجید

○

محبوس اپنے ظاہری پیکر میں ہوں
شعلۂ مضطر ہوں میں لیکن ابھی پتھر میں ہوں
سے نکلنا بھی مجھے دشوار ہے
دیکھ میں کس بے کسی کے گنبدِ بے در میں ہوں
سب مگر کوئی مجھے پڑھتا نہیں
گزرے وقتوں کی عبارت ہوں عجائب گھر میں ہوں
ہے کوئی اور شرم آتی ہے مجھے
یہ سزا کیسی ہے ؟ میں کس عرصۂ محشر میں ہوں؟
ہے میں اپنے سابقوں جیسا نہیں
میں بہادر ہوں مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں
کچھ بنانے میں مرا بھی ہاتھ ہے
میری جانب دیکھ میں بھی تیرے پس منظر میں ہوں
بجنے والا ہے جو آگے بڑھے
میں اکیلا دیوتا جلتے ہوئے مندر میں ہوں
مجھ سے بھی اُڑتے ہوئے لمحے نہ پکڑے جا سکے
میں بھی دنیا کی طرح حالات کے چکر میں ہوں

گوہر ہوشیار پوری

○

شاعری بات نہیں گرمِ سخن ہونے کی
شرط ہی اور ہے شائستۂ فن ہونے کی

بس کہ ہر دم مجھے بالیدگیٔ روح کی فکر
روح کو فکر ہے وارستۂ تن ہونے کی

پرتوِ رنگ سے گلگوں ہُوا معمورۂ چشم
دھوم ہے کوئے تماشا کے چمن ہونے کی

رم بہ رم سلسلۂ موجِ غزالانِ خیال
دشتِ غربت کو بشارت ہو وطن ہونے کی

حق پرستی کو یہاں کون ہے آمادۂ دار
کس کو توفیق ہے بے گور و کفن ہونے کی

یا بچے گا نہ سحر تک کوئی درماندۂ شب
یا سحر ہی نہیں "خاکم بدہن" ہونے کی

درد کی سالگرہ خیر سے گزرے گوہر
آ گئی رات وہی چاند گہن ہونے کی

۱۹۵۳ء

فضیل جعفری

○

ب لیکن نہیں پاتے خود کو
، اپنے ہی سائے ہوئے لوگ

بے نام بگولوں کی طرح
یان لبسائے ہوئے لوگ

م کے صحراؤں میں
یں نہائے ہوئے لوگ

○

شہر لب و رخسار میں مرنے نہیں دیتیں
کچھ مصلحتیں حد سے گذرنے نہیں دیتیں

ایسا کوئی جادو تری یادوں نے کیا ہے
نہ خانوں سے ماضی کے ابھرنے نہیں دیتیں

آوارہ حسیناؤں کے مانند ہوائیں
منزل پہ مسافر کو ٹھہرنے نہیں دیتیں

زاہد فارانی

○

ہے میرے سر سے کوئی بوجھ اتارنے والا
پکارتا ہے یہ ہمدم پکارنے والا

پھرا ہے یوں وہ رخِ آئینہ نما مجھ سے
کوئی نہیں مری صورت سنوارنے والا

بنا ہوں سینۂ دریا کا بوجھ مدت سے
کوئی رہا ہی نہیں پار اُتارنے والا

بدلتی جاتی ہے حالت زمیں کے چہرے کی
کہ آسماں ہے نیا روپ دھارنے والا

اثر کے کارگہِ فن میں فتح یاب ہوا
بساطِ دہر پہ ہر روز ہارنے والا

میں اپنے عہد کا صناعِ شعر ہوں زاہد
مرا قلم ہے نئے نقش اُبھارنے والا

○

ستارے چپ ہیں کہ نغمہ سرا سمندر ہے
شبِ خموش کے دل کی صدا سمندر ہے

سکوتِ لب کو صداؤں کا پیش رو سمجھو
کہ رود بار کے آگے کھلا سمندر ہے

وہ دیکھتا ہے مرے اضطراب کو ہنس کر
میں تیز رو ہوں وہ ٹھہرا ہوا سمندر ہے

مہ و نجوم دکھاتے ہیں آئینہ اس کو
فلک کے سامنے چہرہ نما سمندر ہے

تھکے چلے ہیں مسافت کا نقش اہلِ طلب
ہوا سروں میں ہے اور زیرِ پا سمندر ہے

نظر میں صورتِ ساحل ابھی نہیں آئی
مرے سفر کا ہر اک مرحلہ سمندر ہے

کیفی جامپوری

O

بلبلو! وقتِ نوا تو دیکھو
اور گلشن کی فضا تو دیکھو
کس کو آوارہ سری تھی منظور
دشت کے صبح و مسا تو دیکھو
ایک دامن بھی سلامت نہ رہا
شوخیِ دستِ صبا تو دیکھو
میرے اشکوں میں وہ سرخی نہ سہی
اپنے ہاتھوں کی حنا تو دیکھو
ہنستے ہو چاک گریبانوں پر
تم ذرا اپنی قبا تو دیکھو
لطفِ نغمہ پہ مٹے جاتے ہو
سینۂ نغمہ سرا تو دیکھو

O

سامنے دشتِ وفا ہو جیسے
راہرو آبلہ پا ہو جیسے
ترے لہجے کا یہ دھیما پن بھی
عالمِ رنگ و نوا ہو جیسے
چاندنی رات کے سناٹے میں
کوئی دل چیخ رہا ہو جیسے
میں نے محسوس کیا ہے اکثر
تو ابھی اُٹھ کے گیا ہو جیسے
اہلِ دل کا یہ سکوتِ پیہم
ماتمِ مرگِ وفا ہو جیسے
ہم ہیں بدنامِ تمنا ہم سے
شہر کا شہر خفا ہو جیسے

ظفر ابنِ متین

○

سوچتا ہوں کہ میں آج رازِ نہاں کھول دوں
بند کمرے میں گھٹتا ہے دم، کھڑکیاں کھول دوں

کیا کروں، میرے لب ہیں شکایت سے نا آشنا
ورنہ اک دن بھرم تیرا اے مہرباں، کھول دوں

پڑھ لیا دل کا مضمون چہرے کے عنوان سے
تو نہ مانے تو میں آج سب سرخیاں کھول دوں

میری چُپ ہی بھری بزم کا اب تو موضوع ہے
کیا بنے اہلِ محفل پہ، گر میں زباں کھول دوں

چُپ رہوں میں تو اک نقطۂ بے حقیقت سے کم
اور بولوں تو ہر رازِ کون و مکاں کھول دوں

○

ویراں روش روش ہے، چمن جا کے کیا کریں
اُڑتی ہے سر پہ خاک، ہوا کھا کے کیا کریں

جنگل سہی، سکوں تو ہے پیڑوں کی چھاؤں میں
گھر تپ رہا ہے دھوپ سے، گھر جا کے کیا کریں

رہتے ہیں اور لوگ بھی کچے مکان میں
بادل گرج رہے ہیں تو گھبرا کے کیا کریں

پہنچے گی کیا نحیف صدا بامِ عرش تک
صحرائے بے کنار میں چلّا کے کیا کریں

ساری فضا ہے کرب کی چیخوں سے ہمکنار
ایسی اُداس رُت میں غزل گا کے کیا کریں

اختر انصاری اکبر آبادی

○

ں وہ اک مہ جمال ساتھ رہا
یسے کوئی خیال ساتھ رہا

ئی ماضی نہ کوئی مستقبل
ر زمانے میں حال ساتھ رہا

ب کہاں وہ رفیقِ تنہائی
ں تھا جب تک، ملال ساتھ رہا

کہاں اور تمہاری بزم کہاں
ں تمہارا خیال ساتھ رہا

ٹ گئے سب رفیق دنیا کے
ے میں خستہ حال ساتھ رہا

ناصر صدیقی

○

نہ اجنبی کی طرح اور نہ آشنا کی طرح
وہ میرے پاس سے گزرا مگر ہوا کی طرح

سمٹ نہ جائے کہیں آہٹوں میں لغزشِ دل
مٹا رہا ہے کوئی مجھکو نقشِ پا کی طرح

ہوا سے دُور رہی تیری بات کی خوشبو
کوئی بھی جھونکا نہ آیا تری صدا کی طرح

تمام عمر اُسی چُپ کی جستجو میں رہا
مرے وجود میں اُتری تھی جو صدا کی طرح

یہ واقعہ ہے کہ انساں کے بھیس میں ناصر
ہر ایک شخص دکھائی دیا خدا کی طرح

ارشد ملتانی

○

صبحِ عشرت سے حدِ شامِ فغاں تک دیکھا
دلِ گم گشتہ کو کیا کہیے کہاں تک دیکھا

فصلِ گل تو فقط آغاز ہے بربادی کا
ہم نے آشوبِ بہاراں کو خزاں تک دیکھا

دل کے جل بجھنے کا عالم بھی عجب عالم تھا
کوئی شعلہ نظر آیا نہ دھواں تک دیکھا

تابِ نظارا کہاں، حوصلۂ دید کسے؟
آئینے ٹوٹ گئے تم نے جہاں تک دیکھا

دلِ مضطر ہی سے قائم ہے محبت کا فسوں
سلسلۂ شوق کا بے تابیٔ جاں تک دیکھا

مسعود جاوید

○

پھر بھی جینے کے لیے مرتا ہوا
میں بھی سورج کی طرح ڈھلتا ہو

چاند سے مجھ کو یہی شکوہ ہے
میں اسے چوم نہیں سکتا ہو

وقت پاگل نہ بنا دے مجھ
میں بھی احساسِ زیاں رکھتا

عشق نے جس کو چمن زار
جانے اس آگ سے کیوں ڈرتا

یہی معیارِ وفا ہے مست
آگ بجھتی ہے تو میں جلتا ہ

خالد احمد

○

ں قدر کرب سے اک کرب کا اظہار ہوا
ہر اظہار مری راہ کی دیوار ہوا

بح کی چاہ میں پتھرا گئیں میری آنکھیں
ب آزار مجھے دیدۂ بیدار ہوا

ر فنکار کی ضربوں کے نشاں ہیں اس پر
ب پتھر فقط اس بات پہ شہکار ہوا

ہ کو لے ڈوبا مرے کھوکھلے پن کا احساس
ری ناکامی کا باعث مرا معیار ہوا

، حقیقت ہے فسانوں کی طرح بھول نہ جائے
فسانوں میں اگر آج کا فنکار ہوا

○

ڈھونڈتی ہیں کب سے جیون کے سپنوں کی تعبیر
میری خالی آنکھیں میرے خوابوں کے نخچیر

بُت جب ٹوٹا، خود میرے اندر کا بُت چلّایا
مجھ پر گرز اٹھانے والے میری کیا تقصیر

پیار کے قیدی کب کرتے ہیں، اپنی رہائی قبول
کیسی حسرت سے تھامے ہیں ٹوٹی ہوئی زنجیر

رنگوں میں جب تک نہ ملا تھا رنگ حقیقت کا
خاکے خاکے ہی کہلائے ہو نہ سکے تصویر

ہنستے ہنستے میں نے کہہ دی اپنی کہانی آج
تنہائی میں کب تک خالد کوئی بہائے نیر

خالد شیرازی

○

تری طلب سے کہیں بے خبر نہ ہو جاؤں
میں پانیوں میں اُتر کر گہر نہ ہو جاؤں

مری اُکھڑتی ہوئی سانس دے اگر فرصت
تو اے چراغو! قریبِ سحر نہ ہو جاؤں؟

کسی شجر کی طرح میں بھی صبح کہرے سے
پٹ تو جاؤں، مگر بے بصر نہ ہو جاؤں

مجھے یہ ڈر ہے کہ اس دھوپ کی قلمرو میں
گنواؤں سایا تو گردِ سفر نہ ہو جاؤں

وہ خواب ہوں جسے دھڑکا لگا رہا خالد
اُچٹ کے آنکھ سے بے بام و در نہ ہو جاؤں

○

اگرچہ مجھ کو نہیں اعتبارِ موسمِ گل
میں کر رہا ہوں مگر انتظارِ موسمِ گل

خزاں نے چھیڑ دی رُوداد جلد بیت جھڑ کی
گوارا کر نہ سکی اقتدارِ موسمِ گل

نہ جانے کتنی ہولوں کی خاک چھان چکا
میں ایک برگِ غریب الدیارِ موسمِ گل

مجھے نہ رسکے چلو، خاک اُڑ رہی ہے جو
میں کیسے دیکھ سکوں گا دیارِ موسمِ گل

اگرچہ دونوں مکیں ایک ہی دیار کے
میں بے کلاہ تھا، وہ تاجدارِ موسمِ

عبداللہ جاوید

○

دنیا کی رسم و راہ سے بیگانگی ہے یہ
سچ پوچھیے، وفا نہیں، دیوانگی ہے یہ

وہ بھی بدل رہے ہیں جنھیں پُوجتا ہے دل
بدلے نہیں جو آپ، بڑی سادگی ہے یہ

بڑھتے چلو کہ منزلِ جاناں ہے ایک وہم
یارو، سفر سے کام رکھو، زندگی ہے یہ

جو سنگِ در کسی کی جبیں کا ہو منتظر
اسی سنگِ در پہ سر نہ جھکے، خواجگی ہے یہ

دستِ دعا اٹھیں بھی تو لب پر دعا نہ ہو
جس پر خدا بھی ناز کرے، بندگی ہے یہ

جاوید زندگی کے حقائق سے انحراف
جھوٹے تصوّرات سے وابستگی ہے یہ

○

شدّت کا درد اور مزا دے گیا ہمیں
مل کر ترا بچھڑنا بھی کیا دے گیا ہمیں

اک رسم ہے کہ ہم بھی تجھے بے وفا کہیں
سچ پوچھیے تو وقت وفا دے گیا ہمیں

اب اس غزال چشم کی وحشت کو کیا کہیں
سوغات میں جو دشتِ بلا دے گیا ہمیں

ہم چل پڑے ہیں موجۂ نکہت کے ساتھ ساتھ
جھونکا ہوا کا تیرا پتہ دے گیا ہمیں

مدّت ہوئی بچھڑ کے، مگر یہ نہیں کھلا
وہ درد دے گیا کہ دوا دے گیا ہمیں

جاوید اس کی یاد کے افسانے بن گئے
وہ اک طلسمِ ہوش رُبا دے گیا ہمیں

احمد ندیم قاسمی

○

سب نے انسان کو معبود بنا رکھا ہے
اور سب کہتے ہیں — انسان میں کیا رکھا ہے

یوں بظاہر تو دیا میں نے بجھا رکھا ہے
درد سنے دل میں الاؤ سا لگا رکھا ہے

منصفو! کچھ تو کہو، کیوں سرِ بازارِ حیات
مجھ کو احساس نے سُولی پہ چڑھا رکھا ہے

جس کے ہر لفظ سے ہو حشرِ صداقت پیدا
میں نے وہ گیت قیامت پہ اُٹھا رکھا ہے

ہاں — میں خاموش محبت کا بھرم رکھ نہ سکا
ہاں خدا کو تو ترا نام بتا رکھا ہے

لاکھ فرزانگیاں میرے جنوں کے صدقے
میں نے لُٹ کر بھی غمِ عشق بچا رکھا ہے

اور تو کوئی چمکتی ہوئی شے پاس نہ تھی
تیرے وعدے کا دیا راہ میں لا رکھا ہے

میری امید کی پتھرا گئیں آنکھیں، لیکن
میں نے اس لاش کو سینے سے لگا رکھا ہے

گھومتی پھرتی ہیں لیلائیں بگولوں کی طرح
قیس نے دشت میں اک شہر بسا رکھا ہے

حسنِ تخلیق کی، دھرتی میں جڑیں کیسا پھیلیں
تم نے انسان کو گملے میں سجا رکھا ہے

الطاف فاطمہ

گواہی

یخ کے بعد ہی سے چاند کے دن اور تاریخوں کے چرچے چل نکلے تھے۔ جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔ ہم اپنے خالی
ت روم کے سیمنٹ کے فرش والے نئے طویل افسردہ برآمدے کے گملوں سے خالی دروں کے ستونوں کے ساتھ کاسنی پلاسٹک سے بنی ہوئی
نیا جہان کی باتیں کرتے کرتے گھوم پھر کر چاند کی بات پر آہی جاتے اور خیال آرائیاں شروع ہو جاتیں۔ چاند انتیس کا ہوگا، چاند تیس کا ہوگا۔
ہے، عید جمعے کو ہونا چاہیئے۔ چاند گیارہ کو دکھائی دے گا، چاند بارہ کو ....

چاند! اُوہ یہ چاند صاحب بھی کتنے "امپورٹنٹ" ہو جاتے ہیں ..... اور خلا، والی پبلک اپنے حسابوں سمجھ رہی ہے کہ اس نے اب جا کر
ہے اور یہاں یہ ہے کہ یار لوگ تیرہ سو سال پہلے ہی اس پر قبضہ جا چکے ہیں ..... میں نے کرسی کو ذرا اور دھوپ کی تلاش میں اِدھر
ٹانگیں پھیلا لیں۔ مگر شاید میرے چہرے پر اس ہنسی کے آثار تھے جو میں نے اپنے دل میں محسوس کی تھی یوں کہ اب ارجمند نے اپنے مخصوص
دل والے انداز میں ہنسی کا سبب دریافت کیا تھا اور جب آپ کو کسی کا جارحانہ انداز دلچسپ معلوم ہوتا ہے تو اس کی بات کا جواب دینا
اہے۔

یا میں ہنس رہی تھی؟"

میں تو کیا۔"

ئی تو ہنسنے کو یہ تھوڑی بات ہے کہ میں بیمار ہوں اور سخت دکھیا ہو رہی ہوں۔ اور پھر بھی اتنی صبح صبح سردی میں بستر علالت سے اُٹھ کر
اپس جا کر اس کو بسانا پڑتا ہے۔"

ہی بات ہے کہ اسٹاف روم کے اس طویل افسردہ برآمدے کے گملوں سے خالی دروں کے درمیان بیٹھ کر ہم اصل بات قبول دینے کے
بھی بنا سکتے ہیں اس لئے کہ پینتالیس منٹ کے اس مختصر سے خالی وقفے میں ہم کو بہت باتیں کرنا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک کی ہوئی بات اور اس کا
غیر ضروری اور فرسودہ ہو جایا کرتا ہے ..... ورنہ اگر انسان جرح کرنے اور دل کی اصلی اور خالص سوچوں کو قبولوانے بیٹھ جائے تو کتنی
لئے کہ [illegible] سوچ کا بیشتر حصہ احمقانہ ہوا کرتا ہے۔

ن عید کے دن قریب سے قریب تر ہوتے گئے اور اسی حساب سے چوڑیوں، جوڑوں، جوتوں اور پروگراموں کے تذکروں میں بھی شدت
بھی یاد کرنا پڑا کہ عید ایک نہ ایک دن آ دھمکے تو کچھ بعید نہیں مگر کس دن؟ اس سے مجھے اس مرتبہ یوں دلچسپی نہ تھی کہ اگرچہ بوجہ علالت
ناقہ ہو چکتیں تو نہیں لے سکتا تاہم وہ اپنے آپ کو روزے سے "مستثنیٰ" ٹھہرانے کا مجاز ضرور ہو تا ہے اور انتیس تیس کے پھیر میں بھی نہیں پڑتا۔

چھٹی کا نوٹس میں نے بار بار پڑھا۔ پتہ نہیں کیوں اعتبار نہیں آرہا تھا چنانچہ اسی بے اعتباری کے عالم میں ارجمند اور میں بھٹکتے سسکیلتے اپنی
ی طرف آگے بڑھے تو معلوم ہوا کہ عید تو یہاں سے وہاں تک پھیلی پڑی ہے۔
"کیوں نہ ہم لوگ آج بیڈن سے نکلیں۔" فوراً ہی صلاح بن گئی اور بیڈن کے اندر یہ عالم تھا کہ جو کچھ اور جہاں کہیں تھا سر بازار آگیا تھا۔ سر پر
، ہمتے شامیانوں اور ان کے رنگ برنگے بانسوں والے دروں میں سے گزرتے ہوئے برات والے گھر کا سا سماں لگ رہا تھا۔
"ہر چیز کی کتنی افراط ہے اور کتنی کثرت۔ اجناس اور اشیا کا ایک سیلاب ہے جو حواس گم کئے دیتا ہے۔ اتنے کہ آٹے اور گھی کی گم گشتگی اور چینی
ے ہوئے نرخوں تک کا احساس رخصت ہو چکا ہے
"ارے بھئی میں یہاں ٹھیر کر یہ سجی ہوئی مٹھائیاں ضرور دیکھوں گی۔" ارجمند نے تقریباً مچل کر کہا تھا۔ "مجھے یہ نظارہ بہت اچھا لگتا ہے"۔
"ضرور دیکھو، اور اگر مقدور ہو تو کیمرہ اٹھا کر تصویر بھی کھینچو۔"
"مگر مجھے تو یوں لگتا ہے ——— "
"کیا؟"
کیا یہ ضروری ہے کہ انسان اپنی ہر ادھوری بات کو پورا اور مکمل کرے۔ بہرحال میں نے اپنی بات مکمل نہیں کی، بھلا یہ بھی کوئی کہنے والی بات
۔ہیں تو سارے بازار کی بیچ و بیچ سے آگے نکل بیٹھنے والی دوکانوں کو دیکھ کر بنات النعش گردوں والی پارٹی کا خیال آتا ہے کہ وہ شام ڈھلے سوائے
ا تو سرراہ آ بیٹھتی ہے لیکن کسی نظارے کا یہ کچھ کم احسان ہے کہ وہ آپ کو بہت سی باتوں کے وجود سے لاتعلق کر دے اور آپ کو یہ بھی نہ یاد رہے کہ زندگی
پر خلا بھی ہیں اور ہم نے کچھ کھو یا ہے، اس لئے کہ زندگی کا بھاؤ بہت چڑھ گیا ہے چنانچہ یہ ہوا کہ ہم خاموشی سے آگے بڑھے اور سویوں کے کافوری ا
ڈھیر پر چمکتے ہوئے چاندی کے ورق نے مجھے آنکھ ماری۔

"تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے"

"کیا کہا!"
آؤ سویاں خریدیں۔"
"یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کا جہاز عید کے تند تھپیڑوں میں گھر گیا ہو۔ پھر ارجمند نے عید کے جوڑے اور پروگرام کے متعلق پوچھی
"چنانچہ اب ہم بھی کپڑوں اور جوتوں کی باتیں کرتے ہیں۔"
"ارے میں گڑبڑا گئی عید کے دن اور پروگرام! یار کیا سوال ہے تمہارا بھی کہ بھئی عید کے دن ...."
گر ہاں واقعی .... ارجمند کے سوال کی معنویت اور حقیقت پر غور کرنے کے بعد اپنی ذا ۔ کس قدر حقیر شرمناک اور بے ضرورت محسوس ہوئی
اب کے سامنے الفاظ حلق میں اٹکے پڑے تھے اور مجھے اپنی ذات نہایت واہیات نظر آئی
مگر جس کو اپنی ذات جس درجے واہیات نظر آتی ہے اسی درجہ وہ اکڑتا اور اپنی خودی کو بلند کرتا ہے
چنانچہ میں نے بھی اپنی ذات کے گرد والی فصیل کو اونچا اور مضبوط کرنے کی کوشش کی۔
ارے بھئی عید کے پروگراموں کا کیا ہے۔ ایک پروگرام یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آدمی لحاف میں دبک کر مزے سے کتاب پڑھتا رہے
دیکھو میں نے آج ایک کتاب ٹالکر سے چھپتی ہے۔ اور بھئی روز روز کپڑے بدل بدل کر آتے رہو تو عید کے دن تو کپڑوں کی چھٹی ہونی چاہئے

ریت کا کام ہے کپڑے بدلنا ۔"

چھا!" لیکن مجھے معلوم تھا کہ ایسی باتیں کرتے وقت ہر انسان کے منہ پر سخت پھٹکار برسنے لگتی ہے ۔ چنانچہ اس روز اپنے کمرے میں گھستے ہی آئینے
جانا پڑا تھا ۔ یا سے اس وقت تک وہ پھٹکار تحلیل ہو چکی تھی اور یوں ایک بار پھر میں نے شیر ہو کر سوچا تھا : " اور جو اس وقت میں ایک مدبر مغز
تقریر جھاڑ دیتی تو بتاؤ یہ سب لوازمات ہیں ، عیاشی ہے کہ تم جس کو ثقافت اور روایتوں کا نام دیتے ہو وہ تو زی سوٹے بازی ہے
ن اور نکاس کے ڈھنگ ہیں اور زندگی کے بھاؤ چڑھ جانے کے اصلی سبب ..... " تو بھی کوئی میرا کیا بگاڑ سکتا تھا ۔
لن جب اپنی شال اور سوئیٹر واپس رکھنے کے لئے الماری کھولی تو ہاتھ نے خود بخود سیدھے ہاتھ والی دراز کو کھینچ لیا ۔ فولڈ پلاسٹک کے دریچے
سرمئی فائل بلا ارادہ ہاتھ میں آ گئی ۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ اس میں اپنا ارادہ بھی شامل ہو ۔ الماری کے قریب والی چوکی پر بیٹھ کر احتیاط سے سرمئی فائل کو
رڈاکٹر کی ۔ پوروں کے نیچے ایکسرے تھا ۔ سیاہی اور سفیدی مائل بھدے پن میں ابھرتے ہوئے لیبلوں کے پنجر کے اس طرف ۔ ایک بیمار مغموم اور یادیں
ی سا انسانی دل ___ اس وجود کا حصہ جسے دنیا کے سامنے چراغ جلا کر بھی ڈھونڈ لینا میرے بس میں تھا ۔
ر مجھے ہمیشہ کی طرح ناوقت باتیں یاد آئیں ۔
مجھے لڑکی یاد آئی جو برف باری میں لالٹین اٹھا کر اس راستے پر جا کھڑی ہوئی تھی جس راستے اس کی ماں کو کام پر سے واپس آنا تھا ۔ رات اندھیری
ور باد کا طوفان تند ۔ لڑکی کو ڈر تھا کہ ماں راستہ نہ بھٹک جائے
ر یوں ہوا کہ وہ لالٹین اونچی کئے اندھیرے راستوں کو تکتی رہی ۔ برف کے گالے چپکے چپکے اس کے وجود پر برستے رہے حتیٰ کہ وہ ان کی مکمل حفاظت
ر وہ لالٹین برف کے ڈھیر پر بے سود ٹمٹماتی رہی یوں کہ ماں نے اپنا راستہ بدل لیا تھا ۔
ں نے احتیاط سے فائل بند کی اور وہ بیمار اور مغموم دل فائل کے گتوں کے درمیان چھپ گیا جس نے انجانے میں ہر سال عید کا جوڑا تیار
نے فائل دراز میں واپس رکھ دی ۔
ر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی ۔
ب کیا کہا؟" کسی نے مجھ سے سوال کیا ۔
ں ایک لفظ بھی نہیں ۔ بولی ہوں میں سفید صفحے آپ اپنی گواہی دی ۔
ر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی ۔
ی بار بار میرے اندر گنگناتے جا رہا تھا ۔
شام چاند دیکھنے کی ذرا بھی خواہش نہ ہوئی اس لئے کہ میری طبیعت بدستور خراب تھی اور اس وقت بھی پروگرام کے مطابق میں اس بستر علالت
ر صبح سے خالی پڑا تھا ۔

ر غرمہ تیار تھا ۔ اور سویوں کے مزعفر کا پروگرام ناشتے کے بعد تھا ۔ گرم گرم چائے دان میز پر آ چکا تھا چنانچہ بستر چھوڑنا اب ضروری قرار پایا پھر
شپ شپ کرتے چڑھے ۔ آنکھوں پر عینک غائب تھی ۔

عید نہیں ہے !"

سے جاؤ ۔ عینک لگا کر اخبار پڑھو پھر اطلاع دو ۔"

"اونہوں، اخبار کی کیا بات ہے۔ رات اعلان ہوا ہے۔"

"مگر رات تو چاند کا اعلان بھی ہوا تھا۔"

"مگر یہ اعلان آدھی رات کو ہوا تھا۔"

"محترم صاحب، تم جب کوئی خبر اڑ گئے ویسی ہی لاؤ گے۔ خدائی ہڈ ہو گیا۔ وزارت بدل گئی، سفارت اکھڑ گئی، کہیں حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ حد یہ کہ شاستری مر گیا اس کے صبح صبح عید صاف کرا دی۔"

"پھر کیا خیال ہے؟"

"تم بتاؤ، روزہ کھول رہے ہو؟"

"اب جو سب لوگ فیصلہ کریں۔" اس کی آنکھوں کی گہری آسمانی رنگت ایسے میں اور بھی دلچسپ ہو جاتی ہے۔

"اچھا پھر جاؤ تم فیصلے کا انتظار کرو۔"

"میری نظر کھڑکی کے شیشوں سے باہر نکلتی چلی گئی۔ جنرل صاحب کے طویل سیاہ دروازوں اور سیاہ ستونوں والے گیٹ سے کچھ پرے جھگیوں والوں کے دو گروہ آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"آج عید نہیں ہے!" ایک گروہ نے زور سے کہا اور لفی میں گردنیں ہلائیں۔

"آج عید ہے!" دوسرے گروہ نے اسی انداز میں دعویٰ کیا اور ان کی ہلتی ہوئی گردنوں کا رخ اثباتی تھا۔

"آج عید ہے ..... آج عید ہے۔" اثباتی گردنیں اچھل اچھل کر کہہ رہی تھیں۔

میں نے شیرخورمے کا پیالہ دوبارہ اپنے سامنے کھسکا لیا۔

نیچے نہانے کے پانی ٹھنڈے ہوتے جا رہے تھے۔ کندھوں پر تولئے ڈالے مرد آپس میں بحث رہے تھے۔

"جی تو کیا آپ کا خیال ہے کہ شہر شہر کا اپنا چاند نکلوایا جائے؟"

"ارے میاں۔ گواہ ــــ گواہ ــــ گواہی کی شرائط ہیں جن کا گواہوں میں ہونا ضروری ہے۔"

"تو پھر عید ہو چکی ۔۔ کون ہے گواہی کے قابل آپ کہ میں؟" اب سب خاموش ہیں!

پھر یہ ہوا کہ گھرانا دو فریقوں میں بٹ گیا۔

میں نے بیماروں والے مخصوص ڈھیلے پن اور بے دلی سے صفائی شروع کر دی تھی۔ اس لئے کہ بلو کا موڈ آف ہو چکا تھا اور اس نے پھرتے لحاف الٹ کر بستر کو اور بھی اجاڑ دیا تھا

"ارے بھئی تم کیوں غصہ ہو رہی ہو؟ مسلمان ایسے ہی عید مناتے ہیں۔"

"مجھے تو یہ خیال آ رہا ہے کہ بچارے بیٹو کی پہلی تو عید ہے اور اس میں جھگڑا پڑ گیا۔"

"ارے بھئی بیٹو کی فکر نہ کرو۔ اس کی عید کے امکانات روشن ہو گئے ہیں اس لئے کہ اس کے ابا جان نے غسل خانے کا دروازہ بند کر لیا ہے۔"

چنانچہ روزہ ترک کرنے کے باوجود نمازی بٹ چکے تھے، جنرل صاحب کے گیٹ سے اس طرف متعدد لوگ اس حال میں کھڑے تھے کہ اوپر سے قمیص اتار چکے ہیں اور ٹانگوں میں پاجامہ میلا ہے۔ کسی کا دھڑ رمضان منا رہا ہے تو ٹانگیں عید۔ ایک صاحب کے سر پر فقط ٹوپی نئی تھی، باقی جسم پر میلے کپڑے ــــ

ی تھی۔ پھر میں نے ممّی نے حبیب کو دیکھا جو کراچی چھوڑ اپنے بیساکھی کے سہارے اپنی بیکار ٹانگ کو گھسیٹتا خاموشی سے نماز پڑھنے چلا جا رہا تھا ہی
ے چہرے پر تنہائی کا شدید احساس تھا۔ اس لئے کہ وہ معمول جس کے ساتھ وہ چھپاتا ہوا نماز کو جاتے ہوئے اپنی ساری محرومیوں کو بھول جاتا تھا
جمعہ میں مشغول تھا۔
، کھڑکی کے قریب سے ہٹ آئی تھی۔ "بلو! اب اٹھ کر کپڑے بدل ڈالو۔ آئندہ سے ہم کرسمس منائیں گے۔"

ں؟"

کریں پھر؟"
حبیب کے چہرے پر تنہائی کا وہ بھیانک احساس نہ نظر آتا تو ہو سکتا تھا کہ لحاف میں دبک کر کتاب پڑھنے والا پروگرام ملتوی ہو جاتا۔
راب ملنے والی پارٹیاں آ رہی تھیں جو بعض جگہوں سے منہ کی کھا کر آ رہی تھیں، اس لئے کہ بعض گھرانوں میں عید نہیں آئی تھی اور جب پارٹی
آوازیں دینا شروع کر دیئے تو انسان کو جس حال میں بھی ہو اسی حال میں حاضری دینا پڑتی ہے۔
ب عید منانے اور عید کا بائیکاٹ کرنے والی دونوں پارٹیاں آمنے سامنے تھیں اور بحث ہو رہی تھی۔ میں نے ہنسنے والوں کے لئے سچیاں
، الزامات اٹھتے ہوئے اُبھتے ہوئے فقرے سُنے۔
ند... گواہی... رویت ہلال... گواہی... گواہ کے لئے ضروری ہے...
اہی! گواہی! میں گواہی دیتی ہوں کہ ہم میں ہے کوئی گواہی کے قابل نہیں کہ گواہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ صادق، صالح اور مردِ مومن
ہ یہ پایا کہ اب میں کرسمس مناؤں گی۔ میں نے دوبارہ لحاف میں لپٹ کر سوچا تھا۔ اس لئے کہ جھگڑا آ گئے۔ اور یہ کہ کرسمس میں گواہی کی حاجت نہیں۔
رھا جس قوم کی تقلید کرتا ہے وہ اسی قوم کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔"
ں نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا اور لحاف کے اندر منہ کر کے سوچا گر یہاں تو کوئی نہیں بجز آمدرسے ٹائمز کے جو اپنی تصنیف کے ایک گوشے
پ کھڑا ہے چنانچہ میں نے اس کی تصنیف کو پرے کھسکا دیا اور نہایت ضدی پن سے سوچا تھا۔
یک ہے جو جس قوم کی تقلید کرتا ہے وہ اسی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ چنانچہ میں کرسمس منانے والوں کے ساتھ اٹھائی جاؤں گی۔
ین شاید یہ میرا مقدر نہیں کہ میں ان کے ساتھ اٹھائی جاؤں اور منصوبے میں ہونے والی اس امکانی تبدیلی کی تفصیل یوں ہے کہ.....
ں ہی یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے سفید برآمدے میں قدم رکھا معلوم ہوا کہ ہمشیرہ عزیزہ کے علاوہ گھر کے باقی لوگ بھی آؤٹ ہیں۔ اور یہ
ینی نے دی تھی جو ممّا اکیلے گھر میں وہ جا سفید ممّا دل گرفتہ نظر آتی ہیں، مگر آج خلافِ معمول ان کے چہرے پر ستارے چھوٹ رہے تھے۔
.... ہلو..... بیگم اڈاؤٹ! پھر وہ وکیں آپ جیسی عید۔
دلوں عیدوں کو گذرے بھی ایک دن ہو چکا تھا۔
و مسز میک! میں شکریہ خاک ادا کرتی۔ جبکہ یہ طے تھا اور ان کو نہیں معلوم تھا کہ ——"
—— کہ میں ان ہی کے ساتھ اٹھائی جانے والی ہوں۔"
ر اچانک ہی نینی اپنی عادت کے مطابق اکسا ئٹڈ ہو گئیں۔
، سے کون آیا ہے؟"

"کون ہے؟ میں نے بے دلی سے پوچھا۔

وہ اور بھی اکسائٹڈ ہو گئیں اور میز پر رکھے کچھ کیبوں، الائچی کی تھیلی اور ایسی ہی چند چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ دیکھو! اب بتاؤ کون آیا ہے؟"

"کوئی بنگال سے آیا ہے؟"

"نہیں۔ نہیں" وہ ان کا سر خوشی سے اِدھر اُدھر ڈول رہا تھا۔

اور اب میں سمجھ گئی تھی کہ آنے والا کہاں سے آیا ہے۔ ایک لمحہ کو میرے اندر اکسائٹمنٹ نے جھرجھری سی لی۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد کسی شخص کے متعلق سننے میں آیا ہے کہ وہ اُدھر سے آیا ہے مگر وہاں سے کون آسکتا ہے۔ میں سوچنے لگی۔

"تمہیں معلوم ہے کیا ہوا۔ میں یہاں اس کرسی پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی، کہ مجھے محسوس ہوا کوئی جھکا ہوا مجھے غور سے دیکھ رہا ہے۔ نظر اُٹھائی ....." اور وہ ایک دم ضرورت سے زیادہ اکسائٹڈ ہو گئیں اور لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگیں: "میں چونک پڑی میں ستے اُٹھ گلے سے چمٹا لیا۔

"اوہ مائی ڈارلنگ، مائی لِٹل فرینڈ ــــ پھر وہ کہتی رہیں: "میرا ہم رقص ..... اوہ ہی ڈانسیز سو ویل ....." وہ سفید چکنے فرش پر یہاں سے وہاں تک رقص کے انداز میں لہراتی چلی گئیں .... یہاں تک کہ ان کو دروں میں جڑے ہوئے جالیوں اور روغن کردہ لکڑی کے فریم کا سہارا لینا پڑا۔

پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"یونو، جب لڑائی ہو رہی تھی تو میں اس لڑکے کے لئے کتنا پریشان ہوتی تھی۔ مجھے خیال آتا تھا کہ وہ اب کاہے کو کبھی آئے گا ..... بکاز اسے تھو رو جنٹلمین ...." وہ پھر رکیں۔

"ارے میں تو بھول ہی گئی۔ تمہارے لئے چائے لاؤں؟" انھوں نے رُک کر پوچھا

"نہیں شکریہ! نہیں مجھے پاندان لا دو، میں پان کھاؤں گی۔ میرا گلا بہت دکھ رہا ہے۔"

"پاندان لا کر رکھنے کے ساتھ ہی انھوں نے سلسلۂ کلام جوڑ لیا۔

"میں نے ان کو بتایا کہ جب بھی بجے مالز کے رکارڈ لگاتے ہیں تو میں ہمیشہ یاد کرتی ہوں کہ دو سال پہلے کرسمس ایو پر اسی برآمدے میں رقص کیا تھا .... آف کورس، یہ لڑکا کتنا اچھا والز کرتا ہے۔ میں نے کتنا چاہا تھا کہ وہ ایسٹر پر بھی موجود ہو لیکن اس کا ویزا ختم ہو چکا تھا ......"

میں نے دیکھا ان کا بوڑھا اور پرشکن چہرہ خوشی سے تمتایا ہوا تھا اور آنکھوں میں کچھ پا لینے والی سچی چمک ....

میں نے کرسی سے ٹیک لگا لی ..... دن دھندلا اور مطلع ابر آلود تھا .... اور میرے سامنے برآمدے کے سفید فرش پر کھڑی وہ بوڑھی عورت اندر سے بہت تنہا تھی اور جس پر ہر دوسرے تیسرے مہینے افسردگی کے دورے پڑتے رہتے تھے اور واقعی یہ احساس کتنا شکست خوردہ ہو سکتا ہے کہ بچے اب بڑے ہوتے جا رہے ہیں۔ اب مجھ سے کرسمس پر بھی نہیں بولتے۔ اپنی ذات کی بے مصرفی اتنی ہی تھکا دینے والی کہ پھر انسان بچوں کے کمرے میں نیچی سی کرسی پر اسکارف باندھ کر اور بائبل ہاتھ میں لے کر بیٹھ جائے۔

اور یہ کتنی اچھی بات ہے کہ تمہارا بوڑھا دل مسرور ہے چنانچہ میں تم کو یہ یاد دلانے کی کوشش نہیں کروں گی کہ تم جس شخص کی آمد

تم سے اسی قدر واسطہ ہے کہ تم اس گھر میں بچوں کی دیکھ بھال پر مقرر ہو جہاں وہ مہمان آیا ہے . . . . وہ عمر میں تمہارے اس بیٹے سے بھی بہت
جس سے تم نے اس بنا پر قطع تعلق کر لیا کہ اس نے کیتھولک فرقے میں شادی کر لی تھی اور اب لاپتہ ہے ۔
پھر بھی وہ شخص محض تم کو خوشی دینے کی خاطر تمہارے ساتھ رقص بھی کر لیتا ہے اور بڑے لگاؤ اور توجہ سے تمہارے ساتھ پیش آتا ہے' اس لئے
روپ میں اس کو وہ نیلیاں اور گورلیسیں بھی نظر آجاتی ہیں جنھوں نے اس کو پالا، پروان چڑھایا اور تربیت دی اور یہ کہ تم ان سب باتوں کی
حقیقت سے بھی واقف ہو کہ وہ آپ بھی اندر سے تمہاری طرح تنہا ہے جیسے ویرانے میں کھڑا ہوا ایک تنہا درخت ۔
میں چپ چاپ بغور اس تمتماتے چہرے کو دیکھتی رہی جس کے ساتھ میں اُٹھائی جانے والی تھی ۔
نہیں معلوم کہ مسیحا خضر کی ملاقات کا کیا انداز رہتا ہوگا البتہ یہ مجھے خوب معلوم تھا کہ ہمدم دیرینہ سے لوگ باگ کس انداز سے ملتے ہوں گے اور جبکہ
نہیں متعدد ہمدمانِ دیرینہ جمع ہوں. چنانچہ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ صاحبانِ خانہ گھر آنے پر جب آنے والے کے کوائف سے آگاہ ہوں گے تو
کی غلغل مچے گی۔ لہٰذا میں نے یہی مناسب جانا کہ کمرے میں جا کر لحاف میں دبک جاؤں. عزیزی ہمشیرہ سے گپ لگانے کا امکان ختم ہو چکا تھا کہ
ن کو ایٹ ہوم کرانا اور کھانا کھلانا ہوگا۔ اور مجھے تو نینی نے اپنے اکسا ئمنٹ میں بچوں کے ساتھ ہی کھلا دیا تھا کہ گھر والوں کی آمد وغیرہ
ممکن نہ تھی ۔ اور مہمان اپنی رپٹ لکھوانے تھانے جا چکا تھا ۔
ایسے دھندلے دھندلے دنوں میں سو جاؤ تو رات کا دھوکا کھا کر بھولا بھٹکا کوئی خواب بھی آ نکلتا ہے لیکن ابھی خواب کے بکھرے بکھرے اور مختلف
بھی نہ جم پائے تھے کہ محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے یوں آوازیں دینا شروع کر دیں جیسے بھونچال آ گیا یا پھر کسی کو جگانے کے چھوٹے پیگ کی یاد ستا گئی ہو۔
ناچار ہڑبڑا کر لحاف پھینک کر باہر نکلنا پڑا۔ میں چائے کی ٹرالی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تو نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ سب کے سب چائے کا دور چلا رہے تھے
ہمشیرہ اپنے مخصوص نان سیریس انداز میں سگرٹ کے کش لگا لگا کر کہہ رہی تھیں' ارے کچھ سنا یہ کیا کہہ رہے ہیں ان کی باتیں تو سنیئے "
میں نے کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے اس مہمان کی طرف دیکھا۔ جوان سرحدوں کو عبور کر کے آیا جن کو کچھ دن پہلے ہم دشمن کے علاقے اور سرحدوں سے یاد
ہے ۔
میرے سامنے جانے پہچانے عینک کے اُجلے اور نفیس شیشوں کے اُس طرف جھانکتی ہوئی آنکھوں میں بڑی خاموشی اور عجیب سی بے حسی تھی کہ دیکھنے
م سا گھٹنے لگے اور ان آنکھوں کو اپنے محیط میں لئے ایک چہرہ تھا جسے پہلی نظر میں دیکھنے والا متانت کہہ تو سکتا ہے مگر اپنے اس فیصلے پر مطمئن نہیں ہوتا
ا فراتفری کے عالم میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی ۔
ارے امیری نظر ٹھٹک گئی . . . . تو تم بھی انھیں انسانوں میں سے ہو جن پر سے وقت یوں گذرتا ہے جیسے . . . . خیر کوئی بات نہیں وقت نے اکثر
فرمائے ہیں ۔
"اچھا تو کیا کہہ رہے تھے آپ ؟" میں نے صاحب سلامت کے بغیر ہی سوال کیا۔
"کچھ نہیں ۔" آنے والے کا چہرہ ہر قسم کے جذبے اور تاثر سے عاری تھا۔
میں اس مختصر سے جواب سے یوں مطمئن ہو گئی تھی کہ یہ تو عزیزی ہمشیرہ کا قاعدہ ہے کہ یوں ہی زور شور سے آوازیں دیں گی اور بعد میں پتہ چلے گا
تھی ہی نہیں. چنانچہ میں نے چائے کی پیالی سنبھالی اور اِدھر اُدھر دیکھا ۔ دن کے اس پچھلے پہر سماں اور بھی دھندلا گیا تھا۔ آسمان بہت بھورا اور بوڑھا سا لگ
نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ بادل اور دھند اور ٹھہرتی ہوا سے ہیں یا نہیں۔ پھر مونیک کے سفید برآمدے کے دروں میں بغیر جالی اور بغیر پینٹ والے فرنیچر نے
نشینی کے احساس کو اور بھی چمکا دیا تھا تو نیچر میں طرف کھلی ہوئی لان کی سبزی اور فضا میں دھند ہوتے ہوئے جالی جہاں تک تازگی سے زندگی کا احساس دلا رہی تھی

"کچھ نہیں کیوں! ابھی جو آپ بتا رہے تھے، بتائیے نا نہیں، چائے اور ڈالوں آپ کی پیالی میں؟"

"کیا بات؟" میں نے پھر سوال کیا اور بے وقوفوں کی طرح سب کی طرف دیکھا۔

"بھئی وہ سفید پوشوں والی بات بتاتے کیوں نہیں؟"

"ہاں وہ میں یہی بتا رہا تھا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ انہیں یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کی پشت پر ایک سفید پوش کھڑا ہے۔"

"کیا؟" میں نے اپنی کرسی اس ورے آگے کی کہ ٹرالی گھوم کر آگے جا پہنچی۔ "آپ سے کس نے کہا..... جھوٹ..... ہوں..... جھوٹ"

آواز پر وہی بے حسی طاری تھی: "ہم کیا جانیں، ہم کوئی محاذ پر گئے تھے، ہم سے تو انھوں نے کہا جو آپ سے لڑنے آئے تھے۔"

"فوجیوں نے؟"

"جی فوجیوں سے میرا مطلب سپاہی نہیں، افسروں نے کہا تھا۔"

"اللہ جانتا ہے!"

آنے والا عجیب بے بسی سے مسکرایا۔

"تو اس کا مطلب ہے ہم جن باتوں کو افواہیں، ایجوزن اور من گھڑت کہہ کر ٹالتے رہے ہیں....."

"وہ تو یہ تک کہتے ہیں جب بھی لاہور پر بم پھینکنے کی کوشش کی کسی سفید پوش نے اپنی چادر میں سمیٹ لیا۔"

"اب یہ آپ نے دل سے گھڑ لیا۔"

تب میری بے اعتباری پر اس شخص نے اس انداز سے دیکھا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے کہہ رہا ہو — جیسے کہہ رہا ہو — مجھے کیا غرض باتیں دل سے گھڑ گھڑ کر سناؤں اور وہ بھی تمہارے اپنے شہر کے متعلق۔

"اچھا ایک بات بتائیے۔ بالکل سچ سچ — یہ باتیں مسلمان فوجیوں کی زبانی سُنی ہوں گی؟"

"اس بات کی میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ اس موضوع پر کسی مسلمان فوجی سے قطعی گفتگو نہیں ہوئی۔"

"تو پھر!..... تو پھر......"

میرے کانوں میں وہ آواز گونجی جو اکتوبر ۱۹۶۵ء کی صبح بہت سویرے سویرے چائے کی میز کے قریب سُنی تھی۔

"چونڈہ میں کیا ہوا..... کیا بتاؤں! اگر کچھ کہوں گا تو یقیناً تم لوگ کہوگے — پھر گپ ٹھونکی!"

"ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اکثر اور بارہا گپیں ٹھونکی ہیں لیکن اگر اس وقت میں کچھ بتاؤں تو وہ گپ ہرگز نہیں ہوگی۔ مگر مجھے یقین ہے گپ کی مد میں ڈال دی جائے گی..... مگر میں بیان ضرور کروں گا اس لئے کہ اگر میں نے اب نہ بیان کیا تو شاید......" پھر وہ آواز بھاری میرے کانوں کے پردوں کے اس طرف اُترتی چلی جا رہی تھی — یہاں تک کہ میں نے سُنا:

"تب اس شخص نے کہ جس کا چہرہ چادر کی اوٹ میں چھپا تھا، اس جیپ کے ڈرائیور سے کہا، تم مجھ سے سوال کر کے میری راہ کھوٹی کر رہے ہو۔ آگے جا چکے ہیں اور اب میرے نام کا ڈنکا بجنے والا ہے — اس نے یہ کہا اور آگے بڑھ گیا۔"

تب میں نے نظر اُٹھا کر اس شخص کی طرف دیکھا جو میجر عمر تھا اور جو صبح منہ اندھیرے چائے پینے کے لئے ہمارے پاس کچھ آنسو اس کی آنکھوں سے سرک سرک کر اس کی وردی پر گر رہے تھے۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے میز کو مضبوطی سے پکڑ کر کہا، "پھر سے اس واقعہ کو وقت بہ جھاؤ مجھ پر سنانے کا عالم طاری ہو گیا یہی وہ وقت اور محاذ تھا جہاں ہم نے پہلے دن یا علیؑ کا نعرہ لگایا

"ہو سکتا ہے اس ڈرائیور کو الیوژن ہوا ہو"

"الیوژن.... ا" وہ ہنسا تھا " اچھا پھر یہ کرو کہ تم میرے ڈرائیور کو ایک پیالی چائے بنوا دو.... اور اب ہم چلے"

اور اب اس دھندلائی ہوئی سہ پہر میں چائے کی اس ٹرالی کے قریب بیٹھا وہ شخص، جو ابھی ابھی ان سرحدوں کو عبور کر کے آیا تھا جن کو الفاظ ن کی سرحدیں کہا کرتے تھے، کہہ رہا تھا "وہ کہتے ہیں کہ ایک تو جب وہ نعرے لگاتے تھے تو ہمارے جوان بدحواس ہو جاتے تھے. جیسے پیروں تلے کی سرک جاتی تھی"

وہ شخص آج ان سب باتوں کی گواہیاں دے رہا تھا کہ جن کو ہم نے الیوژن افواہ اور گپ کی مد میں ڈال دیا. اور یہ کہ وہ ان صالحین میں سے ہرگز نہ تھا جو ہوں پر عیدیں منائی جا سکتی ہیں لیکن خیر اس سب سے مجھے کیا میرا تو پروگرام بدل چکا ہے."

اور جو جس قوم کی تقلید کرے گا، وہ....."

خیر وہ سنو اب وہ پوچھ رہا ہے" اور یہ تو جی اسکاؤٹس کون ہیں .." اور اب وہ ایک اسکاؤٹ گنر کی جوانمردی کا قصہ سنا رہا ہے.... اور اب ہم ت آلکا راہوری ہے. اس شخص کا ان محاذوں سے کیا واسطہ. یہ قصے تو ان ہی کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں جو ہمارے محاذوں تک آئے ہوں گے.

"بات یہ ہے کہ ہمارے فوجی جب نعرے لگاتے تھے....."

"تمہارے فوجی " نہ جانے کس نے ٹوک دیا ہے.

بات کرنے والا سپٹا گیا ہے.... اور دوسرے لمحے سر اٹھا کر اس نے کہا ہے...... اس نے کہا ہے.. " ادہ ٹھیک ہے.... تمہاری فوج

اتفاقاً میری نظر شفاف شیشوں کے اس طرف ٹکرائی ہے. ان میں ہر ایک حق اور ہر ایک بات سے دستبردار ہو جانے والی کیفیت کتنی شدید ہے.... خفیف سی دھندلاہٹ بھی. اور اس مرتبہ ان کی طرف دیکھ کر وہ دم گھٹنے والا احساس نہیں ہوا بلکہ مجھے کچھ یوں لگا جیسے میں نے الماری کھولی ہے اور بے خیال ہے ہاتھ کی دراز سے ایک فائل نکالی ہے اور فائل میں سے ایکسرے نکالا ہے. دھندلائی ہوئی آنکھوں کی طرح دھندلا دھندلا ایکسرے اور ان میں ایک دل ہے اور اس دل میں ہر طرف برف کے ڈھیر ہی ڈھیر ہیں اور ہر ڈھیر پر ایک ننھا سا دیپ جھلملا رہا ہے.... مجھے ایک بار پھر لوسی یاد آ رہی ہے.... اپنی ماں کی راہ میں روشنی کرتے نکلی تھی اور اس کی ماں نے پرانا راستہ بدل لیا تھا. اس لئے کہ اس کو ایک قریبی اور سہل راستے کا بھی علم تھا.... اور پھر اکہ تمام رات برف کے نرم نرم گالے اس کے وجود پر چپکے چپکے برستے رہے حتیٰ کہ برف کے ڈھیر پر اس کی چھوٹی سی لالٹین ٹمٹماتی رہ گئی......

اور لوسی کی یہ کہانی بچپن سے کر آج تک میرے لئے پریشان کن رہی ہے. میں نے پہلی مرتبہ بھی یہ کہانی سن کر اپنے چھوٹے سے نرم نرم تکیے میں منہ چھپا اور جب اس کا ایک کونا بھیگ جاتا تھا تو میں چپکے سے اپنی آنکھیں سرکا کر کسی دوسری طرف رکھتی رہی تھی چنانچہ اب بھی میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں دوسری طرف ہیں اور یہ سمت تھی سامنے بیٹھے ہوئے انسان کا وہ سر جس پر وقت سے بہت پہلے برف سی گرتی جا رہی تھی. اس لئے کہ جب کچھ لوگ راستہ بدل لیتے ہیں تو ——

یہ تو لوگوں کے اپنے مسئلے ہیں.

پر میرا تو انفرادی مسئلہ کسی قوم کے ساتھ اٹھائے جانے یا نہ جانے کا ہے. اب میں کیا کروں کہ اب اگر میں ان کے ساتھ اٹھائی جاؤں تو پھر میری پشت کے لئے سفید پرچموں کی ضمانت کون دے گا.

اور عید کے منانے یا نہ منانے کا یہ ہے کہ چاند کی گواہی کے لئے تو ضروری ہے کہ گواہ کچھ ضروری شرطوں پر پورا اترتا ہو چنانچہ طے یہ پایا کہ چاند کی گواہی دینے والا ضروری ہے کہ وہ مومنین اور صالحین میں سے ہو لیکن بعض گواہیوں کی فضیلت اور صداقت کی دلیل ہی یہ ہے کہ گواہی دینے والے مومنین اور صالحین سے نہ ہوں. چنانچہ الیی ہوں گواہیوں اور الیوژن کی گواہی کے بعد میرے لئے یہ فیصلہ مشکل ہے کہ کس قوم کے ساتھ اٹھائی جاؤں.

مسعود مفتی

نئے پیمانے

ایک افسر تبدیل ہو گیا ـــــ دوسرا آ گیا۔

ملاقاتی کمرے میں علاقے کے معتبرین بیٹھے تھے اور باری باری دفتر میں ملاقات کے لئے جا رہے تھے۔ جہاں سے چپراسی نے قریشی صاحب کی تختی اتار دی تھی اور اب نئی تختی لگا رہا تھا۔

لوگ دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ موضوع نئے افسر کی ذات تھی کس قسم کا ہے۔ پہلے کہاں کہاں رہا ہے۔ وہاں وقت کیسے گزارا ہے۔ وہ کسی کا چچا ماموں، کسی کا لڑکا، کسی کی لڑکی کا سسرال۔ کسی کی برادری کا کوئی دور دراز کا رشتہ دار اور کسی کا ملنے والا ضرور کسی ایسے علاقے میں رہتا ہو جہاں اس افسر نے پہلے ملازمت کی تھی۔ تبادلے کی خبر کے ساتھ ہی خطوط چل پڑے تھے۔ اب اُس کے ماضی کی واضح تصویر ملاقاتیوں کے سینوں میں موجود تھی اور آواز میں اپنی اطلاعات کا تبادلہ کر رہے تھے۔

اتنے میں دو آدمی ملاقاتی کمرے کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ صاحب کا چپراسی لپک کر بنچ سے اٹھا۔ جھک کر فرشی سلام کیا۔ مصافحہ کر کے اپنا ہاتھ رکھا اور آگے بھاگ کر ملاقاتی کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

جب وہ اندر داخل ہوئے تو سب ملاقاتی کھڑے ہو گئے۔ دو ایک نے اپنی کرسیاں ان کے لئے چھوڑ دیں۔ باقی سمٹ سمٹ کر بیٹھنے لگے۔

انھوں نے سرسری انداز میں دو چار لوگوں کا حال پوچھا۔ چند ایک لوگ، جو آگے بڑھے تو ان کے ساتھ برتری سے ہاتھ ملایا اور خاموش

"جناب کی اطلاع اندر دوں؟" چپراسی خوشامد سے دانت نکال رہا تھا

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ـــــ سوچا ـــــ پھر ایک بولا "کتنی دیر ملاقاتی لے رہے ہیں؟"

"بس جی پانچ منٹ۔"

"تو بس ٹھیک ہے۔ جب سب فارغ ہو جائیں گے تو ہم اطمینان سے ملیں گے۔"

"بہتر حضور۔"

ان میں سے ایک بھاری بھرکم تھا۔ کوئی پچاس برس کا۔ سر پر سنہری کلاہ اور سفید کلف دار پگڑی، ساری مونچھیں۔ توند کے اوپر اچکن پھنسی ہوئی گھڑی کی زنجیر اچکن کے بٹن اور جیب کے درمیان لٹکتی ہوئی۔ ہاتھ میں مرصع چھڑی۔

دوسرا آدمی لمبا اور دبلا تھا۔ عمر سے پہلے ڈھلا ہوا قیمتی سوٹ میں ملبوس۔ سر کے کھچڑی بال سلیقے سے سجے ہوئے۔ ہونٹوں میں سگریٹ اور چہرے آنکھیں سنہری فریم والے کالے شیشوں سے ڈھکی ہوئی۔

ملاقاتی باری باری اندر جا رہے تھے۔ جب آخری آدمی گیا تو صرف یہ دونوں کمرے میں رہ گئے

اچکن والے نے سوٹ والے کی طرف دیکھا اور بولا "کیا خیال ہے جی آپ کا؟"

دوسرا خاموشی سے سگریٹ کا کش لگاتا رہا۔

"کچھ سنا آپ نے صاحب کے متعلق؟" اُس نے پھر پوچھا۔

سوٹ والے نے کش ختم کر کے راکھ جھاڑی۔ اطمینان سے دھوئیں کے دو تین چھلّے منہ سے اُگلے اور طنزیہ بولا "سنتے ہیں سخت افسر ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"یہی کہ پچھلی جگہ دو تین کلرکوں کو رشوت لینے کی وجہ سے نوکری سے برطرف کر دیا تھا۔" اُس نے دوسرے کی نظروں میں نظریں ڈال کر استہزا آمیز انداز سے ——— دو تین لمحے ایسے ہی دیکھتا رہا۔ پھر خود ہی ہنسنے لگا۔

اچکن والے نے سنجیدگی سے سر ہلایا "ہاں چھوٹے دل کا آدمی ہے۔ کسی کو پیسے بناتے نہیں دیکھ سکتا ——— بالکل تنگ نظر ہے۔"

دونوں کی آنکھوں میں حقارت لہرائی۔

"آپ شیخ انتظام الدین کو جانتے ہی ہیں؟"

"کون وہ جو اسمبلی میں ہیں"

"ہاں ہاں وہی ——— اب آپ ہی سوچیں کتنے بڑے زمیندار ہیں۔ لاکھوں کی جائداد۔ علاقے میں دور دور تک نام۔ مگر سنا ہے کہ اُنہوں نے ایک دو کام کرنے کے لئے صاحب سے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔"

"نہ صرف یہ جی" سوٹ والا بولا "بلکہ میں نے سنا ہے کہ سرکاری قرضہ جات کی وصولی کے لئے اُسے جیل میں ڈالنے کی دھمکی دی۔"

"بالکل ٹھیک سنا آپ نے" اچکن والا سر ہلا کر بولا "توبہ توبہ....."

چند منٹ خاموشی رہی اور پھر اچکن والا بولا "دراصل جی قصہ یہ ہے کہ صرف خاندانی آدمی ہی خاندانی کی قدر کر سکتا ہے مجھے تو یہ صاحب خاندانی نہیں لگتا ——— اب بھلا اس میں بات ہی کیا تھی۔ اگر شیخ انتظام الدین کی عزت کے لئے چند کمزوروں اور بیچاروں کو دبا دیتا اور ان کے خلاف کر دیتا۔"

"بالکل بالکل" دوسرے نے فوراً سر ہلایا اور سگریٹ کا لمبا کش لیا۔ پھر نتھنوں سے دھوئیں کی لہر چھوڑتے ہوئے بولا "پھر بھی ایسوں کا حشر بھی لیں نا، تار کے ذریعے تبادلہ ہوا۔"

دونوں خاموشی سے سوچنے لگے۔

اتنے میں چپڑاسی آیا "آیئے جناب"

اچکن والا اُٹھ کر دفتر کی طرف بڑھا۔

صاحب نوجوان سا خوش خلق آدمی تھا۔ اُس نے اُٹھ کر اخلاق سے ہاتھ ملایا، حال احوال پوچھے گئے۔ نئی جگہ کی باتیں ہوئیں ——— پچھلی جگہ کا ذکر اتفاق سے اپنے خاندان کے دو چار ایسے لوگوں کا بار بار ذکر کیا جو صاحب کے خاندان کے دور دراز کے لوگوں کو جانتے تھے۔ باتوں باتوں میں بارت بھی کرا لیا گیا۔ "میرے دادا سارے پنجاب میں پہلے خان بہادر تھے ——— ۱۸۵۷ء کے غدر کے فوراً بعد انہیں سرکار کی طرف سے خدمات کے عوض خلعت بھی ملی تھی۔"

صاحب نے مروت سے مسکرا کر سر ہلا یا۔

"اور بھی میرے والدین پر بھی سرکار بڑی مہربان تھی۔ ۱۹۱۱ء میں دہلی میں جو دربار ہوا تھا اس میں اُن کو خاص طور پر قطار کے سرے کرسی ملی تھی ..... اور جب شاہ ایڈورڈ انگلستان کے تخت پر بیٹھا تو وہ تاجپوشی میں شرکت کے لئے ولایت بھیجے گئے تھے۔"

صاحب نے متاثر ہونے کے انداز میں ابرو اُبھارا تھا۔

ملاقاتی نرمی سے ہنسا۔ بہت خدمات تھیں جناب ہماری۔ میرے والد پر انگریز خاص طور پر مہربان تھے سب افسر شکار کیلئے ہماری زمینوں پر آتے

صاحب سر ہلاتا رہا اور ملاقاتی اپنا تعارف کراتا رہا۔ بعد ایک دفعہ صاحب نے اپنی گھڑی کی طرف بھی نگاہ کی مگر وہ نظر انداز کر گیا اور اپنے بزرگ انگریزوں کے تعلقات کے قصے سناتا رہا۔

کیا زمانے تھے جناب وہ بھی ــــ انگریز کا راج ـــ اب بھی یاد آتے ہیں تو دل کھل جاتا ہے۔"

صاحب کھڑا ہو گیا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا: "اچھا ملک صاحب، پھر کسی وقت تفصیل سے بات کریں گے۔"

ملاقاتی بھی اٹھ کھڑا ہوا اور قریب ہو کر قدرے دھیمی آواز میں بولا "ہم لوگ سرکار کے پرانے خدمت گار ہیں۔ کل دو بھینسیں بنگلے پر جب سوکھ جائیں گی تو اُن کی جگہ دوسری آجائیں گی۔"

"نہیں نہیں ملک صاحب۔" صاحب نے ہنس کر کہا۔ "آپ یہ تکلیف نہ کریں۔"

"تکلیف کیسی جناب! میں نے تو درجن بھر گائے بھینسیں رکھی ہی افسروں کے لئے ہیں۔ میرا کون سا اپنا کام رک رہا ہے ـــ بھجوا دوں گا جو شیخ صاحب کو دی تھیں۔ اُنھوں نے بھی تین سال استعمال کی ہیں۔ مجھے کیا فرق پڑے گا۔"

"نہیں نہیں۔ آپ بالکل تردد نہ کریں۔" صاحب نے ذرا بے چینی سے کہا۔

"اچھا تو" وہ اور قریب ہو گیا۔ "آج کل نئی فصل آئی ہے۔ دانے اور گھی بھجوا دوں گا۔"

صاحب نے بے صبری سے انکار میں سر ہلایا۔

"میرا کیا جاتا ہے جناب۔ گھر کے دانے ہیں۔ گھر کا گھی ہے۔ جہاں ہمارا اتنا بڑا کنبہ کھاتا ہے، ایک آپ کے کھانے سے کون سا فرق پڑ

صاحب انکار کرتا گیا مگر ملاقاتی نے اصرار جاری رکھا تو اس نے ذرا سختی سے کہا "ملک صاحب یہ میرا اصول نہیں ہے۔ آپ مجھے

ملاقاتی نے مایوسی سے اُسے دیکھا۔ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

"تمہاری گندم تیار ہے۔" وہ چپڑاسی سے سرگوشی میں بولا "آ کے لے جانا۔"

چپڑاسی نے جھک کر سلام کیا۔

سوٹ والا اندر چلا تو اس نے اچکن والے سے کہا "آپ ذرا انتظار کریں۔ میں فارغ ہوتا ہوں تو اکٹھے چلیں گے۔"

وہ اندر گیا تو صاحب بڑی خوش خلقی سے ملا۔ دو چار باتیں ہوئیں۔ پھر صاحب نے خود ہی پوچھ لیا: "آپ کی مل کیسی چل رہی ہے؟"

"کون سی؟"

"وہ جو یہاں ہے۔"

"اچھا اس کو کہہ رہے ہیں۔ میں نے سمجھا آپ نئی مل کا ذکر کر رہے ہیں۔" پھر سگریٹ کا کش لگا کر بولا "یہاں والی بھی اچھی ہے مگر میں اُسے

پارٹی مل جائے تو بارگین کروں۔"

بیچ رہے ہیں آپ؟"

مل جی یہ میری سب سے پہلی مل تھی۔ اس کے منافع سے اب میں سات فیکٹریاں اور لگا چکا ہوں۔ کچھ اس کی مشینری بھی پرانی ہو چکی ہے

(مارکر) تھنک اٹ!"

عقل کی داد لینے کے لئے اس نے فخریہ قہقہہ لگایا اور نکٹائی کی گرہ درست کی۔

صاحب بھی ضابطے سے مسکرایا "آپ کو تو شروع میں انکم ٹیکس بھی تو معاف ہوتا ہے نا۔"

جی لیکن وہ وقت اب ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے اسے بیچ کر اب نئی لگاؤں گا تاکہ اس پر ٹیکس ہالیڈے مل جائے ــــ کیا خیال ہے آپ کا؟

کیا کہہ سکتا ہوں۔ کاروباری چیزیں تو آپ ہی بہتر سمجھتے ہیں۔"

میں کاروبار تو ہر ایک کو کرنا چاہئے۔ اسلام نے بھی تجارت پر زور دیا ہے ــــ آپ کو بھی کاروبار کرنا چاہیئے۔"

خفیف سی ہنسی ہنسا۔

نہیں۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ اگر آپ کی ڈی زائر ہو تو میری نئی فیکٹری میں شیئرز خرید لیجئے۔"

کے صاحب نے قہقہہ لگایا "تو بہ کریں جی۔ ہمارے پاس اتنا پیسہ کہاں۔ تنخواہ میں بمشکل سفید پوشی سے گزارہ ہوتا ہے۔"

۔ تو آپ فکر نہ کریں۔ ڈونٹ یو وری اباؤٹ منی۔ ہمارے پاس ایک فنڈ ہے جس میں سے اپنے مہربانوں کو قرضے دے سکتے ہیں۔"

قرضہ ادا کرنے کو پیسے کہاں سے لائیں گے۔"

اگین اٹ ناٹ ڈی فی کلٹ یو کین پے اٹ بیک آؤٹ آف دی انکم آف شیئرز"

نے نفی میں سر ہلایا "کہتے ہیں جس کا کام اسی کو ساجے۔ آپ کاروبار کریں۔ ہم تو نوکریوں کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اسی سے گزارہ کریں گے۔"

تی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ جیب سے سونے کا سگریٹ کیس نکالا اور کھول کر صاحب کو سگریٹ پیش کیا۔

نا کیجئے میں تو پیتا نہیں۔"

نے خود ایک سگریٹ نکالا۔ ڈبہ بند کر کے سرے کو اس پر مارا اور ہونٹوں میں دباتے ہوئے بولا "بہرحال ..... یو کال ی تھنک اباؤٹ اٹ۔"

ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

کام تو کافی ہوگا آپ کے لئے" ملاقاتی نے کہا۔

ل کام تو کرنا ہی پڑتا ہے، ملازمت جو ہوئی۔"

ں بور ہو جائیں تو ریلیکس کرنے کے لئے لاہور مری وغیرہ کا چکر لگایا کریں۔"

صاحب مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

نسٹنی لاہور، مری، کراچی اور راولپنڈی میں میں نے بنگلے بنوائے ہیں۔ دے آر ایٹ دی ڈسپوزل آف فرینڈز۔ آپ وہاں جائیں

لیے رہیں۔ مائی سرونٹس ول لوک آفٹر یو۔"

نے مسکراتے ہوئے کہا "کون جائے جی اتنی دور۔ یہاں سے ہی فرصت ملنا مشکل ہے۔"

"تو کوئی بات نہیں۔ وی کیپن اینچ اسے گے پارٹی ایپر"

افسر کھڑا ہوگیا۔ "اچھا جی۔ پھر ملیں گے۔"

ملاقاتی بھی کھڑا ہوگیا اور ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ "ہاں کبھی فرصت ملی آؤں گا۔ بہرحال وہیں اذاین اوپن آفر دیہ"

"خدا حافظ" صاحب نے کہا

ملاقاتی چلا۔ دروازے پر رک کر بولا۔ "میرے پاس کچھ اچھی انگلش وسکی آئی تھی۔ میں ایک کریٹ چپڑاسی کے پاس چھوڑ جاؤں گا۔"

افسر مسکرا دیا۔ "نہیں بھائی میں کوئی ڈرنک نہیں کرتا۔"

"اچھا تو پھر گڈ بائی"

باہر نکلے تو اچکن والا ملاقاتی بھی تیار کھڑا تھا۔ دونوں کار کی طرف بڑھے۔ ڈرائیور نے گاڑی چلائی تو اچکن والے نے پوچھا "کیسی رہی ملاقات؟"

"بوگس آدمی ہے" دوسرا بولا

پھر دونوں اپنی اپنی ملاقات کا حال ایک دوسرے کو سنانے لگے۔

کار چل رہی تھی اور وہ باتیں ختم کرکے خاموش ہوچکے تھے۔ اچکن والا سوچ سے نکل کر بولا "خدا بھی ایسے لوگوں کو افسر بنا دیتا ہے جنھیں افسری کرنا آتی ہے۔"

سوٹ والے نے اثبات میں سر ہلایا "اب آپ شیخ صاحب ہی کو لیں۔ کیا ریل پیل تھی ——— کیا رونق تھی ——— گندم آرہی ہے گھی کے ٹین اتر رہے دربار لگا ہے۔ دعوتیں اُڑ رہی ہیں خاندانی لوگوں کو سر پر بٹھا رہے ہیں۔ جس کام کے لئے کہا جیسے بھی ہوا کر دیا ..."

"وہ تو جی یاروں کا یار تھا" اچکن والا بات کاٹ کر بولا "کیا بات تھی۔ افسری تو وہ کر گیا ہے۔"

پھر دونوں اپنی پچھلی یادوں میں کھو گئے۔

کار چل رہی تھی۔

"مگر اچکن والا - مگر نہیں جلدی پیچھا چھوٹ جائے گا اس سے"

"ہاں جی" سوٹ والے نے زور سے سر ہلایا "اور کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

کار چلتی گئی ——— انجن غرّا رہا تھا ———

امّ عمارہ

آگہی کے ویرانے

"آپا، آپا! میری ماں کو رکھ لیجئے" بادشاہ نے چائے کی پیالی ہاتھ میں تھماتے ہوئے سرگوشی کی۔

کیوں بھلا تمہاری ماں کو کیوں رکھوں؟ وہ تو خود چلی گئی۔ اب ——" آسیہ نے چائے کی پیالی لیتے ہوئے بادشاہ کی طرف دیکھا۔ اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر اس کی زبان رک گئی۔ بادشاہ کا پھول جیسا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور اس کے ہر وقت مسکراتے ہوئے ہونٹ ایک سوال میں تبدیل ہو گئے۔

"کیوں بادشاہ خیریت تو ہے؟"

"آپا۔ آپا میری ماں کہتی ہے کہ اگر آپ اسے نہیں رکھیں گی تو وہ مجھے نیلو کے گھر لے آئے گی اور نیلو کی ماں مجھے مارے گی —— اور —— اور آپا وہ مجھے کپڑا بھی نہیں بنا دے گی۔ پھر میں عید میں نیا پینٹ اور شرٹ کہاں سے —— کہاں سے ——" بادشاہ کی بڑی بڑی آنکھوں سے موتی جیسے آنسو

"چپ چپ بادشاہ میں تیری ماں کو رکھ لوں گی۔ بس ——" ننھے سے بادشاہ کے آنسو دیکھ کے وہ چائے کا گھونٹ بھرنا بھول گئی۔ بادشاہ جس کے ننھے منے ہاتھ بکے ہوئے تھے جسے ایک مٹھی بھات اور ایک پینٹ اور قمیص کے لیے صبح سے شام تک ایک پاؤں پہ کھڑے رہنا تھا پھر بھی وہ بادشاہ تھا۔ یہ ماں باپ نام رکھتے وقت کیوں نہیں سوچتے۔ مایوسی کی تصویر بادشاہ پہ ایک نظر اس نے ڈالی۔

"بادشاہ! اے او بادشاہ، کہاں مر گیا ——" رفو کی تیکھی آواز کان چھید گئی۔

"جاؤ بادشاہ ورنہ آپا خفا ہو جائے گی" اس نے آہستہ سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"اونہہ، اسی پیار نے اس کا دماغ خراب کر رکھا ہے ——" رفعت نے چولہے کے پاس سے ہانک لگائی۔

"نوکر نہ ہوا بس مالک ہو گیا ہے کمبخت کی خاطریں ہو رہی ہیں ——" اس نے جھنجھلا کے چائے کی کیتلی اتنے زور سے پٹخی کہ چھناکے کے ساتھ ڈھکن ٹوٹ کر دور جا گرا۔

"کیا ٹوٹا رفعت؟" آسیہ نے آہستہ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں" رفعت نے چائے دانی کی ٹوٹی ہوئی ڈنڈی آنگن میں پھینکتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا "چائے دانی ٹوٹ گئی۔"

"چائے دانی ٹوٹ گئی اور تم کہتی ہو کہ کچھ نہیں ٹوٹا۔"

"ٹوٹنے کی چیز تھی، ٹوٹ گئی۔ میں کیا کروں ——" رفعت نے بکھری ہوئی چائے کی پتی جھاڑو سے سمیٹ کے نالی میں گراتے ہوئے کہا۔ اس کے لیے چائے دانی کا ٹوٹنا کوئی بہت ہی معمولی سی بات تھی اور ایسی ایسی چائے دانیاں جب چاہو آ سکتی ہیں۔ اس کے اس رویے سے

آسیہ کو سخت تکلیف ہوئی۔

"تیرہ روپے کی تھی یہ کیتلی اور تم کہتی ہو کہ ۔۔۔" آسیہ نے افسردگی سے چائے کی پیالی اُٹھا کے ٹھنڈی چائے ایک سانس میں

"کون سا فرق پڑ جائے گا، کیتلی ٹوٹ گئی ٹوٹ گئی۔ تیرہ روپے ہی کی تو تھی۔ آپ آسیہ آپا ایک ایک پیسے کے پیچھے ایسے مرتی ہیں جیسے

آپ کا سب کچھ ہے۔ اور پھر ۔۔۔"

"تم نہیں بولو گی تو اور کون بولے گا رفو۔ جب نمک کی ایک کنکری سے لے کے تمہاری شلوار کے ریشم تک کے بارے میں سوچنا

بھی تیرہ سو کے برابر ہوتے ہیں۔" آسیہ نے آہستہ سے کہا۔

ابھی پرسوں ہی رفو نے اس سے فرمائش کی تھی اب کے عید پر وہ اس کے لئے سیاہ ریشمی شلوار اور جاپانی چکن کی قمیص بنوا دے۔ کمال ہے حالانکہ ابھی

بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پچھلی عید کا شفون کا دوپٹہ اب تک ویسے ہی نیا پڑا ہے۔ اس نے بڑی فراخ دلی سے کہا تھا جیسے دوپٹہ نہ بنوا کر

بہت بڑا احسان کر رہی ہے۔

"اوہ آپ کو میری ریشمی شلوار کھل گئی ہے۔ چلئے میں نہیں بنواتی شلوار قمیص۔ بھلے کو آپ اس بادشاہ کے سنگھار میں لگے رہیے۔ ہمارا آپ کیا دا

کیا بکتی ہو رفو۔ یہاں بادشاہ کا کیا ذکر۔ تمہارا اس سے کوئی مقابلہ بھی ہے؟"

"وہ تو صرف کہنے کی باتیں ہیں۔ ابھی ابھی بادشاہ آپ سے میری شکایت کر رہا تھا اور آپ مزے سے سن رہی تھیں ۔۔۔"

"اور اسی جھنجلاہٹ میں تم نے کیتلی پٹخ ڈالی۔ خدا کسی کو عقل کا اندھا نہ بنائے"

"میں آپ نے میری شکایت سن سن کے اس بے ہودے کا دماغ آسمان پر کر دیا ہے ۔۔۔" رفو کو بادشاہ کے ہنستے مسکراتے چہرے

سے کیا کہ ہر وقت تھی تھی کئے جا رہے ہیں۔" اس نے ایک دن اعتراض کیا تھا۔

"اتنی ظالم مت بنو رفو۔ تمہیں کسی کی ہنسی پر کوئی اختیار نہیں۔ خدا کا شکر کرو کہ وہ اتنا ہنس مکھ ہے ورنہ روتی بسورتی شکل دیکھ کر

دل الٹنے لگتا ہے۔"

"مگر آپا ۔۔۔"

"بس چپ رہو۔ یہ بادشاہ نام کا نہیں دل کا بھی بادشاہ ہے۔ کیوں بادشاہ؟" اس نے مسکرا کے بادشاہ کی طرف دیکھا تھا۔

اور جب سے کے آج تک رفو کی دشمنی پکی ہو گئی تھی۔ موقع بے موقع اس کے کان اینٹھ دیتا، وہ چانٹے لگا دیتا اور بات بے بات

معمولی سی بات تھی۔

"مگر یہ واقعہ ہے آسیہ آپا کہ بادشاہ کو آپ نے بہت سر چڑھا رکھا ہے اور اب یہ بادشاہ ہر وقت ۔۔۔"

"تمہارا دماغ سچ مچ خراب ہو گیا ہے رفو ۔۔۔" آسیہ نے تعجب سے رفو کو دیکھا۔

رفو جو اس کے رشتہ کی بہن تھی لیکن اپنی بہنوں سے زیادہ پیاری۔ تنہائی کے اس کٹھن وقت میں جب ایک ایک کر کے سارے رشتے

اور آسیہ تو تنہا دیکھ دنیا میں ایک ایک کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی تو اچانک آنگن کا دروازہ کھلا اور چھوٹے چچا ہمیشہ کی طرح آنگن کے بیچوں بیچ

"اب انہیں کون سی مصیبت یہاں کھینچ لائی"

آسیہ ان کی صورت دیکھ کر لرز گئی۔ خاندان کے سب سے کڑوے انسان جنہیں دیکھ کے ابا کے پسینے چھوٹ جاتے تھے اور اماں کی جان

بڑے چچا کون تھے، کیا تھے؟ اس کے بارے میں اسے کوئی پتہ نہیں تھا۔ ان کو فقط گھر کے قریبی لوگوں میں ہوتا تھا اور بس ــ وہ یہ البتہ ضرور جانتی تھی کہ بڑے چچا ان کے اپنے چچا نہیں ہیں ـــــــ اور یہ انکشاف بھی اس پر اس دن ہوا تھا جب اس نے چھوٹے چچا کی گود میں بیٹھ کے مارے سوالوں کی ناک میں دم کر ڈالا تھا کہ:

"آپ اگر ابا کے بھائی ہیں تو ان کی طرح اچھے کیوں نہیں؟ آپ کی آنکھیں سیاہ ہونے کی بجائے بھوری کیوں ہیں۔ آپ مرچ کی طرح سوکھے کیوں ہیں، ابا اتنے گول مٹول ہیں؟ آپ کے سر کے بال ویسے لمبے اور سنہرے کیوں ہیں؟ آپ کی ناک ابا کی طرح اونچی اور چوڑی کیوں نہیں؟"

تو چھوٹے چچا نے چڑ کے کہا تھا "میرے ماں باپ الگ اور تمہارے ابا کے الگ۔ بھائی ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ میرے اپنے بھائی تھوڑے ہیں؟"

"ہائیں ـــ یعنی کہ ـــ"

"ہاں ہاں۔ بالکل۔ تمہارے ابا میرے ماموں کے بیٹے ہیں اور ـــــ"

"یعنی میرے دادا آپ کے ایسے ماموں تھے جیسے اماں کے ماموں ہیں جنید نانا؟"

"ہاں ہاں ـــ"

اللہ توبہ ـــ اسے دادا کے تصور ہی سے گھن آنے لگی۔ اتنی بڑی تیز شخصیت کا اتنا باوقار رہنا ـــــ "جنید نانا تو ایک دم کھوسٹ جیسے ہیں۔ تو بھلا ابا کے ابا ویسے تھے تو پھر آپ ابا کے اپنے بھائی ہو ہی نہیں سکتے ہیں، کیوں ہے؟" اس نے اپنے جانتے عقلمندی کی بات کی ـــ

"ارے نہیں بیٹی ـــ تمہارے دادا تو تمہارے ابا سے زیادہ ہاتھ پیر والے تھے تم کیا جانو میرے ماموں کو ـــ ان کے آگے بڑے بڑے جنید تو کچھ بھی نہیں ہیں۔"

"کمال کرتے ہیں چچا، ابھی خود ہی کہہ رہے تھے کہ آپ کے ماموں جنید نانا جیسے تھے اور اب ـــــ"

"اُف! او تو میں نے تمہیں اپنا رشتہ سمجھایا تھا"

"یعنی کہ ـــ"

"یعنی کہ کچھ نہیں۔ چلو بھاگ جاؤ میرے پاس سے ـــ"

"اماں اماں۔ یہ چھوٹے چچا کہتے ہیں کہ وہ ابا کے اپنے بھائی نہیں ہیں اور میرے دادا جنید نانا کی طرح کھوسٹ جیسے تھے جو ان کے ماموں ـــ پھر خود ہی بہکنے ہیں کہ وہ"

"چپ کرو اسے تم کو کیا لینا ان سب باتوں سے"

"ایں مگر یہ چھوٹے چچا بھلا ہمارے اپنے نہیں ہیں؟"

"اپنے ہی تو ہیں۔ تمہارے باپ کی پھوپھی کے بیٹے ہیں"

"اوہ! اب سمجھی میں چھوٹے چچا کی اماں، ابا کی ایسی پھوپھی تھیں جیسے میری زہرہ پھوپھی ہیں، ہیں؟"

"نہیں، فریدہ تمہاری پھوپھی ویسی نہیں ہیں۔ تمہاری کوئی پھوپھی ہیں ہی نہیں۔ تمہارے باپ اپنے ماں باپ کے اکیلے ہیں" اماں نے بیگم کے نام پر تیوری چڑھائی:

"ہوں! چھوٹے چچا بھی اپنے نہیں، زہرہ پھوپھی بھی اپنی نہیں ـــ چھوٹے چچا کے اپنے نہ ہونے کا تو اسے ایک ذرا بھی افسوس نہیں تھا کیونکہ وہ بری بری نہیں دلاتے تھے اس کے دو چار پیسے، بیڑی پینے کے بہانے مار لیتے تھے ـــ لیکن زہرہ پھوپھی کے اپنے نہ ہونے کا اسے بڑا دکھ

افسوس ہو رہا تھا۔

اتنی پیاری سی تھیں، اتنی نازک سی زبیدہ پھوپھی کہ بس اور اسے کتنا پیار کرتی تھیں ــــ جب دیہات سے آتی تھیں تو کہیں مٹی کے لڑو، کہیں آنکھیں روغنی پیٹھے ہیں ــــ خوشبودار چھوارے جیب میں بھر بھر دیتیں اور پیپہ بھر بھر کے گئی، شکرپارے اور پتہ نہیں کیا کیا اللہ بلا لاتی تھیں مہروت سے گودی میں ڈھوئے چلتیں۔ اماں سے لپک لپک کے باتیں کرتیں ــــ مگر اماں کی بھویں جب تک زبیدہ پھوپھی رہتیں دو دھاری تلوار بنی رہتیں لیکن زبیدہ پھوپھی کے رویے میں کوئی فرق نہ آتا ــــ کہیں اماں کی ساڑی زبردستی دھوئی جا رہی ہے تو کبھی ان کے لئے فرائیں سل رہی ہیں اور رات کو مزے سے ابا کی چارپائی پر بیٹھی ایک پاؤں کلیجے سے لگائے بیل کی طرح جھک رہی ہیں۔ ساتھ ساتھ اسے قصہ بھی سنا رہی ہیں، ابا کا پیر دب رہا ہے۔ ملازموں کو انعام و اکرام بھی مل رہے ہیں ــــ اور جب وہ جانے لگتیں تو لڑکر جاکر ابا اور وہ خود سب کے سب رنجیدہ ہو جاتے۔ بس ایک اماں اور دوسرے چھوٹے چچا (اگر وہ ہوتے تب) کے چہروں پر اطمینان کی لہریں دوڑ جاتیں ــــ جیسے بڑی بلا ٹل گئی ہو۔

ایک دفعہ جب زبیدہ پھوپھی ایسے ہی گئیں تو چھوٹے چچا نے اماں سے پوچھا "ٹل گئی بلا؟"

"ہاں مگر چھوٹے، یہ بلا تو تم نے سر چڑھا رکھی ہے۔ میاں گھوڑی تو تمہاری ہے لیکن نہ تم اسے لگام دے سکے اور نہ ہی سیدھے رستے پہ چلنا سکھایا۔ کیسے سوار ہو میاں؟" اماں ہنسیں

"آپ ہنستی ہیں بھابھی یہ کمبخت بڑی منہ زور ہے اور سچ پوچھیے تو وہ نام کو میری گھوڑی ہے ورنہ سوار تو وہی بڑا ہے ــــ صرف نام بدل گیا۔"

"میاں تم سخت بزدل ہو ــــ"

"ایسی بات نہیں بھابھی۔ دراصل ان سب باتوں کے باوجود میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ اور اب سچ پوچھیے تو وہ میرے دل پر چڑھتی بھی نہیں۔ بس آپ ہی بتلیے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ خدا کے بعد اگر کسی کو عزت کے لائق سمجھتا ہوں تو وہ ــــ"

"مگر چھوٹے میاں یہ بھی تو سوچو یہ میرا اجلاپا؟"

"یہ نا انصافی ہے بھابی۔ بلائی بنا کے رکھا ہے بھابی انھوں نے آپ کو کہیے نہیں ــــ بس یہ ذرا سا شوق ہے اور یہ تو آپ سے پہلے کا ہے اسی لئے انھوں نے مجھے ــــ خیر چھوڑیے ــــ"

"دیکھو میاں، میں عورت ہوں اور مجھ سے یہ سب کچھ دیکھی کہ ــــ اور تم کیسے مرد ہو کہ کچھ محسوس نہیں کرتے۔ کمال ہے ــــ"

"بات یہ ہے بھابی کہ میں نے کبھی اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ اور وہ میری ملکیت تھی ہی کب جو میں محسوس کروں۔ میں تو بس محل پر ٹاٹ کا بورڈ ہوں ــــ لاحول ــــ"

اور آتیہ منہ کھولے چھوٹے چچا اور اماں کی مکالمہ بازی سنتی رہی ــــ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا اور تو اور اماں جو ہر لمحے چھوٹے چچا سے جلتی تھیں اس طرح گھل مل کے باتیں کر رہی تھیں کہ اسے سخت تعجب ہو رہا تھا۔ ورنہ اماں تو بس اٹھتے بیٹھتے سخت سخت باتیں کہنے کی عادی تھیں۔ جہاں چھوٹے چچا نے اور اماں نے ہتھیار سنبھال لئے۔ ویسے چھوٹے چچا تھے بھی سخت اٹھائی گیرے۔ انھوں نے کسے بیٹیوں کی طرح گودوں کھلایا تھا ــــ اور پھر ایک دن مزے سے ان کے ہاتھوں کے کڑے سٹکے پردیس سدھار گئے اور اس کا ذرہ بھر بھی خیال نہیں کیا کہ اماں اس کے ہاتھوں میں کڑے نہیں دیکھیں گی تو اس کا کیا حشر ہوگا۔ اماں نے مارے غصے کے دھواں دھوں پیٹ کے رکھ دیا اور ابا نے قسم کھائی کہ زیور نام کی کوئی چیز اسے نہیں بنا دیں گے۔

اب یہ بھی ہونے والی بات تھی کہ ابا نے قسم کچھ ایسے وقت کھائی تھی کہ سرتا سر پوری ہو گئی اور دو دن کے اندر ابا کا جنازہ بیچ آنگن میں دھرا تھا

اگر اور کوئی وقت ہوتا تو آسیہ ہنس پڑتی۔ لیکن اس وقت وہ سچ مچ متفکر تھی۔ چھوٹے چچا کو اس نے بے اعتباری سے دیکھا۔۔۔ ان کی شخصیت کے بارے میں وہ بچپن سے سنتی آئی تھی کہ اگر سچ کو چھوٹے کا سایہ بھی پڑ جائے تو وہ آسانی سے جھوٹ میں بدل جائے۔ اور آج وہ اتنا بڑا جھوٹ سچ میں تبدیل کرنے پر مصر تھے۔۔۔ وہ پریشان سی سوچ رہی تھی۔ اور چھوٹے چچا رفّو کا ہاتھ پکڑے بڑے غور سے اس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور فریدہ پھوپھی جو اماں کی سگی تھیں برآمدے میں آ گئیں "اچھا آپ کب آئے؟ اور اس بار صاحبزادی بھی ساتھ ہیں۔۔۔ اب آپ کے سسر کے پاس کھلانے کو کچھ نہیں رہا کیا؟"

فریدہ پھوپھی کی بات سن کے آسیہ کی جان میں جان آئی۔ تو یہ سچ مچ چھوٹے چچا کی بیٹی ہے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ فریدہ پھوپھی اس کی پھوپھی ہیں، اس کے بارے میں مرتے دم تک اماں نے کچھ نہیں بتایا لیکن پھر بھی وہ اسے اپنی پھوپھی لگتی تھیں۔ چھوٹے چچا جو اماں کا خون تھے۔۔۔ فریدہ پھوپھی جن کی رشتہ داری بس یونہی تھی لیکن دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ چھوٹے چچا جہاں سارے زمانے کے لیے مشہور تھے۔۔۔ وہاں فریدہ پھوپھی کی گھر باہر سوائے اماں کے سب ہی عزت کرتے تھے۔ اور ان کی محبت کے قائل تھے۔ ان کا وقار تو ایسا کہ چھوٹے چچا جیسے منہ پھٹ آدمی بھی ان کا لحاظ کرنے پر مجبور تھے۔۔۔ ان کو دیکھتے ہی چھوٹے چچا کی نگاہیں جھک جاتیں۔ چہرے پر عجیب سی مسکینیت چھا جاتی تھی۔ یہ اس نے بچپن سے دیکھا تھا اور اس وقت بھی فریدہ پھوپھی کی آواز سن کے ان پر نسیان چھا گیا۔ انہوں نے نظریں اٹھا کے ایک فریدہ پھوپھی کو دیکھا اور خاموشی سے اپنے جوتوں کے تسمے کھولنے لگے۔

"ارے چھوٹے میاں جواب کیوں نہیں دیتے؟" فریدہ پھوپھی نے بڑی محبت سے رفعت کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ لیکن بڑے زور سے کانپ گئیں اور ہاتھ ایک جھٹکے سے الگ ہو گیا جیسے بجلی کا شاک لگ گیا ہو۔

جواب کیا دوں اس کی خالہ اور نانا تو اسے ہی نہیں دیتے تھے لیکن میں نے سوچا، آسیہ اکیلی رہے گی۔ اور پھر میں نے سوچا اس کے ساتھ رہ کر کچھ آدمی ہو جائے گی۔ ورنہ وہاں رہ کے تو کچھ دنوں بعد اس میں اور کسی جانور میں فرق کرنا بھی مشکل ہی ہوتا۔ اب اسی وقت دیکھ لو سلام نہ پیام بس آنکھیں پھاڑے ایک ایک کو دیکھ رہی ہے۔ جیسے۔۔۔ چھوٹے چچا نے جھلا کے بیٹی کی طرف دیکھا اور انہیں آسیہ کا بچپن یاد آ گیا۔ جب وہ اتنی سی تھی تو آنے والے کو بڑے ادب سے سلام کرتی، پان پیش کرتی اور میٹھی میٹھی باتیں کرتی اور اب یہ۔۔۔ چھوٹے چچا نے رفّو کی طرف دیکھا جو بڑے اطمینان سے انگوٹھا چوس رہی تھی۔

"تو دیکھ تو اچھی خاصی دس گیارہ سال کی لڑکی انگوٹھا چوس رہی ہے۔ اسی منہ پر اسے میں تمہارے باپ کے آستانے پر چھوڑ آتا؟" چھوٹے چچا نے جل کے فریدہ پھوپھی کی طرف ہاتھ چلایا۔

اور فریدہ پھوپھی کا چہرہ ایسا ہو گیا جیسے غش کھا کے گرنے والی ہوں۔ وہ کپکپا کے زمین پر بیٹھ گئیں۔ آسیہ حیرانی سے کبھی چھوٹے چچا کو دیکھتی اور کبھی فریدہ کو۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے انجانے راگوں میں گم گئی ہے اور چھوٹے چچا اسے دوسرے دنوں کے مقابلے میں زیادہ ہی پراسرار معلوم ہو رہے تھے۔

"فریدہ پھوپھی کے ابا تمہارے سسر ہیں چچا؟" اس نے تعجب سے چھوٹے چچا کو دیکھا

"میرے کیوں ہوتے۔ وہ تو تمہارے۔۔۔"

اچانک چھوٹے چچا کی نظریں فریدہ پھوپھی پر پڑ گئیں اور وہ ایسے رک گئے جیسے یکایک کسی نے ان کی زبان میں تالا ڈال دیا۔

"کیا ہمارے؟" آسیہ نے تعجب سے انہیں دیکھا۔

"کچھ نہیں۔ مدعا یہی ہے کہ وہ چاہتا کہ تمہاری پھپھی فریدہ پھپھی کے گاؤں کی بیٹی تھی۔ اور اس ناطے گاؤں کا ہر بچہ بوڑھا میرا سسر تھا۔ یہ گاؤں کے ناطے تعلقے ایسے ہی ہوتے ہیں بیٹی۔ جیسے میرا سسر تمہاری فریدہ پھپھی کو بیٹا کہتا ہے۔۔۔ وہ۔۔۔ بس یوں سمجھ لو گاؤں میں لوگوں کے ویسے ہی الٹے سیدھے ناطے جڑتے ہیں۔ ویسے کوئی رشتہ نہیں لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ تمام ناطے رشتے خون کے رشتوں سے بھی زیادہ اہم ہوتے ہیں یقین کیجیے۔" اور چھوٹے چچا لاکھ کوشش کے باوجود آسیہ کو اپنی تفسیر نہیں سمجھا سکے۔ آخر جھلا کے چپ ہو رہے۔

فریدہ پھپھی آہستہ آہستہ زمین سے اٹھیں اور ساڑی جھاڑتی ہوئی کمرے سے دوسرے آنگن میں چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد چھوٹے چچا قریب آئے۔ "یہ لو آسیہ بیٹی اب یہ دونوں تمہاری بہن ہے۔ ہاں بس ایک سمجھ کے اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا" چھوٹے چچا رکی آسیہ کے پاس چھوڑ کے دروازے کی طرف بڑھے۔
"آپ جا کہاں رہے ہیں چھوٹے چچا؟ اتنی سی روتی کے ساتھ اتنے بڑے ڈھنڈار گھر میں اکیلے کیسے رہوں گی؟" آسیہ کو پہلی بار تو اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔
"وہ تمہاری فریدہ پھپھی تو ہیں ہی۔ اس لئے۔۔۔" چھوٹے چچا نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ سامنے سے فریدہ پھپھی ہاتھ میں اپنا سوٹ کیس لئے چلی آ رہی تھیں۔

"کہاں چلیں پھپھی اتنی جلدی؟" آسیہ نے تعجب سے پھپھی کی طرف دیکھا۔ ابھی صبح تو وہ اسے دلاسا دے رہی تھیں کہ۔۔۔ اب اسے چھوڑ کے گاؤں نہیں جائیں گی اور اس وقت۔۔۔

"بس بیٹی کہ تمہارے چچا اور بہن آ گئے ہیں۔ اسی لئے میں نے سوچا۔۔۔"
"لیکن پھپھی، چچا تو۔۔۔ اور یہ اتنی سی ہے۔۔۔" اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اکیلے ہو جانے کے تصور ہی سے اس کی روح نکلی جا رہی۔۔۔ پھپھی کا سہارا اسے بہت تھا۔ وہ اسے بچپن سے مانتی تھیں۔ لیکن آج اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ سہارے کتنے کمزور ہوتے ہیں۔۔۔
"میں رہ جاتی میری گڑیا۔ لیکن میرے پیچھے گاؤں میں گھر برباد ہو جائے گا۔ اور پھر تمہاری حویلی کا بھی برا حال ہوگا۔ یوں بھی اس کی دو طرف سے دیواریں گر گئی ہیں۔۔۔"

"اونہہ! حویلی کی فکر کیا ہے۔ جہاں سب گیا وہیں وہ بھی جائے گی۔ البتہ آپ کا اپنا گھر ہے تو پھر شوق سے جائیے۔۔۔ آخر ہم ہیں کون آپ کے؟" اس نے کچھ مایوسی اور کچھ غصے سے کہا۔

"میں پھر آؤں گی گڑیا رانی۔ لیکن ابھی تو مجھے جانے ہی دو۔ مجھے اس گھر کے کونے کونے سے جیسے آواز آتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔۔۔ اللہ۔۔۔"
"رکشہ آ گیا بی بی جی۔" بیگم کی ماں نے بات کاٹ دی اور فریدہ پھپھی دیکھتے دیکھتے جس خاموشی سے گھر میں آئی تھیں، ویسے ہی آنگن کے دروازے سے باہر چلی گئیں۔۔۔ سڑک پر رکشے کی گھنٹی گونجی اور پھر ایک بے کراں سناٹا چھا گیا۔ وہ ویران آنکھوں سے پاٹوں پاٹ کھلے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے پانی کے نلکے پر حسب دستور بالٹیوں پر بالٹیاں بج رہی تھیں۔ گھڑے ٹوٹ رہے تھے، ہاتھا پائی ہو رہی تھی۔ مزدور اپنے سروں پر اپنی ٹوکریاں اٹھائے ہاٹ کی طرف جا رہے تھے۔ باہر کی دنیا میں کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن یہ اتھاہ سناٹا کیوں۔۔۔ اس نے اپنی آنکھیں دوپٹے کے آنچل سے پونچھ لیں۔ کالج کی بس اس کے پھاٹک پر سے گزر گئی اور سامنے اسمٰعیل میاں کے لوہے کے پھاٹک پر رک گئی۔ اس نے دیکھا اسمٰعیل میاں کی چھوٹی لڑکی [illegible] میں بیٹھ گئی۔۔۔

آج ایک مہینے سے وہ کالج نہیں جا رہی تھی۔ زندگی کا نیا سفر جاری رکھنے کے لئے اسے اسکول میں ملازمت کر لینی پڑی تھی ورنہ زندگی جو خدا کی امانت تھی رواں دواں گزرنے کے گھٹ گھٹ کے ختم ہو جاتی۔۔۔ اسے کتنا شوق تھا ایم اے پاس کر کے کالج میں پڑھانے کا لیکن اب وہ وہ کیسے کالج [illegible]

نہیں پڑھ سکے گی، اور ——— اور اپنی محرومی کے احساس پر اس کے آنسو بہہ نکلے۔

"ارے ... ارے آسیہ بیٹی ——— چھوٹے چچا اپنا سوٹ کیس برآمدے میں رکھتے ہوئے ٹھٹک گئے۔

"کچھ نہیں چچا۔ مگر یہ آپ جا کہاں رہے ہیں۔"

چھوٹے چچا کے ہاتھ میں میلا چیکٹ بستر دیکھ کر جو رسیوں سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے تعجب سے انہیں دیکھا ——— "بھلا میں اکیلے کیسے رہوں گی ———"

لہجے میں سارے زمانے کا دکھ تھا۔

"میں کہیں جا تھوڑے ہی رہا ہوں ——— باہر سامان پڑا تھا اسے قرینے سے رکھ دوں ———" چھوٹے چچا بستر کو چوکی پر رکھ کے بیٹھ گئے۔

"اب ہمیں چھوڑ کے آپ کہیں نہیں جائیں گے نا ———" اس نے پُر امید نظروں سے چھوٹے چچا کو دیکھا۔ زینت پھوپھی کے رویے سے اسے بڑی سخت چوٹ لگی تھی۔ "خواہ مخواہ اپنی محبت کا ڈورا ڈالتی تھیں مجھ پہ ———"

"اونہہ میں کیوں جانے لگا اپنی رانی بیٹی کو چھوڑ کے ——— ارے میں تو کبھی بھی یہاں سے نہ جاتا۔ بس یوں سمجھو آسیہ بیٹی! سر پر شیطان کا سایہ اگر وہ گلبیا کمبخت میرے پیچھے نہ پڑتی تو بھلا میں بھیا کے قدموں کو چھوڑ کر کہاں جاتا۔ "اور ———" چھوٹے چچا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنے لگے ——— "آخری دیدار نہیں کیا تھا ورنہ وہ کمبخت دھوکے باز ———" اور آسیہ پر چھوٹے چچا کی پہلو دار شخصیت کا ایک اور پہلو نمایاں ہو گیا۔

تو بھلا یہ کیسے آدمی ہیں کہ دوسرے کی بہو بیٹیوں کو ——— اور پھر وہ گلبیا کمبخت کتنی پارسا بنتی تھی۔ اور پورے باپ کے عمر کے چھوٹے چچا ——— معصوم بنتی تھی اور کرتوت ایسے۔ کیسے کیسے اس کا شوہر ڈھونڈتا پھرتا تھا ——— اور یہ چچا ——— گاؤں سے کتنے آدمی ڈھونڈنے آئے تھے اسے ——— وہ اس طریقے سے غائب ہوئی تھی کہ سب ہی حیرت زدہ تھے ——— لیکن کسی نے چچا کا ذکر بھی نہیں کیا۔ گھر میں کسی نے ان کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا اس کے کپڑے لے کر بھاگے تھے۔ مگر کسی کے ذہن میں یہ بات آئی ہی نہیں کہ وہ ایک کپڑا پہننے والی بھی اپنے ساتھ لئے جا رہے ہیں۔

"کس گنوارن کی نذر کر دیا چچا۔ پورے چار تو سلے تھے میرے کپڑے" اس نے چچا کی طرف دیکھا جو سر جھکائے چوکی کے کونے پر بیٹھے سارے جہان کی مسکینیت ان کے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

"کیسے سیدھے بنے بیٹھے ہیں بے چارے جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔ لے کے میرا کپڑا ———" اسے چچا کے وجود سے پھر سے نفرت ہونے لگی۔

"تم اپنے کپڑوں کے لئے تو بہت روئی ہو گی آسیہ ——— میں نے تو بیچا تمہارا کپڑا پر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ گلبیا"

"کیوں نہیں چچا وہ کپڑے تو سچ مچ گلبیا کے ہاتھوں کی زینت ہی بن سکتے تھے۔ ورنہ میرے ہاتھوں میں تو وہ ———" اس کی آواز رندھ

"اوہ! ارے آسیہ منی میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا میں کہہ رہا تھا کہ اگر وہ کمبخت میرے پیچھے نہ پڑی ہوتی تو میں کبھی تمہاری چیز کی طرف بھی نہ دیکھتا۔ آخر اسے لے جانے کے لئے پیسوں کی ضرورت بھی تو تھی ——— میں نے تو اسے گاؤں میں ہی گروی رکھ دیا تھا بھلا اس کا منہ تھا کہ"

چھوٹے چچا بغیر سوچے سمجھے اپنی صفائی میں نہ کہنے والی باتیں بھی کہتے چلے جا رہے تھے۔

"لیکن چچا، رضیہ کے ہوتے آپ کو ایسی ویسی حرکت نہیں کرنی چاہئے تھی ——— مجھے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ آپ کی شادی ہو گئی ہے اور رضیہ اتنی بڑی لڑکی بھی ہے۔"

"شادی کس منحوس نے کی ہے" ———

"ہائیں کیا کہہ رہے ہیں آپ، بغیر شادی کے ہی یہ آپ کی بیٹی ہے" منی نے کراہیت سے ناک سکوڑی ———

"میں کب کہتا ہوں کہ شادی نہیں ہوتی۔ بس یوں سمجھو کہ دنیا کے کہنے سے شادی بھی ہو گئی بیٹی بھی ہو گئی۔ اور ـــ لیکن میں اُسے کوئی اہمیت
دیتا ـــ شادی تو مٹی بیٹی دو دلوں کے ملاپ کا دوسرا نام ہے لیکن میرا دل کبھی رفو کی ماں سے ملا ہی نہیں اور ملتا بھی کیسے ـــ یہ جو تمہاری زبیدہ پھوپی ہے نا
یہی نٹ کھٹ ہے اب اس دلعت دیکھئے اس کے بھی ـــ اس سے کوئی دل بھی لگا سکتا ہے بھلا وہ تو تمہارے ـــ"
"کیسی باتیں کرتے ہیں۔ زبیدہ پھوپھی کو آپ کی شادی۔ یا۔ تو سے کیا تعلق ـــ"
اب وہ بات یہ ہے آسیہ، میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا ہے نا کہ رفو کی ماں زبیدہ کے گاؤں کی تھی۔ دراصل یہ زبیدہ بڑی وہ ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لو اس کے
پیٹ ہیں ـــ میری زندگی تباہ کر دینے میں اس کا بہت بڑا ہاتھ ہے ـــ"
کیا کہہ رہے ہیں چچا؟ آپ پہلے آدمی ہیں جو پھوپھی کے بارے میں ایسی باتیں کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے تو اپنی ساری عمر برباد کر دی ـــ ایک دن کہہ رہی تھیں
شوہر ان سے الگ ہو گیا اور اکلوتی بیٹی کو بھی لے گیا ـــ سچ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے ـــ"
"اچھا!"
"ہاں اور کیا سچ مچ مجھے ان کے میاں پر غصہ آتا ہے۔ مرا موذی کاتا ـــ پھوپھی تو اتنی اچھی ہیں بے چاری، آج تک اس کے گھر میں بیٹھی ہیں۔ دکھڑے
لائیاں کیں لیکن کبھی اپنے باپ کے یہاں تک نہیں گئیں۔ میں نے ان کے میاں کو برا بھلا کہا تو کہنے لگیں کہ ان کا شوہر فرشتہ تھا وہی اس کے قابل نہیں تھیں۔ ـ"
"سچ وہ ایسا کہتی ہے!" چھوٹے چچا اچھل کے چوکی پر سے آنگن میں آگئے
"اور کیا ـــ آپ کو تعجب کیوں ہو رہا ہے؟ جس سے جی چاہے پوچھ لیجئے ـــ"
"اچھا! تعجب ہے زبیدہ اور اتنی رواداری! مجھے سچ مچ بڑی حیرت ہو رہی ہے تم سے یہ باتیں سن کر۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ زبیدہ ایک نمبر کی فرافہ ہے، تمہیں منی،
اس سے بچ کے رہنا اور اگر یقین نہیں آتا تو گاؤں چلو وہاں ہر شخص میری اس بات کی تائید کرے گا۔ میں نے یونہی کہا ہے ـــ"
"کر کمال کرتے ہیں چچا۔ آپ کو پھوپھی کے بارے میں ایسے الفاظ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ وہ تو اتنی اچھی ہیں کہ میں تو خیر محلے کا بچہ بچہ ان کا نام احترام سے لیتا ہے
ہے" آسیہ نے برا مانتے ہوئے کہا۔
"دیکھو آسیہ منی! تمہاری زبیدہ پھوپھی کو جتنا میں سمجھتا ہوں اتنا کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا ـــ تم ابھی چھوٹی ہو اور لوگوں کو پہچاننے کے لئے ایک عمر چاہئے ـــ"
چچا نے چڑ کر کہا اور سامان درست کرنے لگے۔

"چھوٹے چچا ہم اس چھٹی میں گاؤں کیوں نہ چلیں ہ ـــ اسکول میں جب موسم خزاں کی چھٹی ہوتی تھی اس کا دل اپنا گاؤں دیکھنے کے لئے مچل اٹھا آج تک وہ
بن گئی تھی۔ اماں کو گاؤں کے نام سے نفرت تھی اور ابا کبھی سے اسے ساتھ نہیں لے گئے۔ اب کے جب چھٹی ہوئی تو وہ خود مختار تھی۔ نہ ابا تھے اور نہ ہی اماں کی
وہ آنکھیں انھیں گھورنے کے لئے زندہ ہیں۔
"کوئی ضرورت نہیں ہے گاؤں جانے کی۔ اس ویرانے میں اب کیا رکھا ہے۔ جب اچھے دنوں میں نہیں تو اب جانے کا فائدہ؟ خواہ مخواہ ـــ" چھوٹے چچا
نے کاٹ دی۔
"نہیں چچا، بس ایک بار چلی جاؤں۔ آخر میں بھی تو دیکھوں کہ ابا کا گاؤں کیسا ہے، جہاں وہ کے ابا کی روح جوان ہو جایا کرتی تھی اور ـــ"
"پھر ٹھیک ہے۔ میں تمہیں پہنچا کے چلا آؤں گا۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس اجڑی نگری سے۔ پھر ـــ ن رقو اکیلی رہے گی ـــ" چھوٹے چچا اس کے اصرار سے

عاجز ہو کے بولے۔

"رقو بھی چلے گی ہمارے ساتھ۔ میں بس دو دن وہاں رہوں گی۔ چچا پھر ہم ساتھ ہی واپس آ جائیں گے۔"

"بہت اچھا ۔۔۔"

اسے گاؤں آئے ہوئے دوسرا دن تھا۔ حویلی جس کا ذکر وہ بچپن سے سنتی آئی تھی اور جس کا ہیولیٰ اس کے ذہن میں اونچے پرانے محل سے کم نہیں تھا، کچھ بھی نہیں۔ مٹی کا بہت بڑا مکان تھا جس کی کچی دیواریں دو طرف سے ڈھے گئی تھیں اور وہاں بڑے بڑے آنگن میں لگے ہوئے امرود، شریفے اور شفتالو کے لئے پلے بڑھنے تھے۔ تنگ آ کے زبیدہ پھوپھی نے تاڑ کے پرانے شہتیروں سے ٹوٹی ہوئی دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ دوپہر کی خاموشی میں چلتی ہوئی ہوا جب پتے کی دیواروں سے ٹکرائی تو یہ پتے جھنجھنا کے بج اٹھتے اور سناٹے میں اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے بھوتوں کی بارات آ رہی ہے اور یہ پتے تالیاں بجا بجا کے اس کا استقبال کر رہے ہیں۔

دو دن میں اسے کچھ نہیں تو سیوں مرتبہ اپنا شہر اور گھر یاد آیا۔۔۔ زبیدہ پھوپھی ہر وقت اس کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہتی تھیں۔ گاؤں کی دور و نزدیک کی رشتہ دار عورتیں اس سے ملنے آئیں لیکن زبیدہ پھوپھی نے اسے پہلے ہی ڈرا دیا تھا کہ ان سے گھل مل کے باتیں کرنا گویا اپنا اسکینڈل بنانا ہے۔ چنانچہ اس کی ہوں ہاں سے عاجز ہو کے عورتوں کی بھبھوڑ سی بکواس چھٹ گئی اور گاؤں والیوں نے متفقہ طور پر اسے بددماغ کا خطاب دے دیا۔

ویسے بھی اسے اپنی یہ پھوپھی اور چچیاں ذرا بھی اچھی نہیں لگی تھیں۔ پہلے ہی دن اسے رقو اور چھوٹے چچا کو دیکھ کے انہوں نے اتنی کھسر پھسر کی اور رات ہنسیں کہ ان کی بدتمیزی اور گنوار پنے کا سکہ اس کے دل پر جم کے رہ گیا تھا۔ اور وہ اکتائی اکتائی سی دو دن گزرنے کا انتظار کر رہی تھی۔۔۔ "اللہ یہ ابا کی سسرالوں کا گہوارہ ہے جس کی تعریف کرتے ابا کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ پتہ نہیں ان کو کیا مزا آتا تھا اس اجڑی دنیا میں۔۔۔ اس نے چٹیل میدان کھیتوں کی طرف دیکھا جہاں بارش نہ ہونے کی وجہ سے خاک اڑ رہی تھی اور گاؤں کے کاشتکاروں کی نگاہیں بادل کی تلاش میں آسمان سے ٹنگ کے رہ گئی تھیں۔

"کب چلنے کا چچا؟" اس نے اکتا کے چھوٹے چچا سے پوچھا "میرا تو اس اجڑی دنیا میں ایک لمحے کو بھی جی نہیں لگا۔ اور یہ حویلی۔۔۔ یہ تو مجھے بھوتوں کا مسکن نظر آتی ہے۔۔۔" اس نے اونچے شہتیروں والے کھپریل کمروں کی طرف دیکھا جن میں جالا ایسی مسہریاں بچھی ہوئی تھیں۔ اس نے سوچا صفائی وغیرہ کرا دے لیکن ایک ہی کمرہ جھاڑتے جھاڑتے اس نے اتنی خاک پھانکی کہ اس کے گلے میں خراش پڑ گئی۔

"بڑا بڑھاوا کی باتیں کرتی تھیں پھوپھی۔ حویلی کی دیکھ بھال پتہ نہیں کیا کرتی ہیں۔ یہ موٹی موٹی مسہریاں دیمک کی نذر ہو رہی تھیں اور باہر کے بیٹھکے میں چوکی پر بچھی ہوئی قالین ایسا جیسے دیمکوں نے ایک جال بن کے رکھ دیا تھا۔

"پھوپھی آپ نے اس قالین کو دھوپ ہی دکھا دی ہوتی۔۔۔" آسیہ کو بار بار افسوس ہو رہا تھا "اتنی قیمتی قالین اب کہاں سے آئے گی۔ خواہ مخواہ اپنے یہاں چھوڑ رکھی تھی۔ کون یہاں رہنے آ رہا ہے۔

"یہ تمہاری اماں کی جہیز کی قالین ہے بیٹی اور جس دن وہ بیاہ کے آئی تھیں تب سے آج تک یہ ایسی ہی بچھا ہے۔۔۔ انہوں نے مجھے قسم دے دی تھی کہ ان کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاؤں، سو میں ان کی قسم سے مجبور تھی۔" زبیدہ پھوپھی نے چور ملی کی طرح اسے دیکھا۔

"اوہ تو اتنی نفرت کرتی تھیں اماں ان سے۔۔۔" اس نے ایک نظر زبیدہ پھوپھی کے معصوم چہرے پر ڈالی۔ سفید آنچل میں گھرا ہوا چہرہ فرشتوں کی طرح معصوم تھا۔۔۔ کیا ایسی صورت سے نفرت بھی کی جا سکتی ہے! اس نے تعجب سے چھوٹے چچا کو دیکھا جو اس دو دن کے اندر نہ جانے کتنی باتیں زبیدہ پھوپھی کے خلاف کہہ چکے تھے اور اب واپس جانے کے لئے سامان ٹھیک کر رہے تھے۔۔۔ اور رقو جلدی جلدی کچے پکے امرود اور شریفے بڑی سی ٹوکری میں بھر رہی تھی۔ اس نے ایک نظر دونوں باپ بیٹی پر ڈالی۔ اور خاموشی سے چھوٹے آنگن میں چلی گئی جہاں زبیدہ پھوپھی رہتی تھی اور اس وقت بڑے زور شور

اسکول جانے پر اعتراض کیا جا رہا ہے ۔ آخر کوئی ان سے پوچھے کہ آپ کو کیا تکلیف ہے جو اس غریب لڑکی پر اتنی نوازش ہے۔ آخر اس نے آپ کا کیا بگاڑا ہے لیکن — آسیہ نے کبھی رفو سے اُلجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کیونکہ اس کے مزاج کی اُفتاد سے وہ بہت خائف رہنے لگی تھی۔ جہاں کچھ سمجھانے کی کوشش کی اور یہ تنتنا کے کھڑی ہو جاتی۔

"اب کے ابا کے ساتھ نانا میاں کے یہاں ہی جاؤں گی۔ ماہ ہم بھی کسی کے باندی غلام ہیں کیا جب جی چاہے گا چلے جائیں گے۔ ابا آئیں تو میں صاف کہہ دوں گی۔ آپ نے تو مجھے ان کی تنہائی کا ساتھی سمجھ کے یہاں چھوڑا تھا۔"

"یا اللہ یہ کس گناہ کی سزا ہے" آسیہ نے ٹھنڈی سانس بھر کے رفعت کی طرف دیکھا جو کہ اِدھر اُدھر اِتراتی ہوئی اپنے کمرے سے نکل رہی تھی —

کیا پاکیزہ صورت ہے۔ لگتا ہی نہیں یہ چھوٹے چچا کا پر دلکش ہے۔ یہ تو بس میری بہن لگتی ہے — آسیہ نے غور سے رفو کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ بھرا ہوا چہرہ اور بھرے بھرے موٹے موٹے ہونٹ۔ اوپر سے کھڑی اور نیچے سے کچھ چوڑی ناک۔ بہت ہی دیکھا بھالا چہرہ اور بہت ہی مانوس کس کے ایسی ہے یہ۔ آسیہ نے سوچتے سوچتے نظریں اٹھائیں۔ سامنے چھوٹے چچا اپنا میلا جیکٹ بستر کاندھے پر لادے گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ بڑا اچھا ہوا آگئے بس آج کہہ دوں گی انھیں۔ لے جائیں اپنی لاڈلی کو — مجھ سے صاحبزادی کی نازبرداری نہیں ہو سکتی۔ میرے ناتواں وجود میں شہزادی صاحبہ کے ناز برداشت کرنے کی سکت اب نہیں رہی۔ مارے غصے کے اس کا خون کھول گیا۔

آنگن میں رفو چھوٹے چچا سے لپٹی پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔ اونہہ اسی کا نام ہے مکاری۔ خواہ مخواہ مظلومیت طاری کرنے کی کوشش۔ آج آسیہ کو اپنا وجود سب سے زیادہ قابلِ رحم محسوس ہوا۔ کیا مصیبت سی مصیبت گلے پڑی ہے میرے مالک۔ وہ دل ہی دل میں دہائی دیتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف جانے کو مڑی —

یہ رفو اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔ باپ ایسے ہیں کہ پھرے تیرے دروازے گھوم گھوم کے وقت کاٹتے پھرتے ہیں۔ دو وقت کی روٹی اپنی قوتِ بازو سے حاصل کرنے کی توفیق نہیں ہوئی — اور بیٹی صاحبہ کے طنطنے کا یہ عالم — معاذاللہ! انھوں نے رفو کی طرف دیکھا جو اب تک چھوٹے چچا سے لپٹی روئے چلی جا رہی تھی۔

اس نے ایک نظر اپنے ماضی اور حال پر ڈالی۔ بچپن میں کبھی ضد کی ہو تو کی ہو۔ بڑی ہونے کے بعد اس نے کبھی مزاج کی گرمی شاید ہی کبھی دکھائی ہو۔ اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ ابا کی موت ہونے کے بعد اس نے کسی سے اونچی آواز سے بات بھی کی ہو۔ وہ تو ایسی بُردبار ہو گئی تھی کہ اس کی جوانی بھی اس بُردباری اور سنجیدگی کی نذر ہوتی جا رہی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد ہے کہ اماں جب ابا کے بعد بے قرار ہو کے روتی تھیں تو سینکڑوں نشتر اسے اپنے دل میں ٹوٹتے محسوس ہوتے تھے۔ لیکن وہ عالی ہمتی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے آنسو پی کر اماں سے لپٹ جاتی۔ "دیکھئے اماں! ابا مرے ہیں۔ میں تو ابھی ابھی زندہ ہوں۔ ہوا جو ابا نہیں ہیں اور میرا کوئی بھائی نہیں ہے — میں بیک وقت آپ کا سہاگ اور بیٹا دونوں بن جاؤں گی۔ بیٹا بن کے کما کے کھلاؤں گی اور بن کے خدمت کروں گی۔ اماں، میری اماں — " وہ اپنے لب و لہجہ سے تمام غم جھٹک دیتی۔ لیکن چہرے کو کیا کرتی جس پر یتیمی اور دکھ کی چھاپ تھی کہ اماں کے آنسو اس کی باتیں سن کے تھمنے کی بجائے اُبل اُبل کے بہنے لگتے تھے۔ اور وہ جو بڑے عزم کے ساتھ مردانہ وار دکھوں کا مقابلہ کرنے پر تُلی اسی دکھ کے دھارے میں بہہ جاتی۔ اور پھر جب اماں نے ابا کی رفاقت میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو دنیا اندھیر ہو گئی — اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول اس نے اپنے راستے کا تعین کیا اور پھر خاموشی سے اس راستے پر چل نکلی جو اس کے گھر سے ہوتا ہوا ضلع ہائی اسکول کی سفید عمارت کو جاتا تھا۔ زندگی خود بخود ایک ڈھرّے پر آ گئی — اور رفتہ رفتہ وہ اپنے شب و روز کی عادی ہوتی چلی گئی — اور اب جبکہ وہ ایک ذمہ دار انسان

اور اپنی استطاعت بھر آرام بھی میسر تھا، تب بھی اسے غصہ ایک دم نہیں آتا تھا —— اس کا غصہ تو جیسے اس کے جذبات کی آگ کی طرح ہمیشہ کے لئے برف کے تودے تلے دب چکا تھا۔ وہ ہر ایک کی بات سن لیتی تھی مگر کبھی کسی کو اُلٹ کے جواب نہیں دیتی تھی اور نہ ہی کسی پہ خفا ہوتی تھی۔

یہ کس چیز پر پھولتی ہیں بیگم صاحبہ۔ آخر انہیں کس بات پر اتنا ناز ہے۔ آسیہ نے سوچتے سوچتے کتاب اُٹھا لی۔

ٹھیک ہے کل میں انہیں رخصت ہی کر دوں گی۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری اس نے کتاب کے اوراق پلٹتے ہوئے سوچا میں نے تو کبھی ناز نخرے نہیں کئے لیکن میرا کون بیٹھا ہے ناز برداری کے لئے۔ جبکہ رفو کے پانچ ہاتھ کے باوا اور ننھیال کا بھرا پُرا کنبہ موجود ہے۔ اور یہاں بس اللہ کا نام ہے۔ اماں تو اکلوتی تھیں۔ قدرت کی بھی کیا ستم ظریفی ہے۔ اب جبکہ رفو کو کسی کی ضرورت نہیں تو اس کے سب موجود ہیں اور یہاں اپنا نام کا کوئی رشتہ دار نہیں —— چلو اچھا ہے رفو بی بھی چلی ہی جائیں۔ آخر انہیں کیا ضرورت ہے میرے ساتھ وارفتگی کی زندگی بسر کرنے کی —— ان کا تو سب سے بڑا ستون خدا کے چھوٹے چچا کا موجود ہے —— وہ بڑے اطمینان سے پلنگ پر لیٹ گئی اور کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے —— لا حاصل باتوں میں الجھ کے کیوں اپنے ذہن کو کڑوا کرے۔ اس نے دل جمعی سے کتاب کھول لی اور شروع سے پڑھنے لگی۔

کتاب اتنی دلچسپ تھی کہ وہ کھو سی گئی۔ کب اس کے کمرے کا دروازہ کھلا، کس وقت چھوٹے چچا اس کے کمرے میں آکے بیٹھے اسے پتہ نہیں چلا۔ الفاظ آپس میں گڈمڈ ہونے لگے تھے کہ —— ایک دم برقی روشنی چمک اُٹھی اور ساتھ ہی چھوٹے چچا کی جھنجھلائی ہوئی آواز سنائی دی: "اسی لئے آنکھوں پر یہ موٹا چشمہ چڑھ گیا ہے۔ ایسی بھی کیا لاپرواہی۔ اندھی ہو جاؤ گی تو کون پوچھے گا تمہیں ——" زندگی میں پہلی بار چچا کی آواز میں دبدبہ تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو چچا کا انداز بڑا ہی مسکین ہوتا تھا اور اسے چچا کے نیاز مندانہ لہجے سے الجھن ہونے لگتی تھی۔

"آپ کب آئے چچا؟" چچا کی باتوں نے اس پر خوشگوار اثر ڈالا اور ان کے اپنے پن نے اس کی شگفتگی واپس لا دی۔

"ارے واہ ری لڑکی میں کب آیا؟ گھر میں آتے تم نے نہیں دیکھا تھا؟ تمہارے سامنے ہی تو آیا ہوں، وہ جب تم اسارے میں کھڑی تھیں ——"

"میرا مطلب یہ نہیں، میں نے یہ پوچھا تھا چچا کہ آپ میرے کمرے میں کس وقت آئے"

"یہی کوئی آدھے گھنٹے سے بیٹھا ہوں۔

"پھر مجھے پکار لیتے مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا —— کوئی ضروری کام ہے کیا؟"

"ہاں میں نے سوچا تم سے دو باتیں کر ہی لوں ——" چچا کے لہجے میں بڑی بہادری تھی۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"ہوا کچھ نہیں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں نے اپنی بیٹی اس لئے چھوڑی تھی تمہارے پاس کہ آدمی بن جائے گی اور تم تنہا بھی نہیں رہو گی مگر تم نے اسے انسان بنانے کے بجائے چولہے کی باندی بنا دیا۔ کیوں؟"

"یہ سراسر الزام ہے چچا۔ میں نے رفو کو اپنی بہن سے کم نہیں سمجھا"

"بس اب رہنے دو یہ باتیں۔ بہن کی طرح سمجھتی تھیں اس لئے آج تک اس کے لئے کالا حرف بھینس برابر ہے اور تم خود ٹھاٹھ سے امتحان پر امتحان پاس کئے جا رہی ہو"

"یہ تو اپنا اپنا شوق ہے۔ رفو کو پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اور میں نے ہمیشہ ایم اے پاس کرنے کا خواب دیکھا۔ پھر ——"

"کیوں نہ ہو، کیوں نہ ہو، ماشاء اللہ پڑھے لکھے باپ کی بیٹی ہو۔ کیوں نہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خواب دیکھتیں ——"

دیکھئے چچا۔ آپ تو طعنے دینے بیٹھ گئے ہیں۔ میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اپنی محنت اور اپنے زور بازو سے کیا ہے —— ملازمت کی، خود پڑھا اپنے ساتھ آپ کی صاحبزادی کے دوزخ بھرنے کا سامان کیا، ان کے عیش کی چیزیں پوری کیں اور ——

"کس نے کہہ دیا تھا تمہیں اسے اپنے ساتھ لئے لئے پھرنے کو۔ نہ تم اسے باہر لے کر گھومتیں اور نہ اسے یہ لت لگتی۔"

"حد ہو گئی چچا۔ جیسے میں تو باہر نہیں جاتی۔ پھر مجھ پر کیوں نہیں فیشن کا بھوت چڑھا۔ یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔"

"خیر میں نے بہو دی تھی۔ اور جو نہیں تم نے اس سے کام کروا کر اسے دیوالیہ کر دیا ہے اس کا سبب ہے کوئی بھی نہیں چاہتا کہ کوئی اس کی برابری کرے وہ تو کوئی اور لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کے لئے دنیا تیاگ دیتے ہیں اور پھر بھی——"

"بہت اچھا چھوٹے چچا۔ بند کیجئے اپنی بکواس۔ میں جوگن نہیں ہوں کہ دنیا تیاگ دیتی——"

"نہیں جوگی تو وہ آدمی تھا جس نے تم لوگوں کی بہتری کے لئے اپنا آپ برباد کر لیا——"

"بڑی نوازش آپ کی۔ اب مزید احسان کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ لے جا سکتے ہیں اپنی صاحبزادی کو——" آسیہ نے تلخی سے کہا۔

"کیوں مجھے کیا پڑی ہے جو دوسروں کا پاپ ڈھوتا پھروں۔۔۔ تم ہی بھگتو——" چھوٹے چچا نے حقارت سے کہا۔

"خوب اب یہ اپنی لڑکی ہو گئی اور اسکے سر تھوپنے چلے ہیں۔" آسیہ کا سارا غصہ ہوا ہو گیا۔ اس نے تعجب سے چھوٹے چچا کی طرف دیکھا جو اپنی جیتی جاگتی جوان بیٹی کو دوسرے کی کہہ رہے تھے۔ وہ تو پہلے دن ہی میں نے سمجھا تھا سچ تھا۔ چچا اسے کہیں سے اغوا کر لائے ہیں اور اب—— اب کیا ہوگا۔ وہ آنے والے خطرے کی آہٹ محسوس کر رہی تھی

آپ بھی تماشہ ہیں چچا جب آپ لوگ یہاں آئے تھے تو اپنی صورت حال کے لئے اپنی بیٹی ثابت کرتے تھے اور جب میں نے آپ کی بیٹی سمجھ کے اسے اپنا لیا مجھے نیا دھوکا دے رہے ہیں——

"دھوکے کی کیا بات ہے——"

"آپ اسے اغوا کر کے نہیں لائے تھے؟"

"پاگل ہو گئی ہو کیا میں بردہ فروش ہوں کیا!" چھوٹے چچا غصے سے چیخ اٹھے۔

"پھر؟"

"پھر کیا۔ یہ سچ ہے تو میری بیٹی پر اپنی نہیں——" چھوٹے چچا سنبھل سنبھل کے سوچتے ہوئے بول رہے تھے۔

آپ کی اپنی بیٹی نہیں۔ کیا——" حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔

"نہیں۔ میں نے تو شادی ہی صرف اس کے لئے کی تھی۔"

"کیا مطلب! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں چچا——" اس نے الجھ کے پوچھا۔ چچا کی باتیں اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔

"میری بیٹی مجھے—— دنیا کو جہیز میں دولت ملتی ہے اور مجھے یہ لڑکی ملی تھی——" چچا نے مظلومیت سے کہا۔

"اچھا آپ کی شادی بیوہ سے ہوئی تھی——"

"نہیں تو——"

"میں سمجھ گئی آپ کے ساتھ دھوکا کیا گیا تھا۔ ہے نا؟"

"ارے کوئی میرے ساتھ کیا دھوکا کرتا۔ میں نے تو جان بوجھ کے مکھی نگلی تھی۔ صرف ایک ایسے شخص کی خاطر جسے میں خدا کے بعد خدا سمجھتا تھا"

"یعنی آپ کو ابا نے اس گڑھے میں پھینکا تھا؟" اس کے لئے تو ہر بات نئی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ چھوٹے چچا، ابا جی کو خدا کے بعد خدا کہتے تھے۔ مگر

"بات یہ ہے بیٹی کہ کبھی کبھی خدا بھی ظلم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور تمہارے ابا تو انسان تھے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں——" چچا کی باتیں سن سن کے اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

باس بیٹھے میلی کہ —— ادل — بس یوں سمجھو کہ بیچ انھوں نے ڈالا او دیکھل میں نے پایا "

ایں —— یہ چھوٹے چچا کیا بک رہے ہیں۔ اس کے حواس گم ہوئے جا رہے تھے —— سراسر میرے فرشتہ صفت ابا پر اتہام۔ کمال ہے۔ اچھا بدلہ دیا انھوں نے ان کی نیکی و میرے سلوک کا بہت ہوئی ہمت تمہاری — میں باز آئی ان کی سرپرستی سے۔ واہ کمال ہے جس تھالی میں کھائیے اسی میں چھید کیجئے۔ یہ اچھے آدمی ہیں کہ جس وضعدار کے سامنے ں پر سالوں چلتے آج اسی کی بیخ کنی کرنے پر تیار ہیں ——

اسے چھوٹے چچا کے وجود سے نفرت ہوگئی جو سر جھکائے بڑی تسکینیت سے بیٹھے تھے جیسے انھوں نے کچھ کہا ہی نہ ہو۔

"بہت ہوا اچھا آج تو آپ اپنی صفائی میں میرے باپ پر اتہام لگا رہے ہیں کل کہیں میرا ہی گناہ ثابت کرنے کی ضرورت نہ پڑ جائے آپ کو۔ وہ غصہ سے دل ہی دل میں کھول رہی تھی۔

"اتہام؛ اتہام کی کیا بات ہوئی اس میں ——" چھوٹے چچا نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔

"بس بس۔ اب آپ مع اپنی لاڈلی صاحبزادی کے یہاں سے بستر گول کیجئے میں تم لوگوں کی ہمدردی کے بغیر بھی مزے سے زندہ رہوں گی " وہ ایک دم سے آگ ہو کر چھوٹے چچا پر لپکی۔

"کون حرامزادہ تمہارے ساتھ ہمدردی کرنے آیا ہے —— میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ جس کا باپ اس کی گردن سنبھالو تم اپنے باپ کی تکلیفوں کو —— جان چھوٹے ہماری ——" چھوٹے چچا کے لہجے میں سارے جہان کی پھٹکار تھی۔

"اپنے بڑے اتہام کے لئے آپ کو جواب دہ ہونا پڑے گا۔ یہ میرا گمان نہیں کہ آپ نے ڈکار لیا اور کوئی فرق نہیں پڑا آپ —— آپ ——" وہ کانپ کے اپنے بستر پر بیٹھ گئی ——

"سچ کڑوا ہوتا ہے صاحبزادی لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم میری اتنی ہی رشتہ دار ہے جتنی تم۔ فرق صرف یہ ہے کہ تمہارے ماں باپ دونوں مر گئے۔ اور اس کی ماں ابھی زندہ ہے"

آسیہ کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چھوٹے چچا اتنی بڑی بات کہہ گئے تو اب تک وہ ہوش میں کیسے ہے۔ اس نے چھوٹے چچا کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا جن کے چہرے پر سکینیت چھا رہی تھی —— اور ایکدم سے چھوٹے چچا اور اماں کی مکالمہ بازی اس کے ذہن میں گھوم گئی۔ اماں کی آنکھوں کی نفرت چھوٹے چچا کی سکینیت —— اور آہ —— ایک قد آور ان سامنے آگیا۔ سانولا رنگ۔ بلند پیشانی اور روشن آنکھوں والا پرتمکنت چہرہ —— زبیدہ پھوپھی —— دبلی پتلی دودھ کی طرح سفید، ہلکی ہلکی جھریوں سے بھرا بھرا چہرہ۔ پیشانی پر نماز کا گھٹا لیتہ پایا کا گستاخانہ انداز —— اور —— اور گاؤں میں کرتا تھا کہ ماں کو بھاڑ میں جانا ہے لیکن اتنی بڑی بات اس تک کیسے نہیں پہنچی جبکہ جبکہ —— وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئی —— اس کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔

"آسیہ ——" چھوٹے چچا نے اسے آہستہ سے پکارا

"جی ——" اس نے آہستہ سے نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں سے زندگی کی رمق معدوم ہوتی جا رہی تھی ——

"مجھے معاف کر دو بیٹی —— "چھوٹے چچا نے اپنے پرانے انداز سے گھگھیانا شروع کیا۔

"آپ نے میرا کیا بگاڑا ہے چچا۔ آپ کس چیز کی معافی مانگ رہے ہیں ——" اس نے کرب سے چھوٹے چچا کو دیکھا۔

"میں —— میں بیٹی —— میں رقیہ کو لئے جا رہا ہوں میں نہیں چاہتا کہ رقیہ اپنی نظروں میں آپ ذلیل ہو جائے —— اسے میں نے بیٹی سمجھا ہے۔ اور وہ میری بیٹی ہے ——"

"چھوٹے چچا جلدی جلدی بول رہے تھے ——

اس نے بے حس نظروں سے چھوٹے چچا کو دیکھا جو رقیہ کے لئے سب کچھ تھے اور اس کے کوئی بھی نہیں —— زبیدہ پھوپھی کی ماحتا کہاں مر گئی —— سنتے آئے تھے کہ ماحتا سات پردوں کے پیچھے سے بھی سامنے آ جاتی ہے۔ لیکن یہ کیسی ماں تھیں ——

اس کا معطل ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا ماضی کی ایک ایک بات ذہن کے پردے پر چلتی پھرتی تھی —— چھوٹے چچا —— جو سارے زمانے کے لپاٹیئے مشہور تھے اتنا بڑا سچ اس کے سامنے پیش کر گئے تھے کہ اس کی تپش سے وہ ایک دم راکھ کا ڈھیر ہوتی جا رہی تھی۔

"یا اللہ، یا اللہ —— " وہ گھبرا کے کھڑی ہو گئی اسے اپنا دم اپنے سینے میں گھٹتا محسوس ہوا۔ پسینے کے قطرے پیشانی سے ڈھلک ڈھلک کے چہرے پر بہہ رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں پورا ریگستان بسا ہوا تھا۔

نکہت حسن

نوشتۂ دیوار

دیوار کے اوپر اور دیوار کے پیچھے ایک دنیا آباد تھی۔ سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی دیوار پر مرزا صاحب ہر سال سفیدی کراتے تھے لیکن دو ایک دن بعد ہی دیوار کا سفید رنگ محلے والوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگتا تھا اور وہ جلد اپنی پرانی شکل و صورت میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ دھندلے اور گہرے نقش ابھرتے کوئلے اور پنسل سے تصویریں بنتیں۔ گالیاں اور شعر ساتھ ساتھ لکھے جاتے۔ گدھے کا دھڑ اور انسان کا سر دیکھ کر مستری چراغ دین پر مفہوم ہوا پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ یہ نام اور یہ تصویریں اس کے لئے جان کا عذاب بن کر رہ گئی تھی۔ رنگ اس کے نام چراغ دین کو بھول کر اسے گدھوں کا سردار ہی کہتے تھے۔ ماسٹر یوسف کی بیوہ پھر دھڑتے سے محلے میں نکلتی اور برقعے کے اندر ہی اندر اپنے بے ڈھنگے اور بھدے جسم کو عجیب ہوشربا انداز میں ہلاتی ہوئی اپنے گھر میں چلی جاتی۔ ہاتھی کے جسم پر عورت کا منہ اور نیچے لکھی ہوئی عبارت ——

'تیری بیوی —— میری بیوی —— سب کی بھاوج —— رنڈی'

دلوں کی قربت اور دوری کا اندازہ اس محلے میں اسی طرح لگایا جاتا تھا۔ دیوار کے قریب سے جو بھی گذرتا تھا وہ لمحے بھر کو ٹھہرتا ضرور تھا۔ صاحبِ ذوق ہوتا تو پڑھتا بھی اور اپنی طرف سے کچھ اصلاح اور کچھ اضافہ بھی کر دیتا کچھ نہیں تو چلتے چلتے حروف کے نقطے ہی درست کر دیتا یا اب ست کانوں کو پوری لمبائی دے کر گذر جاتا۔ پر جہاں ذوقِ سلیم کا فقدان تھا وہ بھی پڑھتے تو ضرور تھے۔ بعد میں گردن جھٹک کر استغفراللہ، استغفراللہ کہہ کر نکل جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اس دیوار پر پورے محلے کی اموات اور پیدائش کا ریکارڈ مع نام اور تاریخ کے درج تھا۔ اگر کوئی ڈاکو بھی مر جاتا تھا تو اس کا نام درج کیا جاتا تھا۔

نام :- نیک دل زماں

تاریخ پیدائش :- [illegible] —— تاریخ وفات :- [illegible]

پہلا ڈاکہ :- [illegible] —— دوسرا جیل سے نکلنے اور بارہ سال سزا کاٹنے کے بعد۔

سیرت :- امیروں کو لوٹ کر غریبوں کو بانٹتا

سلسلۂ نسب :- سلطانہ ڈاکو سے ملتا تھا۔

صورت :- کبھی بھیگی بلی اور کبھی خوفناک شیر سے مل جاتی تھی۔

خدا مغفرت کرے عجب مرد تھا ؎

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں   یہ حقیقت میں ہم سے جدا ہوتے نہیں

بچہ ماں کے پیٹ سے بعد میں نکلتا تھا۔ دیوار پہ اس کا نام اور سن پیدائش پہلے رقم ہو جاتا تھا۔ پیدائش کے بعد یا تو ماں باپ کو نام تبدیل کرنا پڑتا تھا یا پھر جنس تبدیل کروانے کی فکر سوار ہو جاتی تھی۔ ہاں جو سہل پسند ماں باپ تھے وہ ان جھمیلوں میں سر سے پڑتے ہی نہیں تھے اس طرح اس محلے میں بہت سی محمود، نثار اور شوکت نام کی لڑکیاں اور انجم، سعیدہ اور ناز نام کے لڑکے دیوار کے سائے سائے پل رہے تھے جو اپنے ساتھی لڑکے لڑکیوں کے چڑانے پر آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر اور اپنی قمیصوں کے دامن اٹھا اٹھا کر یقین دلانے میں لگے رہتے تھے۔ لیکن دیوار کا لکھا قسمت کی لکیر تھا اس طرح اس دیوار نے بہتیرے مردوں کو عورت اور عورتوں کو مرد بنا کر رکھ دیا تھا۔

مرزا صاحب کا اکیلا دم تھا۔ سوچتے تھے محلے والوں سے بگاڑ کر کے کیا کرنا ہے۔ باہر ہی کی تو دیوار تھی۔ اندر تو مرزا صاحب نے گھر میں کسی عبادت گاہ کی سی فضا پیدا کر رکھی تھی۔ دیواروں پر جگہ جگہ اللہ، محمد لکھے ہوئے کیلنڈر لٹکے ہوئے تھے۔ طاقوں اور کارنسوں پر دافع بلیات والے نقش فریم کئے ہوئے دھرے تھے۔ بیٹھک میں جہاں وہ صبح و شام بیٹھتے تھے وہاں کارنس پر رحل میں سرخ کارچوبی کا جزدان چڑھا ہوا قرآن شریف رکھا ہوا تھا دیوار پر سامنے کی طرف مخمل کی بری جانماز کو کیلوں سے جوڑ کر لٹکایا تھا کھونٹیوں اور سوراخوں میں جگہ جگہ اگر بتیاں اڑسی ہوئی تھیں۔ ایک کھونٹی پر کھجور کی گٹھلی کی دانوں والی تسبیح لٹکی ہوئی تھی اور اس کے برابر ہی مرزا صاحب کی مرحوم کی کڑھائی کی دو پلی ٹوپی، جس کا چھاپہ اور کڑھائی اب صرف یادگار زمانہ تھی اور صرف بیٹھک کی آرائش کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ نماز کے لئے مرزا صاحب رامپوری ٹوپی استعمال کرتے تھے، جو رامپور سے نہ آنے پر بھی ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں آسانی سے مل جاتی تھی۔ مرزا صاحب نے اپنی زندگی کی تمام جمع پونجی صرف کرکے یہ مکان بنوایا تھا۔ بڑے بڑے کمروں روشن کھڑکیوں والا مکان مرزا صاحب کی کل ملکیت تھا۔ ماشاء اللہ کنبے والے آدمی تھے۔ بیوی نوجوانی میں مر چکی تھی۔ بہوئیں، بیٹیاں، بیٹے اور نواسے سب تھے۔ یہ دوسری بات تھی کہ ان میں سے کوئی بھی مرزا صاحب کے ساتھ اب نہیں رہتا تھا ایک تو نوکری چاکری کا معاملہ دوسرے محلے کا بگڑا ہوا ماحول، بہوؤں، بیٹیوں کو تو آتے ہی خفقان ہونے لگتا تھا۔ پھر نہ کوئی پاس نہ پڑوس۔ دیوار سے لگے ہوئے گھوسیوں کے دو تین کچے مکان یا پھر قصائیوں، نائیوں اور سگیوں کی آبادی۔ مرزا صاحب نے اپنے اور قصبے کی آبادی کے درمیان پکی پختہ دیوار کو کھڑی کروائی تھی۔ پھر بھی اچھی بری بوئیں، دودھ نکالنے اور گھسے بھینس کے ڈکرانے کی آوازیں اور بے تکا بے تکا شور سب کچھ صاف سنائی دیتا تھا۔ پھر کسی کھاتے پیتے زمیندار کے بھینس کا چارہ کاٹنے والی مشین چلتی اور مرزا صاحب کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے گھر کی عورت پٹنے لگتی۔

جما کی بیوی رشیدہ روز پٹتی تھی۔ وہ روز گنڈاسا ایک طرف پھینک کر اور اکڑ کر بیٹھ جاتی تھی اور بڑبڑانے لگتی تھی: "مشین لگوا دیجی۔ مجھ سے کٹتا ہے چارہ؟" وہ بڑی ادا سے اپنے بھاری بھاری ہاتھ دبا دبا کر پھونکیں مارتی۔

اور جما گنڈاسا اٹھا کر اس کے سر پر سوار ہو جاتا: "اب کاٹتی ہے کُٹی یا اڑاؤں تیری گردن!" وہ شیر کی طرح چنگھاڑتا اور رشیدہ جب بھی نہ اٹھتی تو وہ اپنے سیدھے ہاتھ کی کٹی ہوئی انگلیاں دکھا کر کہتا "پتہ ہے یہ اسی مشین میں آکر کٹی ہیں جس کی دہائی تو روز رات کو دیتی ہے!" اور رشیدہ کی گھگھی بندھنے لگتی۔ وہ کپڑے جھاڑ کر اٹھ بیٹھتی اور گنڈاسا لے کر ذرا سی دیر میں ڈھیر کا ڈھیر چارہ کاٹ کر رکھ دیتی۔ پھر دوسرے دن شام تک وہ پھر بھول جاتی اور پھر گنڈاسا ایک طرف ڈال کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتی۔ جما پھر اس کو دھمکاتا اور اپنا کٹا ہوا ہاتھ دکھاتا۔ رشیدہ پھر گھگھیاتی اور پھر چارہ سے پیر لگ جاتا۔

رات کو جب وہ دونوں لیٹتے تو جما اس کی ٹھوڑی ہلا کر کہتا: "شکر کر رشیدہ، یہ مرزا صاحب کی دیوار کھڑی ہوئی ہے اور سر چھپانے کو انھوں نے اوٹ دے رکھی ہے کسی اور محلے میں رہتی تو تیرا روز تماشا بنتا۔ بچے بڑے سب تالیاں پیٹتے۔"

رشتیدہ پلنگ پہ لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر دیوار کو چھو کر دیکھتی۔ ٹھنڈی یخ دیوار کے لمس سے اس کو جھرجھری سی آتی اور رتجگا کو موقع ملتا۔ مرزا صاحب ضرورت سے صحن میں سے گزرتے تو ان کو دیوار کے پیچھے سے سانپ کی سی پھنکار سنائی دیتی اور وہ ٹارچ لے کر ادھر اُدھر جھانکتے۔ جتنے بچے مکان مردہ مردہ سی روشنی دیکھ کر وہ پڑھنی جگا رہے ہوتے اور پھر اندھا کر دینے گنج اعرش کا ورد کرتے کرتے سو جاتے۔

مرزا صاحب کے مکان کی دیوار محلے میں ہونے والی تمام اچھی بری باتوں کا کھلا ہوا اشتہار تھی تمام اچھی بری باتیں یہیں سے شروع ہوتی تھیں ابھر کر پھیلتی تھیں کتنے ہی چھوٹے بڑے عشق اس دیوار کے سایے سایے پروان چڑھے کچھ پھلے پھولے اور کچھ بن کھلے مرجھا گئے نصرو اور سکینہ کے عشق نے پر محلے کے مردوں کو فکر کا ایک نیا رخ دیا تھا ورنہ اب سے پہلے وہ اس کو جوانی کا جوش سمجھ کر پھبتیوں میں اڑا دیا کرتے تھے۔ سکینہ دیوار کی اوٹ میں ہو کر کھڑی تھی اور نصرو کچھ سڑک پر سے کنکریاں پھینکتا رہتا تھا۔ کنکری جب لڑھکتی ہوئی سکینہ کے پیر کے قریب آکر گرتی تو وہ سمجھ جاتی: "تھوڑی سی بے کلی ہے اور دل میں میٹھا میٹھا سا درد اٹھ رہا ہے۔ پھر ملنے کی خواہش ابھی نہیں ہے" پھر دوسرے دن ایک کے بعد ایک دو تین کنکریاں پے در پے آکر پڑتیں اور سکینہ سمجھ لیتی "دیدار کی خواہش ہے۔ صرف شکل دیکھ کر قرار حاصل کرنا مقصود ہے" پھر اس سے اگلے دن کنکریوں کی بوچھار سی ہونے لگتی۔ سکینہ کے پیر کا انگوٹھا بھی زخمی ہوا وہ پھونک مار مار کر زخم خشک کرتی اور بے چین ہو جاتی: "ملنے کی خواہش ——" وہ آنسو بھری آنکھوں کو دیوار پر ٹکا دیتی۔ دیوار پر بنی ہوئی بھدی تصویریں اور نقش ہلنے سے لگتے اور اس کو کچھ ڈھارس سی بندھتی۔ وہ زمین سے کچی مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھا کر پھینکتی جو راستے میں ہی بکھر جاتا اور نصرو سمجھ جاتا: "معاملہ ٹھیک ہے۔ سکینہ راضی ہو چکی ہے" پھر رات کے اندھیرے میں دیوار کے پیچھے دو سایے سے کانپتے۔ سرگوشیوں اور سسکیوں ابھر کر مرزا صاحب کے صحن میں پھیلنے لگتیں۔ وہ چارپائی پہ لیٹے لیٹے کھنکارتے اور نصرو اور سکینہ دیوار چھو کر اقرار محبت کرتے ہوئے جدا ہو جاتے

مرزا صاحب کی دیوار کے سائے سائے نصر اللہ اور سکینہ کا عشق پروان چڑھ رہا تھا۔ پکی پختہ دیوار ایسی بڑی آڑ تھی کہ سکینہ کا وجود اس پار کا پورا چھپ جاتا تھا اور وہ بے جھجک اشارے کنائے کرتی رہتی تھی۔ پھر ایک دن دیوار سے لگے ہوئے سکینہ کے گھر میں زور سے ڈھولک بجی سکینہ سہرا جھلنے کے لئے بلبلائی بلبلائی پھرنے لگی۔ وہاں اُپلوں کے ڈھیر میں نہ ہیرا تھا اور نہ پتھر۔ وہاں تو بس ایک دھیمی دھیمی آنچ تھی جس کی تپش کو لگائے لگائے سکینہ ڈولی میں سوار ہو گئی۔—— دولہا گھوڑی پر سوار ہونے کے لئے آگے بڑھا تو اس کی نظر دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے شخص اُلجھے بال، گریبان چاک، آنکھوں میں اُداسیاں اور خالی ہاتھ، اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پچھائی ہوئی اکنی نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ پھر ایک اور نقش اُبھرا:

"نوجوان عاشق کی حسرت ناک موت"

نام :- نصر اللہ خاں

پیدائش :- ——

وفات :- ——

سلسلۂ نسب :- مجنوں، فرہاد اور پنجاب کے عاشقوں سے ملتا تھا۔

سیرت :- خون کے گھونٹ پی کر خاموش رہنا۔ اور خاموشی سے مر جانا۔

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ہمیشہ کی طرح سب نے مرے سے لے کر نئی لکھی ہوئی عبارت کو پڑھا۔ بیکار گھر میں بیٹھے اور چہ میگوئیاں کرنے والے بوڑھوں نے بھی، کام کر

ے مردوں نے بھی اور اوباش قسم کے چھوکروں نے بھی۔ پر کسی کے خون نے جوش نہیں مارا۔ وہ سب اس کو ہنسی دل لگی سمجھ کر پڑھتے، دو چار باتوں
ضافہ اپنی طرف سے کرتے، اور پھر قہقہے لگاتے ہوئے یا توبہ توبہ کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ مرزا صاحب صبح سے اپنے دروازے پر کھڑے ہوئے
ماشہ دیکھ رہے تھے۔ ان کو نصر اللہ کی جواں مرگی کا افسوس بھی تھا اور سکینہ کی معصوم محبت کے پامال ہونے کا غم بھی۔ انھوں نے بارہا سکینہ کو دیکھا تھا۔ وہ
ے ہوئے جسم کی ایک دراز قد لڑکی تھی۔ ڈری ڈری آنکھیں، کپکپاتی ہوئی چھوٹی سی ناک اور تھرتھراتے ہوئے گداز ہونٹ۔ اس کے جسم کا رواں رواں
بتا تھا عجیب بودی مٹی سے اللہ میاں نے اس گٹھے ہوئے جسم کی لڑکی کو بنایا تھا۔ وہ روز صبح سویرے کچے دودھ کا جھاگ بھرا کٹورا مرزا صاحب
ے لئے لے کر آتی تھی اور ایسے اوندھے سیدھے قدم اٹھا کر چلتی تھی کہ دودھ اس کے اپنے گھر کے دروازے سے جو چھلکتا تو مرزا صاحب کے کمرے کی میز
رکھنے کے بعد بھی تھوڑی دیر تک کٹورا ہلتا ہی رہتا تھا۔ میز پر جو بوندیں گرتیں ان کو سکینہ اپنے سر کی اوڑھنی اتار کر جلدی جلدی صاف کرنے لگتی۔ اتنی
یں مرزا صاحب سلام پھیر کر اس کی طرف مڑتے تو وہ لڑھکتی ہوئی واپس جاتی ہوئی دکھائی دیتی۔ دروازے پر اس کے ٹھوکر لگتی تو مرزا صاحب چیختے
تن میں سنبھالتی ہی تو سکینہ روز بروز بے ہوش ہوتی گئی۔ پھر ایک دن جب وہ دودھ کا کٹورا میز پر رکھنے لگی تو کٹورے کے ساتھ ساتھ خود بھی اوندھی گر پڑی۔
صاحب نے اس کا بازو پکڑ کر اس کو سیدھا کھڑا کیا تو وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر مرزا صاحب کو غصہ بھی آیا اور رحم بھی۔ انھوں نے
، کر نرمی سے "گھبراتا تو یہاں کون تجھے کھا رہا ہے؟ ہوش میں رہ" پر وہ اپنے گول مٹول جسم کو لٹو کی سی پھرکیاں دیتی ہوئی دروازے سے باہر نکال لے گئی

گھر جا کر اس نے اپنی ماں سے صاف صاف کہہ دیا "تو خود دودھ دے آیا کر یا ابا آپ ہی دے آئے گا۔"

"پر تو کیوں نہیں جائے گی؟" اس کی ماں نے کریدا۔

"بس نہیں۔" وہ پھولی بتی کی طرح پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"بات تو بتا؟" ماں کو کرید سی لگ گئی۔

تب سکینہ نے اپنے پھولے پھولے گالوں کو پچکا کر زور سے آواز نکالی "ہوش میں۔ ہوش میں"

اور پھر دونوں ماں بیٹی ہنستے ہنستے پلنگ پر گر پڑیں۔ دوسرے دن سے نورا خود کھیت پر جاتے ہوئے مرزا صاحب کو دودھ کا کٹورا دیتا جاتا
پھر بھی مرزا صاحب کسی نہ کسی بہانے سے سکینہ کو بلواتے ہی رہتے تھے۔ کبھی چلم بھرواتے اور کبھی تازہ مکھن منگواتے۔ اور سکینہ ویسے ہی ہمیشہ کی طرح
ٹکنیاں کھاتی ہوئی آتی اور سر پٹ کام کر کے تیر کی طرح نکل جاتی ـــــ اور اب کچھ دن سے تو نہ اسے ہوش تھا اور نہ فرصت۔ پہلے بے دھیانی میں
لِلّہ سے دل لگا بیٹھی اور کچی ڈلی پھینک کر اقرار بھی کر لیا، پھر معلوم ہوا کہ وہ دوسرے گھر میں مانگی ہوئی ہے تو پلنگ پر الٹی کھٹوانٹی لے کر لیٹ گئی،
ر دکھی رانی کی طرح جو نہ منہ سے بولے اور نہ سر سے کھیلے۔ ماں نے ٹٹولا تو بس خاموش خاموش گونگوں کی طرح تکنے لگی۔ ماں نے جلتا ہوا اپلا پکڑا یا کہ مرزا صاحب
لم میں ڈال آ وہ کئی مرتبہ آ کر کہہ گئے ہیں، تب بھی ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ وہ تو برات والے دن بھی بس لاش کی طرح اٹھی ہوئی ڈولی میں جا بیٹھی تھی۔

مرزا صاحب نے حقے کے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے اس کے اٹھتے ہوئے قدموں کو گنا تھا۔ اس نے دو قدم کا فاصلہ بارہ پندرہ قدم میں
طے کیا تھا، وہ جو قلانچیں بھرتی تھی، مرے بیل کی طرح چل رہی تھی اور جب ہی سے مرزا صاحب بے چین تھے۔ صبح کو دیوار پر لوگوں نے اس کا
اس کی محبت کا تماشہ بنایا ہوا تھا۔

"بڑے افسوس کا مقام ہے۔ انسانی ہمدردی سرے سے مفقود ہے۔" مرزا صاحب نے دل میں سوچا۔ انھوں نے دیوار کے قریب کھڑے ہوئے
پر نظر ڈالی اور پھر خود بھی چلتے ہوئے مجمع کے قریب آئے اور ایک نوجوان کی کلائی پکڑتے ہوئے بولے "میاں کچھ خوف خدا بھی ہے! بڑے شرم کی بات

ہے! اور یہ تو ہے شیرا! اوروں کو تو چل جانے دے، پر تو عقل اور طاقت دونوں رکھتا ہے۔ پھر کتنی ہی مرتبہ محلے کی لڑکیوں کو غیروں کے چنگل سے چھڑا چکا ہے۔ سکینہ کی مدد کرنے کے بجائے ادھر کھڑا اس کا مذاق اُڑا رہا ہے!"

"پر مرزا جی سکینہ کی شادی ہو گئی ہے، میں اس کو کیسے چھڑا سکتا ہوں!" شیرا بے وقوفوں کی طرح منہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

شادی ہو گئی ہے! ایسی شادی نہیں ہوتی! پتہ بھی ہے ایسی شادی عذاب بن کر پورے قصبے کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے! ماں باپ زبردستی بچی کے گلے پر چھری پھیری ہے۔ خدا کے ہاں تم سب کو اس کا جواب دینا ہوگا۔ تمہیں بھی اور ان سب کو بھی جو آج ایک معصوم کی ہنسی اڑا رہے

مرزا صاحب یہ کہہ کر اندر جانے لگے تو شیرا نے لپک کر ان کا راستہ روک لیا۔ "جی مرزا صاحب چلے کہاں! کچھ ترکیب تو بتاؤ۔"

میں کیا ترکیب بتاؤں۔ تمہارا معاملہ ہے۔ خود سوچو۔ سمجھ میں آئے تو پنچایت بٹھاؤ۔ پر اتنا میں ضرور کہتا ہوں کہ سکینہ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اس معصوم پر ظلم ہوا ہے اور مظلوم کی آہ عذاب بن کر گرتی ہے۔ تمہاری گائیوں کا دودھ سوکھ جائے گا! تمہاری فصلیں جل جائیں گی! تمہارے مویشی مر جائیں اور تم سب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرو گے!" مرزا صاحب نے قرب قیامت کی نشانیاں بتا کر سننے والوں کے مجمع میں سنسنی پھیلا دی۔

"پر مرزا صاحب ایک جان تو گئی۔ گبھرو جوان اپنی جان سے گیا ہے! اور سکینہ کیا بھینٹ مانگتی ہے؟" ایک دوسرے نوجوان نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا، جو شاید نصراللہ کا رشتے دار یا شاید بھائی تھا۔

"تم کس کو کہہ رہے ہو؟" مرزا صاحب نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"نصراللہ کو!"

"بھاڑ میں ڈالو نصراللہ کو، وہ بھی کوئی مرد تھا! اٹھا کر بچھیا سی لڑکی کو قصائی کے حوالے کیا ـــــ اچھا ہوا مر گیا محلے سے ایک نامرد تو اُٹھا۔ تم سب بھی مر جاؤ تو اچھا ہے۔" یہ کہہ کر مرزا صاحب نے کوئی آیت مع ترجمہ پڑھی جس کا مفہوم تھا "ظالم کی نجات نہیں"۔ پھر انھوں نے جاتے جاتے دیوار کی طرف دیکھا۔ شیرا کوئلے کا ٹکڑا ہاتھ میں پکڑے ہوئے نصراللہ کے نام کے سامنے گالیاں لکھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور مجمع اللہ اکبر کہتا چھٹ گیا۔

دوسرے دن صبح کو سکینہ کا باپ مرزا صاحب کو دودھ کا کٹورا دینے آیا تو وہ وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ انگلیوں سے تسبیح کے دانوں کو گھماتے ہوئے انھوں نے منہ سے "ہوں، ہوں" کی اور ہاتھ سے نورا کو ٹھہرنے کا اشارہ کر کے دعا مانگنے کے بعد بولے "نورا، سکینہ کی بغیر مرضی شادی کر کے تو نے اچھا نہیں کیا!"

نورا کھڑے کھڑے ایسا چونکا جیسے کسی زہریلے جانور نے ڈنک مار دیا ہو۔ پھر کچھ سوچتا ہوا بولا "بغیر مرضی! بغیر مرضی کیسے؟ میری مرضی تھی۔ سکینہ کی ماں کی مرضی تھی۔ پھر لڑکے کے ماں باپ کی مرضی تھی۔ سال بھر تک چوکھٹ پر ناک رگڑوائی تھی۔ بڈھے بڑھیا کو تب کہیں جا کر حامی بھری تھی! بغیر مرضی کیسے ہوگی؟" نورا نے اپنا چوڑا چکلا سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

"تیری ہی تو مرضی تھی۔ پر لڑکی ـــــ" یہ کہتے کہتے مرزا صاحب نورا کے تو نورا مذاق اڑانے کے سے انداز میں بولا "کیسی باتیں کرو ہو مرزا جی، بچوں کی بھی مرضی ہووے ہے۔ جہاں ماں باپ نے کر دیا ٹھیک ہے۔"

"یہی تو ٹھیک نہیں۔" مرزا صاحب نے کہا

"کیوں، ٹھیک کیوں نہیں؟ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔"

"غلط ہوتا آیا ہے۔" مرزا صاحب نے تسبیح گھماتے ہوئے کہا۔

رم کیا کریں، اور وائی قرانی قانون کی طرح اس پر بھی کوئی قانون لاگو ہو گیا ہوگا!" نورا نے لاپروائی سے کہا۔
قانون کیسا! یہ خدائی قانون ہے اور ہمیشہ سے ہے" یہ کہہ کر مرزا صاحب نے کارنس پہ رکھی ہوئی کتاب اٹھا کر شادی بیاہ اور نکاح کے فرعی
یلات پڑھ کر نورا کو سنائیں جن کو وہ بغیر سمجھے ہوئے سرہلا ہلا کر سنتا رہا۔
نورا گردن ہلا کر بولا "پر اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ کہو تو بڑھی بھینس خیرات کردوں؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
ڑھی بھینس سے کیا ہوتا ہے! لڑکی کی خیر خیریت معلوم کرا کر خوش ہے تو پھر خوش ہے، لیکن اگر اس کی آنکھ میں ایک بھی آنسو اور سینے میں ایک بھی آہ
ے تیرا دین بھی گیا اور دنیا بھی!" یہ کہہ کر مرزا صاحب نے کتاب بند کر کے کارنس پر رکھ دی اور پیٹھ موڑ کر باقی وظیفہ پڑھنے لگے۔ نورا جانے
نھوں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پہ کوئی تاثر نہیں تھا، سپاٹ اور سیدھا سادا چہرہ، جس کو نہ دین کی پرواہ تھی اور نہ دنیا کی۔ فکر تھی
ل، چارہ، دودھ کی تھی اور نہ پیسے کی، کڑوی کڑوی کھاتی تھی یا ڈکراتی تھی۔ اس نے گھر جا کر کھونٹے سے بھینس کو الگ کیا اور اس کو گھسیٹتا ہوا
طرف جانے لگا۔ مرزا صاحب نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا اور سرد آہ بھر کر رہ گئے۔
ل، گنوار، جانور اور انسان کو ایک ہی طرح ہانکتے ہیں۔ سکینہ اور بڑھی بھینس میں کیا فرق ہوا؟ قصائی قصائی سب برابر، چاہے ہاتھ میں چھری ہو،
ایک ہی بات ہے" مرزا صاحب دیر تک کھڑے ہوئے سڑک پر گھسٹتی ہوئی بھینس اور نورا کو دیکھتے رہے۔ پھر سسکتے ہوئے بیٹھ گئے "میری
زاب نہیں محلے والوں کو بھی سمجھا دیا اور باپ کو بھی خدائی قانون بتا دیا۔ اب یہ جانیں اور ان کا دین ایمان۔ الٰہی قرآن کو عقل دے" یہ کہہ کر
اخبار اٹھا کر پڑھنے لگے۔

صاحب پڑھے لکھے آدمی تھے۔ لوگوں کو صحیح بات بتانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ پھر کچھ خوفِ خدا بھی تھا۔ لیکن اپنی بات منوانے کے لئے کسی کے پیچھے
ی نہیں دوڑتے۔ ان کو معلوم تھا کہ قصبے کی آبادی ہزاروں سال پہلے کے عرب وحشی قبائل سے کسی طرح بھی بہتر نہیں ہے۔ یہ جس کے پیچھے
عورت لگ رہی ایک طرف، جان بچانا بھی دوبھر ہو جاتا تھا۔ اور پھر دیوار ــــــ وہ تو ایسا بستا ہوا ناسور تھا جو کسی بھی وقت کسی کے
سکتا تھا۔ اس میں کسی بڑے چھوٹے، امیر غریب کی تمیز نہیں تھی بس کسی کی کوئی نازیبا حرکت کوئی دیکھ لے یا کوئی اچھی بری بات ہاتھ
دیکھیے دوسرے دن دیوار پر اس کی تفصیل، شجرہ نسب اور تصویروں کے ساتھ قصبے میں ایک سے ایک بڑھ کر فنکار اور صاحبِ ذوق
اپنی موزوں بے تکان اور رسیلی گالیوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ چھوٹے میاں جو قطعی چھوٹا نہیں تھا۔ اس کو سارے عشقیہ اور دل میں
ت پیدا کرنے والے شعر یاد تھے جن کو وہ املا کی تھوڑی سی غلطیوں کے ساتھ دیوار پر موقع و محل کے لحاظ سے فٹ کر دیا کرتا تھا۔ بعد میں جب کبھی
ہردان کو فرصت ہوتی اور وہ ادھر سے گذرتا تھے اور املا کی غلطیاں درست کرتا ہوا نکل جاتا تھا۔ تصویر کشی کا فن چھدا کو اپنے باپ سے ورثے میں
مجذوب سا بزرگ آدمی تھا جو منہ میں پانی بھر کر زمین پر پچکاریاں مار مار کر نقش بنایا کرتا تھا۔ چھدا منہ سے تو نہیں ہاں ہاتھ سے بالکل جیتی جاگتی
تا تھا۔ مستری چراغ دین کا کارٹون اور ماسٹر یوسف کی بیوہ کی تصویر اس کی مصوری کے نمونے تھے، جو دیوار کے انمٹ نقوش تھے۔ پھر ایک
ن کی تصویر دیوار پر آجانے وہ مٹائے نہیں مٹتی تھی۔ ابھی تھوڑے دن کی بات ہے۔ رجب علی بزرگ سا آدمی تھا۔ شرع ترو تازہ کا پابند، پرچون کی
ہی کئے دوکانداری کرتا تھا۔ عورتیں مرد سب اس کی دوکان سے سودا سلف خریدتے تھے۔ ایک دن کسی نے دیکھ لیا کہ وہ جب ماسٹر یوسف
خریدار تھا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور حساب میں بھی گڑبڑ کر بیٹھا تھا۔ پھر کیا تھا۔ دوسرے دن ایک لمبی چوڑی با تصویر کہانی دیوار پر قلم

تھی سے نقلی پیر۔۔۔ اب رجب علی بابا کھا رہا ہے مسجد میں جا کر قرآن شریف اٹھانے کو تیار ہے۔ اپنی کھچڑی بوڑھی کا واسطہ دلا رہا ہے کہ اس کے کان میں اگر بھنک پڑ گئی تو بڑھے رجب علی کا مردہ ہی اٹھوا دے گی۔ وہ جا کر ایک ایک کے آگے گڑگڑایا "میرا جوان بیٹا ہے وہ سُننے لگا تو اس کا خون جوش کھائے گا۔ کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھا تو میں بڈھا ٹھڈا آدمی کہاں پولیس چوکی کرتا پھروں گا۔ پھر تمہیں تو سب کو معلوم ہے کہ میرا حساب کھرا ہے۔ پیسے جوڑنے میں اکثر گڑبڑ کر بیٹھتا ہوں بیسیوں مرتبہ تم میں سے ہی کئی ایک آ کر میرے پیسے واپس کر کے گئے ہو۔ ماسٹر کی بیوہ کے پاس وہ آنے زیادتی چلے گئے تو ایسا کونسا غضب ہو گیا کہ تم نے نہ میری عمر کا خیال کیا اور نہ رتبے کا۔ میری شرافت اور ایمان داری سب پر پانی پھیر دیا۔"

پھر اب کیا ہو سکتا تھا۔ دیوار پر لکھا جا چکا تھا جو مقدر کے لکھے کی طرح اب قبر تک ساتھ جائے گا۔ مرنے کے بعد لوں سے پہلے ہی مٹ جائے۔ دیوار کا تو ہر نقش انمٹ تھا۔ اکثر لوگوں کا دل چاہتا تھا کہ کلہاڑی پھاوڑے اٹھائیں اور اس دیوار کو ڈھا دیں۔ دیوار تھی یا خدائی نوجداری۔۔۔۔ نہ آزادی کا جینا تھا اور نہ چین کا مرنا۔ پھر دیوار کی اوٹ میں ہوتے ہوتے کچے پکے عشق اور گھوسیوں کے مکان آڑے آئے۔ جمّا اور نورا دونوں محلے کے شیر تھے جو کچی پختہ دیوار کے سائے میں وہاں چڑھ کر اور بھی مضبوط ہو گئے تھے۔ کیونکہ ان کو مرزا صاحب جیسے بزرگ کی پشت پناہی حاصل تھی۔ جمّا کو دیوار سے دوہرا فائدہ تھا۔ اول تو وہ بے دھڑک رشیدہ کو چار چوٹ کی مار لگا سکتا تھا۔ رشیدہ کے لئے جمّا کی مار اتنی ہی ضروری تھی جتنا جمّا کے لئے رشیدہ کا بھاری بھرکم جسم۔ اس کو مار پیٹ کر وہ بے تکان اونچی اونچی سانسیں لے سکتا تھا۔ اس کی سانس میں اتنا جوش تھا کہ اگر ہوتی کوئی کچی مٹی کی دیوار تو دو دن میں ہی شاید ڈھیر ہو جاتی۔ پھر بھی سانس لیتے وقت اس کو اپنے گھر کی بقیہ تین دیواروں اور سب سے زیادہ کھپریل کی چھت سے خطرہ ہی رہتا تھا جو جمّا کی پھنکاروں سے کسی وقت بھی اُڑ سکتی تھی۔ اس لئے وہ جلد اپنے کو قابو میں کر لیتا تھا اور سنبھل سنبھال کر سو جاتا تھا۔ لیکن اس کی پھنکاروں سے مرزا صاحب کی نیند ایسی ٹوٹتی کہ صبح تک پلک ہی جھپکنے میں نہیں آتی تھی۔ اُدھر دوسری طرف نورا نے مویشیوں کا پورا ریوڑ اکٹھا کر لیا تھا جن کے گوبر اور چارے کی بدبو سونگھتے سونگھتے مرزا صاحب کو مستقل نزلہ رہنے لگا تھا۔ وہ اکثر سوچتے تھے کہ مکان کے پیچھے شاگرد پیشہ خالی پڑا ہے۔ جمّا اور نورا آرام سے اس میں رہ سکتے ہیں۔ مکان کے سامنے کی غلاظت بھی دور ہو جائے گی اور ان کو بھی سکون مل جائے گا۔ بیٹھے بٹھائے ان کو اچھے مرض لگ گئے۔ انھیں نہ تو نزلے کی شکایت تھی اور نہ کم خوابی کی۔ ان کی صحت اور ان کا کسرتی جسم تو ان کے ہم عمروں کے لئے مثال تھا۔ پچاس سے اوپر کے پیٹے میں تھے لیکن نہ بال سفید ہوئے تھے، نہ دانت جھڑے تھے اور نہ بینائی میں فرق آیا تھا۔ وہ تو ایسے ٹھکے ٹھکائے اور جچے جچائے تھے جیسے ابھی لوہار کی بھٹی سے مکمل کر آئے ہوں۔ اب جو ان کی نیندیں غائب ہونا اور مستقل چھینکیں آنا شروع ہوئیں تو ان کو فکر ہوئی۔ انھوں نے لڑکے بھیج کر جمّا اور نورا کو بلوایا۔ جمّا تو یہ سُن کر ایسا خوش ہوا جیسے جنت مل گئی ہو۔ پر نورا کا چہرہ لٹک گیا۔ یہ دیکھ کر مرزا صاحب نے پوچھا "کیوں بھئی تجھے اُدھر اُٹھ آنے پر کیا اعتراض ہے؟"

"اعتراض تو کوئی نہیں، بس چھ دم اور ایک کمرے کی بات ہے۔"

"چھ دم کون ایسے بڑے ہیں! تیرے چھوٹوں پوتوں کے لئے ایک کمرہ بہت ہے۔ مویشیوں کے لئے جیسے اُدھر چھپر ڈالا ہے اِدھر بھی ڈال لیجو!"

"وہ تو سب ٹھیک ہے۔"

"پھر؟" مرزا صاحب جِھنجھلائے۔

"ابی وہ لونڈیا بھی تو چھٹی کر آئی ہے۔ تم جانو، جوان لونڈیا ہے چھٹی کر بیٹھی تو کیا ہوا۔ دل تو اس کا بھی ہے۔ ہم میاں بیوی کو دیکھے گی تو۔۔۔" نورا اپنی جھونک میں بول رہا تھا کہ جمّا نے اس کو آنکھ ماری اور وہ بوکھلا کر خاموش ہو گیا۔

"کون لونڈیا؟" مرزا صاحب نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"سکینہ جی، وہ رکمنی، اس کا مرد خود چپ کر گیا ہے کہ دکھوا ہی تھوڑے کو۔ نہ منہ سے بولے اور نہ کوئی اور بات بتائے۔ بس مخروسوں کی طرح روئے

ے ساہن کا دل کرے تو آ جائے نہیں تو ہماری طرف سے آزادی: میں تو اس کو دوبارہ جانے کے لئے راضی کر رہا تھا۔ پر تیسرے ہی دن اس کے آدمی کی
"طلاق، طلاق، طلاق۔ پنچ ہنجوں کے درمیان تین طلاق، اب تم بتاؤ؟" نورا ہمیشہ جب روتا تھا مفصل بات چیت کرتا تھا۔
مرزا صاحب نے اس کو بیچ میں ٹوک کر کہا: "اچھا مجھے یہ سب کچھ تو نہیں سننا۔ تم دونوں سوچ لو اور سامنے کا حصہ خالی کر دو تو میں صفائی کے لئے
بلواؤں۔ مکان کے پیچھے تم بھلے ہی کچا مکان کھڑا کر سکتے ہو۔"
جمّا اور نورا شاگرد پیشے میں اٹھ آئے لیکن مرزا صاحب کی کم خوابی اور نزلے کی شکایت بدستور رہی۔ پہلے تو گھڑی دو گھڑی آنکھ بھی لگ جاتی تھی، اب تو
جاگ کر اور توبہ استغفار کرتے ہی گزرنے لگیں۔ ایسے اوندھے سیدھے خیالات آتے کہ کبھی نوجوانی میں نہیں آئے ہوں گے۔ اور وہ لیٹے ہی لیٹے خوف
سے لگتے۔ یہ حالت ان کی اکیلے پن کی وجہ سے نہیں تھی۔ اکیلے مرزا صاحب کوئی آج سے تھوڑی رہ رہے تھے۔ بیوی کو مرے ہوئے بھی پندرہ سال سے
ہو چکے تھے اور سب سے چھوٹی بچی کی شادی کو بھی پانچواں برس لگ رہا تھا۔ انھیں تنہائی سے نہ کبھی وحشت ہوئی تھی اور نہ گھبراہٹ۔ ان کو اپنی
ڑی عزیز تھیں۔ ان تنہائیوں نے ان کو خدا اور مذہب سے قریب کیا تھا۔ پر پچھلے دن سے جو کتابیں ان کے مطالعے میں تھیں۔ ان سے اب وہ اس نتیجے
دنیا کو چھوڑ کے بغیر عقبیٰ کو سنوارنا بچوں والی بھول ہے اور جب سے ہی ان کو یہ تنہائیاں کاٹ کھانے کو دوڑنے لگی تھیں۔ پھر مکان کی دیوار پر اور
پچھواڑے ایک دنیا آباد تھی۔ ایسی رنگا رنگ دنیا، کہ مرزا صاحب لاکھ آنکھیں چرائیں اور دامن بچائیں، وہ کانٹوں والی بیل کی طرح لپٹی ہی جاتی
صاحب صبح سویرے چہل قدمی کے لئے نکلتے تو نہ دیکھنے کے باوجود بھی دیوار پر بنے ہوئے نقش ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے۔ دیوار پر ہر روز کسی تازہ
ستان، طربیہ اور عشقیہ اشعار، ننگی اور عریاں گالیاں اور چھوٹے موٹے لطیفے رقم ہوتے تھے، جو مرزا صاحب جیسے صوفی منش کے دل میں بھی گدگدی پیدا
تے تھے۔ ان کے سینے میں ہلکی ٹیس سی اٹھتی اور وہ صبح کی ٹھنڈی ہوا سے بچاؤ کے لئے اپنی شیروانی کے اوپر کے بٹن بھی بند کر لیتے۔ چھڑی کی نوک سے
ہوئے کسی نقش کے بچے درست کرتے اور کبھی مسکراتے ہوئے اور کبھی جھنجھلاتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ۔۔۔ دیوار پر بنی ہوئی تصویریں۔ دیوار پہ لکھے ہوئے
یار کے پیچھے ہوتے ہوئے چھوٹے بڑے عشق اور پھر آئے دن خودکشی اور گھر سے بھاگنے کی وارداتیں سن سن کر مرزا صاحب کو اپنے ایمان پر شبہ سا ہونے لگا تھا۔
کر کچھ سے ہیر رکھنے کے وہ قائل بھی نہیں تھے ۔۔۔۔ وہ مدت سے دنیا اور اس کے جھگڑوں سے الگ تھلگ صوفیوں کی سی زندگی گزار رہے تھے
ے محسوس کرنے لگے تھے کہ رہبانیت جھوٹا سہارا ہے اور تب ہی تصوف پر سے ان کا ایمان ایکا ایکی ہٹ گیا اور انھوں نے اپنے گرد و پیش میں دلچسپی
لیا۔ پر گرد و پیش میں کیا رکھا تھا، گھوسیوں، قصائیوں اور کسانوں کی آبادی ۔۔۔ اور اس کے درمیان میں کھڑی ہوئی ایک اینٹ کی دیوار، جو سراسر
ٹ تھی۔ اکثر مرزا صاحب کا دل چاہتا تھا کہ راج مزدوروں کو بلوا کر اس کا قصہ ہی ختم کرا دیں، پھر سوچتے تھے رات بھر کی کوفت منٹ بھر میں دور
جب وہ دیوار کے سامنے کھڑے ہو کر کوئی پھڑکتا ہوا شعر یا چٹکلا پڑھ لیتے۔ سارا دن بڑا ہلکا پھلکا گزرتا۔ جمّا کی بیوی کا تھل تھل کرتا ہوا جسم، نورا کی
ے والی بیٹی سکینہ، اس کی اپنے تھاپتی ہوئی بھولے بالوں والی بیوی اور سب سے بڑھ کر جمّا کی اکلوتی گیابھن بھینس ۔۔ ان کے سامنے ڈھیروں جیتے
بکھرے رہتے۔ اور بار بار قصد کرنے کے باوجود ان کی نمازیں قضا ہو جاتیں۔ فرضوں کی جگہ سنت اور وتر میں دعائے قنوت پڑھنے کے بجائے
کر پلنگ پر لیٹ جاتے ۔۔۔ پر رات کا کیا کریں جو قیامت بن کر آتی ۔۔۔ جمّا نشیدہ کھیت کوٹ کر سانپ کی طرح پھنکارنے لگتا اور سکینہ اور
چلا چلا کر چلانا شروع کر دیتیں۔ جب سے یہ لوگ کوارٹر میں آ کر رہنے لگے تھے۔ ان کے درمیان ماں بیٹی والا رشتہ ختم ہو کر سوکنوں والا رشتہ قائم
مرزا صاحب اور ان کے ساتھ ساتھ نورا کا رات کا سکھ ہی جاتا رہا۔ نورا کی ماں بیٹے کے پلنگ کو تک تک کر گزر رہی تھیں، جو نہ سوتی اور
بس خالی خالی آنکھوں سے چھت کو ٹٹولتی رہتی ۔۔۔ صبح کو نورا اور اس کی بیوی سکینہ کے خراٹوں سے جاگتے اور اس کی بیوی پھوپھیا

شروع کر دیتی ہے میری سوت، اپنا خصم چھوڑ کر میرے اوپر پھر انگا کر بیٹھی ہے "
اور مرزا صاحب اس کی آواز کو صبح صادق کا پیغام سمجھ کر آسمان کو دیکھتے ــــ پھر نماز سے فارغ ہو کر باہر نکل جاتے، یہ دیکھنے کے لئے کہ دلوں کو
مید جلانے والی دیوار پر کہیں ان کا نام تو نہیں ــــ !

دیوار کا بھوت محلے میں سب پر سوار تھا۔ پہ آج کل جو سب سے زیادہ پریشان تھا وہ تھا نورا جس کی بیوی اور بیٹی کی آوازیں مرزا صاحب
کے پکے مکان میں گونجتی ہوئی کچی سڑک پر صاف سنی جاتی تھیں۔ وہ کئی مرتبہ مرزا صاحب سے کہہ چکا تھا "میں تو کہہ کہہ کر ہار گیا مرزا صاحب، اب ذرا تم
ان کو سمجھا کر دیکھو۔ تمہاری وجہ سے ڈھکی پڑا ہوا ہے ورنہ ان کی کمینی حرکتوں کی وجہ سے میرا نام کبھی کا دیوار پر آ گیا ہوتا۔"

مرزا صاحب عورتوں کے منہ لگنے کے قائل نہیں تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ بڑھتے وقت قوتِ گویائی کے علاوہ باقی تمام قوتیں کسی روحانی طاقت
کے زور سے ان سے چھین لی جاتی ہیں۔ ہاں، نورا ان سے دعا کے لئے کہتا تو وہ ضرور ان کے حق میں دعا کرتے۔

"اے رب العزت اس مخلوق کی زبان اور اپنی رحمت کے درمیان کوئی ایسا رابطہ قائم کر جو موٹر کے بریک کی طرح جا کر زبان کے نیچے لگ
جائے تیرے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ یا مامور کر دے کسی فرشتے کو یا ابابیلوں کو جو بولتی عورتوں کے سر پر ڈھیلے برسائیں اور ان کو تنبیہ ہو اور خوف خدا
اور انسانی ہمدردی دونوں جذبے ایک ساتھ بیدار ہوں۔"

پر سکینہ اور اس کی ماں کے سلسلہ میں دعا کا کوئی کلمہ بھی ان کی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ بلکہ اکثر رات کو تو عجیب و غریب خیالات ان کو آتے
ان کا دل چاہتا یہ دونوں عورتیں یوں ہی بولتی رہیں اور وہ یوں ہی لیٹے لیٹے ان آوازوں کو اپنے اندر جذب کرتے رہیں۔ انتہائی کرخت اور بے
آوازیں مرزا صاحب کی روح کی گہرائیوں میں اتر کر عجیب و غریب اثر کر رہی تھیں۔ حالانکہ مستقل جاگتے رہنے کی وجہ سے ان کی صحت پر بڑا برا اثر پڑ
رہا۔ ان کا گٹھا ہوا کسرتی جسم روز بہ روز لٹکتا جا رہا تھا۔ پورے جسم میں ہلکا ہلکا درد سا رہنے لگا تھا۔ عجیب سے بے کلی اور بے چینی سی رہتی۔ ادھر وہ نورا کو دیکھتے
تمام راتوں اور روز کے جھگڑوں نے اس کو لیموں کی طرح نچوڑ کر رکھ دیا تھا اور تب ان کو لگتا کہ نورا کا دکھ ان کے دکھ سے مختلف نہیں۔ وہ دونوں چند روز
عمر کے کچھ سال پھلانگ کر اس سرحد پر پہنچ گئے تھے جہاں سے پلٹ کر کوئی نہیں آتا اور جہاں اجالا ہے نہ اندھیرا، نہ آوازیں ہیں اور نہ چیخیں، بس آنکھوں
چکنے والی دیوار کی سفیدی کے سوا کچھ نہیں ــــ تب ایک دن انھوں نے سفید جھاگ سے بھرے دودھ کے کٹورے کے ساتھ نورا کے پھیکے زرد چہرہ
دیکھا اور بولے "ارے اب تجھے کیا ہوا ہے؟"

"بس جی، دونوں ماں بیٹی مجھے کھا کر دم لیں گی۔"

"تو کوئی بھلا مانس دیکھ کر سکینہ کا نکاح کر دے۔" مرزا صاحب نے مشورہ دیا۔

"بھلا مانس!" نورا نے اپنی میلی آنکھوں کو خلا میں گھمایا اور پھر بولا "اجی اب اسے کون جٹے گا؟ پہلے ہی ایک مرتبہ ہو گیا تو بہت ہے۔ نصر اللہ کی موت
دیوار کی کہانی سے آگے ہی اس کی بڑی شہرت ہو چکی ہے۔ میں تو اپنی گھر والی کو سمجھاتا ہوں کہ نیک بخت تو صبر کر۔ یہ تو زندگی بھر کی مصیبت ہے۔ کل کلاں
کسی کے کان میں بھنک پڑ گئی تو دیوار پر نام آ جائے گا۔ پر وہ بھی کیا کرے؟ جوان جی ہے۔ قابو میں آتے ہی آتے تو آئے گا۔ سکینہ سے کہتا ہوں بیٹا تو چپ رہ، اُٹھ
وہ ایک اڑیل ٹٹو ــــ"

"تو سکینہ سے پوچھ کہ وہ نکاح ثانی کے لئے تیار ہے!"

"نکاح ثانی!" نورا نے بغیر سمجھے ہوئے لفظوں کو زبان سے ادا کیا۔

"ہاں، ہاں دوسرا نکاح ——میرا مطلب ہے دوسری شادی"

"پوچھ کر کیا کرنا ہے جی! یہ تو بری بات ہوئی سوت نہ کپاس کولہے سے لٹھم لٹھا، مجھے معلوم ہے اس کو اب کوئی نہیں تھمے گا۔ غریب کی بیٹی ایک مرتبہ بیاہے تو بہت ہے"

"تو پوچھ تو سہی بڑے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔"

نورا کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔ اس نے اپنی میلی آنکھوں کو آستین سے صاف کیا اور کھکھیاتے ہوئے بولا: "مرزا صاحب جی، اگر تمہاری نظر میں بڑکا ہو تو بتاؤ! سکینہ راضی ہو یا نہ ہو، پرمیں اور اس کی ماں مار باندھ کر نکاح پڑھوا ہی دیں گے۔"

"لاحول ولا ——پھر وہی جہالت۔ ایک مرتبہ زبردستی کا نتیجہ دیکھ چکا ہے، پر ابھی عقل نہیں آئی۔"

مرزا صاحب نے ایک مرتبہ پھر اپنا فرض ادا کرتے ہوئے نورا کو سیدھی راہ بھجانے کی کوشش کی۔ نورا کی موٹی عقل میں بات آنی تو مشکل تھی، پر وہ بھی اپنے اپنے سے ماجرا آچکا تھا۔ پھر دیوار کے بھوت سے بھی اس کی جان جاتی تھی۔ ایک مرتبہ اگر بھول چوک سے بھی نام آگیا تو پھر زندگی بھر کے لئے چھوٹ نہ گی۔ اس نے سکینہ کو ہموار کرنا شروع کیا۔ سکینہ نصراللہ کے نام پر جان دینے کی قسم کھا چکی تھی۔ اب کچھ دن سے سوچتی تھی کہ اس ڈائن ماں کے چنگل سے کسی طرح نکل ہی جائے تو اچھا ہے۔ پھر مرزا صاحب ذمہ داری لے رہے تھے۔ اس لئے تیار ہو گئی۔ نورا نے مرزا صاحب کو آکر بتایا تو انھوں نے کہا، "اچھا رکھو، جمعہ کو عصر مغرب کے درمیان نکاح ہو جائے گا۔"

"لڑکا!" دماغ میں کیڑے کی طرح کلبلاتا ہوا لفظ نورا کی زبان سے لڑھک سا پڑا اور وہ کچھ شرمندہ سا ہو کر مرزا صاحب کو دیکھنے لگا۔

"میں سکینہ کو اپنے نکاح میں لے رہا ہوں" مرزا صاحب نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"تم! مرزا صاحب جی تم!" نورا کی منہ اور آنکھیں پوری کی پوری پھٹ گئیں۔ پھر ذرا سنبھل کر اس نے ہوشیار گاہکوں کی طرح مرزا صاحب کا اوپر سے جائزہ لیا۔ اس کے بعد اس کی آنکھوں میں ٹھہراؤ آگیا اور پھٹا ہوا منہ بند ہو گیا۔ بس گردن آہستہ آہستہ ہل رہی تھی کہ وہ ایک دم سے اچھلا اور دیوار سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ مرزا صاحب نے اس کی گھبراہٹ دیکھ کر پوچھا: "کیوں، تجھے کچھ اعتراض ہے؟"

"اعتراض!" نورا بے وقوفوں کی طرح پھر منہ کھول کر کھڑا ہو گیا، پھر بڑبڑا کر بولا "دیوار——!"

"دیوار کیا؟" مرزا صاحب نے ناگوار ناگواری سے پیر پٹختے ہوئے کہا۔

تب پھر نورا بولا "دیوار پر نام آجائے گا! اور تم جانو دیوار پر نام آیا——" یہ کہتے کہتے نورا ذرا رکا تو مرزا صاحب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا لے قریب آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دیر تک اس کو اطمینان دلاتے رہے۔

دوسرے روز شام کو نورا اپنے مویشیوں کو ہانکتا ہوا اپنے کوارٹر میں داخل ہو رہا تھا تو اس نے دیکھا، مرزا صاحب کے مکان کے سامنے والی دیوار گری تھی اور مرزا صاحب بیچ میدان میں کھڑے ہوئے ملبہ اٹھوا کر میدان ہموار کرا رہے تھے۔

حسین شاہد

اِعتراف

دنیائے خدائی منصور بن جانا بھی آسان رہا اور قیس بننا بھی۔ مشکل جو ٹھہرا تو ایک کام اور وہ ہے سکول ٹیچر بننا۔ اگر کوئی منصور بن جائے تو لوگ اسے سولی پر لٹکا دیں گے اور سولی سے بہتر دکھوں کا علاج اور کونسا ہوگا۔ اگر کسی کے مقدر میں قیس بننا لکھا ہے تو اس کے لئے بڑی سے بڑی آفت طفلاں بے پیر کی سنگ زنی ہی ہو سکتی ہے لیکن قیس کو ایک تو پتھر کھانے کی چاٹ خود بھی ہوتی ہے دوسرے اگر وہ پتھر کھانے سے بچ جانا چاہتا ہو تو راہ فرار ہمیشہ کھلی پاتا
لیکن سکول ٹیچر تو اپنے پاؤں چل کر لڑکوں کے پاس جاتے اور پتھر کھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

آج میں وہ سب باتیں صفحۂ قرطاس پر لانے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں جنہیں میں آج تک راز بنا کر سینے میں چھپائے چلا آتا تھا لیکن انہیں ہضم کرنا میرے لئے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

مجھے محکمۂ مال میں آئے ہوئے دس بارہ برس ہونے کو ہیں۔ آج جب میں بطور تحصیلدار دورے پر نکلتا ہوں تو پورے کا پورا علاقہ میری راہ میں آنکھیں بچھاتا ہے۔ میرے سامنے ایک روشن مستقبل ہے۔ جوں جوں میں اپنی ذات کے سنگ ہائے گراں اپنی راہ سے ہٹاتا جاؤں گا ترقی کے دروازے کھلتے جائیں گے اور جس دن میں نے ہمت کر کے اپنی ذات فنا کر دی معلوم نہیں میں کونسے منصب پر سرفراز ہو جاؤں لیکن ترقی کا کوئی بھی زینہ چڑھتے ہوئے مجھے ابتدائی زینہ شدت سے یاد آتا ہے جب میں سکول ماسٹر تھا اور اس زینہ پر کھڑا ہوتے ہی مجھے اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آ جاتا ہے۔ میں اپنی زندگی کے دونوں زمانے کبھی نہ بھلا سکا، شاید آئندہ بھی کبھی نہ بھلا سکوں۔ ایک زمانہ پڑھنے کا اور دوسرا پڑھانے کا۔ پہلے دور میں میں نے سنگ زنی کی لذت جی بھر کر حاصل کی اور دوسرے دور میں لذتِ سنگ سے شناسائی پائی یا یوں سمجھ لیں کہ طالب علم ہوتے ہوئے ایک پودا لگایا اور ماسٹر بن کر اسے کاٹا۔

یہ میری آپ بیتی کے دو روپ ہیں جو آج بھی مجھے یاد آتے ہیں تو میرے دل سے دھواں سا اٹھتا ہے!!

میں سکول کے تصور سے جتنا بھاگتا ہوں سکول اتنا ہی تلخ حقیقت بن کر بار بار میرے سامنے آتا ہے۔ میں دورے پر ہوتا ہوں تو دیہات والے عام طور پر میری رہائش کا انتظام سکول کی عمارت میں ہی کرتے ہیں مجھے یوں لگتا ہے جیسے انہیں کسی زمانے میں میرا شغل تدریس معلوم ہو گیا ہے اور وہ ازراہِ شرارت مجھے اسکول میں ٹھہراتے ہیں۔ ابھی پچھلے ہفتہ کا ذکر ہے میں ایک قصبے میں دورے پر تھا اور حسبِ معمول سکول کی عمارت میں برسرِ عدالت تھا کہ میرے کانوں میں ایک آواز پڑی۔ کوئی آدمی چوکیدار سے پوچھ رہا تھا "صاب بہادر کا نام کیا ہے؟"

"چوہدری برکت علی چیمہ" یہ چوکیدار کا جواب تھا جو ہونا ہی چاہئے تھا لیکن سکول کی عمارت میں بیٹھ کر میرا اپنا دکھ میرے اندر سے نکل کر میرے سامنے آ بیٹھتا ہے اس لئے میں نے یہی سمجھا کہ اس نے مجھے میری سکول میں پڑی ہوئی چڑ سے یاد کیا ہے۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد میں

(اور بہانہ بنا کر چوکیدار کو پیٹ ڈالا۔

میں آپ کو اپنی چڑ کے بارے میں ابھی سب کچھ بتاتا ہوں۔ میں نے وعدہ جو کیا ہے کہ آج کوئی بات چھپا کر نہیں رکھوں گا!.......

آج مجھے خیال آرہا تھا کہ میں تو اتنے بلند منصب پر فائز ہوں کہ جسے جی چاہے بہانہ بنا کر پیٹ ڈالوں لیکن مولوی نعمت اللہ اگر زندہ ہے تو بیچارا
(ب وہی دینیات کا بے بس مدرس ہوگا جب ایسی واردات اس پر گزرتی ہوگی تو وہ کیا کرتا ہوگا۔ میں تو اپنے عہدے کی برکت سے اپنی دلی بیماریوں
(کا علاج کر ہی لیتا ہوں لیکن مولوی کے دکھ تو اس کے اندر گھٹ گھٹ کر اب تک آتش فشاں کا لاوا بن چکے ہوں گے۔ میرے خیال میں اگر اسے آج سیشن جج
(بنائے تو اس کی عدالت سے کوئی نوجوان موت سے کم سزا نہ پائے چاہے ایک زمانہ نوجوان کی بے گناہی کا ثبوت دیتا رہے!——— اب مولوی
(نعمت) اللہ کا ذکر آ ہی گیا ہے تو پہلے اس کی کہانی سن لیجئے میری چڑ کی داستان مولوی کے حالات سے اس طرح منسلک ہے کہ اگر دونوں کو الگ الگ بیان
(کیا جائ)ے تو دونوں باتیں بے لذت ہو کر رہ جائیں۔

میرے والد صاحب جب مجھے پہلے دن سکول چھوڑنے گئے تو داخلے کے لوازمات پورے ہو جانے کے بعد انھوں نے میری موجودگی میں مدرس
(سے کہا) تھا "آج کے بعد ماس آپ کا اور ہڈیاں ہماری آپ ہدایت دینے کے لئے اس کی کھال بھی ادھیڑ دیں تو ہم آپ سے باز پرس نہیں کریں گے"۔
میں گاؤں کے سکول میں پرائمری تک زیر تعلیم رہا اور ماسٹر صاحب میرے والد صاحب کی اجازت کے مطابق میری کھال ادھیڑتے رہے۔ میرے
(نزدیک اس بات) میں پہلی قابل ذکر ہستی خدا کی تھی اور دوسری ماسٹر کی۔ اگر کبھی سر پر غرور ماسٹر صاحب کے سامنے بلند ہونے کی سوچتا بھی تو والد صاحب کا فرمان یاد
(آجاتا او)ر میں اندر ہی اندر دانت پیس کر رہ جاتا۔ لیکن پرائمری پاس کر کے جب میں شہر کے ہائی سکول میں پہنچا تو ماحول کو مختلف پایا۔ ایک تو والد صاحب اب اتنے
(قریب نہی)ں تھے۔ دوسرے میں نے دیکھا کہ گاؤں کے مقابلے میں یہاں کے لونڈے اپنے اساتذہ کا واجبی سا احترام ہی کرتے تھے۔ وہ بھی صرف ان کے سامنے۔ ہیڈ
(ماسٹر سے لے کر مع)لموں نے ہر ایک معلم کی کوئی نہ کوئی چڑ بنا رکھی تھی......
ایک استاد کی چڑ ماسٹر پاپی تھی تو دوسرے کی چھٹا! ایک کو ماسٹر گھسن کہتے ہیں تو دوسرے کو ماسٹر دچو!!
یہ صورت حال نہ جانے کیوں میرے لئے یک گونہ مسرت کا باعث ہوئی!
میرے لئے انتہائی لذت کا ہنگام وہی ہوتا تھا جب میں کسی ماسٹر کے پاس سے گزرتے ہوئے چپکے سے اسے چڑ کا پتھر مار دیتا تھا۔ ایک تو میں ڈیل ڈول
(میں) اچھا، دوسرے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اس لئے میرے ساتھ امتیازی سلوک ناگزیر تھا جس کا میں نے جی بھر کے فائدہ اٹھایا۔ اگر کبھی کوئی ماسٹر
(دیکھ) لیتا تو میں کھلے بندوں اسے اس کی چڑ سے پکارنے لگتا۔ بات بڑھ جاتی تو کبھی کبھی اساتذہ سے معافی بھی مانگ لیتا لیکن پرنالہ وہیں کا وہیں رہتا۔ موقع ملنے
(پر) استاد کو اس کی چڑ کا پتھر مارنے سے باز نہ رہتا۔
مولوی نعمت اللہ دینیات کے مدرس تھے۔ اتفاق کی بات کہ کئی سال گزر گئے لیکن ان کی کوئی چڑ نہ بنی۔ میں تو ایسا کرنے کی ہمت اس لئے بھی نہیں
(کرتا تھا کہ) یہ واحد استاد تھے جو میرے والد صاحب کے ذاتی طور پر شناسا تھے اور جانتے تھے کہ میرا علاج اپنے ہاتھوں سزا دینا نہیں، والد صاحب سے شکایت
(کرنا) ہے لیکن دوسرے لڑکے معلوم نہیں کیوں مروت میں رہے۔ ہم پانچویں درجے سے دسویں میں پہنچ گئے لیکن مولوی صاحب نے ہمارے ہاتھوں چڑ کا کوئی
(پتھر نہ کھا)یا لیکن معلوم ہوتا ہے یہ ساری کسر ایک ہی دفعہ پوری ہونا لکھی تھی۔ بالآخر مولانا اپنی ہی ایک حرکت کی بنا پر چڑ کی دلدل میں پھنس گئے
ایک دیہاتی لڑکے کو مولانا سے کچھ زیادہ ہی عقیدت تھی۔ وہ انھیں ہمیشہ تنوع قسم کی سوغاتیں لا کر دیا کرتا۔ مولوی صاحب بھی بالعموم فرمائش کے ذریعے
(اس کی) فرمائش کیا کرتے۔ ایک دفعہ انھوں نے محمد دینے لڑکے ——— یہ اس برخوردار کا نام تھا ——— تھوم لانے کے لئے کہہ دوسرے روز جماعت میں آئے تو

پہونچتے ہی اُس سے سوال کیا "ملتسنے! تھوم لایا ہے؟"

"خدا کی قسم بالکل یاد نہیں آسکا۔" یہ بدھنے کا جواب تھا۔

دوسرے روز پھر یہی مکالمہ دہرایا گیا اور بدھنے کو بہت معذرت کرنا پڑی۔ سوئے اتفاق کہ بدھنا تیسرے روز بھی تھوم لانا بھول گیا تھا۔ اس پر بہت بسے، یوں ساری جماعت کو حفظ ہوگیا کہ مولوی صاحب نے بدھنے سے تھوم لانے کی فرمائش کر رکھی ہے۔ اُس دن مولوی صاحب کے جانے کے بعد لڑکے بدھنے سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔

چوتھے دن مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ مولوی صاحب کا پیریڈ شروع ہوا تو میں نے ان کی آمد سے پہلے تختہ سیاہ پر لکھ دیا:

"بدّنا! تھوم لایا ہے؟"

"خبیث! تھوم لایا ہے؟"

"نالائق! تھوم لایا ہے؟"

مولوی صاحب جماعت میں آئے تو یہ تحریر دیکھ کر بہت سٹپٹائے پہلے تو انھوں نے لکھنے والے کو خناس، رجیم، خبیث اور ملعون جیسے القاب دیے اور پھر دیر تک کوشاں رہے کہ لکھنے والے کا پتہ چل جائے لیکن لڑکے مجھ سے ڈرتے تھے اس لئے کسی نے نہ بتایا۔

اس سے اگلے دن میں نے مولوی صاحب کے خطابات کا قرضہ چکانے کی ایک اور تدبیر سوچی۔ دینیات کا پیریڈ شروع ہوا تو میں نے ان کے آنے سے پیشتر ان کی میز پر تھوم کا گٹھا لا کر رکھ دیا۔ مولوی صاحب گٹھا دیکھ کر آگ بگولا ہوگئے۔ وہ غصے کے عالم میں پارے کی طرح تڑپ رہے تھے گرج رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جماعت میں ہٹلر گھس آیا ہے جس کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ مجرم کی نشان دہی بہر صورت ہونی چاہئے لیکن لڑکے جانتے تھے کہ مجرم کا نام لیتے ہی مولوی صاحب اس کی ہڈیاں توڑ دیں گے اور پھر بدھا یا نام لینے والے کی اپنی بھی خیریت نہیں، اس لئے وہ چپ سادھے بیٹھے رہے۔ مولوی صاحب بے بس ہوگئے تو انھوں نے گٹھا رکھنے والے کو بڑی بے شرم گالی داغ دی!

اگر کوئی اور مدرس ہوتا تو میں کبھی کا میدان میں آگیا ہوتا کیونکہ ماسٹروں کے کھال ادھیڑنے کے باوجود میرے دل میں ان کا خوف کبھی نہیں آیا تھا۔ میں نے زندگی میں خوف کھایا ہے تو صرف ایک انسان سے اور وہ ہیں قبلہ والد صاحب اس واقعہ بھی میرے سامنے مولوی نعمت اللہ نہیں تھے، اس لئے میں تو یہیں برداشت کر گیا حالانکہ لڑکوں کی آنکھیں مجھ سے سوال کر رہی تھیں کہ آج اتنے بے غیرت کیوں بن گئے استاد؟!

اس کے بعد میں نے مولوی صاحب کے خلاف گوریلا جنگ چھیڑ دی اور آخر کار وہ آگ جو میں نے ہنسی ہنسی میں لگائی تھی پھیل کر پرمحیط ہوگئی۔ یہ منظر اب روزمرہ کا معمول بن گیا کہ پانچ سات لونڈوں نے مولوی صاحب کو تنہا پاکر تھوم تھوم کا شور اٹھا رکھا ہے۔ مولوی صاحب طرح زخم کھا کر لڑکوں پر جھپٹتے اور لڑکے یہ جا وہ جا۔ شریر لڑکے تھوم کی رٹ اس وقت لگاتے جب وہ تعداد میں زیادہ ہوتے تاکہ کسی ایک کی نشاندہی نہ ہو سکے۔ مولوی صاحب پاگلوں کی طرح ان کے پیچھے بھاگتے، انھیں گالیاں اور بددعائیں دیتے اور انجام کار روہانسے ہوکر شانت رہ جاتے۔ ان کے بس میں نہ تھا کہ ورنہ وہ تمام لڑکوں کو ایک جگہ ڈھیر کرتے اور تیل ڈال کر دیا سلائی دکھا دیتے۔

دوسرے مدرسین مولوی صاحب کو سمجھایا کرتے کہ وہ چڑنا چھوڑ دیں تو لڑکے خود ہی بات کو بھول جائیں گے، کبھی کبھار مولوی صاحب مسکراہٹ کا مظاہرہ بھی کرتے اور بات کو ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کیا کرتے لیکن بات کو ہنسی میں ٹالنے کا صحیح وقت نکل چکا تھا۔ اب تو پتھر کھا بن چکا تھا۔

مولوی صاحب منصور بن جاتے تو کبھی کے پھانسی پا گئے ہوتے۔ قیس بن جاتے تو جس دن پتھر کھانے سے طبیعت سیر ہو جاتی سکول جانا چھوڑ دیتے
ن وہ تو بیت کے مصلے چوٹ کر روزانہ سویرے اٹھ کر نماز پڑھتے، پیٹ کا دوزخ بھرتے اور پھر اُجلے کپڑے پہن کر سکول پہنچ جاتے۔ پتھر کھانے کے لئے
ہوں پر نمک پاشی کرانے کے لئے! جتنا جتنا مولوی صاحب چڑتے گئے لڑکے اُتنا ہی مشتعل ہوتے گئے۔ تھوم کا لفظ مولانا کے لئے دوزخ کا عذاب بن گیا۔
معلوم وہ سکول کے باہر نجی زندگی میں کسی کنجڑے سے تھوم خریدنے کے قابل بھی رہے یا نہ رہے۔

مولوی صاحب کے سینے پر تھوم کی تریاں بندوق کی گولیوں کی طرح برستی رہیں کہ اسی اثنا میں ہم میٹرک پاس کر گئے۔ جو بات زیادہ لوگوں
زبان پر جاری ہو جائے بالعموم اس کا مصنف تاریکی میں چلا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کی چڑ باقی تمام اساتذہ کی نسبت زیادہ موضوعِ سخن رہی
ں ہم کم سے کم مولوی صاحب اس کے مصنف کے نام سے ناواقف ہی رہے...... میں سکول سے فارغ ہو کر کالج میں داخل ہو گیا اور
ستہ آہستہ سکول کے بارے میں سب کچھ بھول گیا۔

بی۔اے پاس کیا تو میرے اندر والا انسان صحیح سالم اور جوانی کے جوش سے بھرپور تھا۔ وہ میرے لئے ایک عرصے تک مصیبت بنا رہا
وہ زندہ رہتا تو یقیناً مجھے گمراہ کر دیتا کیونکہ وہ تو شبانہ روز انسانیت کی خدمت کے جذباتی نعرے لگاتا رہتا تھا۔ وہ تو میرے روکے رکتا ہی
ں تھا۔ اسے اپنا مفاد ترک کر کے دوسروں کے کام آنے کا خبط تھا۔ اس نے میری کھال اتنی نرم کر دی تھی کہ معمولی سی بے انصافی کی برچھی بھی میرے
ر پار ہو جایا کرتی تھی۔ اب، تو میں نے اپنی ہمت سے اپنے سینے میں پتھر اور اپنے جسم کے گرد لوہا چن لیا ہے لیکن اس وقت میں موم کا پتلا ہی تھا
ون بیٹھے بٹھائے میری موم پگھل گئی اور میں نے سوچا کہ اس قوم کی سب سے بڑی ضرورت اور خدمت یہی ہے کہ اسے تعلیم دی جائے۔ میں نے اپنے
فیصلے کے نشیب فراز پر غور کئے بغیر اگلے برس بی۔ٹی میں داخلہ لے لیا۔ یہ کورس پاس کرتے ہی میں اپنے پہلے سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کی خدمت
حاضر ہو گیا۔ وہ میری صلاحیتوں سے واقف ہی تھے انھوں نے بلا چون و چرا مجھے ملازم رکھ لیا۔ مجھے سینیئر انگلش ٹیچر کا منصب ملا اور ہائی کلاس کے ایک
کا انچارج بنا دیا گیا۔ اس طرح میں قوم کی خدمت میں ہمہ تن محو ہو گیا۔

چند دن گزرے تو مجھے معلوم ہوا کہ پانچ چھ برس پیشتر میں مولوی صاحب کی جو چڑ بنا گیا تھا وہ تو بعد میں آنے والے طلبا کے ذریعے کھیپ در کھیپ منتقل
ہوتی آ رہی ہے اور ابھی تک اسی جوش و خروش سے اس کا ورد جاری ہے۔ وہ پہلا دن تھا جب مجھے معلمی کا پیشہ اختیار کرنے کا افسوس ہوا لیکن میں سنبھل گیا اور خدا کا
شکر کیا کہ بروقت پتہ چل گیا ہے۔ آئندہ میں ایسی کوئی غیر معمولی حرکت نہیں کروں گا جو میری چڑ بن سکے۔ ویسے اس کے بعد مولوی صاحب مجھے دکھائی دیتے تو میرا جی
چاہتا کہ یا تو مولوی صاحب انتقال کر جائیں یا سکول چھوڑ جائیں ـــــ اس کی وجہ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکی ـــــ میں مولوی صاحب کی موجودگی برداشت
نہیں کر سکتا تھا۔ میں انھیں ۔۔۔ نہیں کر پاتا تھا۔ کبھی کبھی میرے کانوں میں تھوم کی آواز پڑتی تو میں گھبرا جاتا اور میرا جی چاہتا لڑکوں کو آگ لگا دوں۔ معتبر اور
راقم کے لڑکے مجھے گولی کی طرح لگتے اور میں ہر وقت اس شعوری احتیاط کا خیال رکھتا کہ کسی حرکت سے میری کوئی چڑ نہ پڑ جائے۔ مجھے یہ سوچنے کی توفیق
نہ ہوئی کہ ماسٹر اور چڑ تو آپس میں جسم اور لباس کی طرح جڑے ہوتے ہیں۔ جب تک کوئی چڑ نہ پڑے ماسٹر کی ذات نامکمل رہتی ہے۔ ماسٹر کو چڑ سے بھاگنا نہیں چاہئے
یہ دعا ضرور کرتے رہنا چاہیے کہ چڑ پڑے تو گوارا قسم کی پڑے۔

ایک دن میں نے جماعت سے پچھلے دن کا پڑھایا ہوا سبق سننا چاہا تو اتفاق سے کوئی لڑکا بھی نہ سنا سکا۔ مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے کہا "آج تو
چھوڑ دیتا ہوں لیکن کل بھی جسے سبق یاد نہ ہوا اس کا قیمہ کر دوں گا۔"
میں نے یہ بات نہایت غصے کے عالم میں کہی تھی۔ اس کے باوجود ایک لڑکا بے اختیار ہنسی سے پھٹ پڑا۔ بس یوں ہی لگا جیسے کسی نے کان کے قریب

میں جیسا بھر کر ادھر سے زور کا مکا چلا دیا ہو!

میں نے خونی نظروں سے لڑکے کو دیکھا اور پوچھا "اس میں ہنسنے کی کون سی بات تھی ؟"

وہ لڑکا تو سہم کر چپ ہو گیا لیکن مجھے باقی تمام جماعت کی آنکھوں میں شرارت ناچتی ہوئی دکھائی دی۔ مجھ سے یہ آنکھیں برداشت نہیں ہو میری سمجھ میں کچھ نہ آسکا کہ بات کیا ہے۔

کچھ دن اور گزر گئے تو مجھے وہ خبر سنا ہی پڑی جسے میں پہلے دن سے ٹالنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میری چڑ پڑ چکی تھی۔ لڑکوں کو حرکت تو یاد تھی نہ آسکی لیکن وہ اپنے استاد کو زیادہ عرصے تک نامکمل کیسے دیکھ سکتے تھے جب انھیں اور کچھ نہ ملا تو انھوں نے میرے نام کو اُلٹ پلٹ کر میرے نام کا قافیہ تنگ تھا۔ انھوں نے جلتی سی گرہ لگائی اور شعر تیار ہو گیا۔

برکت علی چیمہ ــــــــ بکری دا قیمہ!!

تب میں نے جانا کہ اُس روز میرے ایک شاگرد کا ہنسی والا غبارہ کیونکر پھٹ پڑا تھا۔

اپنی چڑ کا سن کر میں پسینے میں شرابور ہو گیا۔ یہ دوسرا موقع تھا جب مجھے نیم پڑنے کی بے وقعتی کا احساس ہوا۔ اب میں نے سوچا کہ چڑ تو پڑ میرا ردِ عمل صحت مند ہونا ضروری ہے۔ اس کی پہلی صورت یہ ہے کہ میں لڑکوں کو پتہ ہی نہ چلنے دوں کہ مجھے اپنی چڑ کا علم ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب سکول میرے کانوں میں قیمے کی گولی لگتی تو میں اپنی کھال کے اندر تڑپ کر رہ جاتا لیکن باہر سے متحمل رہتا۔ جہاں لڑکوں کا ہجوم ہوتا وہاں سے کترا کر نکل جا اور بھی کیا۔ میں نے معتبر اور ذمہ دار لڑکو بیٹھنا ترک کر دیا۔

آہستہ آہستہ لفظ قیمہ میرے حواس پر سوار ہونا شروع ہو گیا۔ میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ اپنے نام کے ساتھ چیمہ لکھنا چھوڑ دوں لیکن پھر خیال میں لوگوں کی توجہ زیادہ شدت سے اپنی طرف کھینچ لوں گا۔ مولوی صاحب کی چڑ بناتے وقت تو مجھ میں ڈھیروں حسِ لطیف تھی لیکن میری چڑ پڑی حس کہاں چل دی۔ بہت دفعہ اپنے آپ کو سمجھایا کہ کون ماسٹر ہے جس کی چڑ نہیں پڑتی۔ آخر اس بات کو اتنی اہمیت دینے کی ضرورت ہی کیا ہے گاؤں جاتا اور میرے کئی مجھے جھک جھک کر سلام کہتے تو مجھے لڑکوں پر پھر طیش آجاتا!

میں اس وقت سیدھا اپنی عدالت برخاست کر کے آرہا ہوں۔ آج میری عدالت میں ایک آدمی پیش ہوا فائل پر اس کا نام لکھا المعروف چھ چا ــــ جن باتوں کا میں آج انکشاف کر رہا ہوں ممکن ہے کل اس پر پچھتاؤں لیکن اس وقت میری موم پگھلی ہوئی ہے ــــ میں پر حیران ہوا اور اس سے پوچھا کہ چُھ چے کا کیا مطلب ہوا، اس نے جواب دیا۔

"مائی باپ! بچپن میں لوگوں نے چُھ چا میری چڑ بنا رکھی تھی، مائی باپ! جوں جوں میں بڑا ہوا چڑ بھی میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی میں نے سوچا کہ ایک عمر کا ساتھ ہے، اسے نبھانا ہی چاہیئے .....،"

مجھے یوں لگا جیسے اس آدمی نے میرے منہ پر طمانچہ دے مارا ہے، میرے لئے عدالت کی کارروائی جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ میں نے ، کی اور خود عدالت سے ریٹائر کر گیا۔ تھوم! قیمہ! اور چھُ چا! آج میرے عام استعمال کے لفظ نہیں رہے۔ سکول ماسٹر، تحصیلدار اور ایک عام آدمی بن گئے ہیں۔ تھوم کے آئینے میں مجھے اپنا مجرم چہرہ نظر آرہا ہے۔ قیمہ جرم کی سزا بن گیا ہے اور چُھ چا ایک نارمل انسان ہے میں نے اپنی بر لاکھ جتن کئے ہیں لیکن بات نہیں بنی اور اب میں نے قلم سنبھالا ہے، اپنے ہی کیس کا فیصلہ لکھنے کے لئے!

مولوی نعمت اللہ میری آنکھوں کے سامنے سے نہیں ہٹ رہا۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ زندہ ہے تو یقیناً پاگل خانے میں ہوگا۔ میں

جہاں سے آیا وہیں چلا گیا اور میری حسِ لطیف ایک کتابی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ بظاہر تو میں پہاڑ کی سی استقامت لئے رہا لیکن چوکیدار کو پیٹنے کی مضحکہ خیز حرکت اب بھی کر بیٹھتا ہوں۔ سکول میں پڑھاتے ہوئے میں کیسی کیسی عجیب احتیاطیں برتا کرتا تھا۔ اس قسم کی آخری احتیاط جو میں نے سکول میں برتی یہ تھی کہ ایک دن میں جماعت میں جا رہا تھا۔ ابھی میں برآمدے ہی میں تھا کہ میرے کانوں میں قوالی کی سی آواز پڑی۔ لڑکے میری چڑ کا گانا بنائے ہوئے تھے۔ آدھے کہتے تھے:

"برکت علی قیمہ!"

دوسرے آدھے جواب دیتے تھے:

"بکری دا قیمہ!" اور ڈیسکوں کا طبلہ بجاتے تھے۔

میں جہاں تک پہنچ چکا تھا۔ وہاں تک لڑکوں کی نظروں سے اوجھل تھا۔ میں نے سوچا، ممکن ہے میں جماعت میں پہنچوں تو فقرہ ابھی لڑکوں کے منہ میں ہو اس لئے میں الٹے پاؤں لوٹ گیا اور پھر سکول کے صحن میں اپنی جماعت کے سامنے اس انداز میں کھڑا ہو گیا کہ میری پشت لڑکوں کی طرف تھی اور دھیان دوسری طرف۔ لڑکوں نے جھٹ دیکھ لیا اور خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد میں آہستہ آہستہ جماعت میں آ گیا جیسے مجھے کچھ پتہ ہی نہ چلا ہو۔

اس دن میں دل ہی دل میں کڑھتا رہا مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ اپنی چڑ کو لفٹ نہ دینے کے لئے کتنے جگرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس دل میں یہی جذبہ سمایا رہا تھا کہ کسی نہ کسی بہانے لڑکوں کو سزا دوں جیسے پچھلے مہینے چوکیدار کو دی تھی۔ میں نے نہایت بے دلی سے جماعت کو پڑھایا اور دل میں غبار لئے اسٹاف روم میں چلا گیا۔

میرے بعد مولوی نعمت اللہ کی گھنٹی تھی۔ میں باہر آیا تو وہ اندر گئے تھے۔ تھوم اور قیمے کا دروازے میں ملاپ ہوا تھا۔ تھوم جل چکا تھا اور قیمہ بھن رہا تھا، دونوں مل کر لڑکوں کی لذت کا سامان بنے ہوئے تھے!

میرا یہ پیریڈ خالی تھا۔ میں اس کے دوران سٹاف روم میں کباب سیخ بنا رہا۔ اخبارات کے مطالعہ کی بہت کوشش کی لیکن اخبار آنکھوں کے سامنے لاتا تو یہی لگتا جیسے ہر صفحہ پر قیمہ! قیمہ! لکھا ہوا ہو۔

پیریڈ ختم ہوا تو مولوی صاحب میرے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھے۔ اس دن وہ بڑے جذباتی ہو چلے تھے۔ آ کے بیٹھے ہی تھے کہ میرے کان میں تیل ڈال دیا۔ کہنے لگے "برکت! اگرچہ تم اس وقت میرے برابر بیٹھے ہو لیکن تم کتنے ہی اونچے چلے جاؤ میرے بہرحال شاگرد ہی رہو گے ....."

میں جھٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور جواب دیا: "محترم! میں آپ کے برابر محض انتظامی ضرورت اور مجبوری کے تحت بیٹھ جاتا ہوں لیکن اگر آپ کو گراں گزرے تو میں سٹاف روم میں بھی آپ کی خدمت میں کھڑا ہی رہوں۔"

میرے اس جواب پر اُن کی آنکھیں بھیگ گئیں کہنے لگے "تم تو میری اس قدر عزت کرو اور تمہاری جماعت میری اس قدر توہین کرے کیا یہ افسوس کا مقام نہیں؟ ..... کیا میرا تم پر کوئی حق نہیں؟"

مولوی صاحب کا لہجہ میرا سینہ چیر گیا۔ میں نے گھبرا کے ان سے پوچھا "آپ یہ تو بتائیں ہوا کیا ہے؟"

مولوی صاحب کہنے لگے "جو کچھ ہوا وہ تم خود جا کر پوچھ لو۔ مجھے تو اتنا معلوم ہے کہ تمہاری جماعت نے آج میری ریش میں خاک ڈال دی ہے!"

اس کے بعد میرے کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔ بہت سی امکانی باتیں میرے ذہن میں آئیں۔ نہ آئی تو مولوی صاحب کی چڑ والی بات نہ آئی۔ اگر مجھے اس کا خیال آ جاتا تو ممکن ہے میرا ردِ عمل کچھ اور ہوتا لیکن مجھے تو اس وقت اپنی چڑ زیادہ یاد آ رہی تھی۔ مولوی صاحب کی

گیا آتی۔ میں سٹاف روم سے نکلا اور اپنی جماعت کی طرف چل دیا۔

ایسے معلوم دیتا تھا جیسے اُس روز میں، میں نہیں تھا کوئی اور تھا۔ بس میں آگ کا گولا بن چکا تھا جسے اگر پانی میں بھی پھینکا جاتا تو پانی میں آگ لگ جاتی۔ میں انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور شوکتے ہوئے ناگ کی طرح جماعت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میرے چہرے کا رنگ دیکھ کر تمام جماعت سناٹے میں آ گئی۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی شیر کی طرح گرج کر پوچھا "آج مولوی نعمت کو کس نے تنگ کیا ہے؟"

میری کڑک سن کر جیتی جاگتی جماعت قبرستان کا نمونہ بن گئی۔ بڑی خوفناک چپ کا سایہ لڑکوں پر منڈلانے لگا۔ کتنی دیر تک مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے اور زیادہ زور سے کڑک کر کہا "اگر بتا دو تو بہتر ورنہ ایک طرف سے شروع کروں گا اور دوسرے سرے تک تمام جماعت کی کھال اتار دوں گا۔"

قبرستان میں ایک تنکے کو بھی جنبش نہ ہوئی۔

میں نے اپنی دھمکی کو سچ کر دکھانے کے لئے اگلے بنچ پر بیٹھے ہوئے ایک لڑکے کو تڑاخ سے چھڑی دے ماری۔ لڑکے میں سے ایک آواز تو ہائے کی نکلی اور دوسری آواز یہ تھی "جی! تنگ تو ساری جماعت ......جی ساری جماعت نے کیا تھا.... لیکن .... لیکن پہل ..... جی پہل مقبول نے کی تھی ... جی! ....."

بی اے کئے ہوئے افسر کی طرح میں نے یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی کہ مقبول نے پہل کیا کی تھی حالانکہ مقبول میرا بڑا چہیتا شاگرد تھا میں نے اسے آج تک سزا نہیں دی تھی میرے خیال میں اگر اس لڑکے نے جھوٹ بھی بولا تھا تو محض اس لئے کہ مقبول کو کوئی سی مار پڑے گی۔ مقبول لائق لڑکا ہونے کی وجہ سے تمام استادوں کو پسند تھا اور ٹیچر انچارج ہونے کے باعث مجھے اس سے بہت پیار تھا لیکن آج وہ میری عدالت میں ہی مجرم تھا اور کوئی نہ تھا جو اُسے مجھ سے چھڑا سکے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں خونی نظریں لے کر مقبول کے پاس پہنچا تھا تو اس کا رنگ پھولی سرسوں کی طرح ہو چکا تھا۔ وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک سدھائے ہوئے جانور کی طرح اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے اس ہاتھ کو ڈس لیا تو دوسرا آگے کر دیا، پھر پہلا، پھر دوسرا...... وہ باری باری ہاتھ بڑھاتا رہا اور میں چھتے کی آگ بجھاتا رہا۔ مقبول کی چیخیں نکلتی رہیں اور اس کے ہاتھ مشین کی طرح آگے پیچھے آتے جاتے رہے۔ میری اور مقبول کی ریس کتنی دیر جاری رہی اور بالآخر ہار میری ہی ہوئی، میں خود ہی ہانپ کر کرسی میں جا گرا۔

کرسی میں پھنس کر میں کتنی دیر ہانپتا رہا اور جب سانس نارمل ہوئی تو مجھے اصل بات پوچھنے کا خیال آیا۔ میں نے جماعت سے سوال کیا "پہل کس طرح ہوئی تھی؟"

مردے آرام سے قبروں میں لیٹے رہے! کوئی جواب نہ آیا۔

میں نے اگلی لائن کے ایک لڑکے کو کھڑے ہونے کا حکم دیا اور اس سے پوچھا "تم بتاؤ کیا بات ہوئی تھی؟"

"جی ... جی مولوی صاحب جماعت میں ... جماعت میں آئے ..... تو مقبول نے ....جی مقبول کی طرف سے ..... جی تھوم کا گٹھا ... مولوی صاحب کو.....جی تھوم مولوی صاحب کی ...."

لڑکا اپنی طرف سے میری بات کا جواب دے رہا تھا لیکن مجھے یوں لگا جیسے اس نے سٹین گن بھر لی ہے اور اب اٹھ کر مجھ پر باڑھ مار رہا ہے۔ ابھی بات اس کے منہ میں تھی کہ میں نے گولی سے زخمی ہو جانے والے کی طرح چیخ کر کہا "بکواس بند کرو... ..دوسرے! چپ ہو جاؤ!" اس روز میرے یہ آخری لفظ

یں نے ہوش میں لے لے۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بے جان مجسمہ ہوں اور کرسی میں فٹ ہوگیا ہوں ہلنے جلنے کی پوری کوشش کی لیکن مجھے بھی کبھی ہل پائے ہیں؟ میں تھا کہ لڑکوں سے ۔ ہوش ہو جاؤں لیکن چھپنے کے لئے میرے پاس ایک ہی پردہ تھا۔ میری کھال کا پردہ! لیکن میری کھال اس وقت بڑی نرم تھی!! کی آنکھیں میری کھال کو چیر کر میرے اندر پہنچ رہی تھیں۔ کتنی دیر تک میرے اعضا میرا ساتھ دینے سے منکر رہے اور آخر کار جس عضو نے سب سے پہلے میری ہمدردی کا ہاتھ بڑھایا وہ میرے پاؤں تھے۔ میں نے پاؤں کو جنبش دی اور باقی جسم کو پاؤں کے بل پر یوں باہر لے گیا جیسے میرا اوپر کا جسم لکڑی کا ہو نیچے پاؤں کے پہیے لگے ہوں!

پہیے اس وقت تک چلتے رہے جب تک میں بورڈنگ ہاؤس میں اپنے کمرے میں نہیں پہنچ گیا۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے آج تک بے ہوش نہیں ہوا سوائے اُس رات کے جو مقبول کو مارنے کے بعد آئی۔ میرا روم میٹ ماسٹر عبدالغنی پتہ نہیں یا، میں نے رات کس طرح گزاری، کمرے میں پہنچنے کے بعد جب میں نے ہوش سنبھالا تو یہ اگلے دن کی صبح کا ہنگام تھا۔ ماسٹر عبدالغنی منہ لٹکائے میری چارپائی تھا۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو عبدالغنی کھل گیا لیکن فوراً ہی اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ ہمیشہ متضاد حرکات ایک ہی سانس میں کرنے کا عادی تھا۔ تھوڑی سی دیر ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ میں نے دھیمے سے مسکرانا شروع کیا اور ہاتھ پاؤں کو جنبش دی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ہاتھ بوجھل ہیں۔ دونوں ہاتھوں کو آنکھوں کے سامنے لایا تو میری حیرانگی کی انتہا نہ رہی۔ میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھوں پر چمڑے کے دستانے چڑھا کر انھیں ڈورے باندھا ہے۔ کبھی میں ہاتھوں کو دیکھوں اور کبھی عبدالغنی کو۔ آخر میں نے آہستہ سے پوچھا "یہ کیا؟"

عبدالغنی کا گلا رُندھ گیا اور وہ بولا "ظالم! میں نے تمام رات اُلو کی طرح تمہارے سرہانے جاگ کر گزار دی ہے۔ تم تمام رات ایک ہی دہائی دیتے میرے ہاتھوں کو ٹکھور کر دو۔۔۔ میں مر گیا ہے! میرے ہاتھوں کو ٹکھور کر دو ورنہ میں مرا!!"

میں آہستہ آہستہ چارپائی سے اُٹھا۔ دستانے اُتار سے اسفنج اٹھا اور عبدالغنی کے ہاتھ سکول بھجوا دیا۔ (پنجابی سے)

سعیدہ احسان

دائرے

"آپ کو وقت نکالنا ہی ہوگا۔ دیکھئے ابھی سب لوگ ڈائننگ ہال میں ہیں۔ آپ کی غیر موجودگی کا کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا پلیز پلیز" وہ اچانک چونکی۔ ہال میں ابھی تقریریں جاری تھیں اور تالیوں سے ہال گونج اٹھتا تھا۔ زمان صاحب نہالا لمن صاحب کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے ہر شخص ہر دوسرے شخص کا شکریہ ادا کر رہا تھا جب وہ کھانے کی میز سے اٹھ کر آئی تھی تو ڈوڈ صاحب نے جو اس کورس کے اسپانسر تھے، تقریر ختم کی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔

کیا خودی کی تکمیل یوں ہی ہوتی ہے، کیا انا اسی طرح پروان چڑھتی ہے! کیا زندگی کی محرومیوں اور مایوسیوں کے داغ ان خود ساختہ تعریفوں سے مٹ جاتے ہیں! کیا...!

"آپ پھر کچھ سوچنے لگیں"

"پلیز!" اس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان کو دیکھا۔ شوق، التجا اور امید کے انداز اس کی نگاہوں، اس کی آواز میں لرز رہے تھے۔ اسے اپنے ذہن میں ایک جھنجھنی سی محسوس ہوئی۔

پھر ماضی اور حال کے فاصلے سمٹ گئے۔ کسی اور کی آواز اس کے کانوں میں گونجی "جب تم مجھ سے پاس ہوتی ہو، اتنی قریب ہوتی ہو کہ میں تمہیں چھو سکوں، اس وقت تمہارے تبسم کے دلاسے روح کے خلا بھر جاتے ہیں۔ تمہاری قربت مجھے ایسی آسودگی عطا کر دیتی ہے جو ہر خواہش، ہر آرزو، ہر تمنا کی تکمیل ہو۔ پھر بھی میں تمہیں چھوتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ تم کہیں ٹوٹ نہ جاؤ، یا تحلیل نہ ہو جاؤ، بکھر نہ جاؤ۔ تمہاری آنکھوں کی گہری اداسی مجھے محتاط کر دیتی ہے چھپے ہوئے اندیشے سر اٹھاتے ہیں اور میں سہمنے لگتا ہوں کہ میں کبھی سمجھ بھی سکوں گا... کیا...."

یکایک ایک سوال گونجا "آپ چپ کیوں ہیں؟ کیا سوچ رہی ہیں آپ؟ دیکھئے لوگ شاید ادھر آ رہے ہیں۔" وہ چونک کر سیدھی بیٹھ گئی۔

ہال تالیوں کے شور اور قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ غالباً آخری تقریر ختم ہوئی تھی۔ یہ سب کامن روم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس کا ساتھی بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ "چلئے باہر کار میں بیٹھتے ہیں" اور جمال نے جلدی سے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ تازہ ہوا کے ایک جھونکے نے اسے پوری طرح بیدار کر دیا۔ اس کے ذہن نے ایک جھرجھری سی لی اور اب وہ پوری طرح اس موقع، اس لمحہ سے آمادۂ پیکار ہو گئی۔ آخر یہ چھوکرا جس سے اس کی ملاقات کی میعاد محض ایک شام تھی، جو عمر میں بھی یقیناً اس سے چھوٹا تھا، جوان، حسین اور دولتمند سہی، پڑھا لکھا بھی تھا آخر چاہتا کیا تھا؟ محبت؟ ناممکن! خوش وقتی؟ مگر وقت گزارنے کے اس سے بہتر ذریعے بھی اسے ضرور معلوم ہوں گے۔ ... پھر یہ کیا ہے؟

کار میں بیٹھ کر جمال نے اپنا سگریٹ کیس کھول کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا، "سگریٹ لیجیے"

"شکریہ میں سگریٹ نہیں پیتی۔"

"اب وقت سے لیجئے۔ میری خاطر پلیز۔"

اس نے ایک سگریٹ اٹھائی اور سگریٹ جلاتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی لرزش پر اسے تعجب ہوا۔ آخر یہ گھبراہٹ کیوں؟ "مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا، کہتا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو۔ اور اگر آپ کے پاس وقت ہو تو۔ اسی لئے باوجود اس کے کہ کل شام آپ نے بتا دیا تھا کہ آج مصروف ہوں گی، پھر بھی میں نے یہاں آنے کی جرأت کی۔ اس امید میں کہ شاید میں ——— آپ کو کچھ دیر کے لئے اپنے ساتھ ڈرائیو پر لے جانے کے لئے ——— آمادہ کر سکوں...... "

"دیکھئے میں مجبور رہوں اسی لئے میں نے کل بھی آپ کو بتا دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اب بھی میری غیر موجودگی محسوس کی جا رہی ہو گی۔"

"لیکن کل تو آپ کالاان چلی جائیں گی۔"

اسے ہنسی آ گئی "مگر پرسوں واپس بھی تو آ جاؤں گی۔"

"اچھا تو پھر وعدہ کیجئے کہ واپس آنے پر ملیں گی۔ ورنہ میں یہیں ستیہ گرہ کر دوں گا۔"

"اچھا پھر آپ سلیچر کو ٹیلی فون کر لیں۔"

"جی نہیں، سلیچر کو میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔ اور اب صرف دس منٹ کے لئے ڈرائیو پر چلئے۔ دیکھئے نا آپ نے تو آنے کے بعد کافی بھی نہیں پی تھی۔ بالکل قریب ایک ریستوراں ہے۔ دس منٹ میں واپس آ جائیں گے۔"

"اچھا چلئے۔" اس نے بہت بے دلی سے کہا۔ اس لڑکے کا اتنا اصرار اسے اچھا نہ لگا مگر اس کے اس بے پناہ شوق اور بے تکان اصرار کو وہ رد نہ کر سکی اور کسی انجانے ذہنی انتشار اور بے چینی نے اسے جھنجھوڑ کر اس نیم بے حسی کے عالم سے بیدار کر دیا۔ اس گھبراہٹ کو چھپانے کو اس نے نظریں نیچی کر لیں۔ اب اس کی نگاہیں، کافی کی پیالی میں گہرے بھورے مشروب میں ڈوب گئی تھیں۔ پھر جیسے اس کا دم الجھنے لگا۔ دھندلا ہوتا گیا اور یکایک ماضی کی ایک شام اُبھری۔ ایک آواز اس کے کانوں میں بس رہی تھی، کافی کی پیالی میں ایک اور چہرہ اُبھرا۔ پیاس کی بے اختیاری تھی، آرزوؤں کی تپش تھی، لگاوٹ کی چاہت تھی۔ اور محرومی کے اندیشے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا "جب تم میرے پاس ہوتی ہو........"

اور یکایک اسے احساس ہوا کہ اس کا ساتھی بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا ہے۔ سگریٹ کا آخری جلتا ہوا سرا اس کی انگلیوں کو جلا رہا تھا اور وہ ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس بلے آواز شکایت سے اسے بڑی ندامت ہوئی۔

"آپ خاموش کیوں ہو گئے؟"

"بیکار ہے۔ آپ نے سنا ہی نہیں کہ میں نے پچھلے دس منٹ میں کیا بکواس کی ہے۔ آپ کافی ختم کر لیں تو میں آپ کو واپس لے جاؤں۔"

تھکن سے چور وہ کمرے میں پہنچی۔ اگر اس وقت گرم پانی غسل کو مل جائے تو شاید کچھ تھکن دور ہو۔ اس نے سوچا۔ کمرے میں بے ترتیبی کا عالم تھا۔ جانے سے پہلے اس نے جلدی میں بیگ خالی کیا تو تمام کتابیں پلنگ پر ڈال دی تھیں۔ اب کون گرم پانی لا کر دے جائے۔ ویسے بھی ہوسٹل کے نوکر سو چکے ہوں گے۔ وہ پلنگ کتابوں سے خالی کرنے کے لئے بڑھی۔ اتنی موٹی موٹی کتابیں اور

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ پندرہ دن میں ساری کی ساری ختم بھی کر دی جائیں۔ ہنہ!

اس نے بڑی بیزاری سے کتابیں سمیٹیں۔ دائیں ہاتھ سے بائیں بازو کے آغوش نما خم میں ایک کے بعد ایک کتاب رکھنی شروع کی۔ وہ کتابوں کو اس خم میں بھر رہی تھی کہ یکایک اس کا ہاتھ ایک سرد چکنی سطح پر رک گیا۔ اس نے نظر جما کر اس اجنبی چکنی سطح کو دیکھا۔ سائز سے مختلف ایک نیلی خوبصورت سی نوٹ بک نظروں کے دائرے میں آئی اس نے حافظے پر زور دے کر اس نوٹ بک کا جائزہ لیا اور جھنجھلا اٹھی۔

یہ نوٹ بک یہاں کیسے ہے؟

مگر یہ ہے کس کی، میری تو نہیں! کسی نے دی تھی؟ مگر کس نے؟

جھنجھلاہٹ اور ... اسی بے نیتی میں بائیں بازو کے خم کی ساری کتابیں پھسل کر فرش پر بکھر گئیں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور بے دلی سے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

انگلیوں نے نوٹ بک کے ورق الٹنے شروع کیے۔ سادہ اور چکنے کاغذ — مگر خالی اور نا آشنا۔ تاہم اجنبیت کے باوجود اس کی انگلیوں کا لمس، ان سادہ اوراق کی چکنی سطح کو سہلانا چاہتا تھا۔ ان سے الگ نہیں ہو پاتا تھا۔ پھر جھنجھلاہٹ کی ایک لہر دل و دماغ میں تیری۔ اور اسے محسوس ہوا کہ اس کی انگلیاں اس کے ارادے کی تابع نہیں رہیں۔ کسی خارجی ارادے کی قوت جیسے ان کو اپنا مطیع فرمان کیے ہے۔

اس نے آہستہ آہستہ ایک ایک ورق پلٹنا شروع کیا۔

ذہن میں کسی انجانے طوفان کی پہلی لہر اٹھی۔ وہ ہلکے ہلکے ورق پلٹتی رہی اور سوچتی رہی کہ یہ نوٹ بک اتنی اجنبی ہوتے ہوئے بھی اسے اتنی عزیز کیوں ہے کہ اب وہ اسے الگ نہیں کر سکتی تھی۔ نوٹ بک کی نیم شناسا نیم اجنبی کشش اس کی انگلیوں سے چلتی ہوئی اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی۔ ایک بے بس کر دینے والے جذبے کی کڑی گرفت میں تھی۔ ایک اور ورق پلٹا گیا جو باقی اوراق کی طرح خالی تھا۔ اس کی یادداشت کا تانا بانا اور الجھ گیا۔ پوری توجہ سے سوچنے کے بعد بھی کوئی سرا ہاتھ نہ آیا۔ آخری صفحہ باقی تھا۔ اس کی انگلیوں میں ناامیدی رینگ رہی تھی۔ بوجھل انگلیوں سے اس نے آخری ورق الٹا۔ سامنے ورق پر دائرے ہی دائرے تھے۔ چھوٹے بڑے ہر پیمانے کے دائرے۔ . . شاید تھکن سے اس کا ذہن واہموں کے دائرے بُن رہا ہے۔ اس نے بہت احتیاط کے ساتھ ہلکے سے آنکھیں کھولیں کہ حقیقت کو اس دھوکے سے بچایا جائے، لیکن دائرے اب حقیقی شکل اختیار کر چکے تھے اور جواب طلب نظروں سے گھور رہے تھے۔

اور ایک دم بجلی کی تیزی سے جیسے ذہن سے ایک دبیز پردہ اٹھ گیا اور یہ دائرے اسے ایک لمحے میں لے گئے۔

امتحان ختم ہو چکے تھے، اور امتحان کے پرچے ختم ہی نہ ہو رہے تھے۔ وہ بیزار ہو گئی۔ اگلی صبح اسے ایک مختصر کورس پر ایبٹ آباد جانا تھا۔ ابھی ختم کرنا تھا۔ ایک پیالی چائے پی جائے، پھر سے کام شروع کیا جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ اٹھی اور پانی کی کیتلی رکھ کر واپس کمرے میں آئی تو دروازے پر اعجاز کو دیکھ کر اسے تعجب ہوا۔ اعجاز نہایت محتاط آدمی تھے۔ وضعداری ان کی سرشت میں تھی اور یہ ان کے آنے کا وقت نہ تھا۔ اسے دیکھ کر ٹھٹکے سے لگے جیسے وہ گھبرائے ہوں، پھر ذرا سنبھل کر بولے "میں ادھر سے گزر رہا تھا تو سوچا کہ آپ سے خدا حافظ کہہ لوں۔ کل جا رہی ہیں نا آپ"

"جی ہاں صبح سات بجے جانا ہو گا۔ آپ بیٹھیں تو رکھیے" اور پھر ایک ناگوار، بے چین سی خاموشی طاری ہو گئی۔

اعجاز کو وہ پچھلے ایک سال سے جانتی تھی، نہایت خاموش، روایتوں کے پابند مگر خوش مذاق اور بے حد ذہین۔ اسی ذہانت

۔ عد مرعوب تھی اور ... میں یہی دونوں کے درمیان شناسائی کے رشتے کی بنیاد تھی کیونکہ اعجاز نے ہمیشہ ہمیشہ اس بات کا اعلان کیا تھا کہ
نہایت براق اور صیقل شدہ ذہانت، تمہاری اس خداداد ذہانت کی بے حد معترف ہے جس سے تم کوئی ... نہیں۔
اور بارہا اعجاز کے منہ سے اپنی ذہانت کا یہ اعتراف سن کر اسے ہمیشہ ایک عجیب طرح کی فخر مندی کا احساس ہوتا رہا۔ اصل میں دونوں
بیان ذاتی قسم کی گفتگو اسی فقرے پر محدود تھی اور اس میں کوئی کمی بیشی نہ آئی تھی۔

اس میں کسی اونچ نیچ یا اتار چڑھاؤ کا یوں بھی امکان بہت ... تھا۔ اعجاز زرہ بکتر پہن کر زندگی گذارنے کے ماہر تھے۔ جذبات کی لطافت
ی سے بہرہ ور ضرور تھے مگر عقل اور ہوش مندی اور سود و زیاں کو جذبات پر ... زبانت پر حاوی رکھنا ان کے نزدیک جیسے انسانیت
سے اعلیٰ مقصد تھا۔

اعجاز سے اپنے ان تعلقات کو وہ ہمیشہ اپنی سہیلیوں کے سامنے "ذہنی یگانگت" کا کتابی نام دیتی تھی۔ اصل میں یہ ایک عجیب طرح کا اعتماد
ایسے قسم کا بھروسا تھا جو اعجاز کو اپنے آپ پر تھا اور اسے بھی وہی بھروسا اعجاز پر تھا اسی لئے اعجاز کو یہ اجازت تھی کہ جس وقت چاہیں
گھر آسکتے تھے۔

لیکن آج اعجاز کو یوں ناوقت دیکھ کر وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ ایک ہی نظر نے اسے بتا دیا کہ جو اعتماد اعجاز کو ہمیشہ اپنی ذات پر رہا ہے
کے چہرے پر اور ان کی آنکھوں میں موجود نہیں تھا۔

وہ خاموش طبع آدمی تھے مگر آج اس خاموشی کی تہہ میں کوئی طوفانی لہر موجود تھی۔ اکثر جب انہیں کسی سے اپنے کام کے سلسلے میں اختلاف
تا تھا تو وہ اس سے ذکر کرتے تھے اور وہ ان کا بوجھ ہلکا کرنے میں کامیاب ہو جاتی مگر آج تو وہ کچھ بول ہی نہ رہے تھے اور بہت
ی نظر آرہے تھے۔ اس نے بہت سوچا مگر کوئی ایسی بات ذہن میں نہ آئی جس سے ان کی اس خاموشی کو توڑا جاتا۔
"میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

اور جب وہ چائے بنا کر لائی اور ایک پیالی ... کو دی تو اسے ان کے ہاتھ میں ہلکی سی بے معلوم سی کپکپاہٹ کا احساس ہوا۔ اونہہ!
اس نے یہ شبہ فوراً رد کر دیا اور ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ اعجاز کے ہاتھ میں ایک نیلی نوٹ بک تھی۔
"یہ میں آپ کے لئے لایا ہوں۔"
"بہت خوبصورت ہے۔"

اور پھر خاموشی۔ اب اسے جھنجھلاہٹ شروع ہوئی۔ کیا مصیبت ہے۔ مجھے اتنا بہت سا کام کرنا ہے اور یہ کچھ بولتے ہی نہیں۔
مد نہ کچھ کرنے کو انگلیاں کانپ اٹھیں تو اس نے نوٹ بک کے سادہ اوراق اُلٹنے شروع کئے۔ ایک دو تین ... خیال آیا۔ کیوں نہ
یا فقرے یاد ہیں یا کہیں سے پڑھوں گی وہ اس نوٹ بک میں لکھتی جاؤں۔ کم از کم روز کے ... تین اندراج ہوں ... مگر اتنا وقت
ا ہو گا ... خیر ...

یلک اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ اعجاز کا ساکت وصامت چہرہ اب بھی اس کے سامنے تھا۔ اس کی شخصیت نے اپنے بچاؤ کے لئے
زرہ بکتر پہن رکھا تھا۔ اس کی کڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ اس کے آہنی حلقے اور فولادی ریزے خزاں کے پتوں کی طرح اپنے ہی
و ریزہ ہو رہے تھے۔ اس شخصیت کے گرد ایک کے بعد ایک دفاعی حصاروں کی جو فصیلیں تھیں، ان میں جگہ جگہ شگاف تھے۔ یہ اونچے

حصار مٹی میں مل رہے تھے فصیلیں زمین بوس ہو رہی تھیں۔۔۔

وہ پھر چونکی۔ اُسے احساس ہوا کہ وہ مسکرا رہی تھی۔ اعجاز کی آنکھوں میں نمی اور چمک دلی کرب کی ہروں سے دست و گریبان تھے۔ اِن چاہت اور حسرتوں کے شعلے لپک رہے تھے۔

وہ ڈر گئی۔ اعجاز کی آواز نے اُسے ۔۔۔ لیا۔ وہ کہہ رہے تھے "تم مانو گی کہ جب تم میرے پاس ہوتی ہو، اتنی قریب کہ میں تمہیں ۔۔۔ تمہارے تبسم کے ولادت میری ویران زن کے خلا بھر جاتے ہیں؛ تمہاری قربت مجھے ایسی آسودگی دیتی ہے جو ہر خواہش، ہر تمنا، ہر آرزو ۔۔۔

اعجاز نے ٹھنڈی سانس لی۔ اتنی گہری اور ۔۔۔ ناک کہ جیسے دل سینے سے نکل پڑے گا۔

بہت آہستہ سے اُٹھ کر انھوں نے ایک سگریٹ سلگایا اور کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ ان کی آواز میں اب آنسو تیر رہے ۔۔۔ میں تمہیں چھوتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں تم پگھل نہ جاؤ، بکھر نہ جاؤ، تحلیل نہ ہو۔ تمہاری آنکھوں کی گہری اداسی مجھے محتاط کر دیتی۔ سوچنے لگتا ہوں کہ میں تمہیں کبھی سمجھ بھی سکوں گا۔۔۔۔ شاید۔۔۔۔ شاید۔۔۔۔ اچھا میں جاتا ہوں۔ خدا حافظ"

یہ سب کچھ اس قدر غیر متوقع اور اچانک تھا کہ اس کے اعصاب، اس کی عقل مفلوج تھے کچھ نہ دیکھنے والی آنکھوں سے اس کرسی کی طرف دیکھا، پھر کھڑکی کو ٹٹولا ۔۔۔ پھر اس نوٹ بک کو جس پر ۔۔۔ اس کا کانپتا ہوا ۔۔۔ بے جان ہاتھ دائرے ہی دائرے بے ہنگم، ٹیڑھے میڑھے، چھوٹے بڑے دائرے ۔۔۔ دائرے ہی دائرے ۔۔۔

اب یہی دائرے ایک زندہ زنجیر بن کر اس کے رگ و پے میں ہیجان تھے اور وہ ان کی اسیر تھی

کمال مصطفٰی

یہ خانہ بدوش لوگ

یہ لوگ جو ہمارے گھروں کے سامنے کھلے میدانوں میں یا سڑکوں کے کنارے، اجاڑ علاقوں میں آکر عارضی خیمے گاڑ لیتے ہیں، کھلی ہواؤں میں سانس
، نیلے تاروں بھرے آسمان سے، کچی زمین پر سوتے ہیں، ہنستے ہیں، مگن رہتے ہیں اور باہر زمین پر آگ جلا کر وہ اور ان کی عورتیں مل جل کر
اتے ہیں لیکن پھر بھی ہم سے الگ تھلگ اور دور دور رہتے ہیں اور یوں اکیلے اور تنہا نظر آتے ہیں اور پھر چند دن ایک جگہ قیام کرکے اپنے
ا اُکر کسی دوسری طرف چل دیتے ہیں ــــــ تو یہ لوگ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ انہیں زمین کا کوئی خطہ
اپسند کیوں نہیں آ جاتا؟

اور وہ بھی تھے جو ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے نکلے، ان لوگوں کے ساتھ رہے، اُٹھے، بیٹھے لیکن پھر بھی نہ جان سکے ــــــ کچھ نہ جان سکے
ہیں جو ان سے آگے جانے والوں نے جان لیا تھا ــــــ کہ یہ لوگ دراصل اسی پرانی ڈگر پر چل رہے ہیں جو ان سے ہزاروں بلکہ لاکھوں
ان کے بڑوں نے اختیار کی تھی۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ ان کے بڑے تو ایسے اس لئے تھے کہ وہ مویشی چراتے تھے اور انہی کا گوشت
انہی کا دودھ پیتے اور انہی کی کھالوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے اور جب ان کے جانوروں کے لئے گھاس ختم ہو جاتی تو وہ اپنے جانوروں
اور یوں ہی منہ اُٹھائے کسی اور سمت چل دیتے ــــــ کبھی میدانوں، جھیلوں میں، قافلوں میں۔

یہ جو آج ہیں یہ کیوں پریشان، دربدر مارے مارے پھرتے ہیں، ان کو کون سا غم ستاتا ہے؟ ــــــ یہ کوئی نہیں جانتا۔ البتہ چند تحقیق
سے تاریخ جاننے والے وہ بھی ہیں جنہوں نے اپنے بڑوں کے خلاف بغاوت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کا جواب پا لیا ہے اور
ہیں کہ یہ خانہ بدوش لوگ ایک پرانی داستان کو دہرا رہے ہیں۔ وہ داستان جو سب داستانوں سے پہلے شروع ہوئی تھی اور جو ابھی تک ختم نہیں
۔ لیکن یہ سب باتیں بڑوں کی سمجھ سے باہر ہیں۔

تو اس داستان کا آغاز یوں ہوا کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں سال پہلے قدیم انسان کو ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ بلکہ یوں تھا کہ یہ حادثہ قدیم انسان
قدیم زمین کو پیش آیا تھا۔ آج سے ہزاروں بلکہ لاکھوں سال پہلے سورج مغرب سے طلوع ہوتا تھا اور یوں تھا کہ ان دنوں زمین مشرق سے
سمت گھومتی تھی۔ یہ یہ بات جو اب ہم کو اُلٹی نظر آتی ہے اس زمانے کے لوگوں کے لئے بالکل صحیح اور قدرتی ہوگی کیونکہ جو ہوتا آیا ہے، ہمارا
اور انسان روایت کا مارا ہوا، عادت سے مجبور، معمول پسند ہے۔ اس کے باوجود ان باتوں کا اب ہزاروں بلکہ لاکھوں برس بعد ہم صرف اندازہ
تے ہیں کیونکہ ہمیں اس قدیم واقعہ کا کوئی شعوری علم نہیں ہے۔ ہمارے ذہن سے جو ویسے ان گنت صدیوں کا گہوارہ ہے یہ واقعہ بالکل ہی
ہے۔ پر ہم یہ جانتے ہیں کہ اگر یوں ہوا تھا تو وہ کوئی بہت ہی بڑے پیمانے کا حادثہ ہوگا جو اب ہماری یادوں، ہمارے شعور

خیر شعور سے بھی بالکل مٹ چکا ہے۔

اور کچھ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ حادثہ نہیں تھا بلکہ قدرت نے ہی ایسا چاہا تھا اور اس لئے یہ زندگی کا ایک عام سا واقعہ تھا جس طرح موت، تنزل، تبدیلی۔ اصل میں یہ واقعہ، یہ تبدیلی اس قدر آہستہ اور مسلسل تھی کہ انسان کو اس کا احساس تک نہ ہوا۔ انسان کی کئی نسلیں اس کے دوران پیدا ہوئیں، آئیں اور چلی گئیں اور انھیں اس بات کا علم ہی نہ ہوا کہ وہ کسی حادثے سے دوچار ہیں۔ اور کون جانے کہ آج کا انسان بھی ان گئے ہوؤں کی طرح صدیوں سے اسی قسم کے کسی حادثے کا شکار نہیں ہے اور شاید ہم سب صرف یہی جاننے کو بیتاب ہیں —— لیکن یہ ایک اور کہانی ہے۔

پھر یہ جاننا بھی مشکل ہے کہ وہ حادثہ جو ہزاروں بلکہ لاکھوں سال پہلے پیش آیا، اس کا اثر اس زمانے کے انسان پر کیا ہوا۔ کون جانے کیا ہوا! کیسے ہوا! صرف اندازے ہیں، اور کچھ نہیں۔ اور کون جانے کہ ہم جاننا ہی نہیں چاہتے کیونکہ ہم ڈرتے ہیں کہ زیادہ جاننے کی کوشش میں جو کچھ ہم جانتے ہیں اسے بھی کھو بیٹھیں۔ اور جانتے ہی کتنا ہیں! صرف اتنا کہ آہستہ آہستہ زمین کی گردش سست ہوتی گئی اور دن اور رات بڑھتے گئے۔ سینکڑوں برس بیت گئے اور انسان کی کچھ نسلوں کو تو اس بات کا علم ہی نہ ہوا لیکن پھر اچانک، سب ہی کو ایک ساتھ یہ احساس ہوا کہ ان کی دنیا میں کوئی تبدیلی آ رہی ہے جو اجنبی اجنبی سی ہے۔ اب دن کو زیادہ گرمی پڑتی اور رات کو زیادہ سردی۔

یونہی دن بیتا کئے اور پھر ایک دن یوں لگا جیسے دھرتی گھومتے گھومتے تھک گئی ہے اور اب آرام چاہتی ہے اور ایک دن ڈرے سہمے لوگوں نے اپنے بچوں کو جو غیر ارادی طور پر کہانی سنانے بیٹھے تھے جب یہ بتایا کہ دھرتی دیوی تھک گئی ہے تو بچے بولے کہ اگر وہ تھک گئی ہے تو کچھ دیر کے لئے سو کیوں نہیں جاتی۔ اس پر بڑے اور بھی ڈر گئیں اور زیادہ ڈر گئیں اور ان کے ماتھوں پر شکنیں پڑ گئیں (شاید انسان کے ماتھے پر یہ پہلی شکنیں تھیں)" نہ نہ ایسے سوال نہیں کیا کرتے۔ اس طرح نہیں سوچا کرتے نہیں تو دھرتی دیوی خفا ہو جائے گی۔"

پر دھرتی دیوی تو پہلے ہی سے خفا ہو چکی تھی اس ہر دفعہ کے گھومنے سے وہ بیزار ہو چکی تھی اور اب وہ آرام چاہتی تھی لیکن بیچارے انسان کیا کرتے۔ شروع میں تو انہوں نے زمین کے اندر گہرے غار کھود لئے تھے۔ دن کی تپش سے بچنے کے لئے وہ تمام دن اپنے جانوروں کے ساتھ ان میں گھسے رہتے اور یونہی دن بیتنے لگتا اور سائے لمبے ہونے لگتے، انسانوں اور حیوانوں، چرند اور پرند کے غول کے غول اپنی پناہ گاہوں سے شکار کی تلاش میں نکلتے جو بھی کے ہاتھ آجاتا اس کی خوراک بن جاتا اور جب سورج ڈوب جاتا اور افق کی سرخی سیاہی میں تبدیل ہو جاتی تو یہ دنگل یہ آنکھ مچولی ختم ہو جاتی اور انسان مویشی اور درندے پھر زمین کے اندر زمین کی پناہ میں چلے جاتے۔ اپنے اپنے ٹھکانوں میں چھپ جاتے اور اگلی شام کا انتظار کرتے پر یہ سلسلہ کب تک چلتا۔ اب گرمی اس قدر شدید ہو گئی تھی کہ درخت اور گھاس اور پھول رفتہ رفتہ مرجھانے لگے تھے۔ شام کے قریب ان میں کچھ جان آتی تو رات ان کو اپنی خنکی تلے دبا لیتی

پھر ایک دن وہ بھی آیا جب دن کی گرمی اور رات کی ٹھنڈک پہلے انسانوں کی برداشت سے باہر ہو گئی۔ انھوں نے اپنی بستیاں چھوڑ دیں اور مویشیوں اور حیوانوں اور انسانوں کے قافلے غیر ارادی طور پر مشرق کی سمت چل دیئے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ یہ مسافت بے انتہا طویل ثابت ہوگی۔ اتنی طویل کہ ان کو طوالت کا احساس بھی نہ ہوگا کیونکہ ان کی آنے والی بے شمار نسلیں مشرق کی طرف منہ اٹھائے چلے جانے والے اس قافلے کا ساتھ دیں گی، بوڑھی ہو جائیں گی، تھک جائیں گی، ہار جائیں گی لیکن پھر دوبارہ نئی انسانی نسلیں پیدا ہوں گی جو ایک نئے عزم کے ساتھ پھر اسی قافلے میں شامل ہو جائیں گی۔ یہاں تک کہ قافلوں میں چلنا ان کی فطرت بن جائے گا —— اور وہ ازلی و ابدی قافلہ بن جاتا ہے گا۔ یونہی بے مقصد بے معنی رستوں سے گزرتا ہوا۔ ان لوگوں کی قسمت میں اب آرام نہ تھا۔ آرام کی تلاش میں جس منزل کی طرف وہ روانہ ہوئے تھے وہ ان کو نظر نہ آتی تھی۔ اپنے نہ ختم ہونے والے سفر کے دوران ان کی کوشش یہ ہوتی کہ وہ ہمیشہ اس علاقے میں رہیں

ہاں رات کی تاریکی اور دن کی روشنی دونوں دھندلکے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ایک دوڑ تھی جو جاری تھی لیکن دھندلکا آگے ہی رہتا۔ وہ برسوں اسی تگ و دو میں
لگے رہے اور برسوں ہی اس میں ناکام۔ لیکن رفتہ رفتہ زمین کی گردش سست ہوتی گئی۔ دن اور رات زیادہ طویل ہوتے گئے اور ایک دن ایسا ہوا کہ دھندلکے کا علاقہ ان کی
پہنچ میں آگیا۔ یہاں کے لئے ایک خوش آئند دن تھا کیونکہ اب یہ مویشیوں اور انسانوں پر مشتمل پرندوں اور حیوانوں کا سیلاب ہر وقت دھندلکے میں رہتا اور دھندلکے کے ساتھ سفر کرتا۔
اب دن اور رات اس قدر طویل ہو چکے تھے کہ گرمی کی شدت اور سردی کی تیزی اور دھندلکے کی تاریکی سے گھاس پھوس، درخت اور پھول مرجھا چکے
تھے۔ زمین پر ایک مردنی سی چھا گئی تھی اور سمندر بھی ساکت، خاموش اور اندھیرے پانی کی عمیق تہوں میں جا چھپے تھے۔ پریشان کن مجبوری۔ ان خانہ بدوشوں کو
اپنے مویشیوں کے لئے ہریالی کی ضرورت تھی۔ اس لئے ان میں سے کچھ لوگ گھاس پھوس کی تلاش میں مختلف راہوں پر نکل پڑے۔ اسی تگ و دو میں کچھ لوگ
شمالی قطب کی طرف، اس کے نزدیک جا نکلے اور پہلی بار ہری بھری زمین کو دیکھ کر ان کی تھکی ہوئی آنکھوں میں چین کی چمک نمودار ہوئی اور ان کے چہرے
جو فکر اور پریشانی سے سیاہ اور نحیف پڑ گئے تھے پہلی بار خوشی سے دمک اُٹھے۔ انھوں نے تو اس ہلکی ہلکی دھوپ میں ہری بھری جنت پالی تھی۔ چنانچہ یوں ہوا
شمالی قطب کے اور گرد آبادی کا بہت بڑا مرکز قائم ہو گیا — لیکن افسوس کہ کچھ ہی دنوں بعد یہ بستی بھی اجاڑ ہو گئی۔ کیونکہ یہ آبادی سال میں صرف چھ
مہینے تک قطب کے ارد گرد رہ سکتی تھی۔ شمالی قطب پر جب راتیں لمبی ہونے لگیں تو ان لوگوں نے اپنا ڈیرہ اٹھایا اور پھر ہریالی کی تلاش میں جنوب
کی طرف چل پڑے اور اس طرح یوں ہوتا کہ انسانی قافلے دو مختلف اور عمودی سمتوں میں چلا کرتے۔ ایک مستقل مغرب سے مشرق کی طرف اور دوسرا شمال سے
جنوب اور جنوب سے شمال کی طرف۔ اس مسلسل سفر کے دوران اکثر ایسا ہوتا کہ یہ دونوں قافلے آپس میں مل جاتے اور جب بھی ایسا ہوتا تو بہت سے لوگ
اپنے پہلے قافلے کو چھوڑ کر دوسرے میں شامل ہو جاتے۔ کچھ اس وجہ سے کہ وہ ایک ہی رُخ چلتے چلتے اکتا گئے تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ وہ منچلے تھے
مختلف علاقوں کو دیکھنے کا شوق ان کو زمین کے مختلف حصوں میں لے جاتا — اور قافلے چلتے رہے، انہی دو سمتوں میں چلتے رہے۔
اور پھر یوں ہوا کہ زمین کی گردش بالکل ہی رک گئی۔ زمین کب رکی اور کتنی دیر تک ساکت رہی — کون جانے — یہ تو وہ بھی نہیں جانتے جو جاننے کا
دعویٰ کرتے ہیں کچھ کا تو کہنا یہ ہے کہ زمین سالہا سال تک ساکت رہی لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ کتنے سال تک تو وہ کوئی واضح جواب نہ دے سکے اور وہ
لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ صرف چند لمحوں کے لئے زمین کی گردش بند ہوئی اور اس کے بعد اس نے الٹی سمت میں گھومنا شروع کر دیا۔ ہاں البتہ ساکت ہونے
سے پہلے اور اس کے بعد بعد عرصے تک زمین کے گھومنے کی رفتار اس قدر سست تھی کہ اس زمانے کے لوگوں کو یہی محسوس ہوا جیسے زمین عرصے سے ساکت ہے۔
اب ان کا طویل سفر ختم ہو گیا تھا۔ شاید وہ منزل تک پہنچ گئے تھے — اور اب ان کو دھندلکے کے پیچھے بھاگنا نہیں پڑتا تھا۔ زمین کو ساکت رہا اس لئے یہی
رہے کہ وہ ایسے علاقے میں رہتے تھے جہاں اگرچہ روشنی اور تاریکی کی حدیں آپس میں ملتی تھیں لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ روشنی کی حد کہاں ختم ہوتی
اور تاریکی کہاں سے شروع ہوتی تھی۔ اس لئے وہ یہ محسوس نہ کر پائے کہ زمین کی حرکت کب بند رہی۔ ان کے یہ نہ جاننے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس دوران
ان کی کئی نسلیں آئیں اور چلی گئیں۔ انسان کی یہ نسلیں دھندلکے کی نسلیں تھیں۔ ان میں اکثر انسان تو رات کی تاریکی اور دن کی تمازت سے بالکل ہی ناواقف
البتہ چند لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنے بزرگوں سے دھندلکے سے باہر کی دنیا کے بارے میں عجیب و غریب قصے سن رکھے تھے جنھیں یہ کہہ کر ڈرا دیا گیا
تھا کہ اگر وہ ان علاقوں میں نہ جانا۔ ایک طرف تو دھوپ کی تپش سے تم جھلس جاؤ گے اور دوسری طرف اندھیرے میں تم بھٹک جاؤ گے اور اپنا راستہ کھو
بیٹھو گے۔ لیکن ایک آدھ بار ایسا ہوا کہ چند سر پھرے ایسے بھی پیدا ہو گئے جو اپنے بزرگوں کی کہنے کی کوئی پروا نہیں کرتے تھے۔ وہ مشرق یا مغرب کی سمت کچھ دور
نکل جاتے اور پھر واپس آ کر ان علاقوں کا جہاں تنہا رہتے، سورج تھا یا تاریکی تھی اور لق و دق صحرا یا برف کی ایک چادر — وہاں کے حالات وہ
بڑھا چڑھا کر بیان کرتے کہ وہ کہانیاں بن کر رہ جاتے لیکن یہ بھی تھی کہ جو نقشہ اُنھوں نے ان داستانوں میں کھینچا وہ حقیقت سے بہت
مختلف تھا۔ کیونکہ آخر کار وہ روشنی یا اندھیرے کی سرحد پر سے ہی لوٹ آتے تھے۔

اب جبکہ زلزلہ رک چکا تھا۔ انسان دھندلکے کے خطے میں مستقل آباد ہوگیا تھا اور اس نے اپنے آرام و آسائش کے لئے وہ تمام چیزیں پیدا کر لی جو بے فکری اور اطمینان کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس نے اپنی بستیاں بنائی تھیں اور وہ گھر بنا کر رہنے لگا اور انسانی آبادی کا یہ خطہ، یہ پٹی زمین کے چاروں ایک دائرے کی شکل میں پھیلی ہوئی تھی۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اگرچہ اس آبادی کا یہ خطہ قطبین کے سوا تسلسل کے ساتھ زمین کے گرد پھیلا ہوا تھا مگر کی ایک پٹی میں رہنے والوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ زمین کی دوسری طرف بھی دھندلکے کا خطہ موجود ہے اور جو انسانوں سے آباد ہے بلکہ ان میں سے اکثر لوگ اب یہ بھی بھول چکے تھے کہ وہ جس زمین پر رہ چکے تھے کہ وہ جس زمین پر رہتے ہیں وہ گول بھی واقع ہوئی ہے۔ اور پھر یوں ہوا جو ہوتا آیا ہے کہ ایک سر پھرے میں یہ بات سمائی کہ اگر شمال کی طرف چلا جائے اور قطب شمالی کے برفانی غیر آباد علاقے کو بھی پار کر لیا جائے تو دنیا کے دوسری طرف وہ انسانوں کی ایک بستی میں جا پہنچیں گے۔ اور اس طرح کچھ لوگوں کی ایک جماعت انسانی توہمات اور مخالفت کے پردوں کو چیرتی ہوئی شمال کی طرف روانہ ہوئی برفانی چوٹیوں کو سر کرتی ہوئی راستوں کو روندتی ہوئی یہ باہمت مردوں کی جماعت شمال کے قطب کو پار کرنے میں کامیاب ہوگئی اور بالآخر زمین کی دوسری طرف رہنے والے انسانوں میں جا پہنچی اور یوں رفتہ رفتہ زمین کے اردگرد قطبین کے راستے سے انسانوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔

زمانہ گزرتا گیا اور زمین کی گردش معکوس جو پہلے آہستہ تھی ۔۔۔ اتنی آہستہ کہ اس کا سراغ بھی نہ ملتا تھا یہاں تک کہ یہ بھی پتہ نہ چلا تھا کہ وہ سکوت ۔ حرکت میں کب آئی تھی ۔۔۔ اب تیز اور تیز تر ہوتی گئی۔ اور انسان جو اب تک غافل تھا چونک پڑا اس کے لئے زمین کو حرکت میں تصور کرنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا مدت پہلے اس کے آباؤ اجداد کا زمین کو ساکت تصور کرنا ۔۔۔ اور اس کے لئے یہ خبر بے حد حیران کن تھی۔ زمین کی حرکت کی خبر انسان کو کیسے ہوئی، یہ وثوق کے ساتھ نہیں معلوم۔ شاید پہلے ایک افواہ تھی جو مشرق کی سمت سے اٹھی اور دھندلکے کی پوری پٹی میں شمال سے لے کر جنوب تک پھیل گئی افواہ پہلے تھی اور حقیقت بعد میں یا حقیقت پہلے تھی اور افواہ بعد میں۔ کوئی نہیں جانتا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خبر انسان کے لئے ہولناک ہوگی ۔ بے حد پریشان کن۔ قدرت کچھ یوں سفاک تھی کہ ان کی ننھی سی، عارضی خوشی کو بھی چھیننا چاہتی تھی اور اس بار قدرت کا یہ کرشمہ تو اس سے بھی زیادہ گراں گزرا جو ان کے آگے گئے ہوؤں پر گزرا تھا اگرچہ یہ تجربہ ۔۔۔ زمین کا گھومنا ان کے لئے اتنا نیا نہیں تھا جتنا زمین کا ساکن ہونا ان کے بڑوں کے لئے تھا۔ اور یوں ہوا کہ دھندلکے کی پٹی کے مشرق میں رہنے والے پناہ لینے کے لئے دھندلکے کے مغرب میں وارد ہونے لگے شاید یہ ایک دوسرے بڑے قافلے کی پہلی لہر تھی جو مشرق سے اٹھی تھی اور مغرب کی سمت سفر کر رہی تھی یا شاید یہ پہلا ہی قافلہ تھا جو پڑاؤ کرنے کے بعد اب اسی سمت چلنا شروع ہوگیا تھا جس سمت سے آیا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ کس سمت سے آیا تھا اور کس سمت اسے جانا تھا۔ اور ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں سمندری لہروں کی طرح لوگوں کی کھیپ کی کھیپ دھندلکے کے مشرقی کنارے سے اٹھتی اور مغرب کی طرف چل دیتی اور رفتہ رفتہ انسانی سمندر میں مدغم ہوجاتی ہوا بھی ساکن تھا لیکن حرکت میں آنے کے لئے تلا بیٹھا تھا۔ اور جس طرح پانی کی رو میں سمندر میں چلتی ہیں اور اردگرد کے پانی کو بھی اپنے ساتھ لے جاتی ہیں، اسی طرح ایک روز جنگلی جانوروں کا طوفان مشرق سے ابھرا اور ہریالی کو روندتا ہوا۔ دھول کے بادل اڑاتا ہوا مغرب کی طرف بھاگ کھڑا ہوا اور یوں یہ حیوانی لشکر انسانی قافلے کا ہراول دستہ بنا۔ انسانوں کی عظیم آبادیاں پھر اجاڑ ہوگئیں انہوں نے اپنا گھر بار چھوڑا اور لمبے ختم نہ ہونے والے سفر پر دوبارہ روانہ ہوگئے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب وہ مخالف سمت چل رہے تھے اور جس طرف سے آئے تھے اسی طرف جا رہے تھے پر وہ نہ جانتے تھے جس طرح وہ اور کچھ نہ جانتے تھے، اور یوں انسان اور قدرت کے درمیان دوبارہ ایک طویل کشمکش شروع ہوگئی ۔۔۔ وہ کشمکش جو اب بھی جاری ہے۔

ہم یہ جو آج کل کے لوگ ہیں، جو ہمارے گھروں کے سامنے کھلے میدانوں میں یا سڑکوں کے کنارے اجاڑ علاقوں میں آ کر عارضی خیمے گاڑتے ہیں، کھلی ہوا میں سانس لیتے ہیں، نیلے تاروں بھرے آسمان تلے کچی زمین پر سوتے ہیں، ہنستے ہیں، مگن رہتے ہیں اور باہر زمین پر آگ جلا کر وہ اور ان کے ل مل کر کھانا پکاتے ہیں لیکن پھر بھی ہم سے الگ تھلگ اور دور رہتے ہیں اور یوں اکیلے اور تنہا نظر آتے ہیں اور پھر کچھ دن ایک جگہ قیام کر کے اپنے خیمے اکھاڑ کر دوسری طرف ۔۔۔ کیا یہ لوگ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں، اور انہیں زمین کا کوئی خطہ کوئی گوشہ پسند کیوں نہیں آتا؟

کے دیکھنے سے فارغ ہو چکی تھیں۔ وہ خود بھی پانچ وقت نماز پڑھتی تھی۔ خدا نے اُسے کتابی چہرے سے نوازا تھا۔ سانولی سلونی، تیکھے دلکش ناک نقشہ ڈاکٹر سعدی لباس نہایت سادہ پہنتی تھی۔ اسے میں نے کبھی ریشمی لباس میں نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ سوتی سفید شلوار اور ہلکے پرنٹ کی سوتی قمیص میں ملبوس رہتی۔ میک اپ کے قریب بھی نہ پھٹکتی تھی۔ بال اُس کے اکثر خشک ہی دیکھے۔ سیدھی سادی کنگھی اور جوڑا کر لیتا۔ معمولی سینڈل پہنتی لیکن ساتھ چار ضرور ہوتے۔

سیڑھیوں سے رپٹنے کے دو دن بعد ڈاکٹر نے فون پر مجھ سے پوچھا "اُس دن آپ کو چوٹ تو نہیں لگی تھی؟" یہ پوچھتے ہی اُس پر پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔ میں نے غصے میں فون بند کر دیا۔ اُس نے پھر فون کیا اور پھر یہی پوچھا۔ میں نے غصے میں جواب دیا۔ "نہیں!"

مجھے ایسا لگا جیسے وہ ہنسی پر ضبط کر رہی ہے۔ اُس نے کہا آپ کو ضرور چوٹ لگی ہے۔ آپ چھپا رہے تھے۔" میں نے پھر کہا "نہیں" اُس نے جھلا کر پوچھا "یہ نہیں نہیں کیا لگا رکھی ہے؟" میں نے جواب دیا "یہ تم ہی سے سیکھا ہے۔ تم بھی تو ہر بات پر نہیں اور ناہی کہتی ہو۔" اب اُس نے فون بند کر دیا۔

دوسرے یا تیسرے دن وہ میرے دفتر آگئی اور کہنے لگی "میرے ساتھ میرے گھر جاتے ہیں۔ ابا بھی ہوں گے۔" میں نے فوراً کہا "نہیں" اُس کا متین اور سنجیدہ چہرہ سُرخ ہو گیا۔ کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہنے لگی "اچھا تو نہیں آئیں گے آپ؟"

میں نے شرارت کے انداز میں پھر کہا "نہیں"

وہ فوراً اٹھی اور جانے لگی۔ میں نے لپک کر اُس کا بازو پکڑا۔ اُس نے فوراً میرا بازو جھٹک دیا اور کہا "مجھے ہاتھ نہ لگائیے آپ بڑھتے جا رہے ہیں" — مجھے گویا پسینہ سا آگیا۔ میں نے پہلی مرتبہ اس طرح اُسے ہاتھ لگایا تھا۔

میں نے ملتجیانہ نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بیٹھنے کو کہا۔ وہ غضبناک چہرہ لیے ہوئے بیٹھ گئی۔

میں نے پوچھا "چائے پینے کس وقت آؤں؟"

چہرے پہ کوئی تغیر لائے بغیر اُس نے کہا "کل صبح ساڑھے دس بجے" اُس کا لہجہ تحکمانہ تھا —

ایک منٹ بعد وہ اُٹھی اور میرے منہ پر "السلام علیکم" مار کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

دوسرے دن میں ٹھیک صبح کے ساڑھے دس بجے سعدی کے گھر پہنچا۔ اُس کے ابا بھی موجود تھے۔ چائے نہایت پُرتکلف تھی۔ پھل، مٹھائی، کیک، پیسٹری سبھی کچھ موجود تھا۔ مگر چائے دانیاں دو تھیں۔ ایک بڑی، ایک ننھی سی۔ بڑی میں چائے اور چھوٹی میں دودھ تھا۔ مجھے کچھ اچنبھا سا ہوا۔ اچھے خاصے خوشحال ہیں۔ مکان، زمین، بینک بیلنس سبھی کچھ ہے۔ پھر کراکری کے معاملے میں کنجوسی کیوں؟ معمولی دودھ دان دو ڈھائی روپے میں مل جاتا ہے۔ چائے دانی سے دودھ بنانا اور وہ بھی ایک پُرتکلف چائے پر مجھے عجیب سا لگا۔

اس سے پیشتر بھی مجھے دو ایک بار سعدی کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اُس نے دونوں مرتبہ دودھ اور چینی سے بھرپور چائے مجھے پیش کی۔ اُس وقت تو میں زہر مار کر گیا۔ مگر بعد میں میں نے اُس سے احتجاج کیا۔ شاید اُسے یہ احتجاج یاد تھا۔ اسی لئے اگلی مرتبہ اس نے دودھ اور شکر الگ الگ پیش کی مگر دودھ چائے دانی سے بنایا۔ دو چار دن کے بعد میں نے اُس سے پھر احتجاج کیا۔ اُس نے بجھیری تاویلیں کیں مگر میں نے ایک نہ سُنی۔ وہ جھلا اٹھی اور کہا "آئندہ آپ میرے گھر نہیں آئیں گے۔"

اس پُرتکلف چائے پر ادھر اُدھر کی بیکار سی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے ابا کی موجودگی میں یہی کچھ ہونا تھا۔ چائے کے بعد میں چلنے

ا "مجھے کالج ڈراپ کر دیں" اس فقرے میں بھی حکم کا عنصر موجود تھا۔ اُس کے آبا ہمیں سڑک تک چھوڑنے آئے۔ وہ میرے برابر
دا سٹارٹ کرتے ہی میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ خاموش رہی اور سامنے ٹریفک کا جائزہ لیتی رہی۔
ں نے دوبارہ شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: "ڈاکٹر تم بھلی چنگی لڑکی ہو ہر لحاظ سے نارمل ہو۔ مگر تمہارے مزاج میں تکبر، درشتی، بے نیازی،
ر قدرتی طور پر موجود ہے یا تم ضرورت سے زیادہ شی ہو؟"
ں وہ تو تلملا گئی ـــ پھٹ کر بولی "تکبر سے مجھے سخت نفرت ہے۔ درشتی میرے مزاج کا حصہ ہرگز نہیں۔ بے نیازی سے نہ جانے آپ کا
ہے؛ شاید مجھے ورثہ میں ملی ہے ـــ یاد رکھیے میں حاجی باپ کی بیٹی ہوں۔"
نا طویل فقرہ اس نے فر فر بولا، بغیر میری طرف دیکھتے ہوئے میں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی، باقی مختصر راستہ خاموشی میں کٹا
ال کے قریب پہنچے تو اُس نے نہایت روکھے پن سے کہا "بس مجھے گیٹ ہی پہ اتار دیجیے" ـــ میں نے فوراً بریک لگائی وہ بگولے
اور باہر نکل کر اس نے کار کا دروازہ اتنے زور سے بند کیا کہ تمام گاڑی ہل گئی، چہرہ کار ہی کی طرف رکھتے ہوئے اُس نے ایک مرتبہ پھر
میرے منہ پہ چھاڑا اور سامنے والی سیڑھیوں میں غائب ہو گئی۔
ا لڑکی سے پالا پڑا ہے؛ میں بڑبڑایا اور کار لوٹا کر گھر کا رُخ کیا۔
رے لئے ڈاکٹر ایک معما تھی ـــ مجھے اُس کی بے نیازی سے اتنا ڈر نہیں لگتا تھا جتنا اُس کی پارسائی سے۔ وہ مجھے بعد مقدس دکھائی
اس سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے اکثر یہ محسوس ہوا جیسے میں کسی نن سے باتیں کر رہا ہوں۔ وہ طویل فقرے بہت کم بولتی تھی۔ اُس کی مختصر گوئی میں
ہیں کی بھرمار ہوتی تھی۔ میں اُس کے پاس دو دو گھنٹے بھی بیٹھا مگر باتیں بھی کر کرنا پڑیں۔ ان تمام حوصلہ شکن باتوں کے باوجود ڈاکٹر سے
محبت ہو چکی تھی۔ میری زندگی نہایت پرسکون ڈگر پر چل رہی تھی۔ فرائض کی ادائیگی میں میرا بے شمار لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ ان میں
نوجوان لڑکیاں بھی ہوتی تھیں۔ خواتین اور لڑکیوں میں بعض اوقات نہایت دلکش اور شوخ و شنگ ہستیوں کا بھی سامنا ہوتا تھا لیکن
میں کبھی پھسلا نہیں۔ ایک آدھ مرتبہ لغزش ہوئی مگر فوراً سنبھل گیا۔ مگر ڈاکٹر کا معاملہ ہی کچھ اور تھا ـــ وہ چپکے سے بلکہ پنجوں کے بل
میں داخل ہوئی اور پھر بلا تکلف میرے سکونِ قلب پر چھاپہ مار کر بیٹھ رہی اور مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ بڑی دیدہ دلیر نکلی۔
دن مجھے خوب یاد ہے جب وہ پہلی مرتبہ میرے کمرے میں آئی تھی اور مشورتاً نمائش اپنی ایک سہیلی کے کیس کی وضاحت
کے سر اور بازوؤں کی جنبش نے اُس کی زبان کا ساتھ دیا اور وہ بزعم خود میدان مار کر چلی گئی۔ چند دن بعد وہ پھر نمودار ہو گئی۔
پ نے اُس کیس کا کیا کیا؟"
معاملہ خاصا پیچیدہ ہو چکا تھا اور اُسے حل کرنا کوئی آسان نہ تھا۔ میں نے کہا "ابھی کچھ دن لگیں گے" ـــ چند سے توقف کے بعد وہ
ہفتہ عشرہ کے بعد پھر آن دھمکی۔
دوران میں میں معاملہ کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ ماتحت عملے نے کیس خاصا خراب کر رکھا تھا اور درحقیقت ڈاکٹر کی سہیلی سے بے انصافی
نے معاملہ ٹھیک ٹھاک کر دیا اور اُسے اب محض اطلاع ہی دینا تھی کہ فیصلہ اُس کی سہیلی کے حق میں ہو چکا ہے ـــ دوسری طرف
کر فیصلہ سنا دیا تو ڈاکٹر کے ساتھ آج کی نشست آخری ہوگی۔ میں چاہتا کہ اُس کا آنا جانا بند نہ ہو۔ ڈاکٹر نے بیٹھتے ہی پوچھا
"

میں نے عرض کی "ان شاء اللہ جلد ہی کام بن جائے گا اور میں آپ کو اطلاع بھجوا دوں گا"۔

"نہیں۔ آپ آج ہی مجھے دو ٹوک جواب دیجئے"

"دو ٹوک جواب میرے لئے ناممکن ہے کیس کو ابھی کئی مراحل طے کرنا ہیں۔ مگر ان شاء اللہ کام بن جائے گا"۔

"کیس کس سٹیج میں ہے اور ابھی کتنے دن لگیں گے؟"

"آپ تفصیلات نہ پوچھیں"۔

"میں ضرور پوچھوں گی"۔

"میں جواب نہیں دوں گا"

"نہ دیں۔ میں ہفتہ بعد پھر آؤں گی"

"ضرور تشریف لائیں"

وہ جانے لگی تو میں نے ایک منٹ بیٹھنے کو کہا ۔۔۔ وہ بیٹھ گئی۔ میں نے پوچھا "ایک سوال کروں آپ ناراض تو نہیں ہوں گی"؟

"ناراض ہونے والی بات ہوئی تو ضرور ہوں گی"۔

"یہ بتلائیے کہ آپ کی سہیلی خود اپنے کیس کے لئے کیوں نہیں آئی"؟

"وہ پردہ کرتی ہے"

"آپ کیوں نہیں کرتیں"

"آپ کون ہوتے ہیں یہ بات پوچھنے والے"؟

"بتلایئے نا!"

"میرے والدین نے اجازت دے رکھی ہے"

"کیوں؟ آپ تو حاجی باپ کی بیٹی ہیں"

"میرا جو پیشہ ہے اس میں پردہ رکاوٹ پیدا کرتا ہے"۔

"ویسے آپ پردے کی حامی ہیں؟"

"جی"

"تو گویا دولت کمانے کی خاطر آپ نے پردہ چھوڑنا مناسب سمجھا"

"نہیں۔ خدمت خلق کے لئے"

"خدمت خلق تو بہانہ ہے۔ آپ کے بعض ہم پیشہ لوگ تو لوگوں کی کھال کھینچ لیتے ہیں"

بات کھردری ہو رہی تھی۔ "آپ پیچھے پڑ گئے۔ میں نے اپنے والدین کی اجازت سے پردہ چھوڑا ہے۔ ان کی مرضی کے خلاف نہ میں آج تک کوئی اقدام کیا ہے نہ آئندہ کبھی کروں گی"۔

"آپ بڑی نیک بخت اور سعادت مند ہیں"۔

"نہیں۔ اچھا میرا وقت ضائع نہ کریں"

اُس نے میرے منہ پر سلام علیکم کا گولہ دے مارا اور کمرے سے باہر نکل گئی

اپنی سکیم کے مطابق وہ ہفتہ عشرہ بعد پھر آئی اور جواب طلب کیا۔ میں نے اُس کی لطافت کو طول دینے کے لئے اُسے ایک تار دیا جو اُس کی آمد سے چند منٹ پہلے مجھے ملا تھا۔ میں نے اُس سے مشورہ طلب کیا۔ تار پڑھ کر اُس نے پوچھا "یہ کون لڑکی ہے؟"

"میری عزیزہ ہے"

"کیوں بلا رہی ہے؟"

اُس کی شادی کا مسئلہ ڈک رہا ہوا ہے۔ جہاں وہ شادی کرنا چاہتی ہے والدین اُس رشتے سے خوش نہیں ہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ میں جا کر اُس کے والدین کو ہموار کر لوں۔"

"آپ کے نزدیک لڑکی کیسی ہے؟"

"بہت اچھی"

"میں صورت نہیں پوچھ رہی ہوں۔ ویسے کیسی ہے؟"

"میں بھی صورت کا ذکر نہیں کر رہا۔ سیرت اُس کی بہت اعلیٰ ہے۔

"غلط، سب غلط۔ جو لڑکی والدین کی مرضی کے خلاف رشتہ کرے، وہ ہرگز اچھی سیرت کی مالک نہیں ہو سکتی۔ آپ ہرگز نہ جائیں ورنہ آپ بھی برابر کے مجرم ہوں گے"

نہ جانے کیوں میں نے اُس کی موجودگی میں تار بھجوا دیا کہ "میں نہیں آ سکتا" تار بھجوانے کے بعد میں اصل موضوع پر آیا اور بتایا کہ اُس کی سہیلی کا کیس سلجھا دیا گیا ہے اور اب وہ اگلا قدم اٹھا سکتی ہے۔ اُس نے نہایت متانت سے شکریے کا نقطا ایک لفظ ادا کیا اور اپنی سہیلی کا کیس چھوڑ کر پوچھا "آپ نے تار بھجوانے میں بہت عجلت سے کام لیا۔

"آپ کا یہی منشا تھا نا"

اُس نے "آپ نے اچھا کیا" کہا اور اپنی کتاب، اسٹیتھوسکوپ سمیٹ، سلام علیکم کہہ یہ جا وہ جا۔ اور میں دیکھتا ہی رہ گیا۔

نہ جانے اب وہ آئے گی یا نہیں۔ جس کام کے لئے وہ آتی تھی وہ تو ہو گیا اب وہ کیوں آئے گی۔ میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ چند منٹ سکتے کے عالم میں رہ کر میں دوبارہ اپنے کام میں غرق ہو گیا۔

دن اور ہفتے گزرتے رہے مگر نہ اُس کا فون آیا نہ وہ خود آئی۔ میں نے بھی دل کو تسلی دی کہ ایک دور تھا جو ختم ہوا۔ دنیا کا کاروبار خواہ کیسا ہی ہو اسی نہج پر چلتا ہے۔ مگر ڈاکٹرنی یادوں لاشعور میں گھر کر چکی تھی۔

محبت کے تیر مجھ پر کم ہی کارگر ہوئے تھے۔ میں خود کو اس معاملے میں سراپا ڈھال سمجھتا تھا مگر ڈاکٹرنی اور ہی چیز تھی۔ اُس کے اکھڑپن میں بھی ایک جاذبیت تھی کہ مری ڈھال خود بخود اُس کے قدموں میں جا گرتی تھی۔

مہینوں بعد جب وہ دوسری مرتبہ مجھے ملنے آئی تھی تو ملاقات مختصر تھی مگر فتنہ انگیز ہوا یوں کہ اُس کی سہیلی کا کیس سنتے ہی نہ جانے میرے منہ سے کیا نکلا کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بے اختیار مسکرا دی۔

بس یہی مسکراہٹ مجھ پر قیامت بن کر ٹوٹی۔ اس کے لبوں پر تبسم یہی کوئی پانچ سیکنڈ رہا ہوگا مگر اس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں زندگی
سینکڑوں نہیں ہزاروں لوگوں سے ملا ہوں گا۔ ان میں لڑکیوں اور خواتین کا تناسب بھی خاصا تھا مگر ایسی تو بہ شکن مسکراہٹ! معاذ اللہ!
میں اس کے خلوص اور دل کشی کا دل ہی دل میں قائل تھا۔ اپنی سہیلی کی وکالت اس نے جس خلوص سے کی تھی، وہ بجائے خود میرے لیے
عظیم الشان تجربہ تھا لیکن اس کی مسکراہٹ نے تو میری زندگی کا دھارا ہی موڑ دیا۔ اس مختصر تبسم میں وہ میرے سامنے کائنات کی حسین ترین شے
جلوہ گر ہوئی اور میں بتاؤں ہوش حواس اس کے قدموں میں تھا۔

جب پانچ چھ ملاقاتیں ہو گئیں تو ایک دن جی کڑا کر کے میں نے کہا، "ڈاکٹر ذرا مسکرا دو۔"

"اس کی بھویں تن گئیں۔ پوچھا "کیا مطلب؟"

"مطلب یہی کہ تم کبھی مسکراؤ گی بھی یا نہیں؟"

"نہیں، ہرگز نہیں"

"سنو سعدی۔ تمہاری مسکراہٹ نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ میں نے ایسی مسکراہٹ زندگی بھر نہیں دیکھی۔ چلو بناوٹی تبسم ہی لبوں پر لے آ
ڈاکٹر کا چہرہ غصہ سے تمتما گیا "دیکھئے جناب میرے سامنے ایسی بیہودہ باتیں نہ کیجئے۔ میں اس قسم کی خرافات کی عادی نہیں ہوں۔ میں
کہہ چکی ہوں کہ میں حاجی باپ کی بیٹی ہوں۔"

خرافات کا لفظ میرے منہ پر طمانچہ تھا۔ میں نے فوراً معافی مانگ لی اور وہ خاموش رہی۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ جب بھی اس سے ملاقات ہوگی تو صرف دوا اور دو چار قسم کی باتیں کروں گا یعنی اتنی ہی جتنی کہ امراض میں

چنانچہ وہ پھر آئی تو اس کے مختصر سوالوں کا جواب میں نے مختصر ترالفاظ میں دیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر گفتگو میں بار بار وقفہ
تکلیف دہ سکتہ مگر میں اپنی روش پر جا رہا۔

آخر اس نے کہا "اچھا میں چلتی ہوں۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ "دو منٹ بیٹھئے۔ ٹھنڈ ہو رہی ہے۔ چائے کی پیالی پی لیں۔"

وہ بیٹھ گئی۔ چائے آئی۔ اردلی چائے بنانے لگا تو اس نے کہا "تم جاؤ میں خود بناؤں گی۔"

اس نے میرے آگے چائے کی پیالی رکھ دی اور حسب معمول خاموش بیٹھ رہی۔ میں نے طنزاً کہا "آپ نے بہت زحمت کی۔ شکریہ"

"نہیں"

"شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے"

"نہیں کوئی ضرورت نہیں"

یہ سوچ کر کہ شاید چائے کی پیالی پینا گوارا کر کے اس نے اپنے اسٹرموڈ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میں نے ادھر ادھر کی ہانکنا شروع کی
تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"میں اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جاؤں گی۔"

"کب؟"

"اگلے سال"

"پھر"

"پھر یہیں آکر پریکٹس کروں گی"

"خوب دولت کماؤ گی!"

"خدمت خلق کروں گی ــــ"

"پریکٹس شہر کے کس حصہ میں کرو گی؟"

"یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا"

"پریکٹس وہیں کرنا جہاں تمہارے والد نے تمہارے لیے چار کنال زمین لے رکھی ہے۔ تمہارے آنے تک وہاں ایک بہت اعلیٰ کالونی آباد ہو چکی ہوگی"

میرے اس فقرے پر ڈاکٹر تیوراسی گئی "کہاں ہے وہ چار کنال زمین؟ آپ کو کیسے علم ہوا اس بات کا؟"

"چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتلائیے کہ اپنی زمین میں سے مجھے ایک کنال زمین دو گی؟"

ڈاکٹر کے چہرے پر پہلی بار میں نے اتار چڑھاؤ دیکھا۔ وہ کسمساسی گئی اس کے لب ہلے مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ اس نے ایک دم جانے کا فیصلہ کیا اور چند لمحوں میں وہ میرے کمرے سے باہر تھی۔

اس کی پہیلی کا معاملہ اُلجھ جانے کے دو تین ماہ تک اُس سے کوئی ملاقات نہ ہوئی اور نہ اس کا فون آیا۔ میں اُس سے قریب قریب مایوس ہو چکا تھا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور ایک صبح ہسپتال جا نکلا۔ وہ راؤنڈ پر تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔ نرس کو کہا "تم چلو میں آتی ہوں" نرس آگے نکل گئی۔

"السلام علیکم"

"وعلیکم السلام۔ کیسے آنا ہوا؟"

"یونہی"

"کیوں وقت ضائع کیا آپ نے؟"

"بس آپ سے دو منٹ بات کرنا تھی"

"مجھے فرصت نہیں ہے"

"کیا اور کسی وقت آسکتا ہوں؟"

"کل"

"کس وقت؟"

"ساڑھے پانچ بجے شام"

"کہاں ؟"

"میرے کمرے میں۔"

"آپ کا کمرہ کہاں ہے ؟"

ڈاکٹر نے سمجھا دیا۔

"مجھے دستک دینا ہو گی ؟"

"دروازہ کھلا ہو گا۔ ہلکی سی دستک دے کر اندر آ جائیے گا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے اپنے کمرے کی نشاندہی کی تھی ـــــ اُس سے خلوت میں ملنے کی امید نے میرا سکون قلب لوٹ لیا۔ دوسرے دن ساڑھے پانچ بجے سہ پہر تک میں بہت ہیجان میں رہا۔

دوسری سہ پہر میں اُس کے کمرے میں داخل ہوا تو اُسے آرام کرسی پر سوتے ہوئے پایا۔ شاید تھکن کے مارے اُس کی آنکھ لگ گئی تھی میں چند منٹ اُسے دیکھا کیا۔ اُس کے بالوں کی ایک لٹ رخسار پر کنڈلی مارے ہوئے تھی مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے جذبات سے مجبور ہو کر جھکا اور اُس کے داہنے رخسار کو ہلکے سے چوم لیا۔

ایک طوفان اُمنڈ پڑا۔ وہ تڑپ کر اُٹھی۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ دروازہ اندر سے بھیڑا اور مجھ پر برس پڑی۔

اُس نے دوسری مرتبہ مجھ سے اتنی طویل بات کی جو نہایت ہی تلخ تھی۔

"آپ کو جرأت کیسے ہوئی ؟ آپ نہایت ذلیل ہیں۔ میری غفلت سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آئی ؟ آپ نے کمینگی کی ہے آپ کی بیٹی کے ساتھ ایسی ہی حرکت ہوتی تو آپ کا ردِ عمل کیا ہو گا ؟ میرے والدین نے مجھ پر اعتماد کر کے یہاں بھیجا ہے۔ اگر میں اُن کا اعتماد کھو بیٹھوں تو مجھ پر ہزار لعنت۔ کاش آپ کی اس حرکت سے پہلے مجھے موت آ گئی ہوتی !! میں آپ کی صورت سے بیزار ہوں۔ نکل جائیے میرے کمرے سے۔ خبردار جو کبھی ادھر کا رُخ کیا ـــــ"

ایک ہی سانس میں وہ نہ جانے کیا کیا کہہ گئی اور اگر میں اُس کے کمرے سے نکل نہ جاتا تو نہ جانے وہ اور کیا کچھ کہتی۔

ایک اُبھرتی ہوئی حسین عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ ایک دلکش غزل بڑے المناک اور تلخ مقطع پر ختم ہوئی۔

اِس المیے کو دو ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ مجھے اچانک تبادلے کا حکم ملا ـــــ انہی دنوں میرا ایک دوست گردے کے درد میں مبتلا ہو کر اسی ہسپتال میں داخل ہوا۔ میں لیک جھپک اس کی عیادت کر جاتا اور اسی طرح ہسپتال سے باہر نکل آتا کہ کہیں ڈاکٹر دیکھ نہ پائے اور سب کے سامنے مجھ پر برس نہ پڑے۔

ایک صبح کیا دیکھتا ہوں کہ بڑا ڈاکٹر اسے لئے میرے بیمار دوست کے کمرے میں داخل ہوا۔ سخت سردی کے باوجود میری پیشانی پر پسینہ آ گیا۔

ڈاکٹر سعدی نے مجھے دیکھا اور فوراً اپنے سینیئر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ سینیئر ڈاکٹر نے میرے دوست کا معائنہ کیا، چارٹ دیکھا اور سعدی کو کچھ ہدایات دیں۔ میں اس دوران ٹہل کر کمرے کے ایک کونے کی طرف سرک گیا تھا۔

بڑے ڈاکٹر نے میرے دوست کو تسلی دی اور چلے گئے۔ سعدی اُن کے پیچھے تھی۔ اضطراب کی سی کیفیت میں میں بھی کمرے سے باہر نکلا اور سعدی کے پیچھے چلنے لگا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا اور ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ ڈر کے مارے میرا کلیجہ منہ کو آ گیا اور میں ٹھہرنے کی بجائے اُس سے آگے نکل گیا۔

اُس نے مجھے آواز دی ـــــ میں گویا کانپ گیا۔

ے نواز دیکھ کر وہ بولی" یہ آپ کے کون ہیں ؟"

ے دوست ہیں"

ت کافی خراب تھی۔ اب اللہ کے فضل سے بہت بہتر ہے ۔

ں جان میں جان آئی ہمت کرکے کہا" ڈاکٹر صاحب میرا تبادلہ ہو گیا ہے ۔

ے"

نے اپنے تبادلے کا حکم نکال کر دکھایا اور اُس نے اُسے پڑھنا بھی گوارا کر لیا۔ کاغذ واپس کرتے ہوئے اُس نے کہا" یہ نہیں ہو سکتا یہ نہیں ہو سکتا۔

ں گے"

سناٹے میں آ گیا۔

تو شاید پرسوں روانہ بھی ہو جاؤں"

"

ں ۔۔۔ اور آپ ناراض بھی تو ہیں۔

ی باتیں نہ کیجیے" پھر ایک لمحہ رک کر بولی" تو گویا آپ جا رہے ہیں ؟"

میں یقینی طور پر"

خدا حافظ!"

وا سلام علیکم کہہ کے تیزی سے آگے نکل گئی۔ میں اُس کے پیچھے دوڑا اور اُسے ٹھہرایا" کیا میں آپ کو خط لکھ سکتا ہوں ؟"

میں"

!"

یا؟"

سے سوائے" کچھ نہیں۔ کچھ نہیں" کے کچھ بھی تو نہ کہا گیا اور وہ پھر اسلام علیکم کا طمانچہ مار کر آگے چل دی۔

یہ کیسی لڑکی ہے؟" یہ سوچتا ہوا میں منہ لٹکائے اپنے دوست کے کمرے میں آ بیٹھا مگر جی نہ لگا اور گھر چل دیا۔

چار برس بعد ڈاکٹر سعدی کے شہر میں پھر میرا تبادلہ ہو گیا۔ ٹرانسفر سے چھ ماہ پیشتر میری بیوی مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئی تھی اور میں

ی تلاش میں تھا جس کے بڑے میں ہمدرد اور غمگسار سمجھتا ہوں کہ میں جب گھر سے باہر ہوں یا دورہ پر ہوں تو وہ میرے تین بچوں کی دیکھ

شہر میں میرے کوئی رشتہ دار نہ تھے جو اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے۔

عدی کے شہر میں آ کر دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا ملی اور وہ پھر سے دہکنے لگیں۔ ان چار برسوں میں میرا اُس سے مکمل قطع تعلق رہا۔ وہ نہ جانے

انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہو۔ ممکن ہے اُس کی شادی ہو گئی۔ اسی قسم کے خیالات ذہن میں آتے رہے۔

روز شام کو مکان کی تلاش میں نکلتا اور ناکام لوٹتا۔ ایک پراپرٹی ایجنٹ کی زبانی معلوم ہوا کہ گلشن مارکاولی میں ایک صوفیانہ کوٹھی نما مکان خالی

ں نہایت نیک انسان ہیں۔ چنانچہ میں ان کا پتہ پوچھ کر اُس طرف روانہ ہوا۔

گلبرگ کالونی میرے لئے کوئی نیا نام نہ تھا۔ اسی کالونی میں ڈاکٹر سعدی کا چار کنال کا پلاٹ تھا جو اُس کے والد نے اس کے لئے برسوں پہلے خرید لیا تھا۔ ڈاکٹر سعدی کا اسی کالونی میں اپنا کلینک کھولنے کا پروگرام تھا یعنی نئے مکان کے ساتھ ہی کلینک بھی۔

دفورِ اشتیاق سے کار خود بخود تیز چلنے لگی۔ کالونی میں داخل ہوتے ہی مجھے سڑک کے ایک کنارے ایک ضعیفہ ایک نوجوان عورت کے ساتھ بیٹھی نظر آئی دونوں نہایت غریب لگتے تھے۔ میری کار آگے نکل چکی تھی۔ چنانچہ میں پیچھے آیا اور انھیں "لفٹ" لینے کو کہا تو وہ دونوں حیران ہو گئیں۔ ضعیفہ بولی "بیٹا یہاں سے کئی موٹریں نکل گئیں کسی کو ہم پر ترس نہ آیا۔ یہ میری بیٹی ہے۔ بڑی بیمار ہے۔ چلا تک نہیں جاتا۔"

وہ دونوں کار میں بیٹھ گئیں تو میں نے اُن سے اُن کی منزل پوچھی، بڑھیا نے کہا "ہمیں ڈاکٹر سعدی کے ہسپتال جانا ہے"

خوشی سے میرا چہرہ تمتما اُٹھا۔

"مگر مجھے معلوم نہیں کہ اُن کا ہسپتال کہاں ہے"

"میں بتلاتی ہوں۔ آپ سیدھے چلیں اور پھر دائیں کو مڑ جائیں۔ پہلی ہی کوٹھی میں اُن کا ہسپتال ہے۔"

اور میں چند منٹوں میں منزل پر پہنچ گیا۔

راستے میں ضعیفہ سے میں نے ڈاکٹر سعدی کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی "نہایت رحمدل ڈاکٹر ہے۔ غریبوں سے فیس نہیں لیتی بلکہ اپنی جیب سے امداد کرتی ہے۔ اُس کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے۔ امیر غریب سب سے ہنس کر بات کرتی ہے۔ اُس کی مسکراہٹ سے ہی آدھا مرض دور ہو جاتا ہے"

اور مجھے اُس کی مسکراہٹ یاد آ گئی جس نے مجھے اُس کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔

ابھی ضعیفہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ مجھے ایک سادہ سی کوٹھی کے سامنے ایک بڑا سا بورڈ نظر آیا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

"ڈاکٹر سعدی کا کلینک"

میں نے کوٹھی میں کار ٹھہرائی اور دونوں خواتین اُتر گئیں۔ بڑھیا نے مجھے دعائیں دیں اور اپنی بیٹی کو کمر سے تھامے برآمدے کی طرف جانے لگی۔ برآمدہ مریض عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ عورتیں سامنے والے لان میں بھی تھیں   میں نے دو منٹ کوٹھی کا جائزہ لیا اور پھر وہاں سے نکل آیا۔ کہ پراپرٹی ایجنٹ کا بتلایا ہوا مکان ڈھونڈوں   حسنِ اتفاق سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر مجھے وہ مکان مل گیا۔ برابر والی کوٹھی مالک مکان کی تھی۔ اُن سے ملا اور ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر مکان حاصل کر لیا۔ دوسرے دن میں اُس مکان میں منتقل ہو گیا۔

ڈاکٹر سعدی میرے مکان سے لگ بھگ ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ پڑوس واقعی اچھا تھا اور مالک مکان نہایت مشفق اور ہمدرد۔ میرے بچوں کا اُن کے ہاں آنا جانا ہو گیا اور وہ نئے ماحول میں گھل مل گئے۔

مگر میرا اطمینانِ قلب چھن چکا تھا۔ کئی دن اسی الجھن میں رہا کہ ڈاکٹر کے ہاں حاضری دوں یا نہیں۔ نہ جانے وہ کیسے ملے؟ چار سال بعد تو وہ بالکل اجنبی ہو گئی ہو گی۔

آخر ایک سہ پہر جی کڑا کر کے میں اُس کی طرف چل دیا اس خیال سے کہ شام کو مریضوں کی یورش کم ہو گی اور شاید ملاقات کا موقع مل جائے خنک سہ پہر تھی۔ یہی پانچ ساڑھے پانچ کا وقت ہو گا

وہاں عورتوں کی وہی بھیڑ بھاڑ پائی۔ ایک نرس باہر آئی تو اسے میں نے اپنا کارڈ تھما دیا ـــــ پوچھنے لگی "کیا کوئی مریض ساتھ لائے ہیں۔ مرض کی ـــــ نہیں"

ر پھر کیا کام ہے؟"

نہی ملنا ہے"

پہلے سے وقت لے رکھا ہے؟"

ں نہیں"

ر پھر وہ نہیں مل سکتیں۔ بے حد مصروف ہیں"

پ انہیں میرا کارڈ تو دے دیجئے"

ہے سخت ہدایت ہے کہ بغیر کسی خاص کام کے کسی ملاقاتی کو ان سے نہ ملاؤں"

پ میرا کارڈ ان کے سامنے تو رکھ دیجئے"

ے ڈانٹ پڑے گی"

راز مہ ڈانٹ نہیں پڑے گی"

آپ ان کے عزیز ہیں؟

مجھے بے حد عزیز ہیں"

ں نرس غائب ہو گئی اور کہتی کہ برابر کے جالی دار دروازوں والے کمرے سے آواز آئی ۔۔۔"جمیلہ!" اور نرس اندر چلی گئی مجھے یہ آواز جانی پہچانی سی
پہلے نہیں کر سکا۔ نرس فوراً باہر آئی اور مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں اس کے پیچھے برآمدے برآمدے چل پڑا اور اس نے مجھے الگ چھوٹے سے
یا ہر جالی دار دروازوں والے کمرے کے عین مقابل تھا۔ نرس مجھے بٹھا کر چلی گئی۔ اور میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ چار کرسیوں
یک تپائی جس پر صاف ستھرا سفید میز پوش بچھا ہوا تھا۔ کوئی خاص سجاوٹ نہیں تھی۔ کرسیوں کے نیچے ایک معمولی گھر صاف دری تھی اور پردے
ہ۔ تپائی پر چند رسالے پڑے تھے جو سب کے سب ڈاکٹری کے موضوع سے متعلق تھے۔ میں نے وقت کاٹنے کے لئے ایک رسالہ اٹھالیا۔

ری بھر سے باہر تھے۔

بیس منٹ بعد گہرا نیلا پردہ ہلا اور سعدی کمنک سے اندر آگئی۔ سفید لمبا کوٹ، اس پر سٹیتھو سکوپ، چہرے پہ وہی سنجیدگی، کمرے میں
ں اس نے مجھے سلام کیا اور دیر سے آنے کی معافی چاہی، میں نے اٹھ کر اس کا خیر مقدم کیا اور پھر ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔
لمحے سکوت رہا۔ پھر اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ میں نے بھی مشینی انسان کی طرح ہاتھ اٹھالئے۔ اس کے لب ہلتے رہے اور

یا۔

ور بولی "آپ کی اہلیہ کے انتقال کا سن کر مجھے بہت دکھ ہوا تھا"

سناٹے میں آگیا "تو آپ نے میری بیوی کے لئے دعائے مغفرت کی ہے؟"

اموش رہی اور میں حیران کہ اسے میری بیوی کے انتقال کے بارے میں علم کیسے ہوا۔ نہ میری اس سے خط و کتابت رہی، نہ وہ میرے
رکو جانتی ہے، نہ کسی دوست کو۔ بہر حال میں نے اس موضوع پہ اس سے کوئی سوال نہ کیا۔

ری دیکھ بھال کون کر رہا ہے؟"

"کوئی نہیں ـــــ اللہ پر بھروسہ ہے"

"آپ ایک مہینے سے یہاں ہیں۔ ملنے کیوں نہیں آئے؟"

"اول تو میری ہمت ہی نہیں ہوئی، دوسرے مکان کی پریشانی رہی۔"

"اب تو مکان مل گیا ہے نا!"

"جی ہاں"

"اور یہاں قریب ہی نا!"

"جی ہاں"

"بچوں کو میرے ہاں بھیج دیا کریں"

"جی؟"

"جی ہاں، بچوں کو میرے ہاں بھیج دیا کریں۔"

"میری پڑوسی عورتیں بہت نیک ہیں، وہ بہت اچھی طرح دیکھ بھال کر رہی ہیں۔"

"آپ کی مرضی۔ مگر میں بھی تو آپ کے پڑوس میں ہوں۔"

میرا جواب سنے بغیر وہ اُٹھی اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں پیچھے ہو لیا اور وہ مجھے اپنی کوٹھی کے عقب میں لے جا کر کھڑی ہو گئی۔

شام گہری ہو چکی تھی۔ سرد ہوا جسم کے آر پار ہو رہی تھی۔ قریب ہی ایک مسجد سے موذن نے مغرب کی اذان دی۔

وہ اذان ختم ہونے تک خاموش کھڑی رہی۔ دُھندلکے میں اُس نے انگشت شہادت سے اپنی کوٹھی سے ملحقہ خالی قطعہ زمین کی طرف اشارہ کیا اور میری طرف دیکھے بغیر دھیمی آواز میں کہا: "یہ رہی آپ کی ایک کنال زمین ـــ"

میں جیسے منجمد ہو کر رہ گیا اور وہ بڑھتی ہوئی تاریکی میں تحلیل ہو گئی۔

میں فقط ایک سایہ کوٹھی کے برآمدے میں سماتا ہوا دیکھ سکا۔

اس مرتبہ اس نے جاتے ہوئے سلام بھی نہ کیا۔

نگہت مرزا

دریافت

لا زینہ!

ں نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے اور پان کی پیک داہنے ہاتھ کی دیوار پر پھینکی جو پرانے سرخ دھبوں کے ساتھ اس میلے زرد کپڑے کے بارڈر
، بھی کسی زمانے میں دلہن کی مہریں لگی ہوں۔ پہلا زینہ اور یہ پیک! ــــ تم گویا یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تمہیں اس گھر سے نفرت ہے۔ تم اس کے
معے سے دیکھتے ہو تم یہ پرانی بوسیدہ سیڑھیاں توڑ دینا چاہتے ہو اور اس ماحول سے بھاگ جانا چاہتے ہو۔

سرا زینہ!

رے پر دوسرا زینہ میں ہوں۔ آنکھیں بند کر کے لمحہ بھر کو وہ ہونٹوں کو ہتھیلیوں سے سہلاتا۔ تم سب کچھ پیچھے چھوڑ آئے بھائی میرے۔ اب تمہارے اور اس
نیا کے درمیان پردہ حائل ہو چکا ہے۔ (ٹاٹ کا پردہ جسے ہٹا کر وہ پہلے زینے پر قدم دھرتا ہے) اب تمہیں رات بھر اس جہنم میں جلنا ہو گا حتیٰ کہ صبح ہو گی
ں کو روندتے خوش خوش نیچے اتر و گے اور جاؤ گے کہ ایک اور دن تمہیں زندہ رہنے کے لئے مل گیا۔

را زینہ!

لے کے اوپر سے اس کے بھاری قدموں کی چاپ پر نعمت درجن کے لگ بھگ کالے بھجنگ بچوں کی قطار سے اوپر جھانکتی ــــ یا وحشت زدہ
ے سکوڑتا ــــ اور پھر سر جھکائے اوپر چڑھتا جاتا ــــ سمجھوتا۔ تیسرا زینہ ایک سمجھوتا تھا۔ تین زینے ــــ وہ صرف تین زینوں سے آشنا تھا ــــ
! تھا ــــ صرف سمجھوتا ــــ ایک اور رات کے لئے ــــ کون جانے رات کا عذاب کب ختم ہو

وہ حسب معمول باورچی خانے میں ہنڈیا کی جلتی باس سے اوپر اپڑوسن سے گفتگو ــــ اوہ! جی کیسا میلا ہو گیا۔ پیچھے چھوٹ گیا خسرو پرویز۔
ہوٹ گیا۔ اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے اور اپنی تازہ ترین غزل کا مطلع اونچے سروں میں گنگنانے لگا۔ باورچی خانے میں بیٹھی
ہر شام پہلے قدم پر کیسی اجنبی سی لگتی۔ اس کا جی چاہتا چپکے سے اس کے قریب جا کر پوچھے ــــ تم کون ہو، یہاں کس لئے آئی ہو، کیا ایکدم
ندلا جاتا۔ اور وہ ڈیسک پر جھکی ہر لمحہ اپنے بالوں کو ہاتھ کی جنبش سے پیچھے ڈالتی اور گاہے گاہے معصومیت سے آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف
ــ وہ سر جھٹکتا ــــ نہیں ــــ اور اندر اپنے کمرے میں چلا آتا ــــ بچے اس کے پیار بھرے لمس کو اس دن سے ترس رہے تھے جب سے
نے باپ کے وجود کا ادراک کیا تھا ــــ بچے بسا اوقات اس کو جی چاہتا سب کو باری باری اپنے پاس بلائے اور سب کا گلا گھونٹ دے۔
ــ شدید آگ بھری ہوئی ہے میرے اندر ــــ میں نہیں جانتا اس آگ کا کیا ہو گا مریم ــــ ایک سہ پہر جانے کس بات پر وہ انتہائی
ماس چمپئی رنگت کی لڑکی سے جھک کر سرگوشی کی اور وہ تعجب سے چہرہ اٹھائے اسے دیکھا کی تھی۔ "مریم! قسم خدا کی تم کس قدر بھولی

ہو کیسی معصوم — اور پھر یکایک وہ اپنے لمحہ بیشتر کے جذباتی پن پر قلقہ لگا کر ہنستا تھا اور مریم نے خود سے کہا تھا

اور اب رات ہے اور میرے ہاتھ کے بستر پر وہ عورت عجیب بے ڈھنگے طریقے پر لیٹی خراٹے لے رہی ہے یہ تمہاری عورت ہے۔ جی چاہتا ہے اسے کھڑکی سے اٹھا کر نیچے پھینک دوں یا خود کہیں بھاگ جاؤں کہیں دور جہاں اس کا بے ہنگم وجود نہ ہو جہاں اس کے تیز گرجتے خراٹے نہ ہوں وہ دوزخ میں جل رہا ہوں — یہ کیسی آگ ہے جس کو سوا میرے کوئی نہیں جانتا — پھر جونہی دن سیاہی مائل ہوتا تو اس کے قدم مختلف سڑکوں اور گلیوں سے ہوتے بازار کی طرف مڑتے۔ وہاں کیفے ایران میں وہ انتہائی کونے کی میز پر بیٹھا لاپروائی سے سگرٹ پئے جاتا اور سر اٹھا کر سر پر لٹکتے ہوئے قمقموں کو دیکھتا۔ تب اس کی آنکھوں میں ایک انجانا سا دکھ ابھر آتا — خسرو پرویز تم کون ہو کس لئے تمہیں وجود کے جہنم میں جھونکا گیا ہے؟ تمہیں کونسا اہم مقصد ادا کرنا ہے "مریم — اپنے وجود کا دکھ — کیا تمہیں کبھی ایسے دکھ نے آگھیرا ہے جب تمہیں اپنے وجود سے وحشت ہوتی ہے؟ تم اپنے خول کو توڑ دینا چاہتی ہو۔" — "مگر نہیں مریم! تم تو بہت بھولی ہو تمہیں ایسی باتوں کا کیا علم —" اور مریم بسا اوقات اس کی لایعنی باتوں پر خوفزدہ ہو کر وہ بچکانہ انداز میں ہنس پڑتا۔

— اور مریم کوئی اور راہ نہ پاکر اس کی ہنسی میں شریک ہو جاتی (اور رات مریم اپنی روم میٹ سے کہتی "تجھے کیا بتاؤں وہ شخص کیسی باتیں کرتا ہے۔ ایسی باتیں کہ جن کا نہ پہلا سرا میرے سامنے آتا ہے نہ آخری۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس کی باتوں کے درمیان سے آئی ہوں اور وہ پہلے بھی باتیں کر رہا تھا اور میرے جانے کے بعد بھی کرتا رہے گا")

رات — اس عورت کے خراٹوں سے جہنم بنی ہوئی۔ کمرہ اس عورت کے ٹھوس وجود سے گھٹا ہوا۔ اس عورت کے کپڑوں کی بساند — میں اکثر اس کی نیند کھل جاتی۔ وہ بستر سے اٹھ کر سرہانے کی طرف کھڑکی میں جا کر کھڑا ہوتا۔ چوڑی سڑک خموشی سے رات کا بوجھ اٹھائے۔ سڑکوں کے سانحے سے بھینچے ہوئے ہونٹوں کی مانند بند۔ ان کے اوپر مکان تاریکی کے بکل مارے — وہ مہیب رنگت اس اندھیرے میں کیسی رنگت اختیار کرتی ہو سنہرے بال تکیئے پر بکھرے کیسے لگتے ہوں گے۔ وہ گلابی اودھ کھلے ہونٹ — خسرو پرویز — اس کے اندر عجیب سا جذبہ ابھر آتا۔ میں کچھ کرنا چاہتا کھلے آسمان کے خدا! میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔

اور کبھی جو یوں ہو کہ چپ چاپ بیٹھے تم اپنے آپ سے الگ ہو جاؤ اور ایک اور وجود کا روپ دھار لو اور پھر سامنے بیٹھ کر قطعی اجنبیت اور سے اس پہلے وجود کو دیکھو اور پوچھو تم کون ہو — مگر میں وہ تو ہرگز نہیں جسے میں روزانہ صبح شیو بنانے یا کالج جانے سے قبل دیکھتا ہوں — کیا واقعی ہوں؟ آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے وہ اکثر لاشعوری طور پر اپنی انگلی سے اس عکس کو چھونے کی کوشش کرتا — کہیں وہی میں تو نہیں! یہ سارا چکر اس کا جی چاہتا سب کچھ ختم ہو جائے "وہ آنکھیں بند کیسے اور چاہنے کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ مگر یہ صرف برس بھر ہی کی تو بات تھی۔ وہ لمحہ — وہ دریا "شبلی! — تیم جناب امیر کی۔ میں اس لمحے میں زندہ ہوں —" اس نے بند آنکھوں، برس پہلے ادم میں بیٹھ کر شبلی اپنے واحد دوست سے سرگوشی اور بات ساری یہ تھی کہ اس دوپہر جب وہ کلاس لینے بیٹھا تھا اور حسب عادت فائل کھول کر نوٹس لکھوانے شروع کئے تھے تو وہاں سب سے پیچھے ان سیاہ آنکھوں نے جکڑ دیا۔ وہ چمکتی سیاہ آنکھیں اس کی آنکھوں میں تیرتی رہیں — شبلی! — میں اگر کچھ لمحے دیکھتا رہتا تو یقیناً — یقیناً شبلی میں — ہو جاتا — اور یہی بات تھی کہ اس سیاہ آنکھوں اور مہیب رنگت والی بھولی بھالی لڑکی نے اسے عجیب پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔

رات کی سیاہی نیلگوں دھند کے ساتھ مل کر انتہائی پراسرار رنگت اختیار کرتی ایسے میں کیفے ایران میں بیٹھے سبھی لوگ اپنے اپنے معاشقوں

یادگار بھی تھے اور وقت کا مسئلہ بھی ہے کے بیٹھے جاک کیا کرتے۔ خسرو پرویز سگریٹ منہ میں دبائے چھت کے نقشوں کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا۔ پہلا زینہ اوپل مرلو
... اس گھر کو آگ لگا دوں گا۔ میں اس گھر کا وجود ختم کر دوں گا ــــ مریم! میں بھی چاہتا ہوں تمہاری باتیں کریں۔ اپنے داہنے ہاتھ بیٹھے ان خوش باش لوگوں سے
باتیں کریں ــــ سنو تم مریم سے ناواقف ہو گئے ــــ مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ نصف درجن بچوں کا گھ ، میرے ماتھے پر لکھا جا چکا ہے۔ اس عورت کے بخت
تاریکی نے میرا وجود دھندلا دیا ہے ــــ میں مر چکا ہوں ــــ ایسے میں وہ ادھر ادھر کے لوگوں سے کاغذ قلم مانگنے لگتا کہ اس کا اپنا تو ایک لمبے سے رومال
... مد دستے تمھے کے سگریٹ کی ڈبیا اور دو چار تمباکو بھرے پان کے سوا کچھ نہ ہوتا اور کاغذ قلم ہتیا ہوتے ہی وہ میز پر جھک کر آڑے ترچھے حروف میں نظم
ا ــــ مدیر لمحہ ــــ تم بھلا اسے کیا سمجھو گے شبلی! ــــ یہ لمحے کی کرامات ہوتی ہے۔ تم چپ چاپ بیٹھے ہو اور تمہارا ذہن آپ ہی آپ دیکھنے سننے میں مشغول ہے۔
... تم محسوس کرتے ہو تم نے ذہن کی ہنڈکلیا کو نکاس کا راستہ نہ دکھایا تو تمہارے ذہن کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ تم اگلے ہی لمحے فنا ہو سکتے ہو۔ مگر یہ لمحے
... ات ہے شبلی! تم بھلا اسے کیا سمجھو گے!"

رات ــ جناح کالونی کی اس دوکانوں والی سڑک کی رات لڑکیوں کے ہوسٹل پر چھائی رات سے مختلف ہوتی ہے۔ مریم کام ختم کر کے رکفنی
... کو اپنی معصومیت سے کچھ نہ کچھ کہتی اور پھر لحاف میں ناک ڈبو کر بچوں جیسی معصومیت سے سو جاتی ــــ پھر ایک رات وہ روشنی بجھا کر رابی
... بستر پر جا بیٹھی ــــ "رابی ــــ یہ شخص اتنا پست کیوں ہوتا جا رہا ہے ــــ" اور رابعہ نے لحاف اٹھا کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور کالج اور مریم اور
... ت اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو گئے۔ وجاہت وہ خوش باش اور خوش مزاج لڑکا جو چند ہفتے گزرے سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ میں آیا تھا۔ رابی نے اسے
... سے دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں کو جھٹکا دیا "پگلی کیوں فکر کرتی ہے، دوستی کم نہ کرے اس سے اور بحث کرے ــــ پر اسے کچھ کہنے کی ضرورت
نہ آئی کہ وجاہت پچھلے دن سے بادل ہوا اس کے گرد چکر لگا رہا تھا

پہلا زینہ!

دیوار پر کے بے شمار دھبوں میں ایک اضافہ ــ نفرت ہے، مجھے اس گھر کے چپے چپے سے نفرت ہے، میں اس گھر کو آگ لگا دوں گا۔

دوسرا زینہ!

خسرو پرویز ــــ مریم کئی دن سے نہیں آ رہی۔ وہ کیوں نہیں آ رہی ــــ اگر وہ کل بھی نہیں آئی تو میں اس کے ہوسٹل میں چلا جاؤں گا۔ ــ
مگر ــ مگر میں کچھ کرنا چاہتا ہوں

تیسرا زینہ!

ننگ دھڑنگ بچوں کی قطار ــــ تم سب مر کیوں نہیں جاتے! میں اس گھر کو آگ لگا دوں گا۔

رات ــــ جناح کالونی کی بیزار سی رات ــــ "نغمہ برلب تاکہ اس کی جان کا سناٹا ہو دور" مگر یہاں تو کوئی نغمہ نہیں۔ میرے لب تو نغموں
نا آشنا ہیں۔ میں اس عورت کے جہنم سے کب نکلوں گا ــ مریم ــــ مگر مریم کیوں نہیں آ رہی ــــ نغمہ برلب ــــ مریم ــــ

تم اتنے روز کالج کیوں نہ آئیں ــــ وہ وہاں کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس کے بلانے پر وہ کیسی بھاگی بھاگی آئی تھی ــــ
نہ جاؤں بھائی اپنا پروفیسر ہے ــــ وہ لڑکیوں کے ہنستے ہوئے چہروں پر جملہ پھینک کر بھاگنے کی کرتی ــــ وہ اس روز اس سے کتنی
... کھڑی تھی، ایک قدم کے فاصلے پر ــ میں چاہوں تو اسے چھو سکتا ہوں۔ اس کی چمپئی رنگت پر ہاتھ پھیر کر اس کی ملائمت محسوس کر سکتا ہوں
... ان ہونٹوں کو چومنا چاہتا ہوں (خسرو پرویز!) پھر اس نے ہاتھ بڑھایا اور اسے چھو لیا۔ اس کا نرم ملائم ہاتھ۔ اس چھونے سے گداز ہاتھ کو اس نے

اپنے لبوں سے انتہائی درشت، خالص مردانہ انداز میں رگڑتا ـــــــ "مریم!" اس کے اندر کی معصوم لڑکی نے چلا کر مریم کو متوجہ کیا۔ "یہ ہے مریم! ـــــ کل کی شام اور وجاہت اور سڑک پر تیرتی کار میں آہستہ آہستہ دبے لبوں میں گفتگو ـــ آہستہ خموشی کا طلسم ـــ اور وارفتگی اور دگرگونی را میں وجاہت کی پیار بھری باتیں ـــــ مریم! تو کس قدر کمین عورت ہے۔" پر اس نے اندر کی لڑکی کی بات نہ سنی اور اپنا ہاتھ اس کے رہنے دیا جو انتہائی جذباتی طرح پر اُسے اپنے چہرے پر پھیرے جا رہا تھا ـــــ اور رات گئے مریم سوچتی ـــــ "مریم! ـــ یہ تو کیا کر رہی ہے؟ دو دھاروں کے درمیان پس کر رہ گئی ہے۔ تیرا سانس گھٹتا جا رہا ہے ـــــ فیصلہ کر لے مریم! ابھی سے فیصلہ کر لے ـــــ پھر وہ فیصلہ نہ کر وہ وجاہت کی آرزو کرتی اور اسے دیکھ کر خوش ہوتی پر اس سے ملتے ہی اس میں ایک جھنجلاہٹ سی پیدا ہو جاتی اور وہ خسرو پرویز کی اور خسرو پرویز کو پاتے ہی اس کی جھنجلاہٹ ختم ہو جاتی اور وہ بڑے رسان سے گھنٹوں اس کے پاس بیٹھ سکتی تھی ـــــ پھر خسرو پرویز میں اس کے اندر کی لڑکی اس سے جھگڑنے آ موجود ہوتی۔ اور وہ اس کے جھگڑے اور اس کی ملامت کی تاب نہ لا کر وہاں سے بھی اٹھ اور رات گئے تک سوچتی رہتی ـــــ "مجھے کس کی ضرورت ہے ـــــ کسے میری ضرورت ہے ـــــ" اور دن بھر اِدھر اُدھر بھٹکتی پھرتی میں گزرتی ـــــ پھر خسرو پرویز نے کہ انتہائی جذباتی موڈ میں تھا ایک سہ پہر اس کا ہاتھ اپنے رخسار پر رگڑتے ہوئے بیحد دکھ سے کہا ـــــ "مریم! کچھ نہیں دے سکتا، کچھ نہیں دے سکتا ـــــ پر تو مجھے بہت کچھ دے سکتی ہے مریم ـــــ" مریم کا ہاتھ اس کے رخسار پر کانپا ـــــ "مریم! میں تجھے جس حیثیت سے شامل کرنا چاہتا تھا ـــــ وہ حیثیت ـــــ مریم تب میں فرسٹ ایئر میں تھا جب میرے باپ نے میرے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں مریم کا ہاتھ چھوڑ دیا اور آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا ـــــ "اس لڑکے کا تصور مجھے اب بھی مارے ڈالتا ہے ـــــ وہ معصوم لڑکا پرا جس کے پر کاٹ دیئے گئے ـــــ" پھر ایک دم سے وہ آنکھیں کھول کر کر مریم کی طرف جھک آیا ـــــ "کیا تم یقین کرو گی مریم! کہ میں عورت کی محبت سے میں نہیں جانتا عورت کی محبت کیا ہوتی ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر مریم کے بالوں کو چھوا اور وہ سیاہ چمکتی ہوئی آنکھوں میں ڈوب کر اس نے کہا "گناہ میرے ماتھے پر لکھا جا چکا ہے مریم، میں اس گناہ کو ماتھے پر سجائے جس جگہ گیا سب نے میری طرف سے اپنے چہرے ورلئے ـــــ" اس نے مریم کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ایک بلند قہقہہ لگانے کی کوشش کی ـــــ "اپنے جذباتی پن کا تمسخر ـــــ میں بھی کیا باتیں لے بیٹھا مریم ـــ آؤ کچھ

اس رات اس نے سوچا وہ اپنا سارا پیار، ساری توجہ خسرو پرویز کو دے گی اور دن کا بیشتر حصہ اسی کے ساتھ گزارے گی ـــــ خسرو کو کتنی ضرورت تھی۔ اُسے مریم کی کیسی ضرورت تھی ـــــ اور مریم نے آنے والے بہت سے دن خسرو پرویز کو جی بھر کے توجہ دیتے گزارے۔ وہ اس سے بچوں ایسی باتیں بھی کرتی اور اس کی غزلوں پر تنقیدی بحث بھی ـــــ اس سے جھگڑتی بھی اور اس سے پیار بھی کرتی لیکن ایک ہی ہفتے میں کہ وہ اس کمیں کو زیادہ دیر نہیں نبھا سکتی وہ خسرو پرویز کے پیار کے علاوہ بھی بہت کچھ چاہتی ہے ـــــ وہ ایک گھر بھی چاہتی تھی، ایک مستقل سہارا جس میں اُسے کوئی شک و شبہ نہ ہو، جس کے بارے میں وہ کبھی یہ نہ سوچ سکے کہ اب وہ اپنی عورت کے پاس خوش و خرم بیٹھا ہو گا۔ وہ اپنا اور صرف اپنا تھی جس میں کسی غیر کی شرکت نہ ہو ـــــ اسی خواہش نے اسے وجاہت کی طرف پلٹنے پر مجبور کیا ـــــ یہی وہ دن تھے جب وجاہت نے اسے اپنے ساتھ کے لئے چن لیا۔

اور رات گئے خسرو پرویز کا چہرہ اس کے لحاف میں گھس آتا۔ تب وہ لحاف اُلٹ کر بیٹھ جاتی، مریم کیوں پاگل ہوئی ہے۔ خسرو پرویز دکھی سہی لیکن وہ اپنی منزل پا چکا ہے اور تجھے بھی ایک منزل کی ضرورت ہے۔

کہیں جو ایسا ہو کہ میں خود کو پا جاؤں کیفے ایران میں بیٹھے ہوئے، اس نے بلند آواز میں سوچا اور گنگنانے لگا:

اس جہاں کا وقت جیسے سو گیا ٹھہر گیا
جیسے کوئی ساری آوازوں کو یکسر کھا گیا

وہ بیٹھے ہوئے ایک تنومند پروفیسر نے کہ جن کی ٹانگ کسی حادثے میں خراب ہو گئی تھی، اور جو واضح طور پر لنگڑا کر چلتا تھا اور شہر کا زبردست سکینڈل ہو کر تھا کہ اس طرح اپنے احساس کمتری کو دور رکھتا تھا، دوسرے بانک لگائی ——— میں نے کہا پروفیسر صاحب کہیں آنکھ تو نہیں لڑ گئی ——— سگریٹ خسرو پرویز کے ہونٹوں کی ایک ذرا سی لرزش سے کانپا اور فرش پر آ رہا۔ "لاحول ولا برادرم، جب بھی منہ کھولو گے واہی تباہی نکالو گے ——— کسی مولوی نما پروفیسر نے کہا "کیا تم جانتے نہیں اس کے گھر میں پانچ بچے ہیں —— پانچ بچے ——— تیسرا زینہ ——— تنگ و مردہ تنگ بچے ——— باورچی خانے میں جلتی ہوئی ہنڈیا کی باس ——— میں اس کو آگ لگا دوں گا، مریم ——— مریم ——— تم کہاں ہو مریم ——— آؤ اس گھر کو آگ لگا دیں ——— مریم کہا مجھے یہ حق نہیں ——— مریم! میں کچھ کرنا چاہتا ہوں!
آخر کار اس نے اسے بلا بھیجا اور اس نے انکار نہ کیا۔ چپکے سے پرانے دنوں کی مانند چلی آئی۔ وہ اندر اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھا تھا ——— اس چہرے کی لکیروں میں اضافہ ہو چکا تھا اور کتنے دنوں سے اس کی کلاس میں بھی تو نہ آئی تھی ——— اسے یوں لگا تھا وہ اسے دیکھے گی تو اس شام وجاہت سے کئے ہوئے عہد کو بھول جائے گی

لیکن اب ——— اس نے بلایا تھا اور وہ اپنے قدموں کو روک نہ سکی تھی ——— خسرو پرویز نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا ——— یہ وہ نہ تھی ——— یہ اس کی مریم نہ تھی ——— چہرے پر وہ بھولپن نہ تھا ——— سیاہ آنکھوں میں وہ چمک نہ تھی ——— مریم کہاں ہے؟ اس کا جی چاہا چلا کر کہے ——— مریم کو بلاؤ ——— مجھے مریم کی ضرورت ہے، تمہاری نہیں ——— پھر اس کی نظروں کی حدت سے وہ مصنوعی چہرہ پگھل کر جیسے تحلیل ہو گیا اور اس کی مریم، وہ بھولے معصوم چہرے اور سیاہ چمکتی آنکھوں والی مریم وہاں آ موجود ہوئی ——— "مریم ——— اس نے بہت کچھ کہنا چاہا اور کچھ نہ کہہ سکا اور چپ چاپ اسے دیکھتا اور دیکھتا رہا۔ تب مریم نے بازو موڑ کر وقت دیکھا اور اسے ایک دم سے وقت گذرنے کا احساس ہوا ——— "مریم ——— تم نے مجھے چھوڑ کیوں دیا ہے؟ ——— میں تم سے کچھ نہیں چاہتا ——— صرف دوستی، کیا تم مجھ سے تمام عمر دوستی رکھ سکو گی؟ ——— تم نہیں جانتیں مریم تم میرے لئے کس قدر اہم ——— م ——— یم ——— خدا کے لئے ہاں کہہ دو ——— صرف دوستی مریم ——— میں اور کچھ نہیں چاہوں گا ——— مریم کا جی چاہا اٹھ کر اس کے پاس جائے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہے ——— مگر اس نے سر جھکایا اور ہاتھوں سے کھیلنے لگی کہ یہ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ تب وہ اٹھ کر اس کے پاس آیا اور جھک کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا ——— "مریم، مریم" کے اندر کی لڑکی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ——— اور وہ اٹھ کر دروازے کے قریب جا کھڑی ہوئی ——— "مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے سر" اس نے درشت لہجے میں کہا اور دروازہ کھول کر باہر چلی گئی ——— وہ اپنے من کی نفی کرتی ہوئی چلی گئی اور خسرو پرویز سے دور ہوتی گئی۔

کینٹین کی میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے بوڑھے اور جوان دانشور اعلیٰ پائے کے سکینڈل مونگر تھے۔ ہر لڑکی کے بارے میں اوٹ پٹانگ قسم کی خبریں جنم لیتی اور یہیں پرورش پا کر باہر کی گلیوں میں آوارہ ہوتی ——— اس رات خسرو پرویز مریم کے بھرپور وار سے شکستہ اور نڈھال سست قدموں سے اندر داخل ہوا اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر میز پر سر اوندھا لیا ——— "ہائیں خسرو پرویز یار کیا ہوا؟" قریب کی میز سے ہمدردی کی آواز ابھری مگر وہ ویسے ہی پڑا رہا ——— بولنے کی تمام صلاحیتیں گویا سلب ہو چکی تھیں ——— "چہ چہ خسرو"۔ دور کہیں آواز گونجی ——— "کیا ہوا ——— یہ لڑکیاں دولت کے پیچھے مری جاتی ہیں ——— مگر بات کیا ہے بھئی ——— "یار وہی مریم ——— (خسرو کا کلیجہ پھٹنے لگا) "سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں ایک لونڈا سا آیا ہے۔ سالے کے باپ کا بہت روپیہ ہے ——— دن بھر اسے لئے پھرتا ہے ——— خسرو پرویز کو دفعتاً اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کا جی چاہا ایک جست لگا کر باہر بھاگ نکلے۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر رگڑ کر چہرہ پونچھا اور اپنی طبیعت کی خرابی کا عذر کر کے باہر نکل آیا۔ رات آسمان سے قطرہ قطرہ گر رہی تھی ——— گر رہی تھی اور گہری ہوتی جا رہی تھی ——— بنک کا ہجوم ——— کاروں اور سکوٹروں کا شور ——— اسے یکلخت اپنی گمنامی کا احساس ہوا۔ وجاہت میں جو سفید کاروں کا ہارن ہے اور اسکوں اور کروڑوں کی

باتیں کرتا ہے — وجاہت اور مریم — مریم اور وجاہت — مگر خسرو بھائی سنو تو، تم کس امید پر اُٹھے تھے؟ تمہارے پاس کیا تھا؟ یہ اس نازک کومل سی لڑکی کو تم دکھوں میں پالنا چاہتے تھے کیا؟ — مریم — نغمہ برلب تاکہ اس کی جان کا سناٹا بھر دو — مریم — اندر کیسا تو تھا۔ وہ بشمسا والا دیں باتیں کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنے اندر کے جہنم سے نجات پائے — نغمہ برلب — نغمہ برلب — پر کوئی نغمہ نہیں سوجھتا — مریم —
وہ سڑک سڑک پھرا — یہ گھنٹہ گھر ہے — وہ گھوم پھر کر وہیں آجاتا — یہ گھنٹہ گھر ہے — وہ سر اُٹھا کر گھڑی کو دیکھتا — ساڑھے گیارہ۔ کسی بھرا بازار، کسی کچہری بازار یا کسی جھنگ بازار کی طرف اس کے قدم اُٹھ جاتے — وہ گھوم رہا تھا، بے مقصد بے ارادہ، جیسے اُسے خود کا احساس نہ ہو — جیسے وہ خود اپنے لئے بھی مرچکا ہو —

میں کون خسرو ہے — میں کون ہوں؟ — ایک بجھنے کو ہے خسرو — جیسے کسی بات کا کوئی مفہوم نہیں — ہر شے دھوکا ہے خسرو، ہر بات جھوٹ۔ جئے جاؤ خسرو اور ہر جھوٹ کو نباہتے جاؤ — اور جب اس کا سر خود اپنے ہی خیالات کے بوجھ سے پھٹنے کو ہو گیا تو اس کے قدم کسی پالتو ردغا کی مانند اسے کشاں کشاں جناح کالونی کی جانب کھینچ لائے۔

پہلا زینہ!

اس کے ہونٹ خشک تھے اور بے رنگ تھے اور اس نے تقریباً چار گھنٹوں سے پانی نہ کھایا تھا — جھکا ہوا سر، دکھتا ہوا بدن، بھرا اور بے ترتیب اُلجھے ہوئے بال ہا —

دوسرا زینہ!

وہ سب سراب تھا خسرو پرویز — تم بھلا کاہے کی امید لگائے بیٹھے تھے — بے وقوف — تمہاری پہلی اور آخری پناہ گاہ یہی

تیسرا زینہ!

کہاں ہیں وہ — میرے بچے — زینے اداس ہیں خموش ہیں۔ کوئی ان کے سرے پر کھڑا چلاّ نہیں رہا — ابا آگئے — ابا آگئے

چوتھا زینہ!

پانچواں زینہ!

چھٹا زینہ!

ساتواں زینہ!

آٹھواں زینہ!

نواں زینہ!

دسواں زینہ!

باورچی خانے کا دروازہ بند تھا۔ بچے سو چکے تھے۔ وہ دبے پاؤں اپنے کمرے میں آیا۔ وہ بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اداس اور پریشان اس کی نظر بائیں جانب اٹھی۔ وہاں وہ کھڑا تھا۔ گرد میں اَٹے ہوئے بال۔ خشک بے رنگ ہونٹ۔ سپاٹ آنکھیں — یہ میں ہوں — اُ طمانیت سے سوچا جیسے اسے میں ہی ہونا چاہیئے تھا اور کچھ نہیں — اور وہاں۔ بستر پہ ادا پریشان بیٹھی ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ کا دکھ اس کے چہرے پر لکھا جا چکا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور اس میٹھی ہری صورت کو اپنے بازوؤں میں جکڑ کر اُٹھا لیا۔

قیوم راہی

"چچا میاں — چچا میاں" منّے احسن نے کمرے میں گھستے ہی رٹ لگائی۔

یہ اتوار کی حبس آلود دوپہر تھی اور وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ایک جاسوسی ناول میں کھویا ہوا تھا، احسن کی دخل اندازی نے یہ سارا فسوں آن واحد میں توڑ دیا۔ اس پر ایک خفیف سی جھنجھلاہٹ مسلط ہو گئی۔ کتاب کو ایک ہاتھ میں تھامے اس نے تیکھی نظروں سے احسن کو گھورا جس کے چہرے پر شرارت کے آثار جھلک رہے تھے — دیکھنے میں بیشک احسن کا جسم دبلا پتلا تھا اور وہ کمزور سا لگتا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے ارادوں میں کس قدر مضبوط اور اٹل تھا۔

احسن چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر شاید اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی تو اس نے وہی الفاظ دہرائے "چچا میاں —"

"کیا ہے —؟" اس نے دانت پیسنے کے انداز میں پوچھا۔

احسن نے چند قدم آگے بڑھائے اور مدھم لہجے میں بولا "آپ — آپ کیا کر رہے ہیں چچا میاں؟"

"بین بجا رہا ہوں" اس کی آواز قدرے کرخت ہو گئی "جاؤ باہر کھیلو"

احسن لمحہ بھر کو جیسے کچھ سوچتا رہا۔ پھر کمرے میں سے نکل گیا۔

"دیکھئے چچا میاں، عائشہ میرے لئے کتنی اچھی گڑیا لائی ہے" احسن نے ایک دن اسے نائیلون کی گڑیا دکھاتے ہوئے یہ خوش خبری سنائی تھی۔

سانولے رنگ اور بھدے نقوش والی اس کی ہم عمر سہیلی عائشہ بھی اس سے چپٹی کھڑی تھی۔ عائشہ سامنے والے مکان میں رہتی تھی اور بیشتر اوقات سائے کی طرح احسن کے ساتھ لگی رہتی تھی۔

اس کا سر ہلکی ہلکی ٹیسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا — راستے بھر جیسے وہ انگاروں پر چل کر آیا تھا۔ مختار کو کتنی مدت کے بعد اس نے دیکھا تھا مگر نہایت بے اعتنائی سے وہ اسے نظرانداز کر کے اجنبیوں کی طرح اسکوٹر پر فرار ہو گیا تھا۔ یہ وہی مختار تھا جو مہینے میں کئی کئی بار چکر لگایا کرتا تھا لیکن جب سے وہ ایئر انسپکٹر بنا تھا اور اسکوٹر پر سوار ہوا تھا۔ اس نے جیسے پیدل چلنے والوں کو لفٹ دینی چھوڑ دی تھی — نیچ کہیں کا — اس نے آتے ہی اُس دن کا بلا ہوا رسالہ میز پر رکھ دیا تھا اور اس کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا تھا۔ رسالے کے سرورق پر چھپے ہوئے نقش و نگار بڑے اچھے تھے اور ان میں عجیب کشش پائی جاتی تھی —

احسن نے گڑیا کو پیٹ دیا یا تو سیٹی کی آواز نے سناٹے کا جگر چیر دیا "چچا میاں — گڑیا بول رہی ہے" احسن کے ساتھ عائشہ بھی ہنس پڑی

تھی اس بار بھی اس نے چپ رہ کر ہی احسن کو ٹالنے کی کوشش کی تھی مگر تھی تو جیسے اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

"چچا میاں"

"ہوں"

"آپ نے یہ ...." احسن نے رسالے کا سرورق پکڑ لیا تھا۔

"کیا ہے بھئی" اس نے رسالہ کھینچا۔

پلک جھپکتے ہی سرورق رسالے سے جدا ہو چکا تھا۔ احسن کے ایک ہاتھ میں گڈیا تھی اور دوسرے ہاتھ میں سرورق۔ وہ بھاگنے ہی والا تھا کہ اس نے اٹھ کر سرورق چھین لیا تھا اور گڑیا کو باہر صحن میں پھینک دیا تھا۔ "جانے ـــــ اب ایسی حرکت کی تو ہاتھ توڑ دوں گا ـــــ"

احسن اس اچانک حملے سے ہونچکا رہ گیا تھا۔ عائشہ ڈر کر بھاگی تھی تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہوا صحن میں چلا گیا تھا ـــــ اور پھر اس کے ذہن میں چھوٹے چھوٹے ان گنت پتھروں کا ڈھیر اکٹھا ہونے لگا تھا ـــــ میز پوش پر روشنائی کے دھبے ـــــ کمرے کی دیواروں پر کوئلے سے بنائی ٹیڑھی میڑھی لکیریں ـــــ سفید چادر پر ننھے پاؤں کے مٹیالے نشان ـــــ کاغذوں کے پرزے بکھرے ہوئے ـــــ ضدیں کر کے مچلنا اور رونے کے ساتھ ساتھ مل کر اونچی آوازوں میں گانا اور سیٹیاں بجانا ـــــ پہلو بدل کر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں ـــــ مارے درد کے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔

اور یہ واقعہ ـــــ یہ حادثہ اس وقت ہوا تھا جب وہ صبح کمرے کے فرش پر بیٹھا شیو بنا رہا تھا۔ لکڑی کی گیند گولی کی طرح سنسناتی ہوئی دیوار سے ہوتی ہوئی کیلنڈر پر لگی تھی۔ ساتھ ہی احسن ہوا کے جھونکے کی مانند اندر آیا تھا اور اس کے داہنے بازو سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ سیفٹی ریزر ہاتھ سے چھوٹ کر پیچھے گر گیا تھا ورنہ ـــــ بے قابو ہو کر اس نے احسن کے ایک بھرپور طمانچہ رسید کر دیا تھا۔ "بالکل اندھا ہو گیا ہے! تمہیں کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے ـــــ" صحن میں عائشہ مٹی کی مورتی بن کر رہ گئی تھی۔ اس کے ہونٹ کھلے تھے اور آنکھوں میں ایک بڑا سا سوال تھا۔ احسن بلکتا ہوا تھا تو یہ مورتی بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلی گئی تھی۔

شام کو اس کی بھابی نے انتہائی برہمی کے ساتھ اپنے خاوند سے شکایت کی تھی "دیکھئے آپ شہزاد کو سمجھاتے کیوں نہیں ـــــ آخر بات کی حد بھی کوئی ہونی چاہیئے۔"

"ہوا کیا ہے آخر؟" بڑے بھائی نے حسب عادت مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شہزاد کی یہ بے راہ روی اور لاابالی پن اسی وقت تک ہے جب تک وہ شادی کی زنجیر میں نہیں جکڑا جاتا۔

"ہوتا کیا" بھابی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا "وہی پرانا رونا ہے۔ بات بات پر بچوں کو جھڑکتا ہے۔ جب میرے کسی بچے کو کبھی گود میں نہیں لیا تو ہر وقت ڈانٹنے پھٹکارنے کا کیا حق پہنچتا ہے اس کو؟"

"میں پوچھتا ہوں معاملہ کیا ہے؟"

"معاملہ کیا ہوتا ـــــ صبح احسن کو اس بے دردی سے پیٹا ہے کہ بیچارے کا کئی منٹ تک سانس ہی قابو میں نہیں رہا۔ بچے سب ہی شریر ہوتے ہیں۔ چیزیں بھی خراب کرتے ہیں۔ شور بھی مچاتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان سے ظالمانہ سلوک کیا جائے۔ پیار سے سمجھایا بھی تو جا سکتا ہے۔"

بڑے بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ کا دیپ بجھ گیا تھا اور اس سے جیسے ہلکا ہلکا دھواں اٹھنے لگا تھا۔ اس نے چھوٹے بھائی کو

ارد ں سے دیکھا تھا۔ ان نظروں میں نہ غصہ تھا نہ شکایت تھی۔ وہ تو بس کوئی سوال کر رہی تھیں ـــــ سوال جو بڑا اہم تھا ـــــ سوال
ن کی خاموش صدا سارے کمرے میں گونج رہی تھی۔ اور جس کا جواب شہزاد کو زبان کی جنبشوں سے دینا تھا۔
"سنگدلی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے" بھابی نے دونوں بھائیوں کی خاموشی سے فائدہ اٹھایا تھا "ان بچوں نے بھلا کیا بگاڑا ہے ـــــ ہر وقت
سوچا رہتا ہے ـــــ ہر وقت مزاج کا پارہ چڑھا ہوا ہی ملتا ہے۔"
وہ گم سم بیٹھا تھا گویا اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو جیسے وہ یہاں موجود ہی نہ ہو ـــــ پھر یکایک وہ اٹھا تھا اور باہر نکل گیا تھا۔

چند ہی منٹ بعد اس نے تصورات کی بجھی ہوئی قندیلیں پھر سے روشن کر لیں۔ بچھڑی ہوئی سطر ملی تو کمرے کے بند کواڑوں پہ دستک لگنے کا
وار دھاکا ہوا۔ اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ نظریں گھمائیں تو سامنے دیوار پر سیاہ لکیریں کیڑے مکوڑوں کی طرح کلبلانے لگیں۔ کتاب کنگھے کے نیچے رکھ کر اس نے
نہ ہاتھ کی کلائی سے پیشانی کو ڈھانپ لیا ـــــ کواڑوں پر ایک اور دھاکا ہوا ـــــ اس کے احساسات پر ایک اور چوٹ لگی۔ پھر صحن میں کھٹ کھٹ
واز کے ساتھ احسن اور عائشہ کے ملے جلے قہقہے بھی شامل ہو گئے۔
کافی دیر تک وہ اسی گرداب میں پھنسا رہا۔ زندگی کے گلشن میں جب بھی اس نے خوش رنگ پھولوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا نکیلے کانٹوں نے اس کے ہاتھ کو
ز دیا تھا پھولوں تک تو اس کا ہاتھ کبھی پہنچ ہی نہ سکا تھا۔ کبھی کبھی تو اس پر ایک عجیب سی سراسیمگی اور بیزاری کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور وہ تمام جھمیلوں سے
نجانے سکون کی تلاش میں باغوں اور کھیتوں کی طرف نکل جاتا تھا۔
شعور سنبھالا تو وہ اس تہہ خانہ میں پہنچ گیا جو ایک خطرناک گروہ کا پوشیدہ مسکن تھا اور جہاں اس وقت ایک بہت ضروری میٹنگ ہونے والی تھی ـــــ مگر وہ صرف
ور ہی پڑھ سکا۔ کشتی نے تھوڑا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ تلاطم برپا ہو گیا اور تند و تیز تھپیڑوں نے اسے پیچھے دھکیل دیا ـــــ احسن کے چھوٹے بھائی کی رون روں کا ریکارڈ
، اس کی بھابی چلائی "ٹھہر جا احسن کے بچے ـــــ ہزار بار کہا ہے کہ اس کا کھلونا مت چھینا کر اسے مت رلایا کر ـــــ لیکن . . . ." لیکن احسن بھلا کہاں ماننے والا
نے بھائی کا کھلونا چھین کر یہ جا وہ جا ـــــ سیدھا عائشہ کے گھر پہنچ کر دم لیا۔
بچے کے بلکنے کی آواز پکے راگ کی طرح طویل ہوتی چلی گئی ـــــ برداشت کی دیوار دھڑام سے نیچے آ گری اس نے بددل ہو کر کتاب الماری میں پھینک دی
کھول کر باہر جھانکنے لگا ـــــ چاروں طرف تپتی ہوئی جھلسا دینے والی دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور ساری بستی پر سکوت طاری تھا۔ پتا پتا ساکت تھا، ذرہ ذرہ
تھا لیکن اندر ـــــ اندر کا راگ اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا۔ وہ روہ کر احسن کی دھاندلی پر کڑھ رہا تھا۔ کھڑکی بند کر کے وہ ٹانگیں لٹکا کر پلنگ پر بیٹھ گیا مگر
زمن کی وہ کھڑکی بدستور کھلی رہی جس پر احسن اچھل کود رہا تھا۔ اس کھڑکی کو بند کرنے پر شاید وہ قادر نہیں تھا۔ یہ امر شاید اس کی دسترس سے باہر تھا ـــــ
س نے کپڑے تبدیل کئے اور گھر سے باہر نکل گیا۔
دوسری ہی شام احسن اور عائشہ کی شگفتوں کی مالا ٹوٹ گئی۔ اس دن بھابی کے کسی عزیز کی شادی تھی اور وہ صبح سویرے ہی بچوں کو لے کر وہاں چلی گئی
، عائشہ بیاہ کر رخصت ہو گئی۔ جاتے ہوئے احسن سے مل بھی نہ سکی تھی۔ اس کے والد کا تبادلہ اچانک ہو گیا تھا۔
خالی خالی گھر میں اسے بڑا اطمینان ملا۔ اس نے کئی ناول اور رسالے پڑھ ڈالے۔ کئی بار احسن کے خیال نے بھی گدگدی کی جیسے وہ آنے ہی والا ہو لیکن
نے سرگوشی کی ہو ـــــ احسن آئے گا تو اب شاید ہنسی کے پٹاخے نہیں چھوٹیں گے۔ دھما چوکڑی نہیں مچے گی ـــــ پھر نشیب و فراز کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ـــــ
س شاید ایسا ہو سکے۔ احسن کوئی نئی ساتھی ڈھونڈ نکالے گا۔ وہ گلی کی کسی لڑکی اور عائشہ لے آئے گا ـــــ لیکن یہ چین عارضی ہی سہی، بہر حال غنیمت ہے ـــــ کچھ
تو اس گھر کے آنگن میں آندھیاں نہیں چلیں گی۔

احسن دو دن بعد گھر واپس آیا تھا۔ وہ اپنی دھن میں مگن تھا۔ باری باری اس نے اپنے تمام کھلونے دیکھ ڈالے تھے۔ اسے کافی دیر تک علم ہی نہ
عائشہ اب کبھی اس کے ساتھ کھیلنے نہیں آئے گی ـــــ عائشہ کو آنے میں زیادہ دیر ہو جاتی تھی تو وہ یا تو خود اس کے گھر چلا جاتا تھا یا باجا بجا کر اس کو بلا لیا کر
اس وقت بھی اس نے باجا اٹھا لیا تھا اور تین پہیوں والی سرخ رنگ کی سائیکل پر بیٹھ کر اپنے پھیپھڑوں کا زور باجے پر آزمانے لگا تھا۔

احسن کی ماں ان تمام حرکتوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ اسے سب باتوں کا اندازہ تھا۔ وہ احسن کی
سے واقف تھی۔ اسے یوں لگا جیسے باجے میں سے "عائشہ آؤ ـــــ عائشہ آؤ" کی صدائیں نکل رہی ہوں۔ وہ رنجیدہ سی ہو گئی۔

احسن سائیکل چلاتے چلاتے اور باجا بجاتے بجاتے ہانپنے لگا تھا۔ اس نے سائیکل پر بیٹھے ہی بیٹھے اپنی سانسوں کو درست کیا، باجے کو نیکر کی
جیب میں چھپایا اور سائیکل سے اتر کر صدر دروازے کی طرف چلا گیا۔ اس کی ماں نے فوراً ہی اسے پکڑ لیا "کہاں جا رہے ہو بیٹے؟"

"عائشہ کے پاس"

"وہ" ماں احسن کے نزدیک ہی بیٹھ گئی "وہ تو چلی گئی۔"

"کہاں امی؟"

"سیالکوٹ ـــــ یہاں سے بہت دور" اس نے بیٹھے بیٹھے احسن کو گود میں اٹھا لیا۔

"کیوں چلی گئی امی؟"

"اس کے ابو جو چلے گئے"

"کب آئے گی وہ؟"

"اب وہ کبھی نہیں آئے گی بیٹے"

"نہیں امی" احسن مچلنے لگا "میں عائشہ کو بلاؤں گا۔"

احسن کی ماں نے کواڑ کھول کر سامنے اشارہ کیا "وہ دیکھو ـــــ دروازہ بند ہے اور کتنا بڑا تالا لگا ہوا ہے اس میں"

احسن ایک دم چپ سادھ لی۔ اسے شاید اپنی ماں کی بات پر یقین آ گیا تھا۔ اس کی ماں اسے لے کر کمرے میں آ گئی۔ پھر اس نے احسن کو طرح
طرح کی باتوں سے اس کا دھیان بٹانے لگی۔

یہ بڑا ہی بے رنگ سا دن تھا۔ صبح ہی سے لو کے جھونکے سرسرا رہے تھے۔ سہ پہر ہونے کو آئی تھی لیکن گرم ہواؤں کا زور کم نہیں ہوا تھا۔

وہ جب گھر میں داخل ہوا تو پسینے میں شرابور تھا۔ چپل اور پاؤں خاک آلود تھے، کپڑوں پر بے شمار شکنیں تھیں اور سر کے بال پریشان تھے ـــــ نیچی نظ
سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا ـــــ اب تو نہا کر ہی طبیعت کچھ بحال ہوگی ـــــ اس نے خود کو پلنگ پر گرا دیا ـــــ اس کی سوچوں نے اسے پھر دفتر میں پہنچا دیا اور پھر
خیال اس کے لوٹ کر گھر آنے لگے۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ کھانے کی چھٹی کے بعد دیر سے دفتر پہنچا تھا۔ اس پر نوبت نوٹس تک پہنچ گئی تھی ـــــ کام مشین
سخت پابندیاں بھگتو ـــــ رہو اور معاوضہ بس ـــــ اونہہ ـــــ نئی ملازمت کے لئے کتنے ہاتھ پیر مارے تھے اس نے ـــــ لیکن مقدر کا کیا کیا جائے ـــــ!

"عائشہ چلی گئی چچا میاں"

اسے علم ہی نہ ہو سکا کہ کب احسن داخل ہوا اور کب اس کے پلنگ کی پٹی سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"تو میں کیا کروں؟" وہ اٹھا اور کھونٹی پر سے پاجامہ لے کر غسل خانے میں چلا گیا۔ اس نے احسن کو ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

احسن جو اپنے چچا کی ہمدردیاں حاصل کرنے آیا تھا خالی ہاتھ لوٹ گیا تھا۔

جب وہ نہا رہا تھا تو اس نے اپنی بھابی کی آواز سنی تھی "بیٹے تو کیوں گیا تھا وہاں ـــــ وہ انسان تھوڑی ہے ـــــ وہ تو پتھر ہے ـــــ پتھر" ـــــ
کے جبڑوں میں تناؤ پیدا ہو گیا تھا اور گردن اکڑ سی گئی تھی ـــــ بھابی کی آواز کا شیشہ پتھر سے ٹکرا کر کرچی کرچی ہو گیا تھا۔

احسن کی تمام چالاکیاں سرد پڑ گئی نہیں ـــــ وہ سہما سہما سا رہنے لگا تھا۔ کبھی وہ صحن اور کمروں میں بے مقصد گھومنے لگتا تو کبھی اپنے کھلونے بکھیر کر
انہیں اُلٹ پلٹ کرنے لگتا ـــــ گھر کا ماحول یکسر بدل گیا تھا۔ اب نہ نت نئی شرارتوں کی یورش تھی اور نہ احسن کی اوٹ پٹانگ باتوں کا کھٹکا تھا۔ فضا میں ایک
سا پیدا ہو گیا تھا اور یہ ٹھہراؤ اس کے لئے تسکین کا پیغام بن کر آیا تھا۔ وہ گھر میں بڑا سکون محسوس کرنے لگا تھا۔
عائشہ کو گئے یہ پانچواں دن تھا۔

اس دن اس زور کی آندھی چلی کہ سارا شہر گرد و غبار میں اَٹ گیا ـــــ فرم کے مالک نے اسے اپنے ایئر کنڈیشنڈ آفس میں بلا کر چند نوٹ اس کی طرف
بڑھائے تھے، ساتھ ہی یہ جانکاہ خبر بھی سنائی تھی کہ آج سے فرم کو اس کی ضرورت نہیں رہی۔
جب وہ دفتر سے باہر نکلا تھا تو چیختی چلاتی ہوائیں پاگل ہو رہی تھیں۔ درخت ہچکولے کھا رہے تھے، سڑک ویران تھی اور بازار کی گہما گہمی ماند پڑ چکی
ـــــ بار بار ریتلی مٹی اس کی آنکھوں میں گھس کر اس کو رُلا رہی تھی ـــــ بار بار بالوں کی لٹیں اس کے ماتھے پر گر رہی تھیں ـــــ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے
چلا جا رہا تھا گویا وہ خود نہیں چل رہا تھا، بلکہ ہوائیں اُسے دھکیل رہی تھیں ـــــ اچانک اسے یوں لگا جیسے یہ سارا شہر غیر آباد ہو گیا ہو ـــــ ساری کائنات اُجڑ گئی ہو ـــــ
کافی دیر بعد جب ہواؤں نے ریلوں کی یلغار تھمی اور وہ اپنی گلی کے نکڑ پر پہنچا تو ٹھٹھک سا گیا۔ احسن خالی مکان کے دروازے کے ساتھ لگا کھڑا تھا ـــــ یہ
وقت اکیلا یہاں کیا کر رہا ہے ـــــ کیا پھر کوئلوں سے مصوری کا شوق چرایا ہے اسے ـــــ! پھر وہ خواب میں چلتا ہوا احسن کے نزدیک پہنچ گیا۔
مکانوں کے عقب میں آسمان پر آگ لگی ہوئی تھی ـــــ اس نے دیکھا احسن کے ہاتھ میں کوئلے کی بجائے نائیلون کی گڑیا تھی ـــــ اور وہ کبھی گڑیا کو اور
خالی گھر کے در و دیوار کو تک رہا تھا ـــــ اس کے جسم میں ایک تیز سی درد دوڑ گئی اور سانسوں کا زیر و بم تیز ہو گیا ـــــ وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ احسن بھی
سنجیدہ ہو سکتا ہے۔ احسن تو اس کے لئے محض ضدوں اور شرارتوں کی علامت بن کر رہ گیا تھا پتہ نہیں آج وہ نٹ کھٹ شریر احسن کہاں روپوش ہو گیا تھا ـــــ
یاد اسے اس دروازے تک کھینچ لائی تھی ـــــ عائشہ جو ہمیشہ کے لئے اس سے بچھڑ گئی تھی ـــــ اور یہ غم کی ایک مکمل تصویر تھی ـــــ دکھ کا ایک اٹوٹ منظر تھا
یوں لگا جیسے آج احسن اس بھری دھرتی پر تنہا رہ گیا ہو ـــــ آج وہ خود بھی تو بے سہارا ہو گیا تھا ـــــ آج وہ خود بھی تو ایک بھاری بوجھ اٹھائے اکیلا گھوم رہا تھا
گڑیا پر نظر پڑی تو دفعتاً ایک خیال اس کے جگر میں نشتر بن کر پیوست ہو گیا ـــــ میں نے تو اسے کبھی کوئی کھلونا لا کر نہیں دیا ـــــ کبھی کوئی چیز نہیں دی سوائے
اس کے سوالیہ غصیلی نظروں کے ـــــ اس کے سینے میں کوئی شے تڑپ کر رہ گئی ـــــ اور پھر دبے دبے اضطراب و سہمے سہمے غم نے سارے حصار توڑ ڈالے۔
احسن نے ایک بار کواڑ کی جھری میں سے اندر جھانکا۔ شاید وہ بیتے دنوں کی ایک ایک بات تازہ کر رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے ننھے ہاتھ سے لٹکے ہوئے تالے
کو چھوا جیسے سارا قصور اس تالے کا ہی ہو ـــــ وہ مڑا تو اس نے اپنے چچا کو دیکھا۔ گھبراہٹ میں گڑیا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گیلی زمین پر گر گئی۔
اس نے بڑھ کر احسن کی گڑیا اٹھالی اور پتلون کی جیب سے رومال نکال کر اسے صاف کرنے لگا ـــــ پھر گڑیا کے ساتھ ساتھ جیسے اس کے
دل بھی صاف ہو گیا ہو ـــــ احسن نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکا۔ وہ چند لمحوں تک خاموش کھڑا رہا، پھر ڈرتے ڈرتے لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔
ـــــ وہ عائشہ تھی نا عائشہ ـــــ وہ ـــــ وہ ـــــ"
اس نے بے اختیار احسن کو گود میں اٹھا لیا۔ احسن کا بدن بخار میں جل رہا تھا۔ وہ اسے سینے سے چمٹائے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

عشرت نقوی

شمشاد والا

اور جب شمشاد والے نے تیسری شرط بھی جیت لی تو شکور آ لقا کبوتر کی گردن ہلا ہلا کر پنجوں کے بل جھومنے لگا۔ لطیف نے ہارتے ہوئے بھی گیندے کے زرد زرد پھولوں کا ہار اس کی گردن میں ڈال دیا جس میں ایک ایک کے نئے نئے دس نوٹ پھولوں کی طرح پرو دئے گئے تھے۔ منظور نے اپنی طرف سے ایک چھوٹا سا کپ دیا تھا جو کبھی اس نے جیتا تھا۔ اللہ دین سرخ سرخ گلاب کے پھولوں کا بنا ہار لایا تھا مگر وہ اس نے اسی وقت توڑ پھولوں کی پتی پتی ادھیڑ کر رکھ دی اور منہ سے صابن کے سے جھاگ نکالتا ہوا، لطیف کو بے بھاؤ کی سناتا ہوا، اپنے ساتھیوں کو لے کر چلا گیا۔ رمضے صرف پچاس ہی ہارا تھا لیکن لطیف۔ نے تو پورے سو کی کھائی تھی۔ پھر بھی شکور سے ایسے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا جیسے اس کا مخل نہ ہارا ہو بلکہ جیتا ہو مگر شریف سب سے علیحدہ خاموش کھڑا تھا۔ اس نے شکورے کو جھوٹے منہ بھی مبارکباد نہ دی تھی۔ سب اس کے دل کی بات جانتے تھے۔ وہ شکورے سے ہارے ہوئے اونٹ کی مانند خار رکھتا تھا۔ اس نے پچھلے جمعہ کو ڈیڑھ سو ہارے تھے۔ سو نقد تھے اور پچاس کے بدلے بیوی کے چاندی کے پازیب اور جھمکے دیئے تھے۔

یکا یک ہاسی کڑھی میں ابال آیا۔ شریف لطیف سے مخاطب ہوا "بھائی لطیف! شکورے سے کہنا اگلے جمعہ دوسری ہوگی۔ اب شاہین کو تیار کیا ہے۔ امریکہ کے جہاز کی طرح آواز سے تیز اڑتا ہے۔ شاہین ہے شاہین۔ وہ ماسٹر کا ہے نا۔ اقبال کا شاہین بھی اڑے تو میرے شاہین سے مقابلہ کرے تو وہ وقت کا دانہ پانی بھول جائے۔ کل رات آٹھ بجے اترا تھا۔ محلے کی پانچ لالٹینیں اکٹھی کرنا پڑی تھیں۔"

اور شکورے نے کہا "لطیف تو بھی اس سے کہہ دے، وہ کیا چار کی لگالے پر میں بھی اور بیوی کے زیور نہیں لوں گا۔ پچھلے جمعے میں کا نقصان ہوا جھمکے بالکل بیکار تھے۔ سالوں میں کھوٹ ملا ہوا تھا۔ میاں! شرط لگانی ہے تو نقد نرائن ہوگی نقد نرائن۔ کاندھے کڑکڑاتے نوٹ۔ اگر منظور ہے تو میں تیار ہوں۔ اپنا شمشاد والا زندہ باد! پاکستان پائندہ باد!"

شریف تھوڑی دیر تو چپ سا رہا گویا کوئی فیصلہ کر رہا ہو۔ اور پھر کہنے لگا "نہیں دوسری ہوگی۔ نقد سودا ہوگا۔ پہنچے صبح چھ بجے چھوڑیں گے۔ آخری ٹیم پانچ بجے رہے لطیف منصف ہوگا دونوں کے۔" اور منظور قصائی نے بھی حسب معمول گھوڑوں کی ریس کی طرح لطیف سے شاہین پر پچاس کی بدلی۔

شکور اپنے محلے کے مشہور کبوتر بازوں میں سے تھا جس کی عمر کا اکثر حصہ چھت پر آسمان کو گھورتے، گوڑی کے چکر لگاتے اور گلیوں میں گھومتے گزرا تھا۔ یوں تو محلے کا سب سے مشہور کبوتر باز منظور تھا مگر جب بھی اس سے شرط لگانے کی کہتے تو وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ جاتا اور من میں اچھے بڑے بڑے کبوتروں کو گھورتے گھورتے رہ جاتا۔ اس کے پاس اعلیٰ سے اعلیٰ نسل کے کوئی ڈھائی سو کبوتر تھے۔ وہ شام تک اڑتے رہتے تھے۔ شکورے نے ایک بار للچائی نظروں سے اس کے کبوتروں کو دیکھتے ہوئے کہہ ہی دیا "چاچا! تیرے پاس یہ بڈھا بڈھا کبوتر ہیں۔ اٹھتے ہی آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ دل

ہن جاتی ہیں۔ چاچا! تُو تو مہینے میں ہزاروں کماتے۔ یہ تیرا اچھا اگر میرے پاس ہوتا قسم مولا کی اپن کے وارے نیارے ہو جائیں۔ رتھنو کی ماں کے سے بھر دوں۔ باپ کو مہینہ بھر میں بیماری سے کھڑا کر دوں۔ اور چاچا! تیرا یہ ہیرا تو اب ختم ہو گیا ورنہ تو میں نے اسے رات میں اڑتے دیکھا ہے۔ ن چھوڑ دیا ہے اس نے۔ وہ غلط ہے نا سالا۔ پھر بچے بھی سفید ہیں اور چاچا! اپنے شمشاد والے کی بھی کیا بات ہے پرسوں ہی ڈیڑھ سو جیتا ہے۔ سو میں نے پاس مقبو جیت گیا۔ اللہ دین نے اس سے پچھلے جمعہ عبدالغنی سے جیتے تھے دو سو۔ اب پھر بد گئی ہے شریف سے دو سو کی۔ خدا مہربان رہا تو یہ بھی جیت ہے۔

شکورے! یہ شریف سے شرط نہ لگایا کر، حرام زادے نے سارا گھر اس دھندے میں لٹا دیا۔ باپ نے بہن کے لئے کچھ زیور بنائے تھے۔ کبھی کی سارے ختم کر دیئے۔ بیوی الگ قسمت کو رو رہی ہے۔ بہن بھی بائیس کے پیٹے میں ہو گی۔ ابھی تک گھر بٹھا رکھا ہے اسے۔ بھلا کبوتر بازی سے شادی ہے نوابی میں کہیں؟

چاچا! میں چاہوں تھوڑی تھا۔ وہ تو اس نے خود لگائی ہے۔ اسے اپنے شاہی پر گھمنڈ ہے تو اپنا شمشاد والا کم نہیں کھاتا کسی سے۔ اور چاچا! میں نے بھی دیا ہے کہ نقد نقد سودا ہو گا۔ جیب رشید نہیں لوں گا۔ اور چاچا ایک بات اور بھی ہے۔ باپ کا اپریشن ہونا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہے چھ سو روپے لگیں گے میرے پاس ہیں۔ دو سو نیلی چھتری والا چاہے گا تو یہ بھی ہو جائیں گے۔ باپ کا علاج ہو جائے گا۔ چاچا! وہ بہت مخالفت کرتے ہے میرے شوق کی پر میں ہ کہ میرے کبوتروں نے ہی تجھے ٹھیک کیا ہے۔" شکورے نے پانی پیتے ہوئے چینے کو گھورتے ہوئے کہا۔

یوں تو شکورے کے پاس پورے پچاس جوڑے تھے مگر اس کے جگرے کبوتر تھوڑے ہی سے تھے۔ شریف والا اور مل والا اس کے پکڑے ہوئے پٹھے تھے لا تو پار سال شریف کا پکڑا تھا۔ اب تو اس کے دو بچے ہیں۔ مل والا اس نے بھانا رام مل سے پکڑا تھا۔ چاند اس کے اپنے گھر کا تھا لیکن سب سے زیادہ اس کو اور چمپا پسند تھے۔ چمپا کو وہ اس لئے زیادہ پسند کرتا تھا کیونکہ بڑی مشکل سے کئی کبوتروں کے سر گنجے کر کے، آنکھیں خراب کر کے، شمشاد والے نے صرف اس کو ہی یں جانے کی اجازت دی تھی اور چمپا بھی اس کی ایسی عاشق صادق نکلی کہ پہلی ملاقات میں اپنا دل ہار بیٹھی وہ بھی سہمی سہمی سی اس کے خانے میں بیٹھی رہی۔ اور جب نے اس کو شمشاد والے کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر اس کے خانے میں دو دانے رکھ دیں تو اس نے ایک لمحے کے لئے اپنی گلابی گلابی گردن کو اٹھایا، شبنمی آنکھوں دیکھا اور پھر گردن جھکا کر اپنی چھوٹی سی چونچ اس کے سرخ سرخ پیروں پر رکھ دی شمشاد والے کو شاید اس کی یہی ادا بھا گئی۔ اس کی موتیا آنکھوں سے جھلکتا ہستہ آہستہ کافور ہو گیا۔ اس کی جگہ پیار پھیلتا چلا گیا۔ اس نے اپنے پر پھڑپھڑائے اور اپنے سیاہ پنجوں کے بل اس کے گرد ناچنا شروع کر دیا اس کے منہ عجیب لغمے پھوٹنے لگے۔

جب شمشاد والے نے مسلسل تین شرطیں جیتی تھیں وہ پورے محلے میں چتنا فقیر کی طرح مشہور ہو گیا۔ جس کو بچوں سے لے کر بڑی بوڑھیاں تک جانتی تھیں۔ یہ شمشاد والا تو چتنا فقیر کے روپوں سے بھرے ہوئے مٹکے سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ وہ خاص طور پر اس کو دیکھنے آئے تھے۔ جیسے شمشاد والا کبوتر نہ ہو، ن میں وہ نسل کا چینا تھا مگر شکورے کی ماں اسے گلاب شاہ کہتی تھی۔ اس کی بیوی نے اس کا نام موتی رکھا تھا۔ موتی اس کا بڑا مناسب نام تھا۔ اس کی ل موتیے کی طرح صاف شفاف رہتی تھیں۔ کبھی کبھار ان میں گلابی گلابی رنگ جھلکنے لگتا تھا بعض دفعہ تو ایسے لگتا جیسے ابھی کئی موتی آنکھوں سے ٹھل کر گر پڑیں گے جسم پر بھی سیاہ، سفید ہزاروں موتی بکھرے ہوئے تھے چھوٹی سی چونچ، گہرے سیاہ بادلوں کا سا سر جس کی سیاہی پھیلتے پھیلتے اس کی گردن تک آگئی جس میں تمام رنگ پھوٹ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر اس کی ماں کہا کرتی تھی:"ارے شکورے یہ تو اپنے سکتر صاحب کے باغ میں لگے ہوئے کالے گلاب سے بھی زیادہ ت میں تو اسے گلاب شاہ ہی کہوں گی۔"

شمشاد والا دراصل اس کا باپ تھا جو اب بھی شمشاد بائی کے پاس ہے۔ شمشاد بائی ملتان کی مانی ہوئی کبوتر باز تھی۔ فکرے کا چاچا کہا کرتا تھا: "بھئی! کبوتر تو اپنی شمشاد بائی کے پاس ہیں۔ پر نہیں جو کبوتر اس کی ماں نے (اللہ اسے جنت نصیب) پال رکھے تھے وہ تو اس کے پاس بھی نہیں۔ یہی تو اسی سے لگ کرتی تھی ہزار سے کم تو بات ہوتی ہی نہیں تھی۔ اپنے جوڑ کی تو وہی تھی۔ وہ بھی لقا کبوتری تھی بہترین پٹھوری تھی۔ پر کبوتر بازی کے علاوہ بات ہی نہ کرتی تھی۔ میرے کبوتر دیکھنے آتی تھی۔ میں بھی اس کے کبوتر دیکھنے جاتا تھا۔ بس! کسرا، السرا، سرخا، چینا، کوئی کاغذی، ہرا ہرا کرتی تھی۔ ران پہ تو ہاتھ دھرنے دیتی ہی نہیں تھی۔ کبوتری جتنی ہے ہزاروں ہارا۔ مگر پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ کہتی تھی کبوتر بازی کرنی ہے تو شوق سے اس وقت آؤ۔ رنڈی بازی صرف رات کو سجتی ہے۔ ہماری صبح جب ہوتی ہے جب شریفوں کی رات ہوتی ہے۔ اس وقت ہم شرفا میں شامل ہوتے ہیں۔ اب تو صرف کبوتروں کی بات کرو۔"

اور چاچا ایک سرد آہ بھر کر کہتا: "سالی ہر دم نشے میں دھت رہتی تھی۔ کبوتروں کو بھی گمی میں تیرتے ہوئے ملیدہ کے ساتھ ساتھ سونوں رتیے روز افیم کھلا دیتی تھی۔ زعفران بھی دیا کرتی تھی لیکن اکثر کبوتر اس کی طرح افیم ہی زیادہ پسند کرتے تھے۔ لوگ کہتے تھے وہ ان کو شراب پلاتی تھی پانی کی جگہ لیکن یہ غلط ہے۔" چاچا جو سب محلے کا چاچا تھا سینے پہ ہاتھ مار کے کہتا "یہ صرف چاچا منگو ہی جانتا ہے کہ شراب اس کے تین کبوتر ہی پیتے تھے۔ کبوتری کوئی کمی نہیں تھی۔ حرامزادی میرے ہی سامنے شراب سے دھت کبوتروں کو اپنے ادھ کھلے سینے پر بٹھا لیتی اور اس زور سے پیار کرتی کہ میری طبیعت بھی خراب ہو جاتی۔ جی چاہتا کہ ان کبوتروں کی گردن مروڑ کر رکھ دوں اور ..... اور بس وہ شراب کی بوتل بن جاتی برانڈی کی طرح گرم۔ جی چاہتا ایک ہی گھونٹ میں پی جاؤں۔ میں اس سے کہتا "کیا میں ان سے بھی برا ہوں" تو ہنستے ہوئے کہتی "تم تو میرے بادشاہ کی طرح نرے لڑکے ہو۔ اس کی طرح کبوتروں کے پیچھے بھاگتے ہو۔ اور بھاگتے بھاگتے تھک جاتے ہو۔ دوسرے کبوتروں کو گرد منڈلاتے دیکھ کر رہ جاتے ہو۔ منگو شاہ تم جانتے ہو یہ کبوتر رات کو اندھے ہو جاتے ہیں اور میری آنکھوں پر بھی رات کو پٹی بندھی ہوتی ہے۔ کبوتر باز ہو کر بھی نہیں سوچ سکتے۔ میرے بادشاہ کی طرح تمہاری عقل بھی موٹی ہو گئی ہے۔ بوڑھے ہو گئے۔ کاغذی بال تھا جسم بہا گئے پر ہے بوڑم کے بوڑم ہی۔"

سال اوپر ہو گیا۔ شام کے کوئی چار بجے تھے۔ فکرا کبوتر کوٹھے پر حسبِ معمول آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت چینا اکیلا ہی نیچے اتر رہا تھا۔ فکرو اس کے اڑنے کے انداز اور اس کے رنگ سے فوراً پہچان گیا کہ یہ دوسری جگہ کا ہے یا کسی نے نیا تیار کیا ہے۔ اس نے فوراً تمام کبوتروں کو کابک سے نکال دیا۔ چند کبوتر چھتری پر بٹھا دیئے۔ دو دو ٹلے اور موٹے موٹے کبوتروں کو فضا میں اچھال دیا۔ پانی سے بھرے مٹکے سے تھوڑا تھوڑا پانی تسلے میں ڈالنے تھوڑی ہی دیر میں شمشاد والا دونوں کبوتروں کے ساتھ اتر آیا۔ اس وقت اس کی زبان چونچ سے باہر نکل رہی تھی۔ وہ لڑتے ہوئے مرغے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ کی پھیلی پھیلی آنکھوں میں زردی چھائی ہوئی تھی جس نے آنکھوں کے کٹورے سے سیاہ دانے کو بھی پھیکا کر دیا تھا۔ اس کے لمبے لمبے سیاہ و سفید پر پھیل کر زمین تک رہے تھے۔ وہ زمین کی طرف پڑے ہوئے دانوں کی طرف گیا لیکن بغیر ایک دانہ کھائے پانی کی طرف چلا گیا۔ اس نے پانی بھی نہ پیا اور گردن اٹھا کر ادھر دیکھنے لگا۔ فکرو سمجھ گیا کہ بس اب یہ اڑنے والا ہے۔ اس نے فوراً ہی جھپکا مار کر اس کو دبوچ لیا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں شمشاد بائی نے اس کے دروازے کا کنڈا کھٹکھٹا دیا اور اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا "میرا شیرا یہاں اترا ہے۔ اس کا نشہ ٹوٹ رہا ہوگا۔ آج غصے میں میں نے اسے ایک گرلی بھی نہیں دی۔ وہ مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔ میرا شیرا مجھے واپس کر دو۔ میں اسے مناؤں گی۔ میں دو کی جگہ چار گرلیاں دوں گی اسے۔ میرا کبوتر واپس آج وہ تمام دن غائب رہا ہے۔ وہ بھوکا ہوگا جب تک وہ گرلی نہ کھائے گا، دو قطرے نہ پی لے گا، ایک دانہ بھی نہ کھا سکے گا۔"

"لیکن جناب! یہ کبوتر کے قانون میں لکھا ہے کہ پکڑ کا مال واپس کر دو۔ پورے دو گھنٹے دھوپ میں سکتا رہا ہوں۔ میرا ایک پٹھا ابھی تک نہ آیا۔ میں کیسے واپس کر دوں جناب کا شیرا۔" فکرو نے مرعوب نہ ہوتے ہوئے کہا۔ وہ دل میں سوچنے لگا۔ حرامزادی کبوتر لینے آئی ہے۔ نہ جا

ن کے پر تیچ کر چکے ہیں۔ اپنا ایک کبوتر ہاتھ سے جانے لگا تو آگئی روئے پڑو نڈیا زور دار ہے۔ لاجواب چھوری ہے، اگر میرے دلہے
ری بن جائے تو... کیا غضب کی چال پائی ہے ظالم نے۔ لقا کبوتر کی طرح چلتی ہے بالکل۔

وہ آگے نہ سوچ سکا۔ شمشاد بائی نے پھر کہا: "سو روپے لو اور کبوتر واپس کر دو۔ اس کا بچہ بڑا پریشان ہے۔ صبح سے چیں چیں کر رہا ہے۔ بڑی پریشان ہے۔ ابھی تک چھتری پر بیٹھی ہے۔"

"بس! سو روپے! یہ تو بہت تھوڑے ہیں۔" شکورے نے کبوتر کی اہمیت اور سرخ رنگ کی کار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا دو سو لے لو۔"

ان پر تو نز سو کرامتی ہے یہ تو ہیرا ہے ہیرا۔"

"ڈھائی سو ہی لے لو۔" اس نے غصے سے لال بھبوکا ہو کر کہا۔

"یہ تو تیری مسکراہٹ کی قیمت بھی نہیں۔"

"اچھا تین سو لے لو۔" اس نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک گیت پر ہزاروں کمائے۔ راتوں رات لوگوں کو دیوالیہ کر دے اور اس انمول موتی کی قیمت صرف تین سو! پر خیر تو بھی کیا یاد کرے گی کوئی ملا تھا دل والا شرط ہے، ایک بچہ بھی لوں گا ساتھ۔۔۔" اور شکورے نے اپنی بات منوا کر چھوڑی۔ تین کی جگہ چار سو ملے، بچہ بھی لے لیا اور ایک بات اس کو سن آیا۔۔۔ ہائے کیا "عجب" تکا ہے۔ میں تو عذرا بائی کو ہی سمجھا تھا پر کیا بات ہے اپنی شمشاد بائی کی۔ تڑپا دیا ظالم نے۔ چھری تھی چھری۔ کاٹ کے دل ٹکڑے تھا اس چار سو میں دس پانچ اپنے بھی ملا کر اس کے قدموں میں رکھ دوں۔ پھر سوچا کبوتر دینے کا فائدہ ہی کیا ہے دیتا ہے تو اپنی عذرا بائی کو دوں وہ تو اور بھی مہربانی کرے ہے۔

لیکن شمشاد والا کبوتر کا جنا ہی ثابت ہوا۔ افیم کے بغیر حرامزادہ دو پر بھی نہیں مار سکتا۔ روپے روز کی افیم کھا جاتا ہے۔ ابھی پورے پر بھی نہیں ے کہ کبوتریوں کے گرد چکر لگانے شروع کر دیئے۔ ڈربوں کی کوئی کبوتری بھی نہیں چھوڑی۔ کئی دفعہ مار کھائی، سر گنجا کیا، آنکھ بھی زخمی کر لی مگر عادت نہیں ، جس خانے میں کسی کو اکیلا دیکھا ہٹاک سے پر مار کر اس میں گھس جاتا۔ مجال ہے کہ کوئی کبوتری اکیلی ہو اور یہ اس کے گرد گھومتا نظر نہ آئے۔ تمام کبوتریاں ، بلی کی طرح بھاگتی تھیں۔

شکورے کی بیوی کو اس کی یہ ادا بہت بری لگتی۔ پھر بھی دیر تک اس کی حرکتوں کو دیکھتی رہتی۔ وہ سوچتی۔ یہ شکورا میرے لئے اتنا دیوانہ کیوں نہیں ۔ پہلے کب اس کی خوشی کو اپنی خوشی نہ سمجھا۔ کون سی اس کی خدمت میں کسر رکھی ہے جو شمشاد والے کی طرح ہر کبوتری کی طرف بھاگنے لگتا ہے۔

شکورے کی ماں بھی اس سے بہت خوش تھی کیونکہ وہ شمشاد بائی کی طرح بڑا کمیرا ثابت ہوا تھا۔ مہینے میں چار سو کما دیتے۔ اتنے تو شکورا بھی نہیں کماتا۔

ے کے باپ کا علاج تو دراصل یہی کر رہا تھا۔ وہ جب تک اڑایا نہ جاتا خود نہ اڑتا تھا۔ اکثر دیوار یا چھتری پر بیٹھ کر اپنی سرخی مائل سفید آنکھوں سے دھوپ میں ے شکورے کے باپ کو گردن جھکا جھکا کر بڑی پیاری نگاہوں سے دیکھتا۔ جیسے اسے اس کی بیماری کی بہت فکر ہو، بہت دکھ ہو۔ جیسے وہ شرطیں اس کے علاج ہی ، جیتا ہو۔ بعض دفعہ تو ایسے لگتا جیسے ابھی رو دے گا۔ اس کی آنکھوں میں پانی سا تیرنے لگتا

شکورے کے باپ میں بھی اچانک کئی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ وہ شکورے کے اس شوق سے سخت تنگ تھا لیکن اب خود اپنے سامنے اس کے لئے خاص گھی ، بنتا۔ حالانکہ خود انہیں اصلی گھی کھائے ہوئے برسوں گزر چکے تھے۔ وہ افیم کے استعمال کو حرام سمجھتا تھا۔ اس نے کئی دفعہ شکورے کو لتاڑا تھا، کئی دفعہ مارا تھا مگر اب

دھیٹ بن کر ان کی گریاں بند نہ کی تھیں لیکن اب خود وہ شکورے کو یاد دلا دیتا۔ پلنگ پہ لیٹے لیٹے اس کے کبوتروں کا خیال کرتا۔ حالانکہ مہینہ ہوا جب شکورے کے سات کبوتروں کو بلی مار گئی تو وہ بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے کئی دفعہ انہیں گٹھا گٹھا کر کبوتروں کو کھلائی تھیں۔ کئی دفعہ رات کی بچی ہوئی روٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ان کے سامنے ڈالے تھے۔ وہ اپنی بیوی سے کہتا "یہ گلاب شاہ تیرے شکورے سے بھی اچھا نکلا۔ وہ تمام دن رکشا چلانے سے مہینے میں دو ڈھائی سو سے زیادہ نہیں لاتا اور یہ کام ہے پتہ نہیں کہاں کرتا ہے۔ میرا علاج تو یہ گلاب شاہ ہی کر رہا ہے۔ سارے دن چھتری پر بیٹھا مجھے تکا کرتا ہے۔ ایسا لگے جیسے میرا دوسرا بیٹا ہو۔ مجھے تسلیاں دے رہا ہو ــــ بابو! تو گھبرا نہیں، تیرا علاج میں کراؤں گا، تیری بیماری میں دور کراؤں گا۔ یہ دو سو بھی جیت لوں گا۔ پھر تیرا آپریشن ہو جائے گا بابو! تو بالکل اچھا ہو جائے گا۔ میں تمام دن اڑتا رہوں گا۔ میں شرط جیت جاؤں گا ــــ جب چھتری پر بیٹھا با چھا کے پیچھے غٹرغوں کرتا پھرے ہے تو ایسا لگے جیسے کہہ رہا ہو۔ چچا! میں شرط جیتوں گا۔ میں شرط جیتوں گا۔"

اور جمعہ کے روز دونوں کبوتر چھوڑ دیئے گئے۔ شکورے نے لطیف کی جگہ پیسے چاچا منگو کے پاس رکھوا دیئے تھے۔ شریف نے اپنی رقم لطیف کو ہی دی تھی۔ لطیف اور رمضو قصائی نے اپنی رقم اپنے اپنے پاس رکھی تھی۔ شکورے نے آج شمشاد والے کو ایک کی جگہ دو گولیاں دی تھیں۔ آج وہ بہت پریشان تھا۔ وہ جانتا تھا شریف کا یہ چھارا سگے اترتا ہے۔ پھر اسے باپ کی طرف سے بھی فکر تھی۔ ڈاکٹر نے رات کو کہہ دیا تھا کہ حالت خراب ہے فوراً آپریشن کی ضرورت ہے۔

اور آپریشن کے لئے چھ سو روپے۔ تیس پیسیاں چاہئیں تھیں۔ اور شکورے کے ساتھ سب ہی سوچنے لگے چھ سو شام تک ہی ہو سکتے ہیں۔

"اللہ کرے شمشاد والا جیت جائے۔ موتی جیت جائے" شکورے کی بیوی نے ظہر کی نماز پڑھتے ہوئے دعا مانگی

"اللہ کرے گلاب شاہ جیت جائے۔ گلاب شاہ جیت جائے" شکورے کی ماں نے خاوند کی خاک شفا کی سی رنگت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"خدا کرے شکورا جیت جائے شکورا جیت جائے" باپ نے پہلی دفعہ فضا میں گھورتے ہوئے دعا مانگی۔

اور شریف سوچ رہا تھا کہ اب کے خدا نے چاہا تو چار زیور ضرور ہی بن جائیں گے بن کے۔ سب سونے کے بنواؤں گا۔ پچاس کے بعد میں سے پازیب اور جھمکے واپس لے لوں گا۔ اب کے تو ضرور ہاتھ پیلے ہو جائیں گے شبو کے۔ مولا نے چاہا تو ایک ایک سے بدلہ لوں گا ہارنے کا ــــ اور رمضو سوچ رہا تھا کل انشاء اللہ تین بکرے کاٹوں گا۔ پچھلا نقصان بھی پورا ہو جائے گا۔ دس روپوں کا ایک ہار شریف کو پہناؤں گا ــــ اور لطیف سوچ رہا تھا اب کے پیٹ بھر کے ملے گی۔ دو ادھے لاؤں گا۔ بیرا بائی کا مجرا سنوں گا۔ دس کی بازی ہو جائے گی۔ شاید قسمت ساتھ دے دے۔ ــ شمشاد والے نے تو ہارنا سیکھا ہی نہیں۔ بھلا کنجر کا نطفہ بھی کبھی ہارا ہے۔

تین بجے تمام لوگ اپنے اپنے ساتھیوں کو لئے چاچا منگو کے چوبارے پر اکٹھے ہو گئے۔ ابھی تک دونوں کبوتروں کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ بادلوں کی ہلکی ہوں نے ان کو جانے کہاں چھپایا ہوا تھا۔ تین بج کر بیس منٹ پر سب سے پہلے لطیف کو ایک باریک سیاہ دھبا نظر آیا جو بڑا ہوتا چلا گیا۔ اس نے زور سے نعرہ ــــ بالی ــــ اور شکورا تے سے لپٹ گیا۔ جیسے جیسے یہ سیاہ دھبا واضح ہوتا گیا۔ شریف کا چہرہ اس کے کبوتر کی طرح سیاہ ہوتا گیا۔ آنکھیں بے جان مٹی کی طرح ویران ہوتی گئیں، اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ ابھی سے کیوں اترنے لگا۔ اس کو تو ابھی نظر بھی نہیں آنا چاہیئے تھا۔ یہ تو رات کو اترتا ہے۔ یہ تو شاید نا ہی ہیں۔ کیا تھک گیا ہو؟ نہیں یہ تھک نہیں سکتا۔ یہ ہار سکتا ہی نہیں۔ یہ ضرور جیتے گا، یہ شمشاد والے کو ہارے ہی ہارے۔ اس نے بے اطمینانی سے رمضو قصائی کی طرف دیکھا مگر وہ بھی اس بکرے کی طرح نظر آ رہا تھا جو چھری تلے پڑا ہو۔

اور شکورا دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ اب میں باپ کا آپریشن ضرور کراؤں گا۔ میرا موتی ہار سکتا ہی نہیں۔ وہ کوئی ہارنے کے لئے تھوڑی پیدا ہوا ہے۔ ملے طوائف کے گھر آنکھ کھولی ہے۔ وہ کنجر کا جنا ہے۔ وہ بھلا کس سے ہار سکتا ہے۔ پھر وہ شریف کو دیکھنے لگا جو اسے اپنے باپ کی طرح زرد زرد نظر آ

اس کو اپنی جیت کا اور بھی یقین ہو گیا۔ چھ ——— چھ سو ——— تین بیساں ——— وہ اپنے باپ کو ہسپتال کے صاف ستھرے کمرے میں دیکھنے لگا مگر سے میں
لگا، چاچا منگو شاہ کے ساتھ بازار میں گھومتا ہوا دیکھنے لگا۔ اسے اپنی پیشانی پہ چمکتے ہوئے پایا، شمشاد والے کو افیم کی گولیاں کھلاتے ہوئے دیکھا۔ جل
تے ہوئے دیکھا۔ اس کا چہرہ قندھاری انار کی طرح سرخ ہو گیا۔ اس نے زور سے نعرہ لگایا۔ اپنا شمشاد والا زندہ باد۔ چاچا منگو زندہ باد۔ اور لطیف
شکورا زندہ باد، شمشاد والا زندہ باد۔

سبھی شریف کو شاہین کافی نیچے اُتر آیا تھا مگر شمشاد والا ابھی بہت اونچائی پر اُڑتا ہوا ایا ہی کے بچے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ سب کو شکورے کی جیت
یکایک سب کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ شمشاد والا بڑی تیزی سے تباہ شدہ جہاز کی طرح نیچے آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک بیری لگی ہوئی تھی۔ اس نے کئی دفعہ
پیکا۔ پھر شکورا گھٹتے گرتے بچا۔ اس کو لطیف نے سنبھال لیا۔ اس کے منہ سے کئی چیخیں نکل گئیں۔ بیری نے اپنا کام کر لیا تھا۔ دور اونچائی پر شمشاد والا
ہوئے نظر آئے۔ وہ جہاز پر سے پھینکے گئے اشتہار کی طرح ہو ہڑ کے پاس جا گرا۔ شکورا تیزی سے پاگلوں کی طرح اس کی طرف بھاگا۔

جب وہ اس کو اٹھائے روتا ہوا گھر میں داخل ہوا تو اس کو سکتہ سا ہو گیا۔ اس کے آنسو تھم گئے۔ پیروں نے چلنے سے انکار کر دیا۔ وہ ایک بت کی طرح
چاہیں پڑی ہوئی چارپائی کو دیکھنے لگا، جہاں اس کا باپ مرا پڑا تھا۔ ایک دم اس کے جسم میں حرکت ہوئی اور اس نے زور سے جھرجھری لی
ڑتے ہوئے شمشاد والے کو دیکھنے لگا۔

سوچنے لگا کس کا غم مناؤں ——— شمشاد والے کا یا اپنے باپ کا؟ ——— گلاب شاہ کا یا ماں کے اجڑے ہوئے سہاگ کا؟ ——— ر تی،

کی آنکھوں سے کئی آنسو ایک دم نکلے اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے شمشاد والے پر گرنے لگے۔ اس نے زور سے دونوں ہاتھوں میں اس کو بھینچ لیا۔
لگایا اور مسلسل چومنے لگا پھر وہ تیزی سے مڑا اور اس کو دفنانے چلا گیا۔

لیلیٰ عطاءاللہ

یوں تو قصبہ بھر کی لڑکیوں کو پیار اگر تو ڈاکٹر صاحب پر دم دیتا تھا۔ مگر عطیہ کی حالت کچھ زیادہ ہی نازک تھی۔ اسی لئے وہ جو بھی دیوانہ پنے کی حرکت کرتی تو کوئی محسوس نہ کرتا۔ اس رعایت خصوصی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ڈاکٹر صاحب اس کی دریافت تھے۔

انہیں اس دور دراز قصبہ کے چھوٹے سے ہسپتال میں آئے چھ سات ماہ ہو چکے تھے مگر لڑکیوں میں سب سے پہلے ان سے علاج کرانے کا اتفاق عطیہ ہی کو ہوا۔ اسی نے سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب کا غائبانہ تعارف اور پھر مختلف حیلوں سے ملاقات کرائی۔

اس علاقہ کے سخت مزاج جاگیرداروں کی انتہائی سخت باپردہ بیٹیوں کی مجال نہیں تھی کہ وہ مرد ڈاکٹروں سے علاج کرانے کا تصور بھی کرتیں۔ وہ تو باپوں سے اپنی چھوٹی موٹی بیماریاں بھی ان کے جلال کے مارے چھپاتی تھیں۔ پردے کی اس قدر پابندی تھی کہ غیر مرد تو کیا چچا تایا کے بیٹوں تک سے چھپنا پڑتا مگر عطیہ غریب کی بیماری ہی کچھ ایسی عشق مشک قسم کی تھی کہ چھپائے نہ چھپی۔ پہلے تو اماں جانی نے بہت کچھ کوشش کی اور کافی عرصے تک اس کوشش میں کامیاب بھی رہیں مگر اب تک ——— عطیہ بے چاری کو جب بھی دورہ پڑتا تو اس کی یہ حس اتفاقاً ہی ختم ہو جاتی کہ وہ کہاں ہے اور کون کون دیکھ سن رہا ہے ——— اکثر یہ ہونے لگا کہ بابا کو کھانا کھلا رہی ہوتی یا چائے پانی دے رہی ہوتی کہ اچانک دھڑ سے زمین پر گر جاتی، ہاتھ پاؤں اکڑ جاتے، آنکھیں بند ہو جاتیں بالکل مردوں کا سا حلیہ ہو جاتا۔ پھر اسی بے ہوشی میں اس قدر شدت کی اور بے ساختہ چیخیں نکلتیں کہ سارا شہر سنتا۔ بابا جان بے چارے مع اپنے سارے جاہ و جلال اور مزاج کی پابندی کے گھبرا گئے۔ پہلوٹھی کی چہیتی بیٹی تھی اور پھر تو نہ پڑھی ہوئی۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ سارا جاتا دیکھئے تو آدھا دیجئے بانٹ ——— تو خیر خدا نخواستہ بانٹنے کا تو سوال ہی نہ تھا مگر میرا مطلب یہ ہے کہ باقاعدگی سے علاج پر خود بخود راضی ہو گئے۔ لیڈی ڈاکٹر وہاں دور دور نہ تھی۔ ایک ڈاکٹر صاحب تھے جن کا ہیبا مفتی اور ہاتھ کی خشکا کو چھا تھا۔ انہیں کا دم غنیمت نظر آیا اور ایک دن خود ہی ساتھ لے آئے۔ یہ مرض ان کے لئے کچھ ایسا عجیب اور خوفناک تھا۔ مسہری کے پردوں میں سے کلائی نکال کر صرف نبض دکھانے سے بات نہیں بنتی تھی سو پردہ اتر گیا۔

ڈاکٹر صاحب مریضہ کی بیماری آئیر زاڈنگ بھر کے نسخلے سے بھانپ گئے مگر اپنے طور پر نفسیات کا خاصا مطالعہ کر رکھا تھا۔ بیٹی کے علاج سے زیادہ گھبرائے ہوئے باپ کی تسلی کے لئے نبض دیکھی۔ سٹیتھسکوپ لگا کر اچھی طرح معائنہ کیا۔ ایک آدھ بے ضرر سا انجکشن بھی لگایا اور نسخہ لکھنے کے لئے کاغذ قلم طلب کیا۔ اس دوران مریضہ ہوش میں آ کر اپنے طور پر پوری تسلی سے ڈاکٹر صاحب کا معائنہ فرما چکی تھیں۔ یہ کھلانے بھنے والا صاحب کو خود ہی قلم کاغذ لے کر لپکے ہوئے آتے دیکھ کر بڑے اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھنے پڑھنے چار سکون آور ٹانک اور ٹھنڈی دوائیں گھسیٹ کر کاغذ ان کے ہاتھ میں تھمایا کہ کیمسٹ سے منگا لیں اور خود چلتے بنے۔

دوسرے مریضوں کے لئے ہاں سے ڈاکٹر صاحب کا علاج آگ پر پانی کا اثر رکھتا ہو مگر عطیہ کے لئے تو آگ پر تیل ثابت ہوا۔ پہلے کم ہونے کے دوروں کی شدت

سے ناچتی آرہی ہیں اور سوچتی رہیں کہ لڑکیاں تو نری پاگل ہیں۔ اب کوئی پوچھے بھلا اس سانپ سے لڑکے میں آخر رکھا ہی کیا ہے اچھا ہے مگر نیر ایسا بھی کیا کہ انسان ہوش ہی گنوا بیٹھے اپنے خاندان کے شہزادوں ایسے گورے چٹے کالی بھنبیری آنکھوں والے لڑکوں کے سامنے اس کی حیثیت ہی کیا ہے، مگر ساتھ ہی انھیں یہ خیال بھی آیا کہ کنواری لڑکیوں کو بھلا خاندان کے لڑکوں کے نزدیک بھی کون پھٹکنے دیتا ہے۔ خیر چھوڑیں ادھر ادھر سے تاک جھانک کر دیکھ آئے ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر نظر پڑ جائے وہ یہ سب سوچ رہی تھیں کہ اچانک ڈاکٹر نے آنے کو ڈھیلا چھوڑ کر ان کی طرف دیکھا پلکیں کچھ عجیب انداز میں گرگرائیں اور مسکرا کر بولے " بلڈ پریشر تو آپ کا بالکل ٹھیک ہے۔ البتہ جوڑوں کے درد کے لئے نسخہ لکھے دیتا ہوں "

ممکن ہے اس کی وجہ اپنے دل کا چور ہو مگر خالہ حمیدہ کو ڈاکٹر کی مسکراہٹ میں شرارت کی جھلک نظر آئی اور اس خیال سے کہ کہیں ڈاکٹر ان کی بیماری بھانپ نہ گیا ہو، وہ لڑکیوں کی طرح شرما گئیں مگر ساتھ ہی وہ کچھ کچھ تاؤ بھی کھا گئیں۔ ڈاکٹر کی مسکراہٹ اور معاملہ میں واقعی کچھ سے تو تھا۔ اب حمیدہ خالہ کو کون سمجھاتا کہ خالہ جان بہت تو بہت کچھ۔ پر اب محسوس کرنے کی سرحد ہی سے نکل چکی ہوں تو کیا کیا جائے۔

معاملہ برداشت سے باہر ہونے لگا اور بدنامی کا اندیشہ بڑھا تو ڈاکٹر صاحب پریشان ہو گئے۔ اس سارے تماشے کا اول تو مطلب ہی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ لاکھ لڑکیاں بے تحاشہ ہوں وہ یہی محسوس کرتے کہ انھیں بنا رہی ہیں۔۔۔ اتنی بہت سی حسین لڑکیاں۔۔۔ آخر انھوں نے ان میں دیکھ ہی کیا لیا تھا؟ وہ اکثر سوچتے، عام مردوں کے برعکس وہ زیادہ خوش فہم نہ تھے۔ پھر ایک آدھ لڑکی ہوتی تو جب بھی بات تھی، وہ سنبھال لیتے مگر یہ اتنا بڑا غول بیابانی۔ داناؤں کا قول ہے کہ دو ملاؤں میں مرغی حرام ہوتی ہے اور یہاں تو خیر سے پورا لشکر تھا۔ مرغی بے چاری پھنکے جان چھپائے پھرتی۔۔۔ آسان ترین طریقہ یہی نظر آیا کہ اب تک ڈاکٹر صاحب کی نظر سے جتنی محترمہ لڑکیاں گزری تھیں ان سب سے زیادہ قابل رشک ان لڑکیوں کی صحت تھی سو اس طرف سے تو ضمیر پر بوجھ پڑنے کا نہیں۔ لہٰذا گھر میں جا کر مریضاؤں کو دیکھنا قطعی بند۔ اور یہ صرف ارادہ ہی نہ تھا ڈاکٹر صاحب نے اسے پوری طرح نبھایا اور تقریباً ہفتہ بھر تک اپنڈے سائٹس، اختلاج قلب اور آنکھوں اور سر کے سخت درد میں مبتلا جان بلب مریضاؤں کے گھر جانے سے بالکل انکار کر دیا۔ سب مایوس ملازماؤں کو یہی جواب دیا کہ جو علاج کرانا چاہتے ہیں ہسپتال تشریف لے آئیں میں کسی کے گھر جانے کا پابند نہیں۔ کام میں حرج ہوتا ہے۔

یہ ایک ہفتہ ڈاکٹر صاحب نے بے حد اطمینان اور سکون سے گزارا۔ ڈیوٹی کا وقت ہسپتال میں مصروف رہتے، شام بے فکری سے اپنے کمرے میں مطالعہ کرنے اور ریکارڈ سننے میں گزارتے۔ سارے ہنگامے اور گتھیاں اپنے آپ ان کے دماغ سے دور ہونے لگیں۔ صبح بڑے تازہ دم اور خوشگوار موڈ میں ہوتے بلکہ مریضوں اور عملے میں مزید مقبول ہو گئے۔

ایسے ہی ایک دن ہسپتال کسی وجہ سے ذرا دیر سے پہنچے۔ برآمدہ اور درمیان کمرہ مریضوں سے پٹا پڑا تھا وہ کرسی پر بیٹھے بھی نہ پائے تھے کہ بدحواس کمپونڈر جلدی سے سامنے آگیا۔ "جناب! پہلے ذرا خواتین کے کمرے کو دیکھ لیجئے۔"

جائز بات تھی بیٹھنے کے لئے کھینچی ہوئی کرسی یونہی چھوڑ کر ڈاکٹر صاحب خواتین کے کمرے کی طرف بڑھے اور دروازے میں جم کر رہ گئے۔ کمرے میں پورے لاؤ لشکر کے ساتھ وہ طرح دار لڑکیاں لکڑی کے سخت بنچوں پر دیوالی کے دیئے سے جل رہے تھے۔

" آپ سب کس لئے آئی ہیں؟" ڈاکٹر صاحب نے ہکلا کر پوچھا۔

"کمال کرتے ہیں آپ۔۔۔ ہسپتال میں لوگ کس لئے آتے ہیں۔۔۔" جواب ملا۔

ڈاکٹر صاحب کچھ سنبھل کر اندر آ گئے۔ " مگر آپ سب تو ابھی بھلی نظر آتی ہیں۔ کیا تکلیف ہے آپ کو؟"

"یہی تو ہمیں معلوم نہیں۔ آپ ڈاکٹر ہیں تشخیص کیجئے" اور ساتھ ہی دبی دبی ہنسی، ایک بار تو ڈاکٹر صاحب بھی ساری احتیاط بھول کر ہنس پڑے۔

"کمپونڈر صاحب کاؤنٹر مکسچر کی ایک ایک خوراک سب کے سامنے پیش کیجئے"۔ انھوں نے دہیں کھڑے کھڑے کہا۔ پھر اچانک سنجیدہ ہو کر کمرے سے نکل گئے۔

یہ سلسلہ پہلے سے بھی زیادہ پیچیدہ اور خطرناک تھا۔ ہر صبح ڈاکٹر صاحب لرزتے کانپتے اپنے کوارٹر سے برآمد ہوتے، ہسپتال کے برآمدے تک پہنچتے پہنچتے حالت ابتر ہو جاتی یہی دھڑکا لگا رہتا کہ وہ سب پھر موجود نہ ہوں۔ اب تو خیر سے کمپونڈر بھی کچھ کچھ سمجھ گیا تھا جس دن ہسپتال پہ پریوں کی یلغار ہوتی، ڈاکٹر صاحب کی سراسیمگی دیکھ

اتنی اکڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر صاحب کچھ کہتے وہ سب اندر آ گئیں۔ دروازے کے پاس لگا بجلی کا بٹن دبا کر بیٹھے تو اس دوران میں وہ سب بڑے اطمینان سے بیٹھک پر پلنگ، مسہری اور کرسی کی پشت پر بیٹھ چکی تھیں۔ عطیہ اُن سب میں نمایاں تھی۔ اُس کے ململ کے لاپروائی سے رنگے دوپٹے پر گوٹا لگا ہوا تھا، ہاتھ مہندی میں رچے ہوئے تھے اور آنکھیں سرخ تھیں جیسے مہندی کا رنگ آنکھوں میں پہنچ گیا ہو۔ وہ خلافِ معمول چپ بیٹھی، سر جھکائے دوپٹے کے کونے کو انگلی پر کھول لپیٹ رہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کو باقی لڑکیوں سے معلوم ہوا کہ عطیہ تین چار دنوں تک دلہن بننے والی ہے۔ وہ شادی پر رضامند نہ ہوتی تھی مگر اماں نے اپنا دوپٹہ اس کے پاؤں پھیلا ڈال کر بمشکل منایا ہے۔ آج اُسے مہندی لگی تھی یہاں آنے کے لئے اُس نے رخصت سے پہلے ہی چھڑا دیا ہے۔ اور یہ کہ عطیہ ڈیڑھ ہفتے سے مایوں بیٹھی ہوئی ہے۔ آج بڑی مشکل سے وہ لڑکی کھلی ہوا میں ٹہلنے اور دریا تک جانے کے بہانے باہر نکلی اور یہاں تک آئی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب کو خاصی سردی کے باوجود ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے ساتھ ہی ان قید و بند کی عادی نازک اندام لڑکیوں کی جرأت پر حیرت ہو رہی تھی۔ اُس کے علاوہ وہ یہی سوچ رہے تھے کہ آخر اس وقت ان کی وجہ نزول کیا ہو سکتی ہے۔ یہ مشکل بھی عطیہ کی سہیلیوں نے حل کر دی۔ شادی چونکہ اپنے عزیزوں میں ہو رہی تھی لہٰذا عطیہ شادی کے بعد بھی یہیں رہے گی مگر سسرال سے چوری آنا ناممکن ہوگا اس لئے وہ ڈاکٹر صاحب کی کوئی اچھی سی تصویر لینا چاہتی تھی تاکہ آئندہ زندگی کے اجاڑ اور بے رونق دنوں میں اس سے جی بہلا سکے۔

ڈاکٹر صاحب کو یہ مطالبہ کسی صورت منظور نہ تھا کیا پتہ کب اُن کی تصویر عطیہ کے سسرال والوں کے ہاتھ لگ جائے۔ اپنے ماں باپ اور بھائی بہن تو خیر سہہ بھی جاتے ہیں مگر سسرال والوں اور شوہر کا ایسی حرکت پر ردعمل ظاہر ہے جو ہو سکتا ہے۔ عطیہ کا جو حال ہوگا سو ہوگا۔ یہ کون مانے گا کہ ڈاکٹر صاحب اس سارے معاملے میں بالکل بے گناہ ہیں۔ کسی قسم کی صفائی کا موقعہ آئے گا نہیں۔ ایسے سلسلوں میں کسی کو کب اتنی تاب ہوتی ہے۔

سُرخ گوٹے کنارے کے زرد کپڑوں، کھلے بالوں اور مہندی رچے ہاتھوں کے ساتھ سوگوار سوگوار سی عطیہ انہیں آج بےحد اچھی لگ رہی تھی۔۔۔ پہلی بار انہیں یہ نشہ خیز احساس ہوا کہ اتنی پیاری لڑکی ان کے پیچھے جان دیئے دے رہی تھی۔۔۔ اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اپنے سسرال اور آئندہ زندگی کا ذکر سن کر عطیہ کی آنکھیں بے ساختہ بہنے لگی تھیں۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے الماری سے سیاہ جلد کا بیش قیمت البم نکال کر سارے کا سارا اُن کے سامنے رکھ دیا۔

شادی کے بعد عطیہ۔۔۔ کار کے پچھلے شیشوں پر موٹے آسمانی رنگ کے پردے لگی کار میں شوہر کے ساتھ مہینہ بھر کے لئے سوات چلی گئی۔۔۔ اسی دوران میں اچانک بندۂ غریب ڈاکٹر کے تبادلے کے احکام آ گئے۔ باوجود خدمتِ خلق کے حقیقی اور بے پناہ جذبے کے وہ بےحد خوش ہوئے اور بڑے اطمینان سے مختصر سا سامان لے کر چپکے سے چمکتے مہکتے شہروں سے پرے بستے ہوئے اس خاموش سے قصبے سے روانہ ہو گئے جس کی کوئی یادگار اُن کے پاس محفوظ نہیں تھی سوائے ایک ادھورے ہوئے البم کے۔

ایک شادی کی تقریب میں بے انتہا سنوری، زیوروں سے لدی، زری میں لپٹی تین چار آیاؤں اور ملازماؤں کے باوجود اپنی پیاری سی بچی کو گود میں اٹھائے سرور اور شاداں عطیہ کو دیکھ کر خدا جانے کیوں خالہ حمیدہ کو وہ ڈاکٹر یاد آ گیا، کبھی جس کی موہنی مسکراہٹ اور اچھی آنکھوں کا شہر بھر میں چرچا تھا اور جس کے پیچھے عطیہ بال بکھرائے بے ڈھنگے کپڑے پہنے جوگن سا لئے پھرتی تھی۔

ساری احتیاط اور نشیب و فراز بھول کر وہ عطیہ سے مخاطب ہوئیں: "عطیہ! وہ ڈاکٹر یاد ہے؟"

"کون سا؟"

"وہ۔۔۔!"

"ہاں وہ۔۔۔ یاد ہے،" عطیہ لاپروائی سے ہنس دی۔

"لوگ کہتے تھے کہ تم۔۔۔"

"ہاں خالہ،" عطیہ نے جلدی سے اُن کی بات کاٹ دی: "ٹھیک کہتے تھے لوگ کہ میں اُس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ میرا علاج کرتے ہوئے پتہ نہیں اُسے تکلیف ہوتی تھی حالانکہ بابا جان فیس بھی ڈبل دیتے تھے۔۔۔ ضد ہو گئی تھی مجھے اُس ڈاکٹر کے بچے سے۔"

یعقوب ناسک

کروٹ

ابدہ سکول سے واپس آئی تو اس نے گلی کے موڑ پر بڑی کو بھلے ہوئے قدم اٹھاتے ہوئے دیکھا۔ سیاہ پتلون اور سفید قمیض پہنے وہ بڑا اچھا لگ رہا تھا
سفید قمیص اس کے کھلتے ہوئے رنگ پر بہت بھلی لگتی تھی۔ جب وہ چھوٹا سا تھا تو اس کے گال بڑے بڑے اور پھولے پھولے سے ہوتے تھے اور جب بھی وہ اسے
تی تھی کوئی واقف ناواقف ضرور اس کے گالوں پر چٹکی بھرتا۔ عابدہ کی عمر اس وقت آٹھ سال تھی جب بڑی پیدا ہوا۔ اس دن ہلکے ہلکے بادل گھرے
وہ صبح سو کر اٹھی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس کی چارپائی کسی اور ہی کمرے میں تھی اور ابا اس کے پاس بیٹھے شیو بنا رہے تھے۔ "ارے عابدہ تو اٹھ گئی"
آنکھیں ملتی ہوئی چارپائی سے اتر آئی اور پوچھنے لگی "امی کہاں ہیں؟"
"دوسرے کمرے میں"
اٹھ کر جانے لگی۔
"ارے ارے!" سیفٹی رکھ کر ابا نے اسے پکڑ کر گود میں اٹھا لیا۔ "وہاں نہ جاؤ بھئی، وہاں بہت سی عورتیں بیٹھی ہیں۔"
"پھر میں کیا کروں؟ میں ضرور جاؤں گی"، وہ مچلنے لگی۔
ابا اسے گدگدی کرنے لگے: "نہیں بابا وہاں نہ جاؤ۔ چلو چونی لے لو۔"
"پانچ آنے لوں گی۔" اس نے پانچوں انگلیاں پھیلا کر دکھا دیں۔
"اچھی پانچ آنے ہی سہی" ابا نے پانچ آنے گن کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ "تم اب منہ ہاتھ دھولو اور ناشتہ کر کے سکول چلی جاؤ۔"
مڑ کر غسل خانے کی طرف جانے لگی
"عابدہ ذرا سننا تو" ابا نے اسے پکارا
اس نے مڑ کر دیکھا ابا بانہیں پھیلائے کھڑے تھے۔ وہ بھاگ کر لپٹ گئی۔
"تمہیں ایک بھائی لا دیں؟"
"لا دیں۔" وہ مسکرانے لگی
"لا دیں گے۔ اب سکول جاؤ۔"
گود سے اتر کر غسل خانے میں چلی گئی۔ جب وہ سکول سے واپس آئی تو گھر میں اسے چہل پہل نظر آئی۔ صغریٰ بوا اسے اٹھا کر اندر لے گئی: "عابدہ تمہارا
بھائی آگیا ہے۔"

امی رضائی اوڑھے لیٹی تھیں اور ساتھ سرخ سرخ سا چھوٹا سا بچہ رکھا تھا۔ اور وہ اُسے حسرت بھری نظروں سے تکنے لگی۔ ماں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ نکال کر اس کا سر سہلایا "عابدہ تیرا بھائی"

وہ اس پر جھک گئی اور اس کے ہونٹوں کو چھیڑنے لگی "اہا! ہنسے ہیں نا!" اس نے کہا۔

کمرے میں موجود سب عورتیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اور ماں نے گھبرا کر دوپٹے سے منہ ڈھانپ لیا۔

اس کا نام ظہیر رکھا گیا لیکن سب اسے بڈی ہی کہتے تھے اور جب وہ ذرا بڑا ہوا اور اس کی طرف بانہیں پھیلا کر دیکھتا تو وہ اسے جھپٹ کر اٹھا لیتی۔

"چڑیل ہے نری بکیا دبوچ لیتی ہے۔" ماں کہتی۔

عابدہ مسکرانے لگی اور اس نے تیز تیز قدم اٹھانے شروع کر دیئے۔ بڈی اسی طرح بے ہنگم سی چال چلتا ہوا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے بوٹوں کے تسمے کھلے ہوئے تھے اور قمیص پتلون کی پچھلی جانب سے باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ میں اس نے دوات تھام رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں تختی تھی جس کو وہ بڑے زور زور سے ہلا رہا تھا اور چلتے چلتے پاؤں سے کنکریوں کو ٹھوکریں بھی لگا رہا تھا۔ عابدہ نے قدم اور تیز کر دیئے۔ وہ اسے گھر میں داخل ہونے سے پیشتر جا لینا چاہتی تھی۔ اس نے تیز تیز قدم اٹھائے اور اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر زور سے آواز نکالی۔ وہ ڈر کر اچھل پڑا اور پھر اسے دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"ارے اللہ تو نے پھر سیاہی سے منہ ہاتھ رنگا ہوا ہے۔ ذرا چل کے آئینے میں اپنی شکل تو دیکھ۔ پورا چمار لگ رہا ہے۔"

وہ شرما گیا۔ پھر معنی خیز نظروں سے اسے تکنے لگا۔

"اوہو" وہ مسکرانے لگی۔ "لائی ہوں بابا فکر نہ کرو۔"

"تو پھر دو نا!" اس نے ہاتھ پھیلا دیا۔

"ایسے نہیں۔ پہلے منہ ہاتھ دھو تو پھر ملے گی۔"

"نہیں ابھی دو گی" وہ مچل گیا "نہیں تو امی کو بتا دوں گا کہ روز املی کھاتی ہے۔"

"ہائے نہ بتانا" وہ گھبرا گئی "اندر چل کے دیتی ہوں۔"

دونوں نے کمرے میں کتابیں رکھیں۔ امی دوسرے کمرے میں تھیں۔ عابدہ نے کاغذ میں لپٹی ہوئی املی جیب سے نکالی اور اس کے برابر برابر حصے کیے۔ وہ اپنے حصے کی جلدی ہی چٹ کر گیا۔ عابدہ اپنے حصے میں سے تھوڑی تھوڑی کھا کے چوستی رہی۔ وہ اسے للچائی ہوئی نظروں سے تکتا رہا۔

"ارے! ساری کی ساری ہضم بھی کر گیا۔ تو تو بڑا لالچی ہے۔ کیا کھٹی چیزیں کھا جاتا ہے"

اور اس نے اپنا حصہ بھی اس کے حوالے کر دیا۔ وہ ہمیشہ ہی اسے اپنے حصے کی چیز دے دیا کرتی تھی

عابدہ کو روز دو آنے جیب خرچ ملتا تھا۔ مگر جب سے وہ آٹھویں جماعت میں گئی تھی اس کے دو آنے اور بڑھ گئے تھے۔ البتہ بڈی کو دو آنے ہی ملتے تھے۔ دونوں کی اپنی اپنی گلکیں تھیں جن میں وہ پیسے جمع کرتے تھے۔ بڈی بہت سارے پیسے جمع کر کے اُن سے سائیکل خریدنا چاہتا تھا کے پیش نظر کچھ چھوٹی چھوٹی چیزیں تھیں لیکن ہوتا اکثر یوں تھا کہ جب بڈی کی گلک میں ایک آدھ روپیہ جمع ہو جاتا وہ نکال کر اڑا دیتا تھا اور پھر نئے سرے جمع کرنے لگ جاتا۔ اُن دنوں جب اُس کے پاس کوئی پیسہ نہ ہوتا وہ چوری چھپے عابدہ کی گلک میں سے پیسے نکال کے خرچ کر دیتا۔ اس کا راز یوں کھلا ایک دن عابدہ نے اسے موقع پر ہی پکڑ لیا۔ اسکول سے واپس آکر اس نے بستہ رکھتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھ کر گلک اٹھائی۔ عابدہ اُسے چھپ کر دیکھ رہی۔ پہلے تو وہ گلک کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، پھر پاس پڑی ہوئی سلائی اُٹھا کے گلک کو اُلٹا اور پیسے نکالنے لگا۔

"بے ایمان، جھوٹی کہیں کا!" عابدہ نے آگے بڑھ کر اُسے پکڑ لیا۔

اس کو دیکھ کر بڈی کا رنگ اُڑ گیا تب عابدہ کو اُسے اس حالت میں دیکھ کر بڑا ترس آیا بے اختیار اُس کی ہنسی چھوٹ گئی، اُسے ہنستا دیکھ بڈی کو بھی حوصلہ ہو گیا، اور وہ بھی کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ "باجی! مجھے گڑیاں خریدنی تھیں" اس نے جھجکتے جھجکتے کہا۔

"اپنے سارے پیسے تو اڑا دیتے ہو اور پھر میرے پیسے چرانے شروع کر دیتے ہو۔ سچ سچ بتادو، کتنی بار پہلے چوری کی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"صرف ایک بار"

"اوں ہوں! ابھی سچی بتادو۔ پھر پیسے دوں گی" اس نے لالچ دیا۔

"تین بار" اس نے بتا دیا۔

"جھوٹ" اسے پھر بھی اعتبار نہ آیا۔

"اللہ کرے اسے کوڑھ پڑے اور اس کی کیڑی جتنی قبر نکلے جو جھوٹ بولے بس تین بار ہی نکالے تھے۔ دو بار چونی اور ایک بار دو آنے"

"اچھا زیادہ قسمیں نہیں کھاتے۔" اس نے بڈی کے ہاتھ پر دوانی رکھتے ہوئے کہا "جا ؤ گولیاں خرید لو لیکن منہ میں نہ ڈالنا، گلے میں پھنس جاتی ہیں"

رات کو وہ عابدہ کے پاس ہی سوتا تھا۔ سونے سے پہلے کہانی ضرور سنتا تھا یوں تو عابدہ کے پاس کہانیوں کی بہت سی کتابیں تھیں اور وہ کتاب پڑھتی ہوئی پڑھ کر ہی اُسے ضرور سناتی تھی لیکن بڈی کو اس شہزادی والی کہانی بڑی پسند تھی جس کا وزن پانچ پھولوں جتنا تھا۔ اگرچہ یہ کہانی بڈی کو بھی یاد تھی لیکن وہ اکثر یہی کہانی سننے پر اصرار کرتا۔

امتحان میں چند دن رہ گئے تو ان لڑکیوں کو جنھیں ورنیکلر فائنل کا امتحان دینا تھا سکول سے آٹھ دن کی چھٹی مل گئی تاکہ گھر میں تیاری ہو سکے۔ عا کی تیاری قریباً مکمل تھی لیکن بڑی مس صاحبہ نے کچھ ضروری نشانات لگوا دیئے تھے اور انھیں یاد کرنا باقی تھا سکول میں مشہور تھا کہ مس کا گیس کبھی غلط نہیں ہوتا۔

کُل نو سمریاں ہی تو ہیں تین دن میں انھیں ختم کر لوں گی۔ باقی کے پانچ دن دہرائی میں لگ جائیں گے اس نے سارا حساب تیار کر لیا۔

مارچ کا مہینہ تھا لیکن سردی اب بھی باقی تھی۔ وہ کتابیں لے کر چھت پر چڑھ گئی اور سمریاں یاد کرنے لگی۔ آدھ گھنٹے میں اس نے ایک سمری یاد کر لی اور پھر اسے دہرانے کے لئے اس نے خلاصہ بند کر لیا۔ سامنے والی چھت پر اُسے نیلی نیلی آنکھوں اور بھورے بھورے بالوں والا ایک لڑکا کھڑا نظر آیا جو اُسے بُری طرح گھور رہا تھا "بدبخت کیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہا ہے۔" اس نے غصے سے اس کی طرف دیکھا تو وہ پیچھے ہٹ گیا لیکن تھوڑی دیر بعد آ کے پھر وہیں کھڑا ہو گیا۔ اس نے اس کی زیادہ پروا اور پھر سے پڑھائی میں جٹ گئی۔

"یہ اس طرح کھڑا مجھے کیوں گھور رہا تھا؟" اچانک پڑھتے پڑھتے اس نے سوچا" اور یہ ہے کون؟ اس گھر میں تو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ خیر ہو گا کوئی مجھے کیا۔ اس نے کو رٹنا شروع کر دیا اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ سمری یاد ہو گئی ہے تو اس نے خلاصہ بند کر دیا مس نے یاد کرنے کا ایک طریقہ بتایا تھا کہ پہلے یاد کرو پھر آنکھیں بند کر کے ذہن میں اور پھر لکھو تو یاد کی ہوئی چیز کبھی نہ بھولے گی۔ وہ مس کے بتائے ہوئے فارمولے کے مطابق اسے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ آنکھیں بند کرنے سے پہلے اس نے دیکھا وہ ابھی کھڑا تھا لیکن کسی اور طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سمری دوہرانے لگی۔ اچانک ہنسنے کی آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں وہ منڈیر پر جھکا ہنس رہا اُسے بہت غصہ آیا" بھلا اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے! بیوقوف کہیں کا۔ چیزیں اسی طرح تو یاد کی جاتی ہیں" اس نے سوچا اور پھر سے آنکھیں بند کر لیں لیکن جلد

اس نے کتابیں سمیٹ لیں اور نیچے چلی آئی "یہ مجھے پڑھنے نہیں دے گا" اب نیچے جا کر ہی پڑھوں گی"

سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا وہ ابھی تک وہیں کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نیچے آکر اس نے دو مرتبہ پوری آنکھیں بند کرکے دوہرائی اور پھر کاپی کھول کر لکھنے بیٹھ گئی۔

"آخری تھا کون ہے ۔۔۔ لکھتے لکھتے وہ رک گئی "خیر ہوگا کوئی مجھے کیا غرض" اس نے پھر لکھنا شروع کر دیا لیکن دو تین لفظ لکھنے کے بعد وہ بھول گئی۔ اس نے پھر سے آنکھیں بند کرکے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن حروف اس کے ذہن سے پھسلتے ہی چلے گئے۔

"ہائے اللہ! میں بھی کیا کوڑھ مغز ہو گئی ہوں" اس نے اپنے سر کو کتاب سے مارتے ہوئے کہا۔ "کیا ہو گیا ہے میرے دماغ کو۔ یاد ہی نہیں ہوتا" اس نے خود کو کوسا۔

ناکام ہو کر اس نے پھر خلاصہ کھول لیا۔ ایک نظر ڈالی تو بھولی ہوئی سب چیزیں یاد آ گئیں مطمئن ہو کر اس نے خلاصہ بند کر دیا اور لکھنے بیٹھ گئی۔ جلد ہی اُسے پھر احساس ہوا کہ اس کے ذہن سے الفاظ پھسلتے جا رہے ہیں اور اس کا ذہن سلیٹ کی طرح صاف ہو گیا ہے۔ اسے خود پر بہت غصہ آیا۔ "اللہ کی مار، ہفتہ امتحان میں رہ گیا ہے اور یہاں کچھ یاد ہی نہیں ہو رہا۔"

اس نے پھر سے خلاصہ کھول لیا۔ ایک دم سب کچھ اسے یاد آ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے ذہن میں قمقمے سے جل اٹھے ہوں۔ اس نے کتاب بند کرکے لکھنا شروع کر دیا۔ اب کی بار وہ آخری سطروں پر آکر رک گئی اور جب وہ حصہ یاد کرنے میں ناکام رہی تو اس نے جھنجلا کر کاپی پٹخ دی "جانے کیا گوبر بھرا ہوا ہے میرے ذہن میں"

"کیا کروں" وہ سوچنے لگی۔ "شہزاد کے ہاں چلی جاؤں؟ لیکن وہ بھی تو پڑھ رہی ہوں گی" اس نے سوچا۔ اٹھ کر اس نے الماری کھولی۔ سامنے کہانیوں والی کتابیں پڑی تھیں۔ یہ کتابیں چند روز ہوئے وہ شہزاد سے مانگ کر لائی تھی۔ اس نے ایک کتاب اٹھائی۔ اوپر جن کی تصویر بنی ہوئی تھی جس نے شہزادی کو اٹھا رکھا تھا۔ اس نے جھنجلا کر کتاب پھینک دی۔ "ہوگی وہی بکواس۔ ایک جن شہزادی کو اٹھا لے جاتا ہوگا اور ایک شہزادہ اسے بچانے کو نکل پڑتا ہوگا۔ یہ کمبخت شہزادے ہر جگہ یوں ہی موجود ہوتے ہیں۔" وہ بستر پر لیٹ گئی اور لیٹے لیٹے انگلیاں چٹخانے لگی۔

"آخر میں نیچے اُتری کیوں آئی؟ مجھے کیا تھوڑا جاتا؟ وہاں بیٹھ کے کیوں نہ پڑھتی رہی؟" اس نے بہت سوچا لیکن اس سوال کا جواب اُسے نہ مل سکا۔ اُسے اپنے اوپر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اس نے خلاصہ اور کاپی اٹھائے اور پھر چھت پر چلی گئی۔ سامنے والا کوٹھا خالی تھا۔ شاید وہ جا چکا تھا اس نے بیٹھ کے پڑھنا شروع کر دیا لیکن جلد ہی اکتا کے اس نے کتاب بند کر دی اور چھت پر بے مقصد ٹہلنے لگی۔ اکتا گئی تو باہر گلی میں جھانکنے لگی کتنی دیر تک وہ اس طرح باہر دیکھتی رہی۔ پھر وہ پلٹی تو سامنے والا کوٹھا اسی طرح خالی تھا۔ اس نے خلاصہ بغل میں مارا اور نیچے اُتر آئی۔

"آدمی چھوٹی ساری"

"میں نے مکھی ماری"

بڈو سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ رہا تھا۔ وہ تختی ہلا رہا تھا اور زور زور سے چلا بھی رہا تھا۔ اس کے کپڑے مٹی میں لت پت تھے اور منہ پر اور کپڑوں پر جگہ جگہ سیاہی کے داغ لگے ہوئے تھے

"کیا ٹر ٹر لگا رکھی ہے؟ آ گیا ہے کان کھانے کو۔ منہ تو دیکھو لے آئینے میں اپنا۔ چوہڑا چمار۔ جی چاہتا ہے ماروں ایک تھپڑ تیرے منہ پر۔" وہ دہاڑی تو بڈو سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ دیر تک تو وہ سہمی سہمی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا اور پھر بستہ پٹخ کر زور زور سے رونے لگا۔

شمع پرویز

فن شناس

(پکار کر) کلو —

جی سرکار — میں تو یہیں کھڑا ہوں آپ کے پاس۔

کیا بج گیا؟

سرکار گھڑی تو آپ کی کلائی پر بندھی ہے۔

اوہ! ساڑھے گیارہ بج گئے اور وہ لوگ ابھی تک نہیں آئے

کون لوگ حضور؟

ارے ایک سیٹھ صاحب ہماری تصویریں خریدنے آرہے ہیں۔ سنا ہے فن کے بڑے دلدادہ ہیں

(خوش ہوکر) کیا سچ سرکار؟

ہاں۔ یہ تینوں تصویریں آج شرطیہ بک جائیں گی۔ سیٹھ صاحب نے نیا بنگلہ بنوایا ہے۔ اس کی آرائش کے لئے انھیں فن کے اعلیٰ نمونوں کی تلاش ہے — مگر میں تجھ سے کیوں کہہ رہا ہوں؟ بھلا تو کیا جانے فن کیا ہوتا ہے؟

واہ سرکار! بھلا کیوں نہیں جانتا؟ آپ سمجھتے ہیں مجھے ان تصویروں سے سروکار ہی نہیں؟

(ہنس کر) اچھا تو بتا ذرا ان تینوں میں سے کون سی تصویر سب سے اچھی ہے؟

وہ والی سرکار جس میں ایک دوسیزہ (دوشیزہ) کالے کالے بال کھولے اداس بیٹھی ہے۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہیں۔ میں اس تصویر کو [illegible] گھنٹہ دیکھا کرتا ہوں۔ مجھے یہ بہت اچھی لگتی ہے۔ سرکار... یہ اکیلی تصویر ایک ہزار کی ہے۔

(آہ بھر کر) اس میں تو میرا دل ہے۔ میرے جگر کے لہو سے بنی ہے یہ تصویر —

حیرت سے کیا کہا سرکار؟ کس کے لہو (خون) سے بنی ہے یہ تصویر؟

تم نہیں سمجھو گے کلو — یہ آرٹسٹ کی زبان ہے — اس کے دل کی آواز ہے۔ تم نہیں سمجھو گے۔

بہت اچھا سرکار۔ میرے لئے اب کیا حکم ہے؟

تم باہر جاکر بیٹھو۔ جیسے ہی وہ لوگ آئیں مجھے اطلاع کر دینا۔

بہتر سرکار — (باہر گھنٹی بجتی ہے) لیجئے سرکار وہ لوگ آگئے۔ میں انھیں اندر لے آتا ہوں۔

آرٹسٹ: آئیے سیٹھ صاحب تشریف لائیے — تسلیم عرض کرتا ہوں

سیٹھ: (ہنس کر) معاف کرنا بھائی ہم کو دیری ہو گئی۔ آپ کو تو ٹائم (ٹائم) دیا تھا۔ ہم بھول گئے۔ نیلم جی کو بھی یاد نہ رہا۔ ٹھیک گیارہ بجے یاد آیا تو ابھی ٹیم
کچھ بجنس (بزنس) والے لوگ آگئے تو اور دیر ہو گئی۔ آؤ نیلم جی تم بھی اندر آ جاؤ

آرٹسٹ: ابھی ہوئی آواز ہیں، کوئی بات نہیں۔ میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ آپ تشریف لائے۔

سیٹھ: اچھا آرٹسٹ صاب — ہم کو وہ تصویریں دکھا دو — جو ہم کو گودام چیک کرنے جانا ہے۔

آرٹسٹ: تصویریں یہ آپ کے سامنے لگی ہیں ملاحظہ فرمائیے —

سیٹھ: آؤ نیلم جی — تم بھی دیکھو آرٹسٹ صاب کی تصویریں —

آرٹسٹ: سیٹھ صاحب یہ پہلی تصویر بچپن کی — بھولپن — سادگی اور معصومیت کی —

سیٹھ: بچپن کی؟ کس کے بچپن کی؟

آرٹسٹ: انسان کے بچپن کی —

سیٹھ: پن اس انسان کا کوئی نام تو ہوگا؟ کیوں نیلم جی؟

آرٹسٹ: (جل کر) حضور یہ میرے بچپن کی تصویر ہے۔

سیٹھ: ہی ہی ہی — آؤ نیلم جی تم بھی دیکھو آرٹسٹ صاب کے بچپن کا فوٹو۔

نیلم: ہی ہی ..... بچپن میں تو بہت موٹا تھا آرٹسٹ صاب — اب کیا ہو گیا؟ ایک دم سوکھ گیا۔

سیٹھ: آرٹسٹ صاب — تصویر تو بہت اچھی ہے، ہم کو پسند آئی۔ پن ایک مشکل ہے — یہ فوٹو اگر ہم اپنے بنگلے میں لگائیں گا تو وہ جو ہمارا پوتا ہے نا!
وہ ناراج ہو جائیں گا۔

آرٹسٹ: (حیرت سے) پوتا ناراض ہو جائے گا! کیوں؟

سیٹھ: وہ بولیں گا کہ اس کی جگہ میری تصویر لگا۔ بچے لوگ تم جانو بہت جدی (ضدی) ہوتے ہیں —

آرٹسٹ: (مایوسی سے) اچھا اسے چھوڑیئے — یہ تصویر ملاحظہ فرمائیے — یہ حسن سوگوار کی تصویر ہے۔

سیٹھ: حسن سوگوار؟ یہ کیا نام ہوا؟ کون ہے یہ؟ آؤ نیلم جی تم بھی دیکھو چھوکری کی تصویر۔

آرٹسٹ: یہ ایک غمگین دوشیزہ کا عکس جمیل ہے

سیٹھ: غمگین دوشیزہ؟ کیوں کیا گم (غم) ہے اس کو؟

آرٹسٹ: زندگی کے بہتیرے غم ہوتے ہیں سیٹھ صاحب — آپ کیا جانیں —

نیلم: ایسا نہ کہیے آرٹسٹ صاب — ہمارے سیٹھ صاب بڑی سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ پورے بازار میں ان کی ٹکر کا دوسرا بیوپاری نہیں —

سیٹھ: فوٹو تو چھوری کی بہت کم بصورت ہے۔

نیلم: اس میں کیا شک ہے — چھوری کی صورت اچھی بنائی ہے آرٹسٹ صاب نے۔

سیٹھ: یہی تو بات ہے — ہماری سیٹھانی اس کو ہرگز کوٹھی میں نہیں لگانے دے گی۔ عورت جات تم جانو دوسری عورت کی فوٹو سے بھی کھار رکھا

کھاتی ہے۔ ہی … ہی … ہی …

کمار کمانے کی بات بھی ہے سیٹھ جی۔

اچھا تو اسے ملاحظہ فرمائیے ——— بڑھاپے کی تصویر ہے

آؤ فہیم جی ——— تم بھی دیکھو بڈھے کی تصویر ——— ارے فہیم جی ——— یہ تو اپنا مستری دلاور خاں لگے ہے ——— ہی … ہی ۔ ہی

اس میں تو کوئی کام کی بات نہیں ۔ بس ایک بڈھا بیٹھا ہے ۔

بڑھاپا زندگی کا نچوڑ ہوتا ہے سیٹھ صاحب ۔ اس تصویر میں ہر انسان اپنے مستقبل کا عکس دیکھ سکتا ہے ۔ دیکھئے ——— یہ انسان زندگی کا طویل سفر طے کر کے ——— تھک ہار کر اس رہگذار پر بیٹھ گیا ہے ۔

بھئی بڑھاپے میں اتنا پیدل نہیں چلنا چاہیئے تھکن ہو جاتی ہے ۔

اس بڈھے کے پاس موٹر وٹر کچھ نہیں ؟

(غصے سے) جی ہاں ——— اس غریب کے پاس موٹر ہے نہ تانگہ ، نہ سائیکل نہ گدھا گاڑی کچھ بھی نہیں ——— بس یہی دو ٹانگیں ہیں ——— آپ کو کوئی اعتراض ہے ؟ بولیئے آپ کو کوئی اعتراض ہے ؟

باپ رے باپ ۔ آرٹسٹ صاب تو ناراج ہو گیا ——— ہم تو خالی یہ پوچھا کہ یہ بڈھا گریب ہے تو سیٹھ صاب اس کو نوکری دلائیں گا ۔

آپ تشریف لے جائیے ——— میں کہتا ہوں ——— آپ اسی وقت یہاں سے تشریف لے جائیے ۔

آؤ فہیم جی ——— آرٹسٹ صاب تو بہت ناراج ہو گیا ——— ہم تو کچھ بولا بھی نہیں ——— آؤ ۔ فہیم جی ہم کو گودام چیک کرنے جانا ہے ادھر بہت دیری ہو گئی ——— (جاتے ہیں)

(پکار کر) کلو ——— ارے او کلو ———

جی سرکار ———

یہ تینوں تصویریں اتار کر یہاں رکھ دو ——— میرے قریب ——— یہ … میرے دل کے ٹکڑے ہیں ۔ انہیں یہاں لے آؤ میرے پاس ——— (آواز جذبات کی شدت سے بھرا جاتی ہے) میرے … پاس ۔ لے آؤ انہیں ———

(بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

ڈراما

اصغر بٹ

ویرانہ

وقت: شام کے پانچ بجے ہیں۔ منظر: ایک چھوٹا سا دفتر کا کمرہ۔ پیچھے اور بائیں جانب دروازے ہیں۔ دائیں جانب دفتری میز اور کرسی اور ملنے والوں کے لئے دو کرسیاں سامنے رکھی ہیں۔ میز کے برابر سامنے کو ایک چھوٹی تپائی پر ٹیلیفون رکھا ہے اور پچھلی دیوار کے قریب چھوٹی تپائی پر بجلی کی کیتلی لگی ہے۔ میز پر بجلی کا لیمپ روشن ہے۔ ایک طرف رنگ برنگ کی فائلیں ترتیب سے رکھی ہیں۔ کرسی پر تقریباً پچیس برس کی سنجیدہ لڑکی چشمہ لگائے ایک مسودہ کا مطالعہ کر رہی ہے۔ قلم سے کاٹ کاٹ کر اس پر کچھ لکھتی جا رہی ہے۔ لڑکی نہ تو بہت اچھی شکل کی ہے اور نہ ہی بُری شکل کی۔ پچھلے دروازے سے پردہ ہٹا کر ایک قریباً پچاس برس کا سفید ریش آدمی داخل ہوتا ہے۔ اس نے کرتا پاجامہ پہن رکھا ہے۔ ایک ہاتھ میں زرد رنگ کا کاغذ ہے اور دوسرے ہاتھ میں قلم۔ ذرا خمیدہ کمر سے چلتا ہے۔

لڑکی: (مسودے سے نگاہ اُٹھا کر) کیوں کیا ہے شکور؟

شکور: وہ جی پریس سے آدمی آیا ہے۔ کہتا ہے ساری کاپیاں لگا دی ہیں۔ اداریے کے لئے کام رکا ہوا ہے۔ وہ جلدی سے بھجوا دو

لڑکی: تو مجھ سے کیا کہتے ہو؟ ناظر صاحب سے کہو۔ اداریہ انھیں لکھنا۔

شکور: ہر دفعہ یہی ہوتا ہے کہ انھیں لکھنا ہوتا ہے اور آخر لکھنا آپ کو پڑتا ہے۔

لڑکی: ٹھیک ہے لیکن مدیر وہ ہیں۔ میں تو محض معاون ہوں۔ وہ کہیں گے تو میں لکھ دوں گی لیکن اپنے طور پر کیسے لکھ دوں۔

شکور: وہ سارا دن اشتہاروں کے چکر میں رہتے ہیں انھیں لکھنے کی فرصت کہاں ہو گی۔

لڑکی: اب تو اچھا خاصہ چلنے لگا ہے پرچہ۔ ماہنامہ سے ہفتہ وار پر آ گئے ہیں اور اشتہار کے لئے لوگ خود بھی آنے لگے ہیں۔ اب تو لکھنے پڑھنے کا وقت نکل سکتا ہے۔

شکور: (پلٹتے ہوئے) دیکھ لیجئے وہ آپ ہی سے کہیں گے۔

لڑکی: کہانی کی کتابت ہو گئی ہے کیا؟

شکور: جی کر رہا ہوں۔

[پچھلے دروازے سے پردہ اٹھا کر قریباً تیس برس کا آدمی داخل ہوتا ہے۔ ذرا لمبا قد اور جسم دبلاپے کی طرف مائل۔ ایک ہاتھ میں کوٹ اُٹھائے ہوئے۔ ٹائی ڈھیلی حالت میں لٹک رہی ہے۔ بتلون: نہ زیادہ ماڈرن نہ پرانی وضع کی۔ بالکل معقول چشمہ لگائے ہوئے ہیں

ر: (لڑکی سے) رفیعہ اس پریس کے آدمی کو روانہ کر دینا (سامنے کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) ابھی اداریہ نہیں لکھا تم نے؟

م: بہت خوب! مدیر کون ہے؟ میں یا آپ ناظر صاحب؟

ر: بھئی میرے پاس اور ضروری کام تھوڑے ہیں! آخر معاون رکھا کس لئے جاتا ہے؟

م: بیگار کے لئے

ر: (مشکور سے) مشکور اب وقت بالکل نہیں ہے۔ کل پرچہ نکل آنا چاہئے۔ پچھلی دفعہ بھی ایجنٹ نے شکایت کی تھی۔

م: اچھا جی۔

ر: (اٹھ کر واپس پچھلے دروازے کی طرف بڑھتا ہے) مسطر بہی لکھوا دیں گی آپ کے جیسا پچھلے مہینے لکھوایا تھا۔ بیٹھ جاؤ سامنے، وقت بالکل نہیں ہے۔

(پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے)

ر: دیکھا میں نے کیا کہا تھا!

م: (بے بسی سے سانس لے کر کلائی پر گھڑی دیکھتی ہے) پانچ بجے ہیں اور صبح دس بجے سے کولہو کے بیل کی طرح کام کر رہی ہوں۔ اب تو مجھ سے بالکل کچھ نہیں ہوگا۔ چائے پی کر پھر کام کروں گی۔ چھ بجے آئیے گا مشکور صاحب

(اٹھتی ہے، میز میں سے چائے کے برتن نکالتی ہے اور بجلی کی کیتلی کا بٹن دبا دیتی ہے)

م: اچھا چائے بن جائے تو مجھے بھی آواز دے دیجئے (پلٹ کر پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے)

م: ہاں ہاں کیوں نہیں۔

(بائیں جانب بیرونی دروازے سے ایک نوجوان لڑکی جھانکتی ہے)

: میں آسکتی ہوں رفیعہ بہن؟

م: (مسکرا کر) آؤ آؤ نگہت!

(نگہت تقریباً بیس برس کی ہنس مکھ اور خوبصورت لڑکی ہے۔ باس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی غریب گھر سے ہے۔ ہاتھ میں معمولی سا پرس ہے۔)

ن: خوب چائے کے وقت پر آئی (آ کر سامنے کی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور میز پر پڑے مسودے کو جھک کر دیکھتی ہے) او اب کے تو بہت ہی برا لکھا ہے میں نے۔

م: (چائے کے برتن درست کر کے دودھ کا ڈبہ ڈھونڈ رہی ہے) نہیں تو اچھا خاصہ ہے

ن: خاک اچھا خاصہ ہے سارا تو آپ کا لکھا ہوا لگ رہا ہے۔ میرا تو بس یونہی نام ہو جائے گا۔

م: (بدستور چائے کے سلسلے میں مصروف) بڑے تعریفی خطوط آ رہے ہیں تمہارے مزاحیہ خاکوں کے تصویر لائی ہو؟ بعد فرمائشیں ہو رہی ہیں تمہاری تصویر کے لئے۔

ن: (پرس میں سے ایک تصویر نکال کر دیتی ہے) تصویر تو لے آئی ہوں لیکن اچھی نہیں آئی۔

م: مسودے پر ہی رکھ دو۔ اگر تمہاری صورت کا دسواں حصہ بھی آگیا ہے اس میں تو دلوں میں کہرام مچانے کو بہت ہے (قریب آ کر تصویر اٹھا کر دیکھتی

ورنہ اب تمہارے ذہنی انگاں کی خیر نہیں! ایسی ایسی بُری دو چار تصویریں اور مل جائیں تو نظمی کام دوبار کر سکتے ہیں ہم لوگ۔

نگہت: آپ میری حوصلہ افزائی کرتی رہتی ہیں۔

رفیعہ: پہلی نعم آ ناظر صاحب بھی پڑھ کر پھڑک گئے (تصویر وہیں سامنے رکھ دیتی ہے) کہنے لگے کہ خوب لکھتی ہے تمہاری سہیلی۔

نگہت: خیر پچھلے خانے میں تو سوائے عنوان اور دستخطوں کے اور کوئی چیز تھی ہی نہیں میری۔ آپ نے ناظر صاحب کو بتا دیا ہوتا۔

رفیعہ: میں اس قسم کی چیزیں ناظر صاحب کو نہیں بتایا کرتی۔

نگہت: کیوں؟

رفیعہ: وہ مجھے بیحد خشک، سنجیدہ، اور شریف سمجھتے ہیں اور مرعوب رہتے ہیں۔ اگر انھیں میری غیر سنجیدہ کاوشوں کا پتہ چل گیا تو ایک تو رعب ہو جائے گا، اور پھر دوسرے ہی دن نکال باہر کریں گے

نگہت: تو آپ کو نوکری کی ایسی کیا ضرورت ہے؟

رفیعہ: یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔

نگہت: پیسے کی ضرورت ہوتی، وہ بھی نہیں۔ آپ تو شہرت کی خاطر بھی کچھ نہیں کرتیں۔ اداریے ناظر صاحب کے نام سے لکھتی ہیں، مز میرے نام سے اور کہانیاں نہ جانے کس کس کے نام سے۔ آپ کا اپنا نام تو کہیں ہوتا نہیں میری تو بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کس لئے کرتی ہیں (رفیعہ واپس اپنی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

رفیعہ: ہاں خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتا چنانچہ میں نے سوچا ہے کہ یہ کام چھوڑ ہی دوں (میز کے دراز میں سے ایک کاغذ نکال کر نگہت کے سامنے) اس کاوش کے بارے میں کیا خیال ہے؟

نگہت: (جلدی سے دیکھ کر) یہ تو استعفیٰ لکھا ہوا ہے آپ کی طرف سے (ذرا پریشانی سے) کیا مطلب؟ یعنی آپ واقعی چھوڑ کر جا رہی ہیں؟

رفیعہ: سوچ رہی ہوں

نگہت: کیا کوئی اور کام مل گیا ہے؟

رفیعہ: نہیں۔ میں نے ڈھونڈا ہی نہیں۔

نگہت: تو۔؟

رفیعہ: میں جو اپنا خون پسینہ ایک کر رہی ہوں تو کاہے کے لئے رسالے کے لئے؟ سو وہ اب چلنے لگا ہے اور میرے بغیر بھی چلے گا کے لئے؟ تو ہمارے لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ذاتی مروت کے لئے؟ تو آخر کب تک؟

نگہت: میرا خیال ہے کہ ناظر صاحب آپ کو جانے نہیں دیں گے

رفیعہ: کیوں؟

نگہت: اتنے دنوں ساتھ رہا اور۔ یوں بھی تو آپ کے عزیز ہیں نا۔ آپ ہی تو کہہ رہی تھیں کہ آپ کے خالہ زاد یا پھوپھی زاد بھائی

رفیعہ: ہاں (کچھ سوچ کر سر جھکا لیتی ہے) ناظر صاحب کو معاون مدیر چاہئے۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے (سر اٹھا کر) وہ تم بھی ہو سکتی ہو

نگہت: (امید و ناامیدی کے درمیان) نہیں بہن ہمیں کون پوچھتا ہے۔

بسمہ: (اُٹھ کر چائے بناتی ہے اور آواز دیتی ہے) شکور صاحب (نگہت سے) تم شکر کتنی لیتی ہو؟

نگہت: ایک چمچ

بسمہ: (بناکر) لو

نگہت: (پیالی لیتے ہوئے) شکریہ۔ لیکن جہاں تک معاون مدیر کا تعلق ہے (شکور داخل ہوتا ہے)

شکور: جی؟

بسمہ: (چائے کی پیالی اسے دیتے ہوئے) یہ لیجئے آپ کی پیالی بن گئی۔

شکور: (چائے کی پیالی لیتے ہوئے) شکریہ! او جی ماہتاب میک اپ کا نمبر آیا ہوا ہے۔

بسمہ: (حیرت سے) ماہتاب میک اپ؟ کون ماہتاب میک اپ؟

شکور: وہی جی جن کا خط آیا تھا ٹائیٹل پر اشتہار کے لئے۔

بسمہ: تو مجھے کس لئے بتا رہے ہو۔ ناظر صاحب سے ملوادو

شکور: وہ جی چلتے چلتے مجھ سے کہہ گئے تھے کہ شاید وہ آجائے اور ہو سکتا ہے نہ ہی آئے۔ بات پکی نہیں تھی اس لئے انھوں نے انتظار نہیں کیا۔

بسمہ: یہ تو اور سنو نئی بات اب اشتہارات کا کاروبار بھی میرے حوالے ہو گیا۔ صاحب یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ اسے کہہ دو کہ ناظر صاحب سے ہی ملے۔ اور جاؤ ناظر صاحب کو ٹیلی فون کرو۔ کافی ہاؤس میں بیٹھے ہوں گے۔

شکور: جی چونکہ ناظر صاحب کہہ گئے تھے کہ آپ سے ملوادوں اس لئے میں نے اُسے کہا کہ بیٹھئے آپ ابھی بلاتی ہیں۔ اب اگر کہہ کہ آپ نہیں ملنا چاہتیں تو وہ ناراض ہو جائے گا۔ کاروبار کا معاملہ ہے۔

بسمہ: (ذرا جھنجلا کر) اچھا تو بھیج دو۔ غریب خانہ یہ حاضر ہے ہر بلا کے لئے۔

شکور: جی اچھا آپ بات کیجئے۔ میں ناظر صاحب کو بھی تلاش کر رہا ہوں۔

(چائے پیتا ہوا پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے)

نگہت: تو میں چلتی ہوں

بسمہ: نہیں بیٹھو چائے ختم کر کے جانا۔ اور یہ رخ بھی دیکھ لو شاید کبھی اس سے واسطہ پڑے۔ کہاں ہے وہ میرا استعفیٰ (میز سے اٹھا کر پڑھتی ہے) اسے ایک نظر دیکھ لیتی ہوں تو طبیعت میں ایک گونہ سکون سا محسوس ہوتا ہے۔

(بائیں جانب دروازے سے مرد کی آواز)

آواز: میں حاضر ہو سکتا ہوں؟

بسمہ: جی ہاں تشریف لائیے۔

[چھوٹے قد اور موٹے جسم کا ایک آدمی مغربی لباس میں داخل ہوتا ہے۔ شکل نہایت معمولی سبز سی آنکھیں اور ہونٹوں پر ایک بناوٹی سی مسکراہٹ ہے۔]

زدی: میرا نام مبین یزدی ہے۔

رفیعہ: تشریف رکھئے ۔ یہ میری دوست نگہت ہیں ۔
معین: آداب عرض ۔ (نگہت کی برابر والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)
نگہت: آداب عرض ۔
رفیعہ: آپ چائے پیجئے گا ؟
معین: جی پی لیں گے شکریہ ! (رفیعہ اُٹھ کر چائے بناتی ہے) ۔ (نگہت سے) آپ بھی پرچے کے کسی شعبے سے متعلق ہیں ؟
نگہت: جی نہیں مضامین لکھتی ہوں کبھی کبھی ۔
معین: (اچانک گویا پہچان کر گرم جوشی سے) تو نگہت نیّر کے نام سے جو دلچسپ خاکے آپ کے یہاں چھپتے ہیں آپ ہی لکھتی ہیں ۔
نگہت: جی ہاں ۔ شکریہ !
معین: ارے صاحب میں تو آپ کا بیحد دلدادہ ہوں ۔
نگہت: (چونک کر) کیا ؟
معین: (ذرا بوکھلا کر) جی میرا مطلب ہے آپ کے مضامین کا دلدادہ ہوں ۔ واہ واہ کیا مزاح پیدا کرتی ہیں آپ ، کیسے پیدا کرتی ہیں
نگہت: آپ ہی لوگوں سے مل کر کچھ حاصل ہو جاتا ہے

(رفیعہ ہنستی ہے)

معین: شکریہ شکریہ ، یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے ۔ ابھی تک ہم اس سعادت سے محروم تھے لیکن اب انشاءاللہ ملاقات ہوتی رہے
نگہت: جی کیا ۔؟
معین: (ذرا بوکھلا کر) جی میرا مطلب ہے یہیں دفتر میں ، یعنی رفیعہ صاحبہ سے ملنے آپ تو آتی ہی ہوں گی مجھے بھی اشتہارات کے آنا ہی ہوگا ۔
رفیعہ: (معین کو چائے پیش کرتی ہے) یہ لیجئے چائے ۔
معین: (جلدی سے اُٹھ کر) جی آداب عرض ۔ شکریہ !

جلدی سے چائے پیتا ہے اور چائے چونکہ گرم ہے اُسے نگلتے ہی زبان باہر نکل آتی ہے ۔)

رفیعہ: میں بتانا بھول گئی کہ چائے ذرا گرم ہے
معین: جی نہیں کوئی بات نہیں ۔ ہم ہر گرم و سرد زمانہ کے عادی ہیں ۔
نگہت: بہت خوب !
معین: جی آداب عرض کرتا ہوں ۔
رفیعہ: آپ نے بڑی ادب دوست طبیعت پائی ہے
معین: (نگہت کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے) ابجی کون پوچھتا ہے ادب دوستی کو اس زمانے میں ۔
رفیعہ: (مضمون بدل کر) آپ اشتہارات کے سلسلے میں کچھ فرمانے والے تھے ۔

یمین : جی ہاں حاضر تو اشتہارات کے سلسلے میں ہی ہوا تھا لیکن بات ذرا دلچسپ چل نکلی۔

یسمہ : بے شک، آپ بھی ان تمام دلچسپ باتوں کو مضمون کی شکل میں لکھ ڈالئے، ادب پارہ بن جائیں گی۔ زبانی باتوں میں یہ جوہر قابل نہ گنوائیے۔

یمین : (اب خود اعتمادی واپس آجاتی ہے) ارے صاحب یہ کاروبار کا دھندا نہ ہوتا تو ہم بھی کچھ لکھتے۔ بہت شوق تھا لکھنے پڑھنے کا کسی زمانے میں۔

یسمہ : (اسے دالیں پٹری پر لانے کی کوشش میں) ماہتاب میک اپ کا کارخانہ آپ ہی کا ہے نا؟

یمین : (انکساری سے) جی میں کس لائق ہوں۔ آپ ہی کا ہے

یسمہ : تو اشتہار اسی میک اپ کے سامان کے بارے میں غالباً ہوگا۔

یمین : جی ہاں۔ دراصل آپ کا پرچہ خواتین میں خاص طور پر مقبول ہے (نگہت کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے) نگہت نور صاحبہ کے مضامین بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

ہت : خواتین کے علاوہ آپ بھی تو پڑھتے ہیں۔

یمین : بے شک۔ بے شک۔ میرا مطلب یہ تھا کہ عورتوں اور مردوں میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ چنانچہ اس میں میک اپ کا اشتہار نہایت موزوں رہے گا۔

ہت : تو مردوں کے لئے بھی میک اپ کا سامان تیار ہوتا ہے آپ کے ہاں؟

یمین : جی مردوں کے لئے؟ میرے خیال میں مردوں کو تو میک اپ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تو ویسے ہی اچھے خاصے ہوتے ہیں لیکن عورتوں کے لئے میک نہایت ضروری ہے۔

ہت : یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں یعنی عورتیں میک اپ کے بغیر اچھی خاصی نہیں ہوتیں؟

یسمہ : (ٹوک کر) نہیں نگہت ان کا مطلب یہ ہے کہ میک اپ عورت کے حسن کو اور نکھار دیتا ہے اور مرد میں تو حسن ہوتا ہی نہیں جسے نکھارنے کی ضرورت ہو۔

یمین : بے شک۔ بے شک (پھر چونک کر) جی نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا خیر اس بحث میں کیا پڑیں۔ ہمیں تو میک اپ بیچنا ہے۔ اسے عورتیں استعمال کریں یا مرد۔ جو حسین ہے، میک اپ سے حسین تر ہو جائے گا اور جو کرہ ہے وہ کم بدتر ہو جائے گا۔ میرا مطلب ہے وہ بھی بہتر ہو جائے (چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے) ماشاء اللہ بہت اچھی چائے تھی۔

سہ : تو کون سے صفحے کے لئے ہوگا یہ اشتہار اور کے مرتبہ کے لئے؟

ین : خیال تو ٹائٹل کے لئے تھا۔

یسہ : ٹائٹل پر تو ہمارے ہاں آپ نے دیکھا ہوگا اشتہار ہوتا ہی نہیں۔ ٹائٹل کی دوسری جانب البتہ ہو سکتا ہے۔

ین : میرے ذہن میں یہ تھا کہ اگر کسی مشہور خاتون کے بارے میں پرچے میں کچھ چھپ رہا ہو تو ٹائٹل پر اس کی تصویر چھاپ دی جائے اور نیچے لکھ دیا جائے کہ یہ ماہتاب میک اپ استعمال کرتی ہیں۔

سہ : (سوچتے ہوئے) اب کے بیگم خود غرض پر ایک نوٹ چھپ رہا ہے۔ ٹائٹل پر اس کی تصویر دینے کا ارادہ تو نہیں تھا لیکن اگر آپ

ٹائیٹل خرید رہے ہوں تو ـــــ

معین: (جلدی سے رُک کر) نہیں نہیں آپ سمجھیں نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ کسی بھی خاتون کے بارے میں کچھ چھپ رہا ہو تو آپ ہمارا اشتہار لگا

رفیعہ: تو؟

معین: میرا مطلب یہ تھا کہ ان کو تو شاید زیادہ لوگ جانتے بھی نہ ہوں گے۔ کوئی ایسی خاتون ہوں جنھیں ہر شخص جانتا ہو جن کے بارے میں ذہن پر زور نہ ڈالنا پڑے۔

نگہت: مثلاً ملکہ ترنم؟

معین: (جھنک کر) جی نہیں ـــ جی ہاں مشہور تو وہ بے شک ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کی تصویر کہاں سے آئے گی۔

رفیعہ: اور اگر ہو بھی تو غالباً ان کے ساتھ کوئی اشتہار موزوں نہ رہے گا۔

معین: قطعی قطعی ـــ جی نہیں ـــ ظاہر ہے کہ ایسی گستاخی کی کون جرأت کر سکتا ہے۔

رفیعہ: فلم ایکٹرسوں کی تصویریں تو بہت موزوں رہیں گی لیکن وہ ہم ٹائیٹل پر چھاپتے نہیں

معین: (میز پر سے نگہت کی تصویر اُٹھا کر کھڑا ہو جاتا ہے) اگر نگہت نور صاحبہ کو اعتراض نہ ہو تو ہمارے میک اپ کو ان کے ساتھ منسوب ہونے پر بڑا فخر محسوس ہوگا۔

نگہت: (ذرا جھینپ کر) جی نہیں۔ میں معذرت چاہتی ہوں

معین: (ناامیدی سے) اس سے بہتر جوڑ سوجھ نہیں سکتا (تصویر رکھ کر بیٹھ جاتا ہے رفیعہ تصویر اُٹھا کر میز کے دراز میں رکھ دیتی ہے)

رفیعہ: اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ ٹائیٹل پر اشتہار آ نہیں سکتا۔ اب آخری صفحے کے لئے کچھ سوچئے۔

نگہت: اگر آخری ہی صفحے پہ چھپنا ہے تو نرمی صاحب کی اپنی تصویر کیوں نہ چھپ جائے۔

رفیعہ: اس عنوان کے ساتھ کہ یہ جناب میک اپ استعمال کرتے ہیں؟

نگہت: نہیں بلکہ یہ کہ جناب میک اپ بناتے ہیں۔ صنعت اور صنعتکار دونوں کی شہرت ہو جائے گی۔

معین: (سوچتے ہوئے) خیال تو برا نہیں ہے۔

نگہت: بلکہ اگر میک اپ کو فروغ دینے کے لئے آپ اپنا رسالہ بھی شروع کر دیں تو شہرت کئی گنا بڑھائی جا سکتی ہے۔

رفیعہ: اور رسالے کا نام ہو "میک اپ" یا اور نام رکھنا ہو تو "سنگار"۔ اپنا رسالہ بہرحال اپنا رسالہ ہوگا۔

معین: (چونک کر) واللہ ـــ واقعی اس بارے میں مزید سوچنے کی ضرورت ہے (اُٹھ کھڑا ہوتا ہے)

رفیعہ: تو آپ چل دیئے؟

معین: جی ہاں۔ فی الحال آخری صفحے کے لئے میں اپنی تصویر بھجواتا ہوں (دروازے کی جانب بڑھتا ہے)

رفیعہ: بہت خوب

نگہت: اگر تصویر جوانی کی ہو تو زیادہ موزوں رہے گی۔

معین: (رک کر) تو کیا آپ کے خیال میں اب میں بوڑھا لگ رہا ہوں؟

س: نہیں بھئی مطلب یہ تھا کہ تصویر اگر دو ایک برس پہلے کی بھی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں ہوگا۔

ین: ہاں ظاہر ہے کیا مضائقہ ہو سکتا ہے اور سچ پوچھیے تو ہم نے میٹرک کے بعد کبھی تصویر کھنچوائی ہی نہیں۔ کون ان فوٹوگرافروں کے چکر میں پڑے۔ تصویر اتروانے جائیے تو بالکل کاٹھ کے الّو کی طرح بٹھا دیتے ہیں اور پھر طرح طرح کی فرمائشیں کہ یہ پہلو دبا کر بیٹھیے اور اب وہ پہلو دبا کر بیٹھیے۔ پورا پیٹ کوئی دبا دے تو سانس کیسے لے۔

س: (ہمدردی کے لہجے میں) ظاہر ہے ظاہر ہے۔

ت: اور اوپر سے کہتے ہوں گے "ہنسو بھی"۔

ن: جی ہاں۔ آپ بتائیے کہ اگر ہم سانس روکے بیٹھے ہیں تو ہنسیں کیسے!

س: وہ میٹرک والی تصویر ٹھیک رہے گی۔ آپ بے تکلف بھیجیے۔ اکثر مشہور لوگوں کی تصویریں میٹرک ہی کے زمانے کی ہوتی ہیں۔

ت: اصل میں پرانے زمانے کے فوٹوگرافر بھی اچھے ہوتے تھے۔ اب تو اگر کسی سے تصویر بنوائیے گا تو وہ انتہائی غیر ذمہ داری سے بنائے گا۔ کمر کا ناپ کچھ بھی آئے اس کی بلا سے۔

ین: (ذرا سانس اندر کھینچ کر) یہ تو درزی نے کوٹ ذرا کھلا بنا دیا ہے اس لئے کمر کے پھیلاؤ کا شبہ ہوتا ہے۔ کوٹ نہ ہو تو دیکھئے۔ فوٹوگرافر چاہے بھی تو بگاڑ نہیں سکتا۔ اچھا خدا حافظ!

(یونہی سانس رکے رکے اکڑے اکڑے بائیں جانب سے نکل جاتا ہے)

س: ہائے بیچارہ۔

ت: بیچارہ کیوں؟

س: آج سے کھانا پینا ختم کردے گا۔ دیکھ لینا۔

ت: کمر کا ناپ ٹھیک کرنے کے لئے؟

س: اور اس کے بعد تمہاری شامت آئے گی۔

ت: واہ کیوں؟

س: جب کوئی مرد فاقے کاٹنے لگا کسی لڑکی کے لئے تو ظاہر ہے اس کا پیچھا بھی کرے گا۔

ت: (ہنس کر) رفیعہ بہن آپ کو سیدھی سادی باتوں میں بھی رومان نظر آنے لگتا ہے۔

س: اگر ایسا ہوتا تو زندگی بڑی اچھی گذرتی۔ مشکل یہی ہے کہ مجھے سیدھی سادی باتوں میں رومان نظر نہیں آتا جہاں ہوتا ہے وہیں نظر آتا ہے اور جہاں نہیں ہوتا وہاں مجھے ویرانہ بھی صاف نظر آنے لگتا ہے۔

(تھوڑی دیر خاموشی چھا جاتی ہے)

ن: اچھا تو میں اب چلتی ہوں۔ چائے کا شکریہ۔ (اٹھتی ہے)

س: مجھے بھی تو چلنا ہے۔ اکٹھے چلتے ہیں (اٹھتی ہے)

ن: آپ کو تو ابھی اداریہ لکھوانا ہے۔

رفیعہ: (ریکارڈنگ روم سے) ہاں — ہاں — اچھا تو جاؤ تم۔ (آواز دیتی ہے) شکور! ذرا مسطر لیتے آنا۔

نگہت: تو یوں کیوں نہ کریں کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں آ جاؤں اور پھر اکٹھے چلیں۔

رفیعہ: تم میری وجہ سے خواہ مخواہ کیوں رکو۔

نگہت: نہیں مجھے دراصل اپنی بھانجی کے لئے فراک کا کپڑا لینا ہے۔ آپ کے برابر میں جو دوکان ہے وہاں سے لیتی ہوں۔ واپسی پہ چھانٹ لوں گی۔ اگر آپ کا کام ختم ہو چکا ہو تو اکٹھے چلے چلیں گے۔ ٹھیک ہے نا۔ (پھر ذرا رک کر) اور ہاں رفیعہ بہن وہ جو میں سکول میں کام کرتی تھی چھوڑ دیا میں نے

رفیعہ: ارے اچھا! تو اب کیا بیکار رہو گی؟

نگہت: بیکار رہنے سے گھر کا سلسلہ کیسے چلے گا۔ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت تو کرنی ہی پڑے گی۔

رفیعہ: کوئی ہے نظر میں؟

نگہت: اُستانی کی نوکری تو مل ہی جائے گی۔ اگرچہ تنگ آ گئی ہوں بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے۔

رفیعہ: اچھا تم آؤ تو اور باتیں ہوں گی اس بارے۔

نگہت: تو میں ابھی آئی رفیعہ بہن (بائیں جانب سے نکل جاتی ہے)

(شکور پچھلے دروازے سے مسطر، قلم اور دوات لئے داخل ہوتا ہے اور نگہت والی کرسی پر بیٹھ کر مسطر پھیلاتا ہے)

رفیعہ: (میز سے ہٹ کر سوچتے ہوئے ٹہلتی ہے اور آہستہ آہستہ لکھواتی ہے) ہم لوگ ہر ہفتے یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لئے زیادہ سے زیادہ ادب پارے، خاکے اور قصے اس پرچے میں پیش کریں اور ان کے ذریعے آپ کے لئے سامان مسرت مہیا کریں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی زندگی اگر پر بہار ہے تو اور پر بہار ہو جائے اور اگر خدانخواستہ تنہا یا اداس ہے تو اس کی تنہائی اور اداسی دور ہو جائے۔ لیکن کبھی آپ نے سوچا کہ ہم لوگ جو اس کاوش میں لگے رہتے ہیں خود کہاں سے مسرت حاصل کریں

(پچھلے دروازے سے ناظر داخل ہوتا ہے)

ناظر: ہائیں ابھی تک لکھوا رہی ہیں!

رفیعہ: ابھی شروع ہی کیا ہے۔

ناظر: شکور نے ٹیلی فون کیا تھا کہ بزمی صاحب آئے ہوئے ہیں — تو چلے گئے وہ؟

رفیعہ: جی ہاں ابھی ایک دو منٹ ہوئے

ناظر: کیا بات ہوئی اُن سے؟

رفیعہ: آخری صفحے کا اشتہار دلا دیں گے

ناظر: ایک دفعہ کے لئے یا زیادہ؟

رفیعہ: یہ تو ابھی بات نہیں ہوئی

ناظر: اور کیا کیا باتیں ہوئیں؟

س: (ذرا چونک کر) آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت اداریہ لکھ رہی ہوں۔ تفصیلات کل پوچھ لیجئے گا۔

ر: اداریے کی کوئی بات نہیں وہ میں لکھوا دوں گا۔ آپ .....

س: (ایک دم غصے سے) اداریہ جائے بھاڑ میں اور یہ پرچہ بھی جائے بھاڑ میں۔ اگر خود ہی لکھوانا تھا تو مجھے کیوں کہا۔ میں جا رہی ہوں اس جہنم خانے سے۔

ر: (ذرا پریشان ہو کر) ابھی آپ خفا کیوں ہو رہی ہیں؟ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی

س: (بدستور غصے میں) نہیں، آپ نے مجھے زرخرید لونڈی سمجھ رکھا ہے۔ پرچہ بھی لکھو، اداریئے بھی لکھو، اشتہار بھی ڈھونڈو۔ اور مجھے کیا ملتا ہے اس میں؟ (میز پر سے استعفیٰ اٹھا کر اس کے سامنے پٹخ دیتی ہے) یہ رہا میرا استعفیٰ۔

ر: (ذرا برہم ہو کر) تو آپ نے پہلے سے لکھ کر رکھا ہوا تھا استعفیٰ؟

س: ہاں۔

ر: تو میرے اوپر کیوں ہاتھ رکھ رہی ہیں (استعفیٰ کو سرسری انداز میں دیکھتا ہے) اگر آپ کو میری بات بری لگی ہے تو میں معافی مانگ لیتا ہوں۔

س: (سر پکڑ کر میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) نہیں میں اب تنگ آ گئی ہوں مجھے یہاں گھٹن محسوس ہوتی ہے مجھ سے یہاں کام نہیں ہوتا۔ بس۔

ر: (شکورے سے) شکور تم جاؤ ابھی۔ تھوڑی دیر میں دیں گے اداریہ۔

(شکور اپنا سامان سمیٹ کر چلا جاتا ہے)

ر: آخر ہوا کیا ہے؟

س: کچھ نہیں۔ (استعفیٰ کی طرف اشارہ کر کے) پڑھ لیجئے۔

ر: (استعفیٰ کو زیرلب پڑھتا ہے اور پھر نظریں اٹھا کر) بہت خوب تو گویا ہمارا دفتر آپ کو ویرانہ لگتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو اس کام میں دلچسپی ہو گی

س: جی نہیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔

ر: رفیعہ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے بغیر یہ پرچہ نہیں چلا سکتا

س: آپ کا مطلب ہے کہ مدیر معاون کے بغیر۔

ر: یونہی سہی۔

س: تو مدیر معاون دوسرا رکھا جا سکتا ہے۔

ر: ابھی پرچے میں اتنی سکت کہاں ہے کہ کسی پڑھے لکھے آدمی کو صحیح تنخواہ پر رکھ سکیں۔

س: جتنی تنخواہ مجھے دیتے ہیں اتنے میں کوئی اور مل جائے گا۔

ر: مجھے معلوم ہے نہیں مل سکے گا۔

س: اگر کوئی ضرورت مند ہو۔

ر: تو کون ہے ایسا ضرورت مند؟

س: میرا خیال ہے کہ نگہت فوراً مان جائے گی۔

ناظر: (ذرا حیرت سے) نگہت نور؟
رفیعہ: وہ ابھی آ رہی ہے۔ اُس سے پوچھ لیتے ہیں
ناظر: لیکن تم کیوں نہیں رکتیں؟
رفیعہ: میں نے بتا دیا
ناظر: یہ آخری فیصلہ ہے؟
رفیعہ: قطعی۔
ناظر: تو فیصلہ آج نہیں کرتے کل کریں گے۔
رفیعہ: کل نگہت نور شاید یہاں نہ آئے۔
ناظر: مجھے نگہت نور میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔
رفیعہ: جب آپ اسے دیکھیں گے تو دلچسپی ہو جائے گی۔

(بائیں جانب دروازے سے نگہت داخل ہوتی ہے)

نگہت: کیوں ہو گیا کام رفیعہ بہن (ناظر کو دیکھ کر) او معاف فرمایئے۔
رفیعہ: یہ ناظر صاحب ہیں
ناظر: آداب۔
نگہت: آداب (رفیعہ سے) پھر چلو گی۔
رفیعہ: ہاں۔ لیکن میں اکیلی چلی جاؤں گی
نگہت: (جلدی سے) تو میں چلتی ہوں
رفیعہ: نہیں ابھی تھوڑی دیر رک جاؤ۔ ناظر صاحب تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔
نگہت: (ذرا پریشان ہو کر) اس خاکے کے بارے میں؟
رفیعہ: نہیں، در اصل ناظر صاحب بڑی مدت سے سوچ رہے تھے کہ یہ پرچہ کچھ پھس سا ہوتا جا رہا ہے۔ اس میں انشائے لطیف اور گنجائش ہے اور اُن کا خیال تھا کہ اگر آپ تعاون کریں تو اس پرچے کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔
نگہت: (ویسے ہی پریشان) لیکن میں تو تعاون کر رہی ہوں۔
رفیعہ: لیکن آپ ادارتی فرائض میں بھی تعاون کریں۔
نگہت: (ذرا خوش ہو کر) ہاں ہاں میرے لائق کوئی کام بتائیں۔ میں ضرور کروں گی۔
رفیعہ: ناظر صاحب نے میرا استعفیٰ قبول کر لیا ہے۔
ناظر: لیکن میں نے ....
رفیعہ: (بات کاٹ کر) اور وہ چاہتے ہیں کہ آپ میری جگہ کام کریں۔

ت: (پھر پریشان ہو کر) لیکن میں یہ کیسے کر سکتی ہوں۔

یسہ: (دراز کھول کر کاغذ نکالتی ہے اور اپنے پرس میں ڈال لیتی ہے) اس میں پریشان ہونے کی بات نہیں۔ شروع میں مجھے بھی کچھ نہیں آتا تھا۔ مجھے انھوں نے سکھا دیا تھا۔

ت: لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ کی جگہ لے لوں۔

یسہ: تمھیں تو معلوم ہی ہے کہ میں خود ہی چھوڑنا چاہ رہی ہوں (بائیں جانب بڑھتی ہے) اچھا خدا حافظ

(بائیں جانب سے نکل جاتی ہے۔ ناظر اور نکہت خاموش کھڑے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ پچھلے دروازے سے شکور داخل ہوتا ہے ہاتھ میں مسطر اور قلم دوات ہے۔)

نکور: جی وہ چھاپے خانے سے آدمی آیا ہے

ظر: (چونک کر) اچھا۔ ہاں ابھی تو اداریہ لکھوانا ہے (نکہت سے) نو ما چند منٹ تشریف رکھیے (نکہت بیٹھ جاتی ہے) لکھو شکور۔

نکور: (بیٹھ کر مسطر پر لکھتے ہوئے) انھوں نے لکھوایا تھا۔ . .

ظر: نیا مسطر لگاؤ

نکور: (نیا مسطر لگا کر) جی

ظر: قارئین کرام کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ اردو کی مقبول ادیبہ نکہت نور صاحبہ ہمارے ادارے میں مستقل طور پر تشریف لے آئی ہیں . . .

نکور: جی؟

ت: لیکن میں نے تو ابھی . . . .

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا ایکٹ

(وقت۔ صبح کے گیارہ بجے ہیں۔ منظر وہی دفتر کا کمرہ۔ پردہ اٹھتا ہے آمیز پر کاغذوں کے انبار لگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پچھلی دیوار کے قریب ناظر بے چینی اور قدرے غصے سے ٹہل رہا ہے)

ر: (آواز دیتا ہے) شکور۔ شکور

(پچھلے دروازے میں سے شکور جھانکتا ہے)

نکور: جی۔

ر: شکور کب تک چلے گا آخر؟

نکور: کیا حضور! پرچہ؟

ر: ارے پرچہ تو معلوم نہیں چلے گا یا نہیں! یہ کب تک چلے گا کہ اب گیارہ بج رہے ہیں اور نکہت ابھی تک دفتر نہیں آئیں۔

نکور: جی عورتوں کو دیر ہو ہی جاتی ہے۔

ناظر: آ رفیعہ کیسے آج بھی دفتر پہنچتی تھیں۔
شکور: ان کو میک اپ کا شوق نہیں تھا۔
ناظر: یہ سب بزمی نے ستیاناس کر رکھا ہے۔ ہر ہفتے نیا میک کا سیٹ لا کر دے جاتا ہے۔ بزمی کا آنا بند کرنا پڑے گا۔
شکور: اب تو اُس نے دو صفحے کا اشتہار خرید لیا ہے۔

ناظر: ہاں یہ تو ہے۔
شکور: اور پچھلے ہفتے پانچسو کاپی واپس آگئی تھیں۔ یہ نقصان آخر اشتہاروں ہی سے پورا ہوگا یا نہیں۔
ناظر: اشتہار تو دو ایک زیادہ ہوگئے ہیں لیکن پرچے کا ستیاناس ہو رہا ہے۔ ہر ہفتے بکری کم سے اور کم ہو رہی ہے۔
شکور: تو نکہت صاحبہ کو کام پر لگائیے نا
ناظر: کیا کام پر لگاؤں، خاک کام ہوگا جب محترمہ دو گھنٹے سے زیادہ دفتر میں بیٹھیں گی نہیں اور وہ بھی بزمی چلے آرہے ہیں یا کوئی اور
آج تک ایک اداریہ لکھ کر نہیں دیا۔
شکور: خاک تو لکھ رہی ہیں ہر ہفتے۔
ناظر: لاحول ولا۔ وہ بھی کوئی چھاپنے کی چیز ہوتی ہے۔ یہ پہلے کیسے لکھ لیتی تھیں! انھیں تو کچھ ہوگیا ہے۔ دو جملوں میں ربط تو قائم نہیں
کرسکتیں۔ کیا کسی سے لکھوا کر لاتی تھیں،

شکور: جی ہاں۔
ناظر: (چونک کر) کیا!
شکور: وہ رفیعہ کے لکھے ہوتے تھے۔
ناظر: ارے ہٹاؤ وہ کسی سے بھی لکھواتی ہوں لیکن رفیعہ سے نہیں۔ رفیعہ کی تحریر کو میں نہیں پہچانتا کیا!
(میز کے پیچھے جا کر رفیعہ والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)
شکور: آپ سے کوئی کیا بات چھپا سکتا ہے۔ نکہت صاحبہ کے مسودے کی کتابت تو یہی خادم کرتا رہا ہے۔ شروع سے آخر تک سرخ روشنائی
سے رفیعہ صاحبہ کے جملے کے جملے بلکہ پیرے کے پیرے ہوتے تھے۔
ناظر: کیا مطلب وہ طنز و مزاح بھی لکھتی تھیں؟ ناممکن!
شکور: پچھلی فائل نکال کر دیکھیے۔
ناظر: (سوچتے ہوئے) تو مجھے پہلے کسی نے کیوں نہیں بتایا ـــــ خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔ (کاغذوں کے انبار کو اپنی طرف گھسیٹ کر) اور یہ
کاغذوں کا ڈھیر کیوں یہاں پر رکھا ہے (کاغذ الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے) یہ خط تو دو مہینے پہلے آیا تھا۔
(بائیں جانب سے نکہت داخل ہوتی ہے۔ اُس کا لباس پہلے سے کہیں بہتر ہے۔ زینت کی طرف پوری توجہ کی گئی ہے)
نکہت: آداب عرض ناظر صاحب!
ناظر: (اُٹھ کر) آداب عرض

نگہت: ڈاک آپ دیکھئے گا آج؟

ناظر: (کرسی چھوڑ کر سامنے آجاتا ہے) جی نہیں آپ ہی دیکھئے میں بیٹھ کر آپ کی مدد کروں گا

نگہت: (اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے) میں بھی سوچ ہی رہی تھی کہ آپ سے کہوں کسی روز زحمت کریں اور ان خطوں کو دیکھیں۔

ناظر: (خطوں میں ایک اٹھا کر پڑھتا ہے) بخدمت جناب نگہت نور صاحبہ۔ میں ہمیشہ سے آپ کی مداح ہوں اور آپ کا خاکہ بڑے شوق سے پڑھتی ہوں لیکن پچھلے چند ہفتوں سے آپ پوری توجہ سے نہیں لکھ رہی ہیں . . . .

نگہت: پڑھنے والوں کا ذوق عجیب بے ڈھنگا ہے کس کی سنیں اور کس کی نہ سنیں (پرس کھول کر ایک خط نکالتی ہے اور پڑھتی ہے) میں ایک ادیب ہوں اور ادیب کی حیثیت سے عرض کر رہا ہوں کہ جب سے آپ نے رسالے کی ادارت سنبھالی ہے پرچہ نکھر آیا ہے اور آپ کے خاکے تو ماشاء اللہ کیا کہئے۔ فقط منیر نگینوی"

ناظر: خوب (ایک اور خط اٹھا کر پڑھتا ہے) پچھلے دو مہینے میں تین خط لکھ چکی ہوں آپ نے ابھی تک جواب نہیں دیا۔ ہمیں پرچہ باقاعدگی سے نہیں مل رہا ہے۔

نگہت: اس طرح کے انتظامی امور کی طرف آپ توجہ فرمایئے نا۔

ناظر: (ایک اور خط اٹھا کر پڑھتا ہے) معلوم ہوتا ہے کہ پرچہ ڈوب رہا ہے۔ ناظر صاحب کو کیا ہوگیا ہے۔ وہ مضامین کا معیار بہتر کرنے کی طرف کیوں توجہ نہیں دے رہے ہیں۔

نگہت: (اپنے پرس سے ایک اور خط نکال کر) اتفاق سے اس مضمون پر ایک اور خط ملاحظہ فرمایئے (پڑھتی ہے) میرے خیال میں پرچے پر مدیر کی چھاپ کا ہونا ضروری ہے اور مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ آپ کے پرچے پر آپ کی چھاپ بدرجہ اتم موجود ہے۔ جب سے ناظر صاحب نے انتظامی معاملات پر زیادہ توجہ اور ادبی معاملات پر کم توجہ دینا شروع کی ہے مضامین کا معیار پہلے سے بہتر ہوگیا ہے

ناظر: خوب اور اس کے لکھنے والے کون ہیں؟

نگہت: منیر نگینوی

ناظر: آپ کے پرس میں اور بھی کوئی خط ہیں؟

نگہت: جی ہاں بہت (پرس میں ہاتھ ڈال کر ایک پلندہ نکالتی ہے)

ناظر: ان کو فائل میں لگایئے گا یہ کس کس کی طرف سے ہیں؟

نگہت: سب منیر نگینوی صاحب کی طرف سے ہیں۔

ناظر: خوب! یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہم منیر نگینوی صاحب کا کلام کبھی نہیں چھاپتے۔

نگہت: جی نہیں مجھے نہیں معلوم کیوں نہیں چھاپتے؟

ناظر: کیونکہ غیر معیاری ہوتا ہے۔

نگہت: مجھے تو منیر نگینوی صاحب بڑے معیاری ادیب لگے چنانچہ اس پرچے کے لئے میں نے ان کی تین نظمیں شامل کر لی ہیں۔

ناظر: (چونک کر) تین نظمیں! خدا کے لئے، وہ تو دو مصرعے بھی موزوں نہیں کہہ سکتے آپ نے نکمی نظمیں کیسے چھپنے کو دے دیں!

نکہت: (پسندیدگی سے) میرا خیال ہے کہ مجھے ادب پاروں کے انتخاب کا حق تو پہنچتا ہے۔
ناظر: بے شک۔ بے شک۔ لیکن نظم چونکہ آپ کا میدان نہیں ہے اس لئے اس میں غلطی ہو سکتی ہے۔ آپ مجھے دکھا لیجئے۔ وہ نظمیں کہاں ہ
نکہت: ان کی کتابت ہو گئی ہے۔ میں نے پریس بھجوا دی ہیں۔
ناظر: اس میں غلطی میری ہے مجھے چاہیئے تھا آپ کو بتا دیتا کہ چند لوگ ایسے ہیں جو اکثر اپنی تخلیقات ہمارے پاس بھیجتے رہتے ہیں اور انھیں لوٹاتے رہتے ہیں۔ دراصل وہ ادیب بنتے ہی عورت کا نام پڑھ کر ہیں۔
نکہت: کیا مطلب؟
ناظر: پہلے رفیعہ کا نام چھپتا تھا تو اس کی مدح میں خطوط آتے رہتے تھے۔ اب آپ کا نام یا آپ کی تصویر دیکھ کر آنے لگے ہیں۔ لوگ عموماً ایسے خطوط کو نظر انداز کر دیا کرتے ہیں۔
نکہت: لیکن یہ تو انتہائی بے مروتی کی بات ہے۔
ناظر: کہیں آپ نے ان خطوط کے جواب تو نہیں بھیجے؟
نکہت: آپ ہی نے تو کہا تھا کہ پڑھنے والوں کے خطوط کی طرف خاص توجہ دی جائے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں نئے لکھنے والوں کی حوصلا
کرنی چاہیئے۔
ناظر: میرا مطلب یہ تھا.... خیر ہٹائیے
نکہت: معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آج صبح آپ کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔
ناظر: جی ہاں
نکہت: تو آپ ذرا دیر باہر ٹہل آئیے اور مجھے کام کرنے دیجئے (میز پر سے کاغذوں کو سمیٹتی ہے)
ناظر: نکہت میرا یہ خیال تھا کہ ہم دونوں مل کر اس پرچے کو بہتر بنا سکیں گے۔
نکہت: (ڈاک اٹھا کر دیکھتی ہے) اگر آپ تنقید کم کریں اور تعمیر زیادہ تو پرچہ بہتر ہو سکتا ہے۔
ناظر: میں نے تو آج تک تنقید نہیں کی۔
نکہت: اور آج جو اگلی پچھلی کسر نکال رہے ہیں؟
ناظر: میں معافی چاہتا ہوں۔
نکہت: (مسکرا کر) خیر کوئی بات نہیں۔ ہر انسان سے غلطی ہو سکتی ہے۔ آپ فرمائیے کہ پرچے میں کیا خرابی ہے۔
ناظر: ہر پرچے میں بہتری کی گنجائش رہتی ہے لیکن یہ بہتری اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ہم دونوں میں ذاتی سطح پر تعاون ہو۔
نکہت: درست۔ ضرور ہونا چاہیئے تعاون۔
ناظر: میں اپنے ساتھیوں کے قریب نہیں جا سکتا مجھ میں ضرور کوئی خرابی ہو گی۔
نکہت: (ہنس کر) ایسی کوئی خرابی تو نظر نہیں آتی لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خواتین سے آپ کا سابقہ بہت کم رہا ہے۔
ناظر: کوئی ایسی واقفیت بھی نہیں رہی۔ پچھلے کئی برس سے رفیعہ میرے ساتھ پرچے میں کام کرتی رہی اور اب کچھ عرصے سے آپ ہیں۔

ہمت: ہیں تو پھر آپ دفتر کا فرنیچر سمجھتے ہوں گے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی زندگی میں کسی خاتون کا دخل نہیں رہا۔

ظر: یہ بھی درست نہیں۔ میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اور ماں کا اکلوتے بیٹے کی زندگی پر بہت اثر ہوتا ہے۔

ست: ہو سکتا ہے کہ ماں کی غیر ضروری حد تک توجہ نے آپ کو خود پرست بنا دیا ہو۔

ظر: ہو سکتا ہے لیکن میں نے کبھی اپنی خود پرستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

ست: لیکن دوسروں کی طرف توجہ بھی نہیں دی۔

ظر: دیکھئے میں آپ کی طرف توجہ دینا چاہ رہا ہوں۔

ت: (ہنس کر) بہت دیر سے۔ بہت دیر سے۔ اتنے میں مجھے احساس ہو چکا ہے کہ آپ کی مجھ میں دلچسپی محض سطحی ہے۔

ظر: تو آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ دلچسپی اور گہری ہونی چاہیئے؟

ت: (یکایک بوکھلا کر) مجھے معلوم نہیں۔ (ڈاک کی طرف پھر متوجہ ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا جاتی ہے)

ر: آپ بہت مصروف ہیں۔

ت: (بغیر نظریں اُٹھائے) جی ہاں۔

ر: تو میں چلتا ہوں۔ (اٹھ کر پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نگہت کاتب کو آواز دیتی ہے)

ت: شکور۔

(شکور پچھلے دروازے سے جھانکتا ہے)

کور: جی؟

ت: ناظر صاحب نے اداریہ لکھوا دیا ہے؟

کور: جی نہیں۔ انھوں نے ابھی ابھی باہر جاتے ہوئے کہا کہ آپ لکھوائیں گی۔

ت: لیکن وہ تو کل چلا جانا چاہیئے تھا۔ اور ہمیشہ وہی لکھتے ہیں۔

کور: جی میں نے کل کہہ دیا تھا لیکن انھوں نے جب بھی کہا کہ آپ سے لکھوایا جائے۔

ت: (ذرا تامل سے) تو تعلّی ہے یہ؟

ور: جی؟

ت: کچھ نہیں۔

ر: مسطر لاؤں؟ اسی پر لکھوا دیجئے۔ وقت اب کم ہے

ت: (میز سے کاغذ پنسل بڑھاتے ہوئے) نہیں یہ سادہ کاغذ اور پنسل لے لیجئے مجھے مسطر پر لکھوانے کا تجربہ نہیں ہے۔

(شکور کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جاتا ہے)

ر: جی۔

ت: (سوچتے ہوئے) اداریہ۔

شکور: جی وہ تو میں نے پہلے ہی لکھ لیا۔

نگہت: اچھا تو آگے لکھیے (سوچتے ہوئے) کیا لکھا جائے ۔۔۔ لیڈی لباس کے بارے میں تو پچھلے ہفتے ناظر صاحب نے لکھوا دیا تھا
پچھلے ہفتے کیا تھا؟

شکور: عورتوں کا ادب میں حصہ۔

نگہت: اور اس سے پچھلے ہفتے؟

شکور: ادب میں مزاح

نگہت: ہاں یہ تو سب ہو چکے۔ اب میرے لئے مضمون کوئی چھوڑا ہی نہیں لکھواؤں کیا خاک۔ اچھا تعلّی ہے تو تعلّی ہی سہی۔ خیر لکھئے۔

شکور: جی۔

نگہت: (سوچتے ہوئے انداز کر تعلق ہے) لکھیے، اس ہفتے ہم اپنے قارئین کی توجہ ایک نہایت اہم مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

شکور: جی لکھ لیا۔

نگہت: (رک کر) لیکن وہ اہم مسئلہ کیا ہے؟

شکور: یہ بھی لکھوں جی؟

نگہت: ارے نہیں میں سوچ رہی ہوں۔ اچھا تم بتاؤ وہ مسئلہ کیا ہو سکتا ہے؟

شکور: جی مجھے کیا معلوم۔

نگہت: اب اتنا میں نے لکھوا دیا ہے تو آپ لوگ بھی کچھ سوچیں۔ کیوں دنیا میں اس وقت کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے؟

شکور: مشرق بعید میں جنگ کا مسئلہ ہے۔

نگہت: ہم سیاسی مسائل پر نہیں لکھ رہے۔ کوئی ادبی یا سماجی مسئلہ بتاؤ ۔۔۔ اچھا خیر میں خود ہی سوچتی ہوں۔۔۔ "شہر والوں میں صا
یہ کیسا رہے گا؟"

شکور: لیکن اس پر تو رفیعہ صاحبہ ایک مرتبہ لکھوا چکی ہیں۔

نگہت: تو دوبارہ نہیں لکھا جا سکتا کیا؟

شکور: لکھوا دیجئے لیکن کوئی نئی بات تو نہ ہوگی۔

نگہت: تو یوں لکھو کہ اس ہفتے ہم اپنے قارئین کی توجہ ایک ایسے مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جس پر پہلے بھی لکھا جا چکا

شکور: جی لکھ لیا۔

نگہت: لیکن رفیعہ پڑھیں گی تو ہنسیں گی۔ کیا لکھا؟

شکور: اس ہفتے ہم اپنے قارئین کی توجہ ایسے مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جس پر پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔

نگہت: "جس پر پہلے بھی لکھا جا چکا ہے" یہ کاٹ دیجئے

شکور: کاٹ دیا۔

ت: اب پھر پڑھیے۔

شکور: اس ہفتے ہم اپنے قارئین کی توجہ ایسے مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

ت: یہ تو فقرہ بے معنی ہو گیا۔ "ایسے مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں" کاٹ دیجئے۔

شکور: کاٹ دیا

ت: اب کیا رہ گیا؟

شکور: اس ہفتے ہم اپنے قارئین کی توجہ۔

ت: یہ بھی کاٹ دیجئے

شکور: کاٹ دیا۔

ت: اب پڑھیے

شکور: اداریہ

ت: (واپس آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) اداریہ ــــ اداریہ (جھنجھلا کر) یہ ناظر صاحب کی سراسر زیادتی ہے (بائیں جانب دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے) کون ہے؟

(باہر سے آواز)

از: منیر نگینوی۔

ت: تشریف لائیے۔

شکور: تو میں جاؤں جی؟

ت: نہیں آپ بھی بیٹھئے۔

[منیر نگینوی بائیں دروازے سے داخل ہوتے ہیں گندمی رنگ شکل نہایت معمولی درمیانہ قد دبلا پتلا جسم کرتا پاجامہ پہنے ہوئے ہیں۔ پاؤں چپل ہے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا رجسٹر ہے]

منیر: آداب عرض ہے

شکور: (اٹھ کر) آداب عرض

ت: یہ شکور صاحب ہیں۔

منیر: دوبارہ آداب بجا لا کر) تشریف رکھئے شکور صاحب

شکور: آپ بھی تشریف رکھئے

منیر: نوازش

(شکور اور منیر دونوں کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

(نگہت سے) بہت دنوں سے آپ سے ملنے کی تمنا تھی۔ آج ہمت کر کے آن ہی پہونچا۔

نگہت: اس میں ہمت کی کیا بات ہے۔ یہ ایک ادبی ادارہ ہے اور آپ ادیب ہیں۔ لازم و ملزوم۔

منیر: اور شکریہ ادا کرنا تھا اس بات کا کہ آپ نے میری چند نظمیں انتخاب فرمائیں۔

نگہت: ہم پرچے میں نئے لوگوں کو بھی لانا چاہتے تھے۔ پرچے میں افسردگی سی آنے لگی تھی

منیر: یہ تو آپ کی عنایت ہے ویسے ہم کچھ ایسے نئے بھی نہیں ہیں آپ کی دعا سے بچپن سے شعر کہہ رہے ہیں۔

نگہت: (ذرا حیرت سے) بچپن سے؟

منیر: جی ہاں قدرتی طور پر طبیعت موزوں ہے۔ میں دو سال کا تھا جب بے ساختہ پہلا شعر میرے منہ سے نکل گیا۔

نگہت: (اور حیرت سے) دو سال کا؟

منیر: جی ہاں ابا مجھے گود میں لئے ہوئے بہلا رہے تھے۔ شعر سنا تو حیران رہ گئے۔

نگہت: خوب، کیا شعر تھا وہ؟

منیر: بچپن کی باتیں کسے یاد رہتی ہیں۔ یقیناً کوئی اچھا شعر ہوگا جبھی ابا مرحوم اس کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے تو عرض یہ ہے کہ صرف پچھلے ایک برس میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اس بیاض میں ہے۔

(رجسٹر اٹھا کر میز پر رکھتا ہے)

نگہت: تو آپ بیاض کو ساتھ کیوں رکھتے ہیں؟

منیر: یہاں قصہ یہ ہے کہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے شعر نازل ہوتے رہتے ہیں۔ اگر بیاض ساتھ نہ ہو تو ایک ادبی خزانہ ہاتھ سے جاتا رہے۔

نگہت: بے شک

منیر: خیر چھوڑیے اس قصے کو ہمیں اپنے بارے میں تو کچھ کہنا نہیں تھا ہمیں تو آپ سے ملنا تھا اور واقعی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ جیسا سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا۔

نگہت: شکریہ (موضوع بدلتے ہوئے) پرچے کا معیار بہتر کرنے کے لئے اگر آپ کے ذہن میں کچھ مشورے ہوں تو ہمیں بتائیے۔

منیر: جب سے آپ تشریف لائی ہیں پرچے کا معیار روز بروز بہتر ہو رہا ہے۔ کسی مزید مشورے کی گنجائش ہی نہیں ہے آپ کی ذات ہی با دیکھئے شعر ہو گیا۔

نگہت: جی کون سا شعر؟

منیر: آپ کی ذات۔ سے بابرکات

نگہت: (ہنس کر) یہ وہی شعر تو نہیں جو دو برس کی عمر میں کہا تھا۔

منیر: (ذرا برا مان کر) ہمارے یہاں آمد ہے، آورد نہیں اور نادر بھی ایسی کہ سہل ممتنع سمجھ لیجئے۔ یہ وہ چیز ہے جو شاید آپ کو آسان لگے لیکن بڑے استادوں کے قلم لرز جاتے ہیں اس کے آگے

شکور: بے شک۔ بے شک

منیر: (شکور کی طرف متوجہ ہو کر) آداب عرض۔ آداب عرض۔

شکور: ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔
منیر: واہ ۔ واہ ۔ واہ تو جناب بھی شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ واہ واہ واہ واہ۔ ذرا ارشاد فرمائیے گا
شکور: (ذرا پریشان ہو کر) ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔
منیر: (پھر پھڑک کر) واہ کیا زمین نکالی ہے کیا دوسرا مصرعہ ہے بہت خوب کہا ہے آپ نے!
شکور: (ذرا حیرت سے) جی؟
نکہت: (ہنس کر) یہ تو مرزا غالب کا مصرعہ ہے۔ شکور صاحب تو شعر نہیں کہتے
منیر: مرزا غالب! آپ کیا فرما رہی ہیں؟ مصرع یوں ہے کہ غالب کے طرفدار نہیں۔ اب فرمایئے کہ کون شاعر ایسا ہو گا جو اپنا طرفدار نہ ہو۔
شکور: جی یہ مرزا غالب ہی کا مصرع ہے اور مقطع ہے۔
منیر: خیر اب آپ لوگوں کو اصرار ہے تو مان لیتا ہوں ورنہ شعر کی داخلی کیفیت تو سب میری بات کے حق میں ہے۔
نکہت: اور خارجی کیفیت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔
شکور: اگر مجھے اجازت دیں تو تھوڑا سا کام کر لوں۔ چند صفحوں کی کتابت باقی ہے۔
نکہت: اچھا! لیکن دفتر ہی میں رہیے گا ابھی ادارہ یہ لکھنا ہے۔
(شکور اٹھ کر پچھلے دروازے کی جانب بڑھتا ہے۔ جی بہتر۔

(پچھلے دروازے سے چلا جاتا ہے)

منیر: تو آپ کاتب ہیں۔
نکہت: جی ہاں
منیر: بہت خوب۔ خیر آپ نے بڑی خوبصورتی سے شکور صاحب کو باہر نکالا
نکہت: (ذرا حیرت سے) جی!
منیر: جی ہاں۔ جیسے ہی آپ نے خارجی کیفیت کہا میں سمجھ گیا کہ آپ اشارۃً شکور صاحب کو خارج ہونے کو کہہ رہی ہیں اور شکور صاحب اٹھ کر چل دیئے
نکہت: جی نہیں میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا اور نہ ہی شکور صاحب سے اشارۃً کچھ کہنے کی مجھے ضرورت ہے،
منیر: خیر وضعداری کے تقاضے نباہیئے۔ دگرنہ کیا ہم نہیں جانتے کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔
نکہت: (ذرا پریشان ہو کر) کیا فرما رہے ہیں آپ؟
منیر: نکہت صاحبہ آپ کا ایک ایک خط میں نے کئی کئی بار پڑھا ہے اور آپ کا طرز تکلم پہچاننے لگا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ بظاہر معصوم سی بات کے پردے میں کیا کیا کہہ جاتی ہیں۔
نکہت: (ذرا گھبرا کر) مثلاً؟
منیر: مثلاً آپ کے ایک خط میں یہ جملہ تھا کہ اپنے کلام میں جذباتی رنگ قائم رکھیے۔ اب ہم اتنے بھولے بھی نہیں ہیں کہ اس کا مطلب بھی نہ سمجھ سکیں
(بائیں جانب سے دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے)

نگہت: کون ہے؟

(باہر سے معین بزمی کی آواز سنائی دیتی ہے)

معین: میں حاضر ہو سکتا ہوں؟

نگہت: جی ہاں تشریف لائیے

(بائیں جانب کے دروازے سے معین بزمی داخل ہوتے ہیں)

معین: آداب عرض (منیر سے) آداب عرض۔

منیر: (اٹھ کر ناپسندیدگی سے) آداب عرض (پھر بیٹھ جاتا ہے)

نگہت: (تعارف کراتے ہوئے) یہ معین بزمی صاحب ہیں اور یہ منیر نگینوی صاحب ہیں۔

(دونوں دوبارہ آداب بجا لاتے ہیں)

معین: میں مخل تو نہیں ہوا؟

منیر: جی ہاں ہم کچھ مصروف ہی تھے

نگہت: (جلدی سے) جی نہیں قطعی نہیں، منیر صاحب ہمارے پرچے کے لئے لکھتے ہیں اور آج یوں ہی آ گئے تھے۔

معین: (جو منیر کی موجودگی سے ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے) اگر آپ مصروف ہوں تو میں تھوڑی دیر میں دوبارہ آ جاؤں گا۔

منیر: اگر ایسا ہو تو بہت اچھا ہے (معین اٹھتا ہے)

نگہت: (منیر سے ڈانٹ کر) منیر صاحب آپ ہمارے مہمانوں سے اس طرح بات نہیں کر سکتے اور چونکہ آپ اشارے سمجھتے ہیں اس لئے

کروں گی کہ آپ کے لئے خارجی کیفیت بہتر رہے گی۔

منیر: (کرسی پر یوں بیٹھتے ہیں کہ برسوں نہیں اٹھیں گے) خارجی کیفیت تو یہ ہے کہ ہماری گفتگو ابھی نامکمل ہے اور میری داخلی کیفیت تو آپ جانتی

معین: (ذرا پریشان ہو کر) میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے . . .

نگہت: (بزمی سے) بزمی صاحب آپ تشریف رکھئے (منیر سے) مجھے بزمی صاحب سے ایک ضروری بات کرنا ہے

منیر: نگہت صاحبہ آخر ہمارا بھی آپ پر کچھ حق ہے۔ آپ نے خطوط میں اتنی حوصلہ افزائی فرمائی تو ہم حاضر ہوئے۔

نگہت: (غصے سے) آپ اب تشریف لے جائیے۔

منیر: بزمی صاحب آپ کے آنے سے پہلے حالات بہت اچھے جا رہے تھے۔

بزمی: (غصے سے اٹھ کر) منیر صاحب میں نگہت صاحبہ کو بہت عرصے سے جانتا ہوں، معلوم ہوتا ہے آپ شریف آدمی نہیں ہیں، آپ تشریف

منیر: (اٹھ کر) بہت اچھا تو ہم تشریف لے جاتے ہیں لیکن یہ عرض کر دوں کہ ہمارے قلم میں ابھی زور ہے جو بھی ہو سکتا ہے۔

(بزمی دھکیلتا ہوا اسے دروازے سے باہر نکال دیتا ہے — نگہت صوفے پر ڈھے کر بیٹھ جاتی ہے)

نگہت: یہ ادیب ہیں یا غنڈے؟ عجیب مصیبت ہے!

بزمی: کوئی بات نہیں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

نگہت: (ایک کاغذ کراؤن پر لکھتے ہوئے) میں استعفیٰ دے رہی ہوں۔

بزمی: یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ میں خود بھی کہنے والا تھا کہ آپ اس پرچے کو چھوڑ دیجئے۔

نگہت: (لکھتے ہوئے رک کر) اچھا! کیوں؟

بزمی: مجھے اپنا پرچہ نکالنے کی اجازت مل گئی ہے۔ اور میں آپ سے درخواست کرنے ہی والا تھا —

(بائیں جانب سے رفیعہ جھانکتی ہے)

رفیعہ: ہیلو نگہت۔ (بزمی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

نگہت: آئیے رفیعہ بہن آپ بہت اچھے وقت پر آئیں۔

رفیعہ: (کمرے میں آکر) کیوں کوئی خوش خبری ہے؟

نگہت: جی ہاں۔

بزمی: آداب عرض کرتا ہوں۔

رفیعہ: آداب عرض۔ بزمی صاحب نے اسے ملازمت کے لئے پورا پرچہ لے لیا ہوگا۔

نگہت: (جو کاغذ پر لکھ رہی تھی وہ رفیعہ کو دیتی ہے) جی نہیں خوش خبری یہ ہے

رفیعہ: (پڑھتے ہوئے) استعفیٰ — کیوں کیا ہوا؟

نگہت: بس یکایک فیصلہ کر لیا

رفیعہ: کہیں بزمی صاحب نے تو یہ مشورہ نہیں دیا۔ (کرسی پر بیٹھتی ہے)

نگہت: نہیں۔ لیکن سن کر خوش بہت ہوئے ہیں۔

بزمی: (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) آپ کو اگر یاد ہو تو آپ نے مجھے اپنا پرچہ شروع کرنے کو کہا تھا۔ وہ آپ کی دعا سے سنگھار کے نام سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

رفیعہ: مبارک ہو اور نگہت اس کی مدیرہ ہوں گی۔

بزمی: زہے نصیب۔

نگہت: یہ ان کا حسن ظن ہے ایمانداری کی بات یہ ہے کہ مجھ سے پرچے کا کام نہیں ہوتا۔

رفیعہ: تو کیا گھر داری کا ارادہ ہے؟

بزمی: زہے نصیب۔

رفیعہ: (ایک قہقہہ لگا کر) بہت خوب تو یہ ارادے ہیں۔

نگہت: بزمی صاحب آپ یہ کیا فرما رہے ہیں؟

بزمی: (بوکھلا کر) جی — جی میں نے کچھ عرض نہیں کیا۔

رفیعہ: لیکن آخر حرج ہی کیا ہے؟

نگہت: بیٹھا دیکھی رفیعہ بہن (بزمی سے) بزمی صاحب آپ کے اجازت چاہئے گا۔
بزمی: جہاں آپ فرمائیں۔
رفیعہ: ہائیں تو تم جا رہی ہو کیا؟
نگہت: جی قطعی!
رفیعہ: اور ناظر صاحب سے بات نہیں کرو گی۔
نگہت: جی نہیں
رفیعہ: لیکن ہوا کیا ہے؟ تم ایسی بھی کیا ناراضگی ہے کہ ان سے بات بھی نہیں ہو گی۔
نگہت: (اُٹھ کر) بزمی صاحب آپ کا رکھا کر لائیے۔ میں اپنی چیزیں سمیٹ لوں اتنے میں۔
بزمی: (دائیں جانب لپکتے ہوئے) جی ابھی لیجئے۔ (بائیں جانب سے نکل جاتا ہے)
(نگہت میز پر سے چند کاغذ اٹھا کر اپنے پرس میں ڈالتی ہے)
نگہت: میں اپنے آپ کو دھوکا دیتی رہی کہ میں پرچے کو کامیابی سے چلا رہی ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر بزمی صاحب اشتہارات میں اضافہ نہ کرتے تو پرچہ بالکل بیٹھ گیا تھا۔ اور تعریفی خطوط سوائے دو تین سرپھروں کے اور کسی کی طرف سے آئے نہیں رہے تھے۔
رفیعہ: تو اب کیا ارادہ ہے؟
نگہت: کچھ نہیں اگر آپ اجازت دیں گی تو آپ کے پرچے کے لئے خاکے لکھ دیا کروں گی۔
رفیعہ: میں اجازت دوں؟ اور میرا پرچہ! بھلا اس پرچے سے کیا واسطہ
نگہت: میرا مشورہ مانیئے آپ دوبارہ آ جائیے۔
رفیعہ: بہت خوب ——— کیوں؟
نگہت: تو کون سا ایسا ضروری کام کر رہی ہیں آپ!
رفیعہ: آرام سے زیادہ ضروری کام کیا ہو سکتا ہے؟
نگہت: رفیعہ بہن اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ کے "وہ" پرچے کے علاوہ کسی اور سے بھی دلچسپی لے سکتے ہیں تو یہ غلط ہے۔
رفیعہ: میں کیسے مان لوں کہ تمہارے ہوتے ہوئے اس ویرانے میں کچھ فرق نہیں پڑا۔
نگہت: قطعی مان لیجئے کہ میں نے اس میں کوئی گل نہیں کھلائے۔
رفیعہ: تو اس ویرانے کو ویرانہ چھوڑ کر جا رہی ہو تم۔
نگہت: شاید اب وہ ویرانہ نہ رہا ہو۔
رفیعہ: اچھا!
نگہت: مکان تو ہے اور باہر جا کر کونسا باغ مل گیا یا بہار مل گئی آپ کو۔
رفیعہ: اچھا میرا ذکر چھوڑو تم اپنا بتاؤ، خاکے لکھنے کے علاوہ اور کیا ہو گا ... بزمی کیسے ہیں۔

نکہت : (سوچتے ہوئے) شریف اور بدھو ہیں۔
رفیعہ : یعنی ان میں میاں بننے کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔
(نکہت اور رفیعہ ہنستی ہیں۔ بائیں جانب سے ناظر داخل ہوتا ہے)
ناظر : ہیلو — ہیلو رفیعہ — کیسے آنا ہوا؟
رفیعہ : (اٹھتی ہے) یوں ہی گذر رہی تھی۔ سوچا نکہت سے ملتی چلوں
ناظر : ہوں — تو آپ لوگ کھڑے کیوں ہیں بیٹھئے نا۔ وہ تم نے چائے بنانے کا اچھا سلسلہ شروع کیا تھا۔ نکہت نے نہیں چلایا چنانچہ اب چائے باہر سے منگوانا ہوگی۔
نکہت : میں نے رفیعہ بہن سے درخواست کی ہے کہ وہ چائے کا سلسلہ پھر شروع کریں۔
(استعفیٰ ناظر کے حوالے کرتی ہے)
ناظر : (یکدم چونک کر) یہ کیوں؟ ناراضگی کی وجہ؟
(بزمی بائیں جانب سے بڑی تیزی سے داخل ہوتا ہے)
بزمی : آئیے میں گاڑی گھما لایا ہوں (ناظر کی طرف دیکھ کر) آداب عرض ناظر صاحب۔
ناظر : ہیلو بزمی صاحب آئیے تشریف لائیے
بزمی : میں پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔ اس وقت نکہت صاحبہ کو جلدی ہے۔
نکہت : اچھا ناظر صاحب خدا حافظ۔ غلطی معاف فرمائیے۔ (بائیں جانب چلتی ہے)
بزمی : اچھا جی خدا حافظ۔
(نکہت اور بزمی دونوں بائیں جانب سے نکل جاتے ہیں)
(تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا جاتی ہے۔ پچھلے دروازے سے شکور داخل ہوتا ہے)
شکور : وہ جی پریس سے آدمی آیا ہے۔ کہتا ہے۔ ساری کاپیاں لگا دی ہیں۔ اداریئے کے لئے کام رُکا ہوا ہے وہ جلدی سے بھجوا دیجئے (رفیعہ سے) آداب عرض۔
رفیعہ : کیسے ہو شکور؟
ناظر : میں ذرا پریشان ہوں رفیعہ۔ تم لکھوا دو گی اداریہ؟
رفیعہ : لکھتی ہوں —
ناظر : وقت نہیں ہے تو مسٹر ہی پر لکھواؤ۔ شکور مسٹر لیتے آؤ۔
شکور : جی بہتر (پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے)
ناظر : مجھے ایسا لگتا ہے کہ اب بزمی کی طرف سے پرچے کو اشتہارات نہیں ملیں گے۔ بہت دوڑ دھوپ کرنی پڑے گی ہم دونوں کو۔ شکر ہے کہ تم آگئیں۔

(پردہ گرتا ہے)

محمد خالد اختر

۳

باٹا خیل کی سرائے

لاری باٹا خیل کے بڑے گاؤں میں کوئی ایک بجے داخل ہوئی۔ یہ ان دیہات میں سے ہے جنہیں قصبہ کہنا چاہیئے۔ اس کا بازار لمبا ہے۔ دوکانیں اچھی خاصی ہیں اور ہر قسم کا سامان وہاں بک سکتا ہے۔ باٹا خیل مالاکنڈ ایجنسی میں ہے۔ لاری ایک لمبے چوڑے برآمدوں وا کے سامنے رکی۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہاں لاری بہت دیر ٹھیرے گی اور ہم کھانا کھا اور ستا سکتے ہیں۔

ہوٹل کے برآمدے میں ایک لمبی میز تھی۔ اس پر ایک ستھرا میز پوش بچھا تھا اور میز کے چوگرد ٹین کی کرسیاں تھیں، اس لئے یہ ممکن تھا کہ بھی کھاتے جاؤ اور بازار کے منظر کی سیر بھی کرتے رہو۔ اس لحاظ سے یہ ہوٹل کسی قدر یورپی وضع کا تھا

ہوٹل کے ملازموں نے ہمارا خیر مقدم خوش اخلاق میزبانوں کی مانند کیا۔ یہ وہ چیز ہے جسے تم پنجاب کے ہوٹلوں میں بیکار ڈھونڈو گے معلوم ہوتا ہے یہی مسافر نوازی کی روایات سے ہوگا؛ وہاں ہمارے ہوٹلوں میں ایک غیر شخصی سی، معاندانہ سی فضا ہوتی ہے، سرحد میں ایسا نہیں ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے تم ایسا محسوس کرتے ہو جیسے تم اپنے گھر میں اپنے کنبے کے افراد اور احباب کے ساتھ کھا رہے ہو اور تمہارے اپنے تمہاری ضروریات پوری کر رہے ہوں۔ بلاشبہ ہمیں اپنے کھانے کے دام ادا کرنا پڑتے ہیں لیکن یہ ایک محض رسمی تکلف ہے اور اتنی ستھری اور خوراک اور خوش اخلاقی کے صلے میں کچھ بھی نہیں۔

ان اچھے لوگوں نے ہمیں یہ محسوس کرایا جیسے ہم کوئی شہزادے ہوں اور ہماری آمد اس ہوٹل کے ہر فرد کے لئے ایک بڑی اور طرفہ عزت موجب ہو۔ انھوں نے ہمیں بٹھا کر آفتابے اور چلمچی سے ہمارے ہاتھ دھلائے (یہ چیز کہ پنجاب میں قطعاً ناممکن ہوگی)، ایک بوڑھا کھلے چہرہ والا شخص ــــ تھا ــــ خود ہی ہمیں ان چیزوں کی تفصیل بتانے آیا جو اس وقت تیار تھیں۔ کھانا جس وقت آیا سادہ اور گھر کا سا تھا۔ بڑے خمیری نان اور تازہ گوشت صحت بخش تھا اور تمہارے پنجاب کے ہوٹلوں کے کھانے کی طرح مصالحے اور بناسپتی کی خوفناک لپیٹ نہیں تھا۔ خمیری نان سے زیادہ اچھی ز دنیا بھر میں نہیں ہے۔

اور ان کا یہ سلوک صرف ہمیں سے نہیں تھا، بلکہ ہر غریب سے غریب مسافر جو اس دسترخوان پر بیٹھا تھا، ان کے لئے ایک ممتاز ادا تھا۔ ایک مسافر کو میں نے دیکھا ــــ اٹھارہ سالہ بدحال جوان ــــ وہ بڑا ہی غریب ہوگا کیونکہ وہ ایک روٹی کو کاغذ میں لپیٹ کر اپنے کو۔ ڈھلے ہوئے تھا۔ اس نے بیٹھ کر اپنی روٹی کو کھولا اور سالن کی بجائے ملازم کو چائے کی صرف ایک پیالی لانے کے لئے کہا۔ کسی کو اس پر تعجب لوگوں میں افلاس عام ہے۔ اس جوان سے اس کی تنگدستی کی وجہ سے کسی نے تحقیر کا سلوک نہ کیا۔

اگر کسی کے ساتھ دوسرے مسافروں سے زیادہ لحاظ اور خاطر برتی گئی تو وہ لاری کا ڈرائیور تھا۔ یہ شخص بلاشبہ ہم سب عام مسافروں سے کہیں زیادہ معزز اور باوقار تھا اور ان عنایات اور مراعات کا ہر طرح مستحق جو ہوٹل والے اس پر نچھاور کر رہے تھے۔ اپنی بڑی بھوری مونچھوں اور تیکھے سرخ چہرے کے ساتھ وہ ایک شاندار مرد تھا ـــ اپنے جوتوں سمیت کوئی چھ فیٹ کا، تیر سا سیدھا، چوڑے مضبوط کندھوں کے ساتھ! البتہ اس قدر بہتر سلوک کی اصل وجہ اس کی یہ مرعوب کن شخصیت نہ تھی۔ اس سے ایک خاص مہمان کا سا سلوک اس لئے کیا گیا کہ وہ اس ہوٹل کے لئے گاہک لاتا تھا۔ اس کی خوشامد اور رضا جوئی ان لوگوں کے لئے ضروری تھی۔ کیونکہ لاری کا ناخدا ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی لاری کو کچھ آگے اگلے ہوٹل کے سامنے بھی تو ٹھہرا سکتا تھا پھر سب مسافر اس ہوٹل میں جاتے اور ان لوگوں کا بزنس بالکل سونا ہو جاتا ـــ اس ڈرائیور کو ہوٹل کے کمرے میں ایک الگ میز پر کھانا کھلایا گیا۔ کونسے خاص کھانے اس کے سامنے چنے گئے ـــ میں نہیں بتا سکتا۔ ہاں میں نے ایک تازہ چاندی کے نیچے کا حقہ (شاید صاحب خانہ کا اپنا!) اس بڑے آدمی کے لئے اندر جاتا دیکھا۔

کھانے کے بعد، دو آدمیوں نے ہم سب کے ہاتھ چلمچی میں دھلائے۔ بڑی میٹھی چائے کے پیالے سرو کئے گئے۔ اور ہم ایک لذیذ کاہلی کے احساس سے سگرٹ پینے لگے ـــ اب ہوٹل کا گراموفون مہمانوں کی تفریح اور دل جوئی کے لئے بجنے لگا۔ یہ تو ایک مانی ہوئی بات ہے کہ موسیقی ہاضمے میں مددگار ہوتی ہے۔ مگر یہ موسیقی سے زیادہ جھنجھناتا ہوا خوش آیند شور تھا۔ ایک ریکارڈ کا گانا مجھے یاد ہے ـــ اس کی نے عرصے سے میری چہیتی ہے "ایلو۔ میں ہاری بالم آ ـــ اس جانی پہچانی پیاری سے کو۔ اتنی دور۔ ریاست خیل میں سننا ایک نادر مسرت تھی۔

ہمارے ساتھ ایک کھچڑی لمبی داڑھی اور کھانسے کے سے تیز چہرے والا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کی ٹمٹماتی آنکھوں میں عمر کی شفقت اور خوش طبعی آگئی تھی (جوانی میں وہ مختلف ہوگا) وہ ایک شگفتہ مزاج اور خوش صحبت بوڑھا آدمی تھا۔ ہم جلدی گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ وہ چٹکلوں کی پوٹ تھا اور سوات کے متعلق ہر قسم کی دلچسپ اور عجیب معلومات کا خزینہ۔ بلاشبہ اسے ان لوگوں میں ایک دینی عالم ہونے کی سند حاصل تھی (یہ ہمیں بعد میں پتہ چلا) مگر اس کے شاداں قہقہے اور اس کے کسی قدر رسیکڑ مزاج کی حس ثابت کرتے تھے کہ وہ نرا زاہد خشک نہیں تھا ـــ اپنے زمانے میں بوڑھے آدمی نے زندگی کے سب ذائقے چکھے تھے۔

اس نے ہم سے پوچھا کہ آیا ہم اس ملک میں بیوپار کے لئے جا رہے تھے اور آیا یہاں ہماری یہ پہلی آمد تھی۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم بیوپاری نہ تھے اور صرف سوات دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ اس پر وہ کچھ حیران معلوم ہونے لگا اور پھر اس نے ہمیں ایسی مشفقانہ شرارت آمیز نظروں سے دیکھا کہ ہم دوست بن گئے۔

سوات بڑا اچھا ملک ہے" بوڑھے آدمی نے کہا "اس کی وادی بڑی زرخیز ہے اور لوگ خوشحال اور پرامن اور شگفتہ ہیں۔ اب ہر گاؤں میں ایک مڈل سکول ہے۔ چوری اور قتل کا نام نہیں۔ بادشاہ صاحب کا زمانہ نہ ہوتا تو تم اس طرح اِدھر آ سکتے۔ راستہ میں تم قتل ہو جاتا۔ بادشاہ صاحب کے زمانے سے پہلے لوگ بڑے خراب تھے۔ قتل ایک کھیل تھا۔ کسی کا جان، مال یا عزت محفوظ نہ تھے۔ بادشاہ صاحب نے آ کر یہاں انصاف اور امن بحال کیا"

"بادشاہ صاحب اب بہت بوڑھا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"بوڑھا آدمی کڑکڑاتا ہوا ہنسا "بادشاہ صاحب اب پچاسی برس کا ہے مگر بوڑھا؟ وہ تو کئی جوانوں سے اب بھی اچھا ہے۔ اس کی صحت رشک کے قابل ہے۔ اس عمر میں وہ ہر صبح روزانہ پانچ میل پہاڑ پر چڑھتا ہے۔ بعض وقت وہ اپنے افسروں کو اپنے ساتھ ان سیروں پہ لے جاتا ہے۔ جس افسر کا چڑھتے ہوئے دم پھول جائے یا جو تھک جائے اس کی شامت آ جاتی ہے۔ کبھی کبھی وہ اس کو نوکری سے بھی برطرف کر دیتا ہے۔"

"کیا یہ بے جا سختی نہیں ہے؟"

"نہیں۔ بادشاہ صاحب کہتا ہے کہ آرام طلب اور موٹا آدمی ماسوا اپنے دسترخوان کے بیکار ہوتا ہے۔ وہ عام لوگوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔

دوسروں کے لئے مصیبت برداشت کر سکتا ہے۔ بادشاہ صاحب ایسے افسروں سے نفرت کرتا ہے"

ہمیں بادشاہ صاحب کی زیرکی اور اچھی سمجھ کی داد دینا پڑی۔ ایک آدمی جو اونچے پہاڑ پر چڑھنے کا دم رکھتا ہے یقیناً ایک صالح اور تندرست جسم کا مالک ہوگا۔ صالح جسم کا مطلب ہے صالح دماغ اور مطمئن ضمیر۔ پہاڑوں سے محبت کرنے والا شخص خائن اور غاصب نہیں ہو سکتا اور بڑے والی کا یہ اپنے افسروں کی اہلیت یا نااہلی کے امتحان کا طریقہ بڑی عمدگی سے سارے ملک میں رائج کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہر بڑے شہروں اور ریاست والوں اور بڑے عہدیداروں میں سے کتنے ہیں جنہیں پہاڑوں سے محبت ہے۔ ان میں سے کتنے ہیں جو کبھی کسی پہاڑ پر چڑھتے ہیں؟ پھر کوئی تعجب کہ ان کے جسم اور دماغ اس قدر بیمار ہیں۔

باتاخیل کی اس مہمان سرائے میں (ہوٹل کا نام ایسی صحت بخش جگہ کے لئے نہیں جچتا) ہم ایک گھنٹے تک سستاتے رہے ــــ زندہ دل بوڑھے سے باتیں کرتے ہوئے اور ٹالیو۔ میں ہادی عالم کو بار بار سنتے ہوئے۔ سرائے میں لے دے کے چار پانچ ریکارڈ تھے۔ وہاں ہم نے کچھ عرصے کے لئے سچی طمانیت محسوس کی۔ نعمت کو ڈھونڈ لینا اتنا مشکل نہیں جتنا ہر کوئی سمجھتا ہے مصیبت یہ ہے کہ ہم اسے غلط جگہوں میں تلاش کرتے ہیں ــــ بڑے اچھے سجے ہوئے مکانوں میں یا کسی ہوٹل کے لاؤنج میں ــــ سچی طمانیت مل سکتی تو ایسی سراؤں میں جیسی یہ باتاخیل کی سرائے تھی۔ یا پھر ایک خانہ بدوش کے کیمپ میں۔

اس اچھی سرائے سے چلتے ہوئے ہم نے وہاں کے لڑکوں اور خدمتگاروں میں چاندی کے سکے تقسیم کئے ــــ شکرانے کے طور پر۔

قلعوں کی سرزمین

باتاخیل سے چند میل آگے تک میٹلڈ روڈ اوپر چڑھتی ہے اور پھر ایک اور وادی میں اترتی ہے جسے "ارمغان سوات" کا قابل قدر مصنف اپر سوات کی وادی کا نام دیتا ہے۔ اس ہستی اور اس کی کتاب کے بارے میں آگے اپنی مناسب جگہ پر کچھ کہنے کی کوشش کروں گا۔ یہاں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اس نے کتاب میں وادیوں کے ضمن میں یہ درج کیا ہے: ریاست سوات میں دو وادیاں ہیں (۱) اپر سوات کی وادی (۲) لوئر سوات کی وادی۔ (ممکن ہے یہ نئی اپر سوات کی وادی ہی ہو)

اس وادی میں اترتے ہوئے میٹلڈ سڑک یکلخت ختم ہو جاتی ہے اور ایک عام روڑی کوٹی ہوئی پختہ سڑک میٹلڈ روڈ سے قدرے تنگ مگر اچھی حالت میں) اس کی جگہ لے لیتی ہے ــــ ایک میدان جو تقریباً ہموار تھا اور جس کے حاشیوں پر بید مجنوں کے درخت تھے۔ ہمارے بائیں کو وادی ایک فراخ گودا بہشت تھی اور درختاں دھند پرے پہاڑوں کے فاصلے کو حل کرتی تھی۔ صنوبر، دیودار اور چنار اور کو یا ننھے تنکوں میں بہار کے اجلے اجلے پیراہن اوڑھے میں اور پہاڑ کی ڈھلانوں پر نمودار ہونے لگے تھے اور بے مثال بکائن کے اودے پھول آنکھوں کے لئے ایک نادر مسرت تھے۔ اپی کیہورس جیل دیکھنے کا بڑا مشتاق تھا اور بڑی مدت تک ہم نے جیل نہ دیکھی۔ کیونکہ جیل پانچ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر اگتا ہے ــــ پھر اپی کیہورس نے اپنا جیل دیکھ لیا۔ اکیلا تھا یہ ایک اونچی پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا تھا۔ اپی کیہورس نے بڑی خوشی اور فخر سے اس کی طرف اشارہ کیا ــــ دریائے سوات اپنے جنگلی پھولوں اور زمردیں وادیوں کے بستر میں ایک بلوریں فیتہ تھا۔

تقریباً یہیں ہم نے دور شمال کے پہاڑوں پر برف چمکتی دیکھی۔ بوڑھے سرفراز گل نے ہمیں بتایا کہ یہ پہاڑ لنگا ہنگار کہلاتا ہے ــــ بے شک ایک پہاڑ کے لئے یہ ایک عجیب نام ہے مگر اس کے پیچھے ایک روایت ضرور ہوگی۔ اس انکشاف نے اپی کیہورس کو قدرے مایوس کر دیا۔ اس نے ایک بے لگام تخیل سے کام لے کر امید ظاہر کی تھی کہ یہ ننگا پربت کی برفیں ہیں ــــ وہ قاتل پہاڑ جس پر جرمن ہرل چڑھا تھا اور جہاں عجیب عجیب آوازوں نے اندھیرے میں پکارا تھا اور جس پر سے وہ گرتا پڑتا اور نیم پاگل اپنے دوستوں کے پاس لوٹا تھا ــــ بعض لوگوں پر چاند کا سایہ پڑ جاتا ہے۔ اپی کیہورس نے

برف بھی کچھ اسی قسم کا اثر کرتی ہے۔ وہ اتنا مضطرب تھا اور اتنی دفعہ برف پوش پہاڑیوں کی طرف وجد کی حالت میں اشارے کرتا تھا کہ بڑے آدمی نے سچ مچ اسے اس طرح دیکھا جیسے وہ باؤلا ہو۔

بڈھا سرفراز گل ہم سے پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا چٹکلے بیان کرتا تھا اور مذاق کرتا تھا۔ اس کی زبان بھی نہیں رکتی تھی۔ کوئی لڑکی اور نئی چیز آتی تھی۔ تمدو وہیں اس کے متعلق بتاتا۔ وادی کا آدمی ہونے کی وجہ سے وہ اس کے چپے چپے کو جانتا تھا اور چونکہ وہ ایک دنیا دار عالم بھی تھا اس لئے ٹوٹی پھوٹی اردو میں وہ احساسات دوسروں تک منتقل کر سکتا تھا۔

بعض وقت دریا ہٹتا اور ہٹتا سڑک کی بغل میں آ جاتا۔ کیا عجیب دریا، بلور بھی اس سے زیادہ صاف اور شفاف نہ تھا۔ ایک ایسی جگہ میں نے ایک خوبصورت پہاڑی عورت کو مشکیزوں کی بنی ہوئی ڈونگی میں کھڑے دیکھا۔ سورج کا سونا اس کے بالوں اور آنکھوں میں تھا اور وہ ایک لمبے بانس سے ڈونگی کو کھیر کر دریا کے دوسرے کنارے پر جا رہی تھی۔ یہ تصویر میرے ذہن میں محفوظ ہے اور لاتعداد دوسری تصویریں — خانہ بدوشوں کے قافلے اپنے گدھوں اور خچروں پر گذرتے ہوئے — ایک گاؤں میں چند بچے ایک آڑے تختے کے سروں پر بیٹھ کر جھولتے ہوئے — وہ دنیا کی ہر جگہ کے بچوں کی طرح تھے۔ غور کرنے والے دماغ کے لئے ایک ملک کے انسانوں اور دوسرے ملک کے انسانوں کی بنیادی خواہشات اور امنگوں میں چنداں فرق نہیں۔ تبت کے ایک بچے کو مغرب کے مہذب ترین ملک میں لے جاؤ تو وہ مشکل ہی سے وہاں اجنبیت محسوس کرے گا۔ وہ وہاں کے بچوں سے اس طرح گھل مل جائے گا جیسے وہ اس کے اپنے گاؤں کے دوست ہوں۔ انسان جب بڑے ہو جاتے ہیں تو پھر نہ جانے انہیں کیا ہو جاتا ہے؟

ہم ایک چٹان پر تختوں میں بنے ہوئے پتھریلے قصبے کے بیچوں بیچ گذرے۔ حاجی سرفراز گل نے سوٹ اور سواتی ٹوپی میں ایک لمبے گٹھے جسم کے شخص کی طرف ہمیں متوجہ کیا۔ وہ اپنے معمولی مکان کے چھوٹے پھاٹک کے باہر گلی میں کھڑا تھا۔ "یہ" اس نے بتایا "والی کے ضلع کے حاکموں میں سے ہے — ایک عہدیدار جو ہمارے ہاں کے ڈپٹی کمشنر کے برابر تھا۔ سرفراز گل کو یا تو پتہ نہ تھا یا حب الوطنی کی وجہ سے وہ بتانا نہ چاہتا تھا کہ جب ہم نے اس سے ڈپٹی کمشنر کی تنخواہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے اپنے چوڑے کندھے ہلا دیئے۔

اس سارے عرصے میں ہم شمالی یا شمال مشرقی سمت میں سفر کرتے رہے۔ اب ہم نے ایک چکر کاٹا اور ایک اور وادی میں داخل ہوئے۔ چٹان اب ہمارے بائیں کو تھی۔ وادی دائیں کو اور ہم جانے بغیر ۱۸۰ درجے کے زاویے میں سے گھوم گئے تھے (ایک تجربہ جو پہاڑی سفر میں کافی عام ہے) اور سیدھے جنوب کو جا رہے تھے — دریا اب ایک کھاتے ہوئے سیمیں اژدہے کی طرح ہمارے ساتھ ساتھ لہراتا جاتا تھا — کبھی پلٹ کر آتا ہوا کبھی ہٹ کر بہتا ہوا اور کبھی مست خرام اور کبھی اس کے ایک بازو کا پانی دور رہ جاتا ... وہ بہتا تھا۔ یہ ایک شاداب وادی میں شاداں دریا تھا پھر ہم رک گئے۔ سامنے ایک پھاٹک تھا۔ ہم سواتی ... ہم نے اتر کر ایک چھوٹی چائے کی دوکان میں چائے پی۔ اور سنہری سویرے میں وادی کے جادو کا نظارہ کیا۔ ہم تعجب کرتے ... کہ کوئی دوسری جگہ بھی اتنی خوبصورت ہو سکتی ہے۔ چوکی کے محصول لینے ہماری لاری کی چھت پر چڑھ کر اسباب کی جانچ پڑتال کرنے لگے۔ بیشتر مسافروں کو اپنے ٹرنک یا بستر کھول کر معائنہ کرانا پڑا مگر انھوں نے ہم سے کچھ پوچھ گچھ نہ کی — سامنے پھاٹک کے پاس تین سامان بردار ... سیدو کے ہوٹلوں کے اشتہار — ایک بس ... کی سمت سے آئی اور پھاٹک کی پرلی طرف رک گئی۔ اس کے مسافر باہر نکلے۔ ان میں ایک ... سالہ امریکن لڑکا تھا — چکنے خاکی میں ایک قدرے پلپلا چھوٹا موٹا لڑکا — تیز بینی شیشوں کی عینک لگائے اور کندھوں سے ایک کیمرہ لٹکائے۔ اس کے ساتھ اس کا ایک پاکستانی ہم عمر دوست تھا اپنے انداز میں کسی قدر تخریلا اور رقابتی۔ وہ چائے کی دوکان پر آئے۔ امریکن لڑکا پاس پڑی کھاٹ پر لیٹ گیا۔ اس کا دوست کہیں سے بڈھے سرفراز گل کو پکڑ کر

سے لگا۔ بڈھا لڑکے کے ساتھ گھاٹ پر بیٹھ گیا اور وہ آپس میں فارسی میں باتیں کرنے لگے۔

بعد میں جب ہم اپنی لاری میں سوار ہوئے تو سرفراز گل نے ہمیں بتایا کہ لڑکا امریکی تھا۔ وہ اکیلا بخارا سے آ رہا تھا۔ وہ فارسی اپنی مادری زبان کی طرح بولتا تھا۔

یہ امریکی لڑکا کون تھا؟ ہم نے تعجب کیا۔ وہ بخارا سے کیوں آ رہا تھا؟ وہ بخارا کیوں گیا تھا؟ کیا وہ امریکی جاسوس تھا؟ یا کیا وہ رومانس اور مہم کی تلاش میں ہم سا آوارہ گرد؟ جو کوئی بھی وہ تھا بہرحال ایک لڑکا جو بخارا سے آ رہا ہو۔ اس سے زیادہ قابل رشک اور کون ہو سکتا ہے؟ وہ اپنے کئی ہم عمروں سے کتنا خوش قسمت تھا جو کلاس روموں میں شاید لیکچر سن رہے ہوں گے یا کسی فیکٹری میں کوئی پرزہ ڈھالنے میں لگے ہوں گے۔

چوکی سے گذر کر سڑک پہاڑی کے گرد وسیع درانتی کے سے نیم دائرے میں گھومی اور جب ہم نیم دائرے کے دوسرے سرے پر پہنچے تو ہمارے بائیں کو تھی اور ہم شمالی سمت کو جا رہے تھے۔ سب ہما فروں کے لئے شمالی سمت اصل سمت ہے۔ دوسری سمتیں مسافروں کے لئے نہیں (کیونکہ وہ بیوپاریوں اور کارخانوں کے مالکوں کے لیے ہیں (میں جانتا ہوں یہ محض بکواس ہے تاہم اس میں کافی صداقت کی رمق ہے)

ہم ایک گاؤں کے پاس سے گذرے۔ یہاں ایک سبزہ زار میں ایک چھوٹا سا قلعہ ایستادہ تھا۔ یہ ایک دوستانہ چھوٹا قلعہ تھا ـــــ شکل میں ایک مکعب اس کی دندانے دار فصیل کے چاروں کونوں پر برج تھے۔ برج شطرنج کے رخ تھے۔ پتھریلی دیواروں کی چنائی تھوں سے ہوئی تھی۔ لکڑی کی کھپچیاں تھوں کو دوسرے سے جدا کرتی ہیں اور یہ سب کچھ ستھری بیدکاری کا تاثر دیتا تھا ـــــ سرفراز گل نے بتایا کہ یہ تھانہ ہے۔ اب ایک تھانے سے اس کا مطلب پولیس اسٹیشن سے تھا یا فوجی چوکی سے یا محض غلہ جمع کرنے کی جگہ سے ـــــ ہمیں معلوم نہ ہو سکا ـــــ ہر ننھے گاؤں میں یہ برج نما قلعہ موجود تھا۔ یہ ہمیں پتہ ایک طرح سے سوات کا قومی نشان ہے جس طرح شیر ببر اہل انگلستان کا اور چھپٹتا ہوا عقاب المانیہ کا۔

سڑک کے ساتھ ساتھ صنوبروں اور لمبے سروؤں کی چار دیواری میں محفوظ لوکاٹ اور شفتالو اور سیب کے باغات تھے ـــــ اور دور دور تک پوست کے خرم سپید پھول ہوا میں ناچتے تھے۔ میں نے سرفراز گل سے پوچھا "تمہارے ملک میں لوگ پوست تو بہت پیتے ہوں گے؟"

اس کی آنکھیں تمتائیں "یہ خدا کا تحفہ ہے۔ لوگ پیتے نہیں۔ بس کاشت کرتے ہیں۔"

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ پوست کے ملک کے لوگ پوست کے ذائقے اور نشے سے محروم رہیں یہ ایسا ہی ہے جیسے انگوروں کے ملک کے لوگ انگوروں کی شراب کشید نہ کریں۔ آدمی کی زندگی میں ایسی منزلیں آتی ہیں جب نشیلی چیزیں ضروری ہوتی ہیں اس کے پاس زندگی کی تلخی کے مداوا کے لئے کچھ تو ہونا چاہیے۔ وہ لوگ جو نفع نقصان کی دنیا میں رہتے ہیں نشیلی چیزوں کو مطعون کرتے ہیں کہ یہ صحت اور روپے کو برباد کرتی ہیں اور مذہب اور اخلاق کے خلاف ہیں ـــــ درست ـــــ مگر یہ آدمی کو وقتی طور پر دیوتاؤں کے ساتھ اولمپیا پر بھی بٹھا دیتی ہیں ـــــ اسے لافانی خواب دیکھنے تو عطا کرتی ہیں اور خدائی کا ایک لمحہ پچھتر سال کی باعزت بے حصول خود غرضانہ زندگی سے کہیں زیادہ بیش قیمت ہے ـــــ اور کہیں زیادہ

حاجی سرفراز گل سیدو سے ایک دو میل ادھر ایک مسافر خانے کے سامنے اترا "میں یہاں اتر جاؤں گا۔" اس نے کہا "میرا دل تو چاہتا تھا تمہارے ساتھ چل کر تمہیں سیدو کی سیر کراتا لیکن میرا کام ضروری ہے۔"

ہمیں اس کے جانے کا افسوس ہوا۔ وہ ایک بے مثال بوڑھا آدمی تھا ـــــ ان خوش باش بوڑھوں میں سے ایک جو زندگی کی شام میں ڈھلان سے اترتے ہوئے اپنے دل کی استقامت نہیں کھوتے۔ بلکہ جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے۔ وہ زیادہ رسیلے اور رواداری ہو جاتے ہیں۔

شہرِ طلسمات

نیلی آنکھوں والے ایک خوش شکل، خوش اعضا نوجوان نے جس کے سرخ تیکھے چہرے میں دن کی تاب اور پہاڑوں کی شادمانی تھی، میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ایسا نوجوان تم میدانوں میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔

"یہ" اس نے کہا "سیدو شریف ہے ــــ والی صاحب ادھر رہتا ہے" اور اس نے بائیں طرف پہاڑی پر بنے ہوئے ایک شہر کی طرف اشارہ کیا۔ ڈھلتی ہوئی سہ پہر میں سیدو واقعی فنطاسک لگتا تھا ــــ اور جدید ــــ ایک کوہستانی قصبہ نہیں، جیسا کہ ہم امید کر رہے تھے۔ رنگین ڈھلوانوں میں بنگلے اور حویلیاں ایک اونچی پہاڑی کے گرد اکٹھی ہو رہی تھیں۔ ایک نیلی دھند سی شہر کے اوپر معلق تھی اور سیدو کہانیوں کی کتاب کا شہر لگتا تھا۔

یکلخت سڑک ہموار ہو گئی اور چوڑی بھی۔ بجلی کے پول سڑک پر نمودار ہونے لگے۔ ہم ایک چوڑے گلابی پتھروں کی دکانوں کے بازار میں سے گزر رہے تھے۔ چوک پر ملیشیا میں ایک پولیس مین بجلی کے پول کے اوپر لگی ہوئی چھتری کے نیچے کھڑا تھا۔ مستعدی سے اس نے ہمیں ہاتھ دیا۔ ہم آگے گزر گئے اور لاری کے اڈے پر جا رکے۔

خوش شکل پٹھان نے کہا "یہ منگورا ہے۔ نہیں، بس سیدو نہیں جاتی۔ تم سیدو سیر کے لئے جا سکتا ہے، وہاں تانگہ جاتا ہے۔ تم ٹھہرے گا منگورا ہی میں۔ سیدو میں ہوٹل نہیں ہے۔"

ہمارے اترتے ہی گویا منگورا کے سارے فقیر چھوکروں نے ہم اور ہمارے سامان پر ہلہ بول دیا۔ سیدو جو ہرا بھرا تھا، قصہ پھر دہرایا گیا۔ اور اس سے پیشتر کہ ہم جانتے کہ ہم کہاں تھے، اپنی کیمرس اور پانچ چھ مزدور روندوں کی ہمراہی میں سڑک کے پیچھے مارچ کر رہے تھے ــــ اور سارے بازار کے لئے ہنسی کا نشانہ ــــ میں نے اپنی کیمرس کو اتنے مزدوروں کو اجرت دینے کی حقیقت سے بیکار آگاہ کیا۔ میں نے انسان روندوں پر نگاہ رکھنے کے لئے بیکار بار بار کہا۔ وہ ہمارے سامان کے ساتھ غائب ہونے کے اہل تھے۔ اپنی کیمرس محض مسکرایا۔ وہ فقیر چھوکروں سے محبت کرنے کے موڈ میں تھا۔

ان بچوں کا سرغنہ ایک چالاک چھٹا ہوا لڑکا تھا۔ وہ ہمیں گلی کے آخر میں ایک محراب دار پھاٹک کے ہوٹل میں لے گیا۔ یہ جگہ ہوٹل سے زیادہ ایک بھٹیار خانہ تھی مگر چالاک لڑکے نے مجھے یقین دلایا کہ اس سے بہتر رہائش اور کہیں نا ہمیں منگورا میں اور کہیں نہیں ملے گی۔ اپنی کیمرس سامنے کے ہوٹل کو دیکھنے چلا گیا تھا جو دو منزلہ تھا اور ایک چھوٹی سڑک کے اوپر دیکھنے والی بالکنی رکھتا تھا۔ موٹے چالاک لڑکے نے میرے احتجاجوں کے باوجود ہمارا سامان اس بھٹیار خانے کے ایک کمرے میں اتروا دیا۔ یہ کمرہ بڑا اور نہایت غلیظ تھا۔

"ہم یہاں نہیں ٹھہریں گے۔" میں نے مزدور لڑکوں کو حکم دیا کہ سامان اٹھا کر سامنے کے ہوٹل میں لے چلیں۔ سامنے کے ہوٹل کا نام نشاط ہوٹل تھا۔

چالاک لڑکے نے شور مچانا شروع کر دیا "وہ نشاط ہوٹل والا چور ہے۔ ادھر پانچ روپیہ روز کرایہ لیتا ہے۔ ادھر کل ڈیڑھ روپیہ۔ دیکھو اچھا کمرہ ہے۔"

"ہم یہاں نہیں ٹھہریں گے۔" میں نے غصے میں کہا اور سامان اٹھوا کر باہر سڑک پر نکل آیا۔ اپنی کیمرس نشاط ہوٹل کی بالکنی میں ایک شہرِ مطمئن گورے کی طرح کھڑا مجھے اوپر بلا رہا تھا۔ مایوس اور گستاخ لڑکا اپنے ہوٹل کے باہر اکڑا چلا رہا تھا "بابو! وہ ہوٹل گندہ ہے۔ وہ چور ہے۔"

میں ہوٹل میں داخل ہوا۔ ڈائننگ روم صاف ستھرا اور خوبصورت تھا۔ اس میں پتھر کی میزیں تھیں۔ کاؤنٹر پر ایک چھوٹا سا شخص کھڑا تھا ــــ اتنا معصوم کہ وہ مجھے ایک نورانی فرشتہ معلوم ہوا۔ اس نے دلآویز مسکراہٹ سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر پشتو میں میری خیریت پوچھی اور مجھے سیڑھیوں کی راہ دکھائی۔

"بالکنی کے کمرے میں سامان رکھوانے کے بعد میں بالکنی میں آیا تو مجھ سا موٹا چھوکرا چلانے لگا: "آدھر ابودال بھات لے گا؟ ادھر بھنا ہوا گوشت ہے"۔
میں نے چاہا کہ نیچے جا کر اس کی ٹھکائی کروں۔ مگر میں بزدل آدمی ہوں۔ آخر اپی کیورس اور میں نے کمرے کا دروازہ ہی بند کر دیا۔

مجھ میں (اس کا اظہار کرنے کی غالباً ضرورت نہیں) ذرہ برابر بھی خود اذعانی کا مادہ نہیں۔ اپی کیورس میں خوش قسمتی سے یہ شے بدرجہ اتم موجود ہے۔
سے ورود نے ہوٹل کے عملے کو (وہ دو چھوٹی ناکوں والے مسٹنڈے لڑکے تھے، ہیرگل اور گل نواز نامی) بھگا نا دوڑانا شروع کر دیا۔ ایسے معزز اور اہم
مانوں نے، ایسا لگتا تھا، اس ہوٹل کو کبھی پہلے رونق نہ بخشی تھی۔ انھوں نے بلاشبہ ہوٹل کا سب سے اچھا کمرہ ہمیں دیا تھا۔ صرف اسی کمرے کے آگے بالکنی تھی)
لے بستر کھولے، سامان ٹھیک ٹھاک کیا۔ نہا دھو کر تازہ دم ہوئے۔ ہم نے اجلے کپڑے پہنے اور نئے آدمیوں کی طرح محسوس کیا۔ چائے پینے کے بعد جب ہم سید
چکر لگانے کے لیے نیچے آئے تو گہری نیلی شام ہو چکی تھی اور بجلی کے لیمپ روشن تھے۔ ہم سید و شریف جانے والی سڑک پر چلنے لگے۔ یہ کسی بڑے جدید شہر کی
ک سے کسی طرح کم نہ تھی ——— بڑی چوڑی اور پوری طرح میل کی ہوئی۔ اس کے دو رویہ بید مجنوں اور صنوبر ایستادہ تھے اور جنگلی پھولوں کی خوشبو ہواؤں
ی بھری تھی۔ آسمان تاریک مخمل تھا اور نتھرے ہوئے چمکدار تارے جھرمٹوں میں اوپر سید و پر گر رہے تھے ——— سیدو کی سب پبلک اور سٹیٹ
رتیں اسی سڑک پر تھیں۔ شہد کی مکھیوں کا ایک فارم تھا۔ اس سے آگے بائیں کو اسٹیٹ کالج کی عمارت تھی ——— حرف ب کی شکل کی جس کے سامنے کے
ل پر سانپ کی چھتری کے پودے کی شکل کے دو برج تھے۔ وہ اس جھٹپٹے میں ایک عجیب پر اسرار تاثر دیتے تھے۔ سڑک آگے بتدریج چڑھتی گئی۔ سٹیٹ
سپتال اور سوات ہوٹل کی عمارتیں آئیں۔ اندھیرے میں ہم عمارتوں کو اچھی طرح ابھار نہ پاتے اور کوٹھے ہوکران کے نام کے بورڈوں کو پڑھنے کی کوشش
تے۔ ہم اسی طرح چلتے چلتے ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے سڑک دو شاخوں میں بٹ جاتی تھی۔ بجلی کے پول کے نیچے اس نقطے پر ایک راہ نما تھا
ــــ زاویہ قائمہ بناتے ہوئے دو بازوؤں کے ساتھ۔ ایک بازو پر لکھا تھا "ولیعہد صاحب"۔ دوسرے پر "والی صاحب"۔ اس سے ہم خوب محظوظ ہوئے۔
ہوں اور سڑکوں کے نام دینے کی بجائے فنگر پوسٹ پر ان ہستیوں کے نام دینا جو غالباً ان سمتوں میں رہتی تھیں ایک عجیب اور غیر معمولی اختراع تھی ———
لی صاحب اور ولیعہد صاحب دونوں معزز ہستیاں شہر کے دو متقابل سروں پر فروکش تھیں۔

"اب فیصلہ کرو" میں نے اپی کیورس سے پوچھا "ولیعہد صاحب یا والی صاحب"۔

"ولیعہد صاحب" اپی کیورس نے جھٹ جواب دیا جیسا کہ اس کے بارے میں کوئی شک نہ ہو سکتا تھا۔

اور ہم ولیعہد صاحب کی سڑک پر ہولئے۔ مگر اندھیرے میں یہ جادو کی سڑک تھی اور یہ کسی طرح ہمیں سیدو شریف کی خوش کن جیدار گلیوں میں
ے گئی۔ شہر انجینیرنگ کے "قصبہ" کی طرح گلیوں اور کوچوں کا بھنڈا منتر ہے ——— گلیاں جو نیچے اترتی ہوئی سیڑھیاں ہیں اور زمین کی انتڑیوں میں جاتی معلوم ہوتی
ں۔ اور پھر اچانک پر اسرار نالیوں کے پاس آ نکلتی ہیں ——— سیدو شریف کا مزار ہر جگہ چھایا ہوا ہے۔ سب کوچے آخر کار ہمیں مزار پر پہنچتے ہیں۔ تم کوئی
ی گلی پکڑو، ہر پھر کر تم مزار پر پہنچو گے۔ یہ ایک بڑی عمارت ہے اور دیکھنے کے قابل۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ یہ فقیر جیوکروں سے پٹی ہوئی ہے
——— اپی کیورس اور میں جوتیاں ہاتھ میں پکڑے اس کے ٹھنڈے صحنوں میں گھومتے رہے۔ فقیر بچوں کی فوج ہمارے جلو میں تھی۔ ہم ایک حجرے کے دار
نیچے ایوان میں گئے۔ جہاں مزار ایک قیمتی غلاف میں منڈھا ہوا تھا۔ ایک سیاہ بدکی داڑھی والا آدمی دوزانو بیٹھا گڑگڑاتے لہجے میں پیر سے کوئی
مت مانگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عیاری تھی کسی قدر رعونت کی جھلک اور اس کا چہرہ ایک عیار کا چہرہ تھا ——— تم ان لوگوں کو جانتے ہو گے
ہ کے ولی مذہب کی ہر طرح سے بے گانہ ہوتے ہیں۔ جو اپنے ہمسائے کی کھال ادھیڑنے سے نہیں چوکتے۔ اگر اس سے ان کا کچھ فائدہ ہوتا ہو ایسے
ف اکثر پیروں سے فیض حاصل کرنے میں سرگرداں رہتے ہیں۔ فیض سے ان کی مراد دولت کی فراوانی ہوتی ہے اور اگر انھیں ایک پیر کے دربار سے فیض

ملتا تو وہ دوسرے پیر کے دربار پر جائیں گے اور فیض پانے کے لئے کڑی سے کڑی شب بیداریاں اور چلہ کشیاں کریں گے مزار کے
ہی ایک وسیع ایوان میں مسجد ہے۔ بڑے فانوس چھت سے لٹک رہے تھے۔ مزار سے باہر ہم نے حاتم طائی بن کر جود و سخا کے دریا بہائے۔ میں نے
دوکان سے کیپسٹن کا پیکٹ خرید کر دس کے نوٹ کو چھوٹی ریزگاری میں تبدیل کر لیا تھا اور اب ہم نے اسے فقیر بچوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ ہم سیدو
تھے اور اس مبارک سانحہ کی خوشیاں منانا چاہتے تھے۔ مگر یہ ہماری غلطی تھی۔ جلد ہی سیدو کے سارے گداگر بچے اور اپاہج ہمارے گرد جمع تھے۔ اتنی سی
ری ان کے لئے کافی نہ ہو سکتی تھی۔ سو ہم وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے....

معطر اور مخملی رات میں ہم واپس ہوٹل میں آئے۔ پیر گل نے ہمیں کھانا کھلایا۔ تھکے ماندے تو تھے ہم آتے ہی مشالی گھوڑے بیچ کر سو گئے۔ اچھے اچھے خواب
سروں میں لئے ہوئے ٹھنڈی ہوا بالکنی میں سے اندر آ رہی تھی اور تارے باہر کالی رات میں منگورا اور سیدو پر دمک رہے تھے۔

خوارزخیل

دوسرے دن (نو اپریل) چائے اور تلے ہوئے انڈوں کا ناشتہ کر چکنے کے بعد ہم نے پیر گل سے پوچھا "مدین اور بحرین کو لاری کتنے بجے
ہے؟" پیر گل کی اردو پوری سوری تھی۔ جواب دینے سے پہلے اس نے سوچا۔ پھر اس نے کہا: "مدین سے ایک لاری دس بجے جاتا ہے دوسرا بارہ بجے۔
دس بجے کا لاری پھر شام کو منگورا سے واپس آجاتا ہے"۔

پیر گل 'سے' اور 'کو' کے فرق کے بارے میں پوری طرح واضح نہ تھا۔ وہ فقرے میں ایسی جگہ 'سے' استعمال کرتا، جہاں 'کو' زیادہ موزوں ہوتا۔
عادت سے اس کے فقرے اکثر اس کے مطلب سے بالکل الٹ مفہوم دینے لگتے اور سننے والے کے لئے ایک پر لطف الجھن کا سبب ہوتے۔
نے میں ہمیں کچھ دقت لگا کہ 'مدین سے ایک لاری' سے اس کا مدعا مدین کو جانے والی لاری سے تھا —— وہ بعض دفعہ 'سے' کو ویسے ہی فقرے
ے آتا جہاں وہ قطعاً غیر ضروری ہوتا۔

ہم نے اس سے پوچھا کہ آیا مدین منگورا سے اچھی جگہ ہے؟ —— ہمارا مطلب تھا قدرتی خوبصورتیوں کے معاملے میں۔ اس نے اس پر سنجیدگی
غور کیا اور اپنے دل میں جواب مکمل کر کے کہا "مدین سے منگورا کا بازار اچھا نہیں ہے"۔

بے چارہ چھوکرا! وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ مدین کا بازار منگورا کے بازار سے اچھا نہیں ہے۔ مگر 'سے' کے بے جا استعمال نے اس کے فقرے کو بالکل
نئے معنی دے دیئے اور اس کے جواب کو معما بنا دیا۔

"تمہارا مطلب ہے مدین کا بازار اچھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مدین کا بازار اچھا نہیں ہے۔ منگورا کا بازار بہت اچھا ہے۔" اس نے وضاحت سے کہا۔

مگر یہ وہ نہ تھا جو ہم جاننا چاہتے تھے یعنی یہ کہ مدین کے پہاڑی نظارے منگورا سے زیادہ پرشوکت ہیں یا نہیں۔ ان باتوں کے متعلق لڑکا بھلا
رسکتا، اس نے کبھی ان جگہوں کے اس پہلو کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ ایک جگہ اچھی تھی اگر اس کا بازار اچھا تھا۔ اتنی اچھی نہیں، اگر اس کا بازار
تھا۔ قدرت کی رنگینیوں کو اس میں دخل نہ تھا۔ آدمی سوچتا تھا کہ کیا کبھی اس لڑکے کا دل ایک جنگلی گلاب کو دیکھ کر اچھلا ہے؟ شاید نہیں۔ وہ ہمیں پتہ لگا
کے پاس کے ایک چھوٹے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ مر چکا تھا اور لڑکا اپنی چھوٹی عمر میں ہی پہاڑ کی بے فکر آزادی کو چھوڑ کر ایک تنگ دنیا
روزی کمانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ یہ جان اور روح کو کشادہ رکھنے کی مستقل تگ و دو ایسے لڑکے کو جھرنوں اور سبز پوش پہاڑیوں کی خوبصورتی پر غور کرنے کا

وقت نہیں دیتی۔ تاہم ہیرگل کی بدقسمتی پر رحم کرنا اور اس بات کا ماتم کرنا کہ وہ کبھی غالب کی شاعری کے حسن سے متاثر نہ ہو سکے گا۔ یا یہ کہ شیو برٹ کے اس کی روح کو کبھی نہیں ہلائیں گے، بالکل فضول اور احمقانہ بات ہے۔ ایک اچھی زندگی گذارنے کے لئے آدمی کو ایک سادہ معصوم دل اور مضبوط ضمیر ضرورت ہے۔ تم غالب کا ایک لفظ جانے بغیر، شیوبرٹ کے نغموں کو سمجھے بغیر بھی خوبصورت زندگی گذار سکتے ہو اور ایک ریوڑ کا چرواہا ہونا، ایک روکھے فلسفی ہونے سے کہیں بڑی خوش بختی ہے۔ غالب کی شاعری اور شیوبرٹ کے نغمے ہی دنیا کا سارا حسن نہیں ہے اور اس کو سمجھنے کا اہل ہونا اس بات کا نہیں ہے کہ تمہارا دل لطیف ہے یا تمہارا ضمیر صاف۔ ایک چرواہا اپنی بکریوں اور ریوڑ کے ساتھ اپنی پہاڑی ڈھلان پر گھنٹوں قدرت کے اسرار پر غور ہے۔ وہ گنگناتے ہوئے چشموں کے راگ سنتا ہے اور موسم کے بدلتے ہوئے چہرے اور موجیں دیکھتا ہے۔ وہ میز پر جھکے ہوئے تمہارے شاعر یا افسانہ مقابلے میں چیزوں کے اصل جوہر سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ وہ چرواہا ان چیزوں کو نثر یا شعر میں بیان نہیں کر سکتا مگر تم اس کے لئے اس پر رحم کیوں ان کہے نغمے کہے ہوئے نغموں سے کہیں میٹھے اور رسیلے ہوتے ہیں ایک پہاڑی آدمی ایک نظارے کو دیکھ کر تم سے یہ نہیں کہے گا "یہ نیلی پہاڑی کتنی خو ہے" لیکن تم پہاڑی لوگوں کی آزادی اور شادمانی کو ان کی آنکھوں، ان کے سارے وجود میں دیکھو گے ـــــ اس سے مجھے خیال آتا ہے کہ ہم قدرتی نظا ذکر ضرورت سے زیادہ شعر اور نثر میں کرنے کے عادی ہیں۔ آرٹ زندگی کی ایک نامکمل مصنوعی تقلید ہے اور آرٹ کے حسن سے لطف اندوز ی بہت سے لوگوں ہیں۔ بیر یا بینگن کی ترکاری کی طرح ایک اکتسابی ذوق ہے۔ یہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک آدمی میں خوبصورت ادبی چیزوں سے اٹھانے کا ملکہ تو ہے مگر مصوری اور موسیقی کے لئے وہ اندھا اور بہرا ہے اور جب وہ دوسرے لوگوں کو بے خودی سے اور مست کسی راگ پر ہے تو اسے ان کی بے وقوفی پر جھلاہٹ ہوتی ہے۔ سننے والوں کو راگ وقت اور مکان کی حدود سے باہر لے جا رہا ہے اور ہمارا ادبی آ ہے کہ آخر اس آ۔آ۔آ ـــ میں لوگوں کو کیا ملتا ہے؟

سو ہیرگل کی زندگی پر رحم یا افسوس کی کیا ضرورت ہے۔ وہ ایک صحت مند کھاتا لڑکا تھا اپنی آپ خبر رکھ سکتا تھا اور اپنے ہوٹل میں آ کر اس کا ہر قسم کے لوگ دیکھنے اور ان سے باتیں کرنے کا موقع پا رہا تھا۔ یہ ایک تندرست دماغ کے لڑکے کے لئے بری زندگی نہیں تھی۔

ہیرگل سے مدین کی بس کے اڈے کا پتہ پوچھ کر ہم نیچے سڑک پر اترے اور دھوپ میں نہاتے ہوئے بازار میں بتائی ہوئی سمت میں چلتے ر ادھر جا کر ہم ایک تراہے پر بائیں طرف مڑے۔ بلند رنگت کی چوڑے فرنٹ کی دوکانیں ہماری دلچسپی کا مرکز تھیں۔ وہ ہر طرح مال سے بھری ہوئی تھیں ملے کے کام کی سواتی ٹوپیاں، جوتیاں اور رنگین موٹی دھاریوں کے پارچہ جات ـــ وحشی دور دراز پہاڑیوں میں یہ جدید شہر جس میں چوڑی میٹلڈ تھیں۔ ٹریفک پولیس مین اور بجلی کے پول اور ہوٹل تھے حقیقی نہ لگتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے ہم نے اس سڑک پر یقین کرنا چھوڑ دیا۔ یہ طلسمات کا جیسے کسی جن نے اپنے مالک، شاہزادے کے حکم سے تہذیب کی ساری سہولتوں کے ساتھ ان پہاڑوں کے بیچ بنا دیا تھا۔ تھوڑی دیر اور ـــ اور یہ سے غائب ہو جائے گا ـــــ اور اس کے ساتھ ہی اس کے ٹریفک پولیس مین اور بجلی کے پول اور تاجر بھی۔ یہاں کے تاجر یقیناً طلسم تھے ـــ حاجی سرفراز گل نے ہمیں بتایا تھا کہ سیدو ایک فوجی چھاؤنی ہے۔ ہم نے پر رونق بازار میں کئی جوان سواتی دیکھے ـــ سے واسکٹیں لٹکائے اور بے پروائی سے ٹہلتے ہوئے ـــ اپنے کیمرہ میں سوات پر کوئی گائیڈ یا معلوماتی کتب حاصل کرنے کا مشتاق تھا۔ ہم اسٹیشنری کتابوں کی ایک دوکان پر چڑھ گئے۔ پروپرائٹر کاؤنٹر کے پیچھے سے تعظیماً کھڑا ہو گیا ـــ نہیں اس کے پاس سوات کا نہ کوئی گائیڈ میپ تھا نہ کوئی پھر اس نے ہمیں تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرنے کو کہا۔ اپنے ایک جوان اسسٹنٹ کو پاس کی کتابوں کی ایک اور دوکان میں بھیجا۔ وہ گیا اور وہی کتاب آیا جس کی ہمیں ضرورت تھی۔ اس کا نام تھا "ارمغان سوات" تھا اور یہ شیخ مظفر حسین سی۔پی۔ایچ کی تصنیف تھی۔ اس میں چند فوٹو گراف بھی تھے۔ ہم

.یہ ہمارا شیخ مظفر حسین کی مشہور ہستی سے پہلا غائبانہ تعارف تھا۔ اس سے پہلے اس کا وجود نہ تھا۔ اب وہ نادر آب و تاب سے ایک واحد روشن ،کی طرح سوات کے ادبی اور علمی آکاش میں چمکنے لگا۔ ہم شیخ مظفر حسین سے ملنا چاہتے تھے۔ ہم اسے کہاں مل سکتے ہیں؟ سی پی ایچ وہ کیسے تھا۔ مگر کتاب کو حاصل کر کے ہم وہاں سے بھاگے۔ وقت اب نو کا تھا۔ لاری دس بجے جاتی تھی لیکن ایپی کیورس کی رائے تھی کہ ہمیں نسٹ متو۔ کے متعلق ہلنے کی خاطر وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے پہنچنا چاہیئے۔ راستے میں ہم تین چار دوا فروشوں کی دوکانوں پر "وکس" کا پتہ کرنے کے لئے رُکے۔ یہ دوکانیں انگریزی سے بھری ہوئی تھیں۔ بے شمار پیٹنٹ دواؤں کے ڈبے خوش اسلوبی سے الماریوں میں سجے تھے۔ "وکس" کے کئی پیکٹ ان میں مجھے نظر آئے لیکن روں نے ہمیں یقین دلایا کہ مدت سے مال نہیں آیا۔ یہ سب ڈبے خالی تھے۔ اور محض دوکان کے شو کی خاطر رکھے گئے تھے ـــــ اس کے بعد ہمارے منگورا کے طلسماتی شہر ہونے کے بارے میں کوئی شک نہ رہا۔

بس تقریباً بھر چکی تھی جب ہم وہاں پہنچے۔ ایپی کیورس نے میری "وکس" کی تلاش کو اس "تاخیر" کا موجب گردانا۔ یہ اس کی قطعی زیادتی تھی۔ ایک آدمی ہر لگائے ٹکٹ بیچ رہا تھا۔ ایپی کیورس کو دیکھ کر وہ تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ ایپی کیورس دیسے بھی بارعب آدمی ہے اور اپنے فیلٹ ہیٹ اور چشموں میں تو وہ ہی بارعب تھا۔ اس اچھے آدمی نے کسی نہ طرح ہمارے لئے دو نشستیں پیدا کر ہی لیں۔ ایک ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر، دوسری اس سے پیچھے۔ بٹ پر ایک اور آدمی سوٹی ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا ـــ شلوار قمیض میں۔ اور کچھ کچھ ایک احمق سکول ماسٹر کا سا ـــ ہم اسے جانتے تھے وہ مردان سے ہمارے ساتھ ہی سوار ہوا تھا اور ہم نے اسے نشاط ہوٹل میں بھی دیکھا تھا۔ اس نے ہمارے ساتھ واقفیت گانٹھنے کی کوشش کی تھی مگر ایپی کیورس کو وہ اپنی "خود وری وضع" کے سبب پسند نہ آیا تھا۔ اور ہم اس سے زہر کی طرح بچتے رہے تھے ـــ ایپی کیورس نے اس کے ساتھ بیٹھنے پر پیچھے بیٹھنے کو ترجیح دی اور مجھے اور خالی دماغ شخص کے سامنے بیٹھنا پڑا۔ وہ اپنی ٹانگیں پھیلا کر اور سوٹی پر ٹیک لگا کر زیادہ سے زیادہ جگہ گھیرے ہوئے تھا۔ میرے آنے کر اس نے پسند ر وہ اپنی گھیری ہوئی جگہ سے ذرہ بھر بھی نہ سرکا۔ میں دبک کر ایک غیر آرام دہ طریق سے بیٹھ گیا۔ میں اپنے پاؤں بھی نہیں پھیلا سکتا تھا۔ کیونکہ نیچے گیئر باکس ، اس بے تمیز شخص نے اپنی گٹھڑی اور چمڑے کا ٹیچی رکھا ہوا تھا۔ ایپی کیورس بھی پیچھے دو نسوار کھانے اور تھوکنے والے سواتی بزرگوں کے درمیان پھنسا ہوا کچھ آگے جھکا ہوا۔

ڈرائیور جب وہ دس بجے اپنے سٹیرنگ پر آ کر بیٹھا تو ہالی وڈ کے سٹیورٹ گرینجر کا ہم صورت نکلا ـــ وہی تیکھا لمبا چہرہ پتلے حساس ہونٹ، ہیلا مین، وہ پتلا اور خوبصورت تھا لیکن کسی طرح تم اسے پسند نہیں کرتے تھے ـــ جہاں تک میرا تعلق ہے میں دنیا کے اسٹیورٹ گرینجروں سے نفرت کرتا ہوں عورتوں کے لئے شاید ان میں کشش ہوتی ہوگی۔ مگر میرا خیال ہے کہ کوئی آدمی انہی جنسیت سے بھری ہوئی مینڈکیوں کو حقیقی طور پر دل میں جگہ دے سکتا۔ تم انسانی گرمی کو ان کے سرد، گدھے کے سے چہرے پر منڈلاتے ہوئے نہیں دیکھو گے۔ اگر تم عورت ہو تو وہ تمہیں سیدھے بستر میں لے جانا چاہیں گے۔

منگورا کے نواح سے نکل کر سڑک مڑتی اور چکر کاٹتی، تدریجی چڑھائی چڑھتی ہے۔ یہاں شروع میں نرم پھلوں کے باغوں، مرغزاروں اور پیلے کھیتوں کی تھی۔ مگر ہم اونچے پہاڑوں کی سمت جا رہے تھے۔ پہاڑ قریب آ گئے تھے اور وادی اپنے کو سمیٹتی ہوئی لگتی تھی۔ ایک مقام پر ہم نے خانہ بدوشوں کے پورے "قافلے" کو لاری کی چھت پر بٹھایا۔ وہ اخروٹوں کے ایک چھوٹے سے ذخیرے کے ساتھ پڑاؤ ڈالے پڑے تھے۔ لاری کے آنے پر انھوں نے پیسے اکٹھے کئے اور اپنے گھر کے سامان سمیت چھت پر بٹھا دیئے گئے۔

ایپی کیورس نے جیل کا دوسرا درخت دیکھا اور مجھے اس کی خوشخبری دی۔ پوست کے پھول ہوا میں ناچتے تھے، اور سوات اب ایک

پہاڑی ناابنا ہمیں لگتا تھا۔ پہاڑوں پر برفیں شاندار تھیں۔ وہ کبھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتیں۔ ... پھر بید کاری کے دیہی قلعے اپنے مرغزار میں ایستادہ تھے۔ خانہ بدوش پہاڑی عورتیں سڑک پر سے گذرتیں یونانی ناکوں اور تیکھے نقوش کی عورتیں ــــ اور قدرے جھکی ہوئی۔ سیاہ کپڑوں میں ملبوس اور وحشیانہ زیورات میں لدی پھندی۔ ان کے سروں پر گول ٹوکریاں جن میں کنبے کی کل کائنات ان ٹوکریوں میں ہر قسم کے بھانڈے اور ہر رنگ کے چیتھڑے ــــ ان کے مرد (کاہل بدمعاش!) اپنے گدھوں اور گھوڑوں پر سوار ہوتے۔ ان لوگوں کی زندگی سخت ہے مگر گزارنے کو دلچسپی کی۔ وہ خدا کے گھر کی کھلی چھت کے نیچے رہتے ہیں اور ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ راہ پیما رہتے ہیں۔ دنیوی اسباب میں غریب مگر ہر اور چیز میں امیر ــــ صحت میں امیر، دماغ کی مستعدی میں امیر، قناعت میں امیر، جب تک دنیا کے پاس خانہ بدوش ہیں اسے ناامید نہیں ہونا چاہیئے۔

خوارزخیل ــــ ایک قصبہ جہاں ہم ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد پہنچے ــــ ایک پُر رونق پہاڑی قصبہ ہے۔ یہاں پتھر کی دوکانیں ہیں بے شمار شگفتہ فقیر بچے، اور ملیشیا میں پولیس کے سپاہی۔ ہم ایک جگہ پر آ کر رکے۔ یہاں سے ایک سڑک نیچے پُراسرار سنہری دھند میں اترتی ہے دوسری اوپر چڑھتی ہے ــــ خوارزخیل ہمارے لئے ایک رومینٹک، ہوشربا ناول کا پہلا باب تھا۔ یہاں سے دوسرا باب شروع ہوتا تھا۔ ہم یہ جاننے کے لئے تلملا رہے تھے کہ کونسی نئی روح کے ایڈوینچرز ہماری تفریح کے لئے ہمارے انتظار میں تھے۔

ہم یہاں تھوڑی دیر کے لئے بس سے اترے۔ ایبی کیورسن نے اپنے جرنل میں اس کے واضح تاثرات [illegible] کئے۔ بہت سے بچے ہمارے گرد جمع ہو گئے ــــ چھلبلے اور ہر جگہ کے بچوں کی طرح حیرانی سے پُر۔ وہ ہمیں گول حیرت بھری آنکھوں سے دیکھ رہے تھے (خوارزخیل کے بچوں کے پاس آٹوگراف بکس نہ تھیں!)

ایک گٹھیلے جسم اور کھلے خوشگوار چہرے والا پولیس کا سپاہی بندوق کندھے سے لگائے ہماری طرف سرکتا ہوا آیا۔ اس وادی کے ہر ننھے گاؤں اور بستی میں والی نے پولیس کی چوکی بٹھا رکھی ہے اور یہ سپاہی ہر وقت چوکنے اور مستعد اس ننھے گاؤں میں بسنے والوں اور راہ گیروں کی حفاظت کے لئے اس کے کوچوں میں چلتے رہتے ہیں۔ یہ سپاہی دور کھڑا پہلے ہمیں متجسس سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کا تجسس اس کی جھجک پر غالب آ گیا اور اس نے آ کر ہمیں السلام علیکم کہی۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے تھے۔ ہم نے کہا "مدین اور بحرین"۔ اچھے آدمی نے ہمیں کسی جنس کا تاجر یا بیوپاری سمجھا۔ وہ یہ خیال نہ کر سکتا تھا کہ کوئی شخص جگہوں میں ماسوا کسی کاروبار کے محض سیر کے لئے جا سکتا ہے۔ یہ کہ ایک آدمی کسی جگہ صرف سفر کے لئے یا دل کو خوش کرنے جائے یا اس کے پاس ایسے بیکار مشغلے کے لئے وقت ہو۔ ان اچھے پہاڑی لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ ہمارے یہ بتانے پر کہ کاروباری آدمی نہ تھے بلکہ صرف مسافر تھے وہ خاصا مایوس ہوا۔ اس کے پوچھنے پر ہم نے اسے اپنے نام اور عہدے بتلائے اور ہم نے اسے اپنی ماہوار تنخواہ بتائی تو وہ اس سے کافی مرعوب ہوا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا اور اصرار کیا کہ ہم اس کا نام اور [illegible] جونٹی میں نوٹ کر لیں اور واپس اپنے دیس میں جا کر اسے خط لکھیں۔ ہم نے اس سے وعدہ کر لیا۔ (مسلسل)

سید فیضی

منٹو

زخم گہرے ہوں تو جراحی کا ہوتا ہے عمل
منٹو جراح تھا، زخموں کو کریدا اُس نے
اندھی آنکھوں میں اُگاتے ہیں بصیرت کے کنول
پردہ بے رنگ حقیقت سے اٹھایا اُس نے

کون جانے یہ اندھیرے میں لپکتی ہوئی آگ
کب سے سیلاب کی مانند بہا کرتی ہے
زندگی ہے کہ حقیقت کا تڑپتا ہوا راگ
جو حقیقت ہے وہ عُریاں ہی رہا کرتی ہے

زندگی نام و نمود، آئینۂ حرص و ہوس
زندگی پھول سے گالوں پہ چمکتے آنسو
زندگی فصلِ بہاراں کا نچوڑا ہوا رس
زندگی روندے ہوئے جسم کی مُردہ خوشبو

ایک نغمہ تھا جسے سینکڑوں عنوان ملے
کب سے مضرابِ طلبِ زیست کا یہ ساز بھی تھا
اس کے ہر پردے میں افسانے پریشان ملے
منٹو خود وقت بھی تھا، وقت کی آواز بھی تھا

نقوش لاہور

شہزاد احمد

صفیہ بھابی

آغا خلش کاشمیری لاہور والوں کو بے تحاشا گالیاں دے رہے تھے اور وہ بھی گوالمنڈی کے ہوٹل میں بیٹھ کر۔ ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور انھیں لاہور انسانوں کا شہر نظر نہ آتا تھا۔ وہ آزادی سے کئی برس پہلے سے بمبئی میں آباد تھے اور بمبئی ان کے خون میں سرایت کر چکی تھی۔ لاہور سے انھیں خاصی نفرت تھی۔ اگر ان کی والدہ کا انتقال نہ ہوتا تو شاید وہ کبھی لاہور کا رخ نہ کرتے۔ منٹو کی زبوں حالی اور شراب خوری کے قصے ان تک پہنچ چکے تھے۔ وہ خود صوفی آدمی تھے اور منٹو کی شراب نوشی انھیں بمبئی میں بھی پسند نہ تھی مگر لاہور میں منٹو کی شراب اور دوستی دونوں کا معیار گر گیا تھا۔ روایت یہ ہے کہ منٹو کی شراب نوشی کی عادت چھڑانے کے لئے وہ خود اسے پاگل خانے تک لے گئے تھے۔ جس دن کا میں ذکر کر رہا ہوں اس دن منٹو پاگل خانے میں علاج کروا رہا تھا اور آغا صاحب تو الٹے پیٹ دیوانے ہو گئے تھے۔ انھیں منٹو سے عشق تھا۔ مگر ان سے کہیں زیادہ عشق صفیہ بھابی کو منٹو سے تھا مگر انھوں نے کبھی گالی نہ دی، کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائیں۔ انھیں منٹو کے شرابی دوست بے حد ناپسند تھے مگر انھوں نے اس کا اظہار کبھی نہیں کیا۔

جب منٹو پاگل خانے سے واپس آیا تو اس نے کئی دن تک شراب نہ پی۔ صبح سے رات تک بھابی صفیہ سائے کی طرح اس کے ساتھ رہیں۔ انھیں معلوم تھا کہ اگر اس کھلے بچے کو کھلا چھوڑ دیا گیا تو یہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال لے گا۔ ان دنوں منٹو اور بیگم منٹو (جو ہمارے لیے صفیہ بھابی ہیں) متعدد بار تانگے میں اکٹھے نظر آئے۔ منٹو حسب معمول اگلی سیٹ پر اور بھابی پچھلی سیٹ پر۔ ان دنوں بھابی صفیہ نے ہر شام باغ جناح جانے کا پروگرام بنایا۔ ایک بار مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت ملی۔ انھیں یقین تھا کہ کھلنڈرا منٹو اب سنبھل چکا ہے مگر ان کے دل میں ایک نامعلوم خوف تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی منٹو کو آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتی تھیں مگر منٹو معلوم نہیں کب دھوکا دے کر یا اجازت لے کر اکیلا اپنے دوستوں کے پاس چلا گیا اور شراب نوشی پھر سے شروع ہو گئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ بھابی صفیہ کو جب یہ خبر ملی تو ان کے تاثرات کیا تھے مگر میرا خیال ہے کہ ان کے دل میں مایوسی اور خوف کی لہر اٹھی ہو گی جس کا اظہار انھوں نے کبھی نہیں کیا۔

صفیہ بھابی کو پہلی بار میں نے منٹو کے ساتھ ہی کہیں دیکھا تھا چونکہ ان کی تصویریں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ اس لئے مجھے انھیں پہچاننے میں ذرا بھی مشکل نہ ہوئی۔ ان کی شخصیت میں مجھے کسی غیر معمولی چیز کا احساس نہیں ہوا سوائے اس کے کہ انھیں منٹو سے بے پناہ محبت تھی، ایسی محبت جس کا ذکر افسانوں میں ملتا ہے مگر منٹو کے افسانوں میں نہیں ملتا۔ میرا خیال ہے کہ منٹو بھی ان سے محبت کرتا ہو گا مگر اس کا اظہار اس نے بھی کبھی نہ کیا۔ مجلس اقبال یا حلقہ ارباب ذوق میں منٹو اور مسز منٹو کئی بار آئے تھے مگر بھابی صفیہ نے کبھی بھی اپنی موجودگی کا احساس نہ ہونے دیا۔ ایک افسانہ پڑھنے کے بعد منٹو کی پنجابی گفتگو اس اعتماد اور خود پسندی کی حامل تھی کہ محفل میں کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ بھابی صفیہ منٹو کے اس تحکمانہ رویے پر خوش ہوتی ہوں یا وہ صرف اس لئے ساتھ آ جاتی ہوں کہ ان کا وقت کٹ جائے۔ یہ اجلاس کے دوران منٹو کی گفتگو کے ساتھ ساتھ ان کے چہرے کے تاثرات تیزی سے تبدیل ہوتے نظر آتے۔

صرف ایک موقعے پر میں نے صفیہ بھابی کو روتے دیکھا تھا اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے۔ بعد میں ان کے چہرے پر تاسف کی لہر دوڑ گئی

واقعہ یوں ہوا کہ مجلس اقبال کے بعد ہم گورنمنٹ کالج لاہور کے لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بھابھی صفیہ کے ساتھ منٹو کی بہن اور کالج کی کچھ طالبات بیٹھی تھیں۔ منٹو کو طالبات سے ملانے کے لئے خاص طور پر بلوایا گیا تھا۔ شاید اسے یہ حرکت پسند نہ آئی۔ ایک لڑکی کا تعارف کراتے ہوئے کسی نے خوشامد سے یہ کہہ دیا کہ یہ لڑکی آپ کی طرح آرٹسٹ ہے۔ منٹو صاحب نے پوچھا، "تم شراب پیتی ہو؟" لڑکی سے کچھ جواب نہ بن پڑا تو منٹو نے کہا "اگر تم شراب نہیں پیتیں تو آرٹسٹ نہیں ہو سکتیں"۔ اس دن میں نے صفیہ بھابھی کو پہلی مرتبہ منٹو سے ناراض ہوتے دیکھا۔ مجھے ان کے الفاظ یاد نہیں مگر حافظے میں اتنا ضرور محفوظ ہے کہ منٹو باقی لڑکیوں سے ملے بغیر بڑبڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔ بھابھی اس قدر شرمندہ تھیں کہ معذرت بھی نہ کر سکیں۔

معاف کیجئے میں نے ایک ایسا واقعہ سنا دیا جس میں منٹو بدتمیز اور اجڈ نظر آتا ہے مگر غالباً یہ تنہا واقعہ ہے۔ عام طور پر خواتین کے اجتماع میں منٹو بے حد مہذب اور پرتکلف رہتا تھا، خواہ اس نے پی رکھی ہو، آداب اس کے ملحوظ خاطر ضرور ہوتے تھے۔ منٹو کے افسانے پڑھنے کے بعد ان کے مصنف کی جو تصویر لوگوں کے ذہن میں عام طور پر ابھرتی ہے، منٹو اس سے خاصا مختلف تھا۔ اس کا لباس اور گھر دونوں نفیس تھے۔ اسے بچے بے حد پیارے تھے اور بچوں کے سلسلے میں اس کی یہ محبت اپنی اولاد تک محدود نہ تھی۔ وہ بچوں کی عجیب و غریب زبان بے حد غور سے سنتا اور ان کے معنی متعین کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ بچوں کے بنائے ہوئے اوٹ پٹانگ الفاظ بے حد معنی خیز ہوتے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ اسے زبانی یاد تھے اور بعض اوقات وہ خود بھی بچوں سے انہی کی زبان میں بات کرتا۔ اس وقت وہ ننھی منی سی روح محسوس ہوتا اور کوئی اندازہ بھی نہ کر سکتا کہ یہ وہ شخص ہے جس پر فحاشی کے مقدمے چل چکے ہیں۔ منٹو کی بیباکی اور عریانی اس کی حقیقت پسندی تھی۔ وہ معصوم بچوں کی طرح جو سوچتا تھا کہہ دیتا تھا۔ یہ فیصلہ کئے بغیر کہ تحریروں کا محاسبہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اپنے افسانے "بو" میں منٹو نے جو منظر بیان کیا ہے وہ سارے کا سارا اس کے بمبئی کے مکان سے متعلق ہے۔ اس افسانے پر مقدمہ بھی چلا۔ منٹو یہی کہتا تھا کہ صفیہ بھابھی اس افسانے کو پڑھ کر بے حد ناراض ہوئی تھیں کیونکہ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ منٹو واقعی کسی عورت کو بھابھی کی عدم موجودگی میں اپنے کمرے لایا تھا۔ ممکن ہے ایسا ہوا ہو، مگر میں نے لاہور میں جس خاتون کو دیکھا تھا وہ ایسا نہیں کر سکتیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ منٹو نے یہ کہانی گھڑی ہو کیونکہ معصوم ذہن اس قسم کی کہانیاں گھڑ کر ان پر خود بھی یقین کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔

لاہور میں منٹو لکشمی مینشن کے ایک مختصر سے فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس کا خاندان ایک بیوی اور تین بچوں پر مشتمل تھا۔ بمبئی میں اس کے ہاں عارف میاں پیدا ہوئے تھے مگر ان کا انتقال ہو گیا۔ عارف میاں کی یادگار منٹو کی ایک کہانی ہے جس کا عنوان ہے "خالد میاں"۔ بچے کی موت کے بعد منٹو کی ساری شخصیت میں اولاد نرینہ نہ ہونے کا دکھ بری طرح سرایت کر گیا تھا۔ منٹو بڑے دکھ کے ساتھ یہ واقعہ سنایا کرتا تھا کہ عارف کو آخری غسل دینے کے لئے جب غسال نے لائف بوائے صابن مانگا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا کیونکہ عارف میاں کے لئے منٹو نے، بڑھیا سے بڑھیا ولایتی صابنوں کا بکس بھر رکھا تھا مگر عارف میاں کی ضرورت منٹو سے کہیں زیادہ صفیہ بھابی کو تھی کیونکہ منٹو کا لاابالی پن جادو رنگ لانے والا تھا اور بیٹیاں پرایا دھن نہیں۔ تاہم سعادت حسن بھی تو ایک بچہ تھا، کھلنڈرا، لاابالی، ضدی اور خود پسند — منٹو کا جی پڑھائی میں کبھی نہ لگا تھا۔ خاندان کے دوسرے افراد کے مقابلے میں منٹو کی تعلیم ادھوری تھی اور اس کے گھر میں ایک انگریزی ڈکشنری اور دیوان غالب کے سوا کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ منٹو کا ادب اس کے سینے کے اندر ہی محفوظ تھا۔

لکشمی مینشن کا فلیٹ تین یا چار کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک ڈرائنگ روم جس میں پرانی وضع کا ایک صوفہ سیٹ پڑا تھا اور دروازے کے بالکل سامنے جو صوفہ تھا اس پر اکڑوں بیٹھ کر منٹو کہانیاں لکھا کرتا تھا اور اسی کمرے میں اس کے بچے شور مچاتے رہتے تھے۔ ایک روز میں اور منیر احمد شیخ اس سے ملنے گئے تو منٹو بڑی ہیجانی کیفیت میں تھا۔ اسے کسی کباڑیے کی دوکان سے "حمیدہ کی آپ بیتی" مل گئی تھی۔ یہ کتاب مثنوی کی شکل میں تھی اور اس میں شب عروسی کی داستان کو کھل کر بیان کیا گیا تھا۔ اتفاق سے اس وقت کمرے میں ہم تینوں کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔ پہلے تو منٹو نے کتاب کی تشبیہات اور استعاروں

کی بہت تعریف کی، پھر مثنوی کو پڑھنا شروع کیا۔ ابھی اس نے تین چار شعر ہی پڑھے تھے کہ اچانک صفیہ بھابھی کمرے میں داخل ہوئیں۔ منٹو نے جلدی سے کتاب چھپالی اور بڑی گھبراہٹ کے ساتھ میرا حال چال پوچھنے لگا۔ اس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ منٹو کے دل میں اپنی بیوی کے سلسلے میں کتنا تقدس موجود ہے۔ منٹو اس وقت شریر اور شرمیلا لڑکا محسوس ہو رہا تھا۔

گھر کا دوسرا کمرہ جس تک میری رسائی ہو سکی سوٹ کیسوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں بمبئی کی یادگار ایک فرج تھا جو بجلی اور مٹی کے تیل سے چل سکتا تھا۔ انھیں سوٹ کیسوں کی تہوں میں بھابی اپنے پیسے چھپا کر رکھا کرتی تھیں۔ مگر بھابھی کی عدم موجودگی میں منٹو کپڑوں کی تلاشی لیتا اور پیسے چوری کرکے لے جاتا۔ بھابھی کو کبھی کسی دن اس چوری کا علم نہ ہوتا۔ انھیں یہ بھی یاد نہ رہتا کہ انھوں نے کس سوٹ کیس میں کتنے پیسے رکھے تھے۔ چوری کا یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، بھابھی جانتی تھیں کہ ان کا چور کون ہے۔ مگر وہ جان بوجھ کر سب کچھ بھول جاتی تھیں۔ اور کبھی شکایت نہ کرتیں۔ شکایت تو وہ اب بھی نہیں کرتیں۔ پہلے ان کا چور منٹو تھا، اب منٹو کے پبلشر ہیں جو ہزاروں کی تعداد میں اس کی کتابوں کے ایڈیشن چھاپتے ہیں اور اس کے بچوں کو کچھ نہیں دیتے۔ اس کا گھر اس قدر سونا ہو گیا ہے کہ منٹو کے پبلشر تو کیا اس کے دوستوں نے بھی کبھی بھول کر اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ عارف میاں کی موت کے بعد بھابھی نے جو اداس زندگی شروع کی تھی وہی زندگی انھیں منٹو کی موت کے بعد پھر سے شروع کرنا پڑی۔

ظہور الحسن ڈار

باغی

اگر میں نے اس کی میت کو اپنے سامنے لحد میں اترتے نہ دیکھا ہوتا تو میں اس خبر پر کبھی یقین نہ کرتا کہ وہ مر چکا ہے، مگر وہ مر چکا تھا۔ وہ جو
ں کا مصنف تھا، اب خود ایک المیے کا ہیرو بن چکا تھا۔ اس کے افسانوں کی طرح اس کے اپنے خاتمے میں بھی چونکا دینے والا فنشنگ
تھا۔ تقریباً سال بھر پہلے جب وہ سخت بیمار ہوا اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو وہ اچانک صحتیاب ہو کر تیزی سے افسانے لکھنے لگا اور اب جبکہ
رنے کا کوئی امکان نہیں تھا، وہ ایکا ایکی موت سے بغل گیر ہو گیا اور اس کا وہ آخری افسانہ بھی نا تمام رہ گیا، جو وہ صرف چند گھنٹے پہلے
ارے دفتر میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔

معلوم نہیں اس نے اپنے آخری افسانے کے لئے کیا فنشنگ ٹچ سوچ رکھا تھا لیکن اس کی اپنی زندگی کے افسانے کے مقابلے میں اس کے
نوں کے فنشنگ ٹچ ہیچ ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا منٹو کی موت کی خبر سن کر دوسرے لوگوں پر کیا گزری لیکن مجھے اس کی موت پر کوئی صدمہ
مجھ پر حیرت اور تعجب کی ایک ملی جلی مگر بھرپور کیفیت طاری ہو گئی۔ ہو سکتا ہے یہ کیفیت ذہن کو صدمہ پہنچنے کا ہی نتیجہ ہو لیکن اس صدمہ
مجھے بالکل نہیں ہوا۔ اس وقت بھی نہیں ہوا جب میری آنکھوں کے سامنے دو سیاہ فام گورکن اس کی قبر کو آخری ٹچ دے رہے تھے
وقت بھی حیرت زدہ تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ منٹو سچ مچ سپرد خاک ہو چکا ہے۔ گورکن اس کی قبر پر مٹی ہموار کر رہے تھے اور مجھے ہر لحظہ
ہونے والے واقعے کا انتظار تھا کہ ابھی منٹو قبر سے باہر نکل کر انہیں پکڑ لے گا اور کہے گا "تم یہ کیا چکر چلا رہے ہو، تم سمجھتے ہو میں سچ مچ
ں ؟" اس کے بعد وہ اپنی قبر کے آس پاس کھڑے لوگوں کو دیکھ کر ہنسے گا۔
ندہ مر گیا یہ ایک فراڈ ہے لیکن تم اسے قبر میں ڈال رہے ہو یہ اس سے بھی بڑا فراڈ ہے" یہ کہہ کر وہ بہاتیں اوپر اٹھنا شروع کریگا، تھوڑا اوپر
گا، پھر حاضرین سے مخاطب ہوگا۔

منٹو کی جگہ نیچے نہیں، نیچے فراڈ ہے اور اوپر دھواں، منٹو نیچے فراڈ تھا اور اوپر دھواں ہے"۔
پھر اوپر اٹھنا شروع کر دے گا اور تمام لوگوں کو حیرت زدہ چھوڑ کر آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا۔

منٹو سے یہ چیز غیر متوقع نہ تھی۔ اپنے افسانوں کی روشنی میں وہ ایک بہت بڑا شعبدہ باز نظر آتا تھا۔ قلم اور زبان دونوں کے زور سے عجیب
کھاتا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے آگ پر چلتا تھا، بڑے سکون سے شیشے کی کرچیں پھانک لیتا تھا۔ بڑی بے نیازی سے پیٹ میں خنجر اتار لیتا
باوجود اس پر کوئی آنچ نہیں آتی تھی۔ وہ بار بار مرتا تھا اور بار بار زندہ ہوتا تھا۔ ابھی اس کی افسانہ نگاری کا آغاز تھا کہ اس پر تپ دق کا حملہ ہوا
ں تو دق نے منٹو کو پسپا کر دیا لیکن دو سرے ہی لمحے کے بعد وہ خود پسپا ہو گیا۔ اسی طرح اسے چند ماہ ایک پاگل خانے میں رہنے کا اتفاق ہوا تو اس

باہر آکر پاگلوں کے متعلق بعض ایسے افسانے لکھے کہ پاگلوں کا علاج کرنے والے ڈاکٹر پاگل ہوگئے اور پاگل خانے سے باہر بسنے والی دنیا میں کئی پاگلو دماغ ٹھکانے آگئے۔ اس تجربے کے بعد اسے ایک اور خطرناک مرحلے سے گزرنا پڑا۔ اب کی دفعہ اس کا مقابلہ شراب سے تھا۔ لوگوں کا خیال تھ کو شراب خراب کر رہی ہے منٹو کہتا تھا میں شراب کو خراب کر رہا ہوں۔ بہرحال اس گڑبڑ میں جب معاملہ بہت ہی خراب ہوگیا، تو منٹو ہسپتال پہ اور تین ماہ تک زندگی اور موت کے درمیان لٹکتا رہا۔ اس دوران میں کبھی شراب اس پر غالب آجاتی اور کبھی وہ شراب پر، لیکن میدان اسی۔ ہاتھ رہا، اور میدان اس وقت بھی اسی کے ہاتھ رہا جب وہ کچھ عرصہ بعد شراب کا ایک چھوٹا سا جام زہر کے طور پر پی کر اسے ہمیشہ کے۔ شرمسار چھوڑ گیا۔

جان کر من جملۂ خاصان میخانہ مجھے حشر تک رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

موت سے منٹو کی بار بار پنجہ آزمائی اور پھر فاتحانہ فلک کے تمام واقعات میرے ذہن میں محفوظ تھے مجھے خوب معلوم تھا کہ وہ اس سے پہلے کئی سے فرار کر چکا ہے۔ شاید اسی لئے مجھے توقع تھی کہ وہ اس بار بھی موت سے فرار کرے گا۔ مگر جب اس کی قبر بالکل تیار ہو گئی، اس پر پھول بھی چڑھا دیئے۔ وہ قبر سے باہر نہ آیا تو مجھے اچانک اس تلخ اور دردناک حقیقت کا احساس ہوا کہ اب کی بار معاملہ مختلف ہے۔ اس بار خود زندگی منٹو سے فرار کر گئی۔

وہ منٹو جس کا نام سعادت حسن تھا۔ جو لکشمی مینشن میں رہتا تھا جو ایک بیوی کا شوہر اور تین بچیوں کا باپ تھا۔ جو زندگی کے آخری دنوں میں ہمہ کے نشے میں وحشت رہتا تھا۔ جو اس دنیا کو اور اپنے آپ کو ایک فراڈ سمجھتا تھا جس سے زندگی بھی نالاں تھی اور موت بھی ـــــ مر چکا ہے، اس لئے کہ اسے نہ ایک روز مرنا ہی تھا لیکن وہ منٹو جو بیسیوں افسانوں، ڈراموں اور خاکوں کا مصنف ہے، جو آئے دن کسی نہ کسی "خوشیا" کسی نہ کسی "سوگندھی"۔ اور کسی نہ کسی کو جنم دیتا رہتا تھا، کیا اسے بھی کوئی موت کسی قبر میں دفن کر کے بے نام و نشان بنا سکتی ہے؟ کیا کوئی اندھیرا بمبئی کے چکلے کی ان پراسرار روشنیوں کو نگل سکتا۔ آج بھی سوگندھی کے چہرے کو اجال رہی ہیں؟ کیا کوئی غبار اس سدابہار چمک کو دھندلا سکتا ہے۔ جو صرف زرد روشنی کے پیچھے آنسو ہی پیدا کر سکتے ہیں!!! آب و تاب سے گوپی ناتھ، سلطانہ، خوشیا اور بڑھی ممی کے چہرے روشن ہیں ـــ!

ابھی تک تو ایسا نہیں ہوا، کل کیا ہوگا، میں نہیں کہہ سکتا۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ منٹو سے زندگی بھی نالاں تھی اور موت بھی۔ موت تو اس سے اس لئے نالاں تھی کہ اس کے پے درپے حملوں کے باوجود منٹو کا نہیں ہوتا تھا اور زندگی اس سے اس لئے نالاں تھی کہ وہ اس سے کسی طرح بھی سمجھوتا کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں نے یہاں زندگی کا لفظ معاشرے کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ جس معاشرے میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں، وہ منٹو سے اس لئے نالاں تھا کہ منٹو اس کی تمام فریب کاریوں اور بداعمالیوں کو طرح جان چکا تھا اور ان کا پردہ چاک کرنے کی ہمت بھی رکھتا تھا، یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ایک گنہگار صرف ایک خوبصورت عمامہ باندھ کر اور ہو کر کیوں کر نیکو کار واعظ بن سکتا ہے یا کوئی کس طرح اپنے مکروہ چہرے کے مہاسوں اور کیلوں کو غازے کی تہوں میں چھپا کر اپنے منہ سے اپنے حسن ا قصیدے پڑھ سکتا ہے۔ اس کی نفرت اس ریاکاری کے خلاف بغاوت کرتی تھی اور وہ نوک قلم سے پوری بے رحمی کے ساتھ عماموں کی تہیں کھ سچائی کے چھینٹوں سے غازے کی تہیں اتار دیتا تھا اور ان کالے چہروں کو ننگا کر دیتا تھا جو اس معاشرے میں بڑے بڑے مسند نشینوں پر بیٹھ کر ہمارا اخلاق پر وعظ سنا رہے ہیں۔

یہ اس کے فن کا ایک رخ ہے۔ اس کے فن کا دوسرا رخ یہ ہے کہ منٹو نے انتقام کے جوش میں نہیں بلکہ سمجھ بوجھ کر اور نہایت ا ساتھ ان لوگوں کو اپنے سینے سے لگایا جنہیں ہمارا معاشرہ ہمیشہ سے دھتکارتا چلا آیا ہے اور جن کا ذکر چھڑتے ہی معاشرے کے نام نہاد نیکو کا

بنے گئے ہیں۔ منٹو کے افسانوں میں سماج کے ان اچھوتوں کے لئے گہری محبت موجود ہے جو ہمارے ہی گناہوں کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں۔ یہ ایسے بیٹے بیٹیاں ہیں جنھیں پیدا کرکے ہمارا معاشرہ بھول ہی نہیں گیا، بلکہ ان پر جرمیں اور مصائب بھی تانتا رہتا ہے۔ کیا کوئی بھی ایماندار فن کار ان بد نصیبوں کو اس معاشرے کی طرح گنہگار کے نام سے پکار سکتا ہے؟ اگر یہ گنہگار ہیں، تو پھر ہمیں اپنے آپ کو سیاہ کاروں کے نام سے یاد کرنا چاہیئے کیونکہ ان گنہگاروں کو ہم نے پیدا کیا ہے۔

منٹو ایک ایماندار فن کار تھا، اس لئے وہ ریاکار نہ بن سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی بھر معاشرے کے قہر و غضب کا شکار رہا۔ اس کی تلخ گوئی اور بیباکی اس کے لئے ہمیشہ بلائے جان بنی رہی۔ اس معاشرے نے جس کا ہمنوا ہو کر وہ عیش کی زندگی بسر کر سکتا تھا، اسے باغی قرار دے کر قبول نہ کیا اور اپنے ہتھکنڈوں سے بہت جلد موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ منٹو کو شراب لے ڈوبی۔ مجھے یہ سن کر ہمیشہ پنجابی کے مشہور شاعر دامن کا ایک شعر یاد آتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے اسی صورت میں برداشت کیا جاسکتا ہے کہ آدمی شراب کے نشے میں چور رہے۔ جو آدمی شراب کے نشے کے بغیر معاشرے کی ریاکاریوں کو برداشت کرتا ہے، وہ یا تو پاگل ہے اور یا پھر بے غیرت ———

منٹو کو معاشرے نے کبھی قبول نہیں کیا، ادب میں بھی بعض دانشوروں نے اسے ہمیشہ کوئی اونچا درجہ دینے سے گریز ہی کیا۔ لیکن ان دونوں چیزوں کا منٹو کی زندگی سے تھا۔ منٹو کی موت کے ساتھ ہی ان باتوں کی اہمیت ختم ہو گئی۔ اب جو چیز زندہ ہے، وہ منٹو کا فن ہے یا اس کے وہ کردار جن کو اس نے اپنی فنی ریاضت سے، اپنی گہری محبت اور سچے خلوس سے امر بنا دیا ہے۔ یہ کردار آج بھی زندہ ہیں اور جب تک یہ زندہ رہیں گے ان کو جنم دینے والا فن کار بھی زندہ رہے گا۔

مجھے منٹو کے ان کرداروں کی اپنے خالق سے محبت اور عقیدت کا بخوبی اندازہ ہے، مجھے وہ منظر وہ خوب یاد ہے جب میں منٹو کی قبر کے قریب اس بات پر غمزدہ تھا کہ اس کے جنازے کے ساتھ بہت کم آدمی آئے ہیں اور جو آئے ہیں وہ اسے منوں مٹی کے نیچے اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اس وقت جب میں بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو رہا تھا، میں نے ایک پل کے لئے ایک عجیب منظر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ منٹو کی قبر کے اردگرد ایک پراسرار سی روشنی پھیل گئی ہے اور منٹو کے تمام کردار اس کی قبر کے گرد جمع ہیں۔ ان میں نوشیا بھی ہے اور سوگندھی بھی، گوپی ناتھ بھی ہے اور سلطانہ بھی، ممی بھی ہے اور مسز ڈی کوسٹا بھی اور ——— اور ان کے درمیان ایک کتا بھی ہے، ٹیٹوال کا کتا، جو بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے خالق کی قبر پر کھڑا آنسو بہا رہا ہے۔

آغا بابر

منٹو اور طوائف

طوائف ہمارے کلاسیکی ادب کی ہیروئن تھی اور بہت دیر رہی۔ مرزا سعید کے ناول "خوابِ ہستی" میں شمیم اور حسن آفرا دونوں اونچے درجے کی طوائفیں
ادیب اپنی ادبی ضرورت کے مطابق طوائف کو جتنا اونچے درجے کا چاہتا بنا دیتا تھا۔ ہماری تہذیبی زنجیر میں طوائف کو اہم کڑی کی حیثیت حاصل تھی۔ پوری
صدی کا ادب اور معاشرہ محض طوائف کی ذات سے متحرک نظر آتا ہے۔ طوائف کہیں علامت ہے کہیں حوالہ۔ منٹو کے ادب میں طوائف حقیقت ہے
بنجر زمین سے فصل بڑی محنت اور مشقت سے اترتی ہے اور وہ بھی صرف اس وقت جب آپ کو بنجر زمین پر اعتماد ہو۔ منٹو کو طوائف پر صرف
ہی نہ تھا بلکہ وہ طوائف کو ایک مذہب کی طرح مانتا تھا۔ مثلاً مرزا غالب پر فلمی کہانی لکھنے کے لئے جس چیز نے منٹو کو سب سے زیادہ اپیل کیا تھا وہ
کا کردار تھا جسے وہ مسکرا کر ڈومنی کہتا تھا۔

منٹو پہلا ادیب ہے جس نے پرانے ادب کی اونچے درجے کی طوائف کو حسب ضرورت سنوارا نہیں بلکہ اس نے ادب کو کھیائی سے متعارف
جو اس کی اپنی دریافت تھی۔ سعادت حسن کو طوائف کا کردار کیوں اپیل کرتا تھا؟

جب سعادت حسن نے ہوش سنبھالا امرتسر میں پانچ ہزار طوائفیں تھیں۔ یہ عجیب شہر تھا۔ بازار حسن کنڈلی مارے سانپ کی طرح ٹیڑھا
لیٹا پڑا تھا۔ اس بازار کو کئی بازار کاٹتے مگر مختصر سے کٹاؤ کے بعد یہ لمبا طویل بازار پھر شروع ہو جاتا۔ ان ٹھیکروں اور نگینوں کا ایک روپے سے
تک مول تھا۔ اور اس کے بعد جان کی بازی۔ جو امیروں کبیروں کے نکاح میں تھیں ان کی ایک اپنی دنیا تھی۔

سعادت حسن بچپن میں نہایت نٹ کھٹ نڈر اور دلیر تھا جب اس نے اس ہجوم دلبراں میں آنکھ کھولی ہوگی تو ظاہر ہے کہ اس کے مزاج نے کیا تاثر قبول کیا
سعادت حسن اپنے معاقب و معاملت کی وجہ سے ذہنی طور پر جلدی بالغ ہو گیا تھا۔

ادیب صداقت کی تلاش اور حقیقت کی جستجو میں حسن کی دنیا میں جھانکتا ہے جسن اور اسرار اس کے موضوع کے لئے بہت بڑی دولت ہیں
طوائف کی ذات میں حسن بھی ہے اور اسرار بھی اور جو چیز اس موضوع کو زیادہ پرکشش بناتی ہے وہ انسان کی ازلی کمزوری ہے ــــ جنس ــــ
طوائف کی ادائے دلبری اور عشوہ طرازی کے درمیان بیچارہ افسانہ نگار کھڑا دیکھتا ہے یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ یہ بڑا مشکل متن ہے جو افسانہ نگار
ہے، کیوں اٹھاتا ہے؟ اسے اپنی اختراعی ذہانت پر بھروسہ ہوتا ہے۔ اسی کے بل پر وہ اس بار ذمہ داری کو اٹھاتا ہے ورنہ حسن اور اسرار حیات کا گھروندہ کیوں جھانکے
اسی اختراعی ذہانت ہی کے بل پر مصور پیالیوں میں رنگ گھولتا ہے۔ ایک مرتبہ میرے یہ کہنے پر کہ میں نہیں مانتا آپ نے طوائف کو خطوط اور رنگ
قید کیا ہو عبدالرحمٰن چغتائی نے مجھے چند ایک تصویریں دکھائیں جن کا موضوع محض طوائف تھا۔ مدعا یہ ہے کہ تمام فنون کا خمیر جن بنیادی عناصر سے اٹھتا
جیسے ہوتے ہیں خواہ افسانہ نویسی ہو یا مصوری ــــ ڈی ایچ۔ لارنس ایک جگہ کہتا ہے:

خالد حسن

منٹو اپنی موت کے دس سال بعد

سعادت حسن منٹو کو ہم سے جدا ہوئے ابھی دس سال ہی گزرے ہیں لیکن یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اردو میں مختصر افسانہ نویسی کا دیوار ہی نکل گیا۔ منٹو ہم سے جوانی کے عالم میں رخصت ہوا تھا۔ چالیس سال کوئی زیادہ عمر نہیں ہوتی۔ افسوس کہ موت کے ہاتھوں سے وہ محفوظ نہ رہ سکا۔ اسے کئی سال پہلے ہی اپنے مر جانے کا علم ہو گیا تھا۔ اکثر بیمار رہنے کی وجہ سے اب اس کے قویٰ بھی جواب دینے لگے لیکن اس اضمحلال سے بھی اس کو ایک حظ حاصل تھا۔ مصائب سے لطف اندوز ہونا اس کی عادت تھی اور یہ عادت زندگی بھر اس کے ساتھ رہی۔

آزادی کے وقت منٹو بمبئی میں تھا، یہاں اُسے دولت بھی حاصل تھی اور شہرت بھی۔ اس کا اپنا ایک حلقۂ احباب تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بمبئی میں اس کی طبیعت لگی ہوئی تھی۔ اس شہر سے اُس کو اُنس تھا۔ ایک قسم کی جذباتی وابستگی تھی جو منٹو کی ذات سے علیحدہ نہیں ہو سکتی تھی۔ بمبئی کے کوچہ و بازار۔ زندگی کی ہماہمی سے بھر پور بارونق اور شگفتہ ہوئے۔ رات دن چلتی رہنے والی بسیں، ورلی میں چو پاٹی اور جوہو کے دل لبھانے والے منظر، سر بفلک عمارتیں۔ غلیظ محبہ خانے والوں کے جھرمٹ، چھکتے ہوئے کاروبار۔ یہ بمبئی تاجروں اور کمپنیوں کا شہر۔ ایکٹرز اور ایکٹرسوں کی نگری۔ اسی شہر بمبئی کو منٹو نے اپنی کہانیوں میں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

بمبئی سے منٹو کو اتنا پیار کیوں تھا۔ یہ بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں اسے ہر طبقے کے لوگوں سے میل جول میسر آ سکتا ہو کیونکہ ہر قسم کے لوگ آسانی کے ساتھ یہاں مل جاتے ہیں جیسے رئیس، امیر، غریب، جاہل، پڑھے لکھے، قسمت کے دھنی اور مقدر کے راندے ہوئے۔ یہ شہر ہر طبقے کے افراد سے آباد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو کو اپنی کہانی لکھنے کے لئے اسی شہر سے بہترین کردار نصیب ہوئے۔ یہ شہر اس کے سراج، بابو گوپی ناتھ، موذیل اور ممد بھائی کا شہر تھا۔ یہاں بازار حسن کے ٹھاٹھ تھے۔ یہ دانشوروں کا مقام تھا، ایکٹروں، ایکٹرسوں کی بستی تھی، مارواڑی سیٹھ لوگوں کا دیس تھا۔ ہو سکتا ہے منٹو کے قلم سے زندہ جاوید ہونے پر بمبئی منٹو کی کوئی یادگار قائم کرے جس سے یہ اعتراف مقصود ہو کہ منٹو اس شہر کے عاشقوں میں سے تھا۔ بہت سے اہلِ قلم نے اپنے اپنے شہروں کے متعلق لکھا ہے لیکن ان کی تحریروں میں احساس کی شدت نہیں پائی جاتی۔ وہ تحریریں پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی سیاحتی ادارے کے اشتہار ہوں۔ ان میں اطلاعات کا ذخیرہ تو موجود ہے مگر وہ ذوق و شوق نہیں مشاہدے کی وہ گرمی اور فکر کی وہ بلندی نہیں جو اپنے پسندیدہ شہر کے در و دیوار اور کوچہ و بازار دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔

وہ کسی حال میں بھی بمبئی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے ایسا کرنا پڑا اور اسی لئے شاید اس نے اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کیا ہو۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اس نے بمبئی کے بارے میں جو کچھ لکھا اس میں احساس کی کمی کے ساتھ ساتھ سیاسیت بھی موجود ہے کیونکہ آزادی کے بعد بمبئی کا سہاگ اجڑ گیا تھا۔ نئے نئے لوگ آباد ہونے لگے تھے جنہوں نے آتے ہی یہاں کی روایات کے شیشے کو چکنا چور کر دیا تھا۔ "مسلمان" اور "ہندو" کے الفاظ عام طور پر کانوں میں پڑنے لگے تھے۔ عام رائے

قتل و غارت اور دیگر فساد کے واقعات رونما ہو رہے تھے۔ ان حالات میں منٹو بمبئی چھوڑنے پر مجبور ہوگیا۔ نفرت کی یہ آگ اب ہر طرف پھیل چکی تھی اور سارا [illegible] اس آگ کی لپیٹ میں تھا۔ حد یہ ہے کہ منٹو کو اپنے جگری دوست شیام کی آواز میں بھی نفرت کا شعلہ محسوس ہونے لگا۔ اسی لئے اس نے بمبئی چھوڑنے کا ارادہ کرلیا اور شیام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا "شیام میرے! میں تو پاکستان جا رہا ہوں"۔

پھر چند سال بعد منٹو نے پنڈت نہرو کے نام دو ایک کھلے خط لکھے۔ ان میں سے ایک خط کو تو بہت درد بھرے انداز میں ختم کرتے ہوئے لکھا ہے:

"پنڈت جی! میں نے بمبئی چھوڑ دیا تھا، کیا آپ کشمیر نہیں چھوڑ سکتے۔"

پاکستان پہنچ کر منٹو نے اپنے آپ کو بالکل کھویا ہوا پایا۔ یہاں بے چینی، [illegible] افراتفری کا عالم تھا۔ کسی کو کیا پڑی کہ پوچھتا آپ کون ہیں۔ جسے الاٹمنٹوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے کسی بات کی پائیداری کا احساس ہی نہیں تھی۔ بس جو کچھ بھی کرلیں کم ہے اور منٹو کے سے شخص سے یہ توقع رکھنا عبث تھا کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف ان دھندوں میں پڑ جاتا۔ یہاں اس کے لئے کوئی ملازمت نہیں تھی۔ نہ کسی کے نام وہ کارخانے اور فیکٹریاں الاٹ کراتا تھا۔ ایسے اشاعتی ادارے بھی یہاں موجود نہ تھے جن کا مطمح نظر علم و ادب کی اشاعت ہو اور نہ ہی ایسے ادبی رسائل کا یہاں وجود تھا جو اہل قلم کو ان کی محنت کا بہتر سے بہتر معاوضہ پیش کرتے۔ منٹو کے لئے یہ کس قدر نامساعد حالات تھے پھر بھی اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ وہ ہر آفت کا مقابلہ کرتا رہا اور اپنے ہی طور طریقوں کے ساتھ۔ اس کی روش سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن وہ اپنے ہی بنائے ہوئے راستے پر گامزن رہا۔

غربت و افلاس کی حقیقت کو تسلیم کرلینا ایک حساس فنکار کے لئے آسان بات نہیں اگر وہ اسے تسلیم کرلیتا ہے تو پھر مشکل ہی سے نباہتا ہے۔ تنگ دستی سے اس [illegible] اس لئے بھی مشکل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے تخلیقی شاہکاروں کا معاوضہ بھی لینا چاہتا ہے۔ سماج سے اس کے چند مطالبات ہوتے ہیں جنہیں پورا کرنا [illegible] کا کام ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ انسانی سلوک ہوتا رہے۔ ان حالات میں افراد کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ وہ تو اپنے حالات کی پیداوار ہیں۔ اسی لئے وہ اعمال کے جواب دہ بھی نہیں ہوسکتے۔ ظاہر ہے کہ منٹو کے سوا اگر کوئی اور شخص ان حالات سے دوچار ہوتا تو وہ پاگل بن گیا ہوتا یا دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلیتا۔ مگر منٹو نے کہانی لکھنا نہیں چھوڑا اور اگر سچ پوچھیے تو منٹو کی بہترین کہانیاں اسی دور کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں محبت ہے، عشق ہے، ایثار و قربانی ہے اور اپنے مقصد سے وابستگی ہے۔ ان کہانیوں کے کردار وہ مرد اور عورتیں ہیں جو کسی مریض اور پاگل ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ ہماری ہی دنیا کے چلتے پھرتے انسان ہیں۔ ایسے انسان جن کے لئے انسان کے دل میں احترام و ہمدردی کا جذبہ موجود رہتا ہے۔

منٹو کے آخری دنوں میں دنیائے ادب کے بھیڑیوں نے اس کی صلاحیتوں اور [illegible] بیچنا شروع کردیا تھا اور اس کے خون سے جی بھر کے ہاتھ رنگے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ منٹو نے بھی ان لوگوں کو اپنا خون پینے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس کا معمول تھا کہ وہ اخبارات و رسائل کے دفتروں میں پہنچ کر کسی ایڈیٹر [illegible] کے لئے [illegible] ہوتا تاکہ جس پیرائے میں [illegible] اس کے انتظار میں کھڑا رہتا۔ جیسے میں اس کے دل و دماغ پر جھکی لگانے کی طرح سوار رہتا تھا۔ وہ پہنچتے ہی بڑے اکھڑ انداز میں ایڈیٹر سے پیسے مانگتا لیکن ادھر ادھر کا بہانہ کرکے ایڈیٹر حضرات اسے ٹال دیا کرتے تھے [illegible] کہانی لکھنے کا وعدہ بھی کرلیتے تھے۔ منٹو ایک لمحے کے لئے کچھ سوچتا، پھر وہیں بیٹھے بیٹھے لکھنا شروع کردیتا۔ جس کاغذ کی پیشانی پر وہ لکھتا اور مشین کی طرح لکھتا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر کہانی تمام کرکے وہ صفحات ایڈیٹر کے سپرد کردیتا۔ وہ اپنی تحریر پر نظر ثانی کرنے کا عادی نہیں تھا۔ ایک ہاتھ سے حوالے کرتا اور دوسرا ہاتھ نقدی وصول کرنے کے لئے بڑھاتا۔ رقم گننا اس نے کبھی گوارا نہ کیا کیونکہ وہ اسے گھٹیا اور ذلیل حرکت خیال کرتا تھا۔

زندہ یا مردہ مصنفوں کے زمرے میں منٹو کے سوا شاید کوئی اور مصنف ہو جس کے ساتھ اتنی بے انصافی ہوئی ہو جتنی منٹو کے ساتھ ہوئی۔ بظاہر [illegible] اور با اخلاق پبلشر بھی منٹو کی بے نیازی سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے تھے۔ یہاں ان اشاعتی اداروں کو تو منٹو سے خلق

دیکھ میں کچھ تو ندامت محسوس ہوگی کہ وہ منٹو کے ساتھ اس کی زندگی میں اور اب اس کے مرجانے کے بعد کیا کیا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔ منٹو کی تمام تحریروں کا مجموعہ صرف اس لئے اب تک شائع نہیں ہوا کہ اردو اہلِ قلم کا ایک خاص گروہ اس کی یکبارگی اشاعت پر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ اس کی تحریروں کے جملہ حقوق محفوظ کرانا اور ان حقوق کی تفصیل اور میعاد وغیرہ کا مقرر کرنا ایسے مسائل ہیں جن سے نپٹنے کے لئے وکلاء کا رہینِ منت ہونا پڑتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ منٹو لین دین کے معاملات میں بڑا سیدھا آدمی تھا۔ ہیر پھیر سے ناواقف کسی پبلشر سے دھوکا کھانے کی تو اس میں صلاحیت بھی موجود نہ تھی۔ اس لئے منٹو اور اس کے پبلشروں سے متعلق بہ آسانی کے ساتھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کون ظالم تھا اور کون مظلوم!

بہر حال دوسری طرف کوئی بھی امید نہ تھا کہ حکومت کا کوئی ادب نواز محکمہ منٹو کی تحریریں ایک مجموعے کی شکل میں شائع کر دے گا، ابھی قبل از وقت ہے۔ وقت اپنے پر اگر ایسا ہو بھی جائے تو یہ کم سے کم خدمت ہوگی جو منٹو کے لئے کی جائے گی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ منٹو کے متعلق کوئی نہ کوئی نیا شوشہ نکلتا ہی رہتا ہے۔ ابھی چند روز ہوئے اس کی آخری کتاب کی اشاعت اور فروخت پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم نے منٹو کو ابھی تک معاف نہیں کیا حالانکہ اسے مرے ہوئے بھی دس سال بیت چکے ہیں۔

منٹو کی وفات کے بعد جتنی کتابیں اس کی زندگی اور فن پر لکھی گئیں۔ ان میں ایک کتاب تو ایسی بھی ہے جسے بکواس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے مصنف کا دعویٰ ہے کہ وہ منٹو کے آخری دنوں میں اس کا قریبی ساتھی رہ چکا ہے لیکن منٹو کے حلقۂ احباب کو پہچاننے والے اس حقیقت سے لاعلم ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے حضرات ہیں جنھوں نے منٹو کے مرنے کے بعد اس کی شخصیت کو ذاتی شہرت حاصل کرنے کا وسیلہ بنایا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے اہلِ قلم نے اور خود منٹو کے فن کو پسند کرنے والوں نے بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ افسوس ہے کہ ان مضامین کو اب تک کتابی شکل میں شائع نہیں کیا گیا۔ حالانکہ ایسا اقدام منٹو اور اس کے ادب کی بہت بڑی خدمت سمجھی جاتی۔ ماہنامہ "نقوش" لاہور نے منٹو نمبر شائع کر کے عظیم خدمت سر انجام دی ہے۔ جناب حامد جلال نے (جو منٹو کے اعزا میں سے ہیں) منٹو کی چند کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کر کے BLACK MILK کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ یہ مجموعہ لاہور کے ایک انگریزی کتابیں چھاپنے والے ادارے کی طرف سے شائع ہوا تھا مگر چند نامعلوم وجوہ کی بنا پر بازار میں نہ آ سکا اور پریس کے گودام میں ہی ڈھیر رہا جہاں منٹو کی یاد کی طرح اس پر بھی گرد و غبار کی تہیں جم چکی ہیں۔ اس ترجمے کی ایک جلد میں نے بھی دیکھی ہے اور مطالعہ کے بعد اندازہ لگایا ہے کہ مترجم نے بڑی جانفشانی سے کام کیا ہے۔ اس مجموعے کی ایک کہانی "اوڈر" کو امریکہ سے شائع ہونے والے ایشیائی کہانیوں کے مجموعے میں بھی شامل کیا گیا ہے جو عام طور پر بک سٹالوں سے مل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کسی اور کتاب کا علم نہیں جو منٹو کو زندہ رکھنے کے لئے منظرِ عام پر آئی ہو۔ ممتاز شیریں کا مقالہ بھی ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔ اس کا تھوڑا سا حصہ جو میری نظر سے گذرا ہے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں منٹو کے فن، اس کے ذہن اور اس کی شخصیت کا اتنا جائزہ نہیں لیا گیا جتنا خود مصنفہ نے اپنے مطالعے کی وسعت پر روشنی ڈالی ہے۔ شاید ہی کسی اور ادبی تحریر میں بڑے بڑے نام گنوانے پر اتنا زور دیا گیا ہو جتنا ممتاز شیریں کی اس تحریر میں ہے۔

یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ منٹو کی تصنیفات کتب فروشوں کے ہاں سے غائب ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کے مرنے کے بعد بہت کم کتابیں دوبارہ شائع کی گئی ہیں۔ منٹو کے جو بہترین شہکار تھے، وہ بھی صرف ایک ہی بار چھپ سکے ہیں اور وہ بھی اس وقت ذاتی یا پبلک کتب خانوں کی زینت ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس ضمن میں منٹو کی "گنجے فرشتے" قابلِ ذکر ہے۔ پہلی بار یہ مجموعہ منٹو کی زندگی ہی میں شائع ہوا تھا اور اس کے بعد آج تک اسے دوسری بار چھپنا نصیب نہ ہوا۔ آج یہ حالت ہے کہ کراچی، لاہور، پنڈی اور دوسرے بڑے شہروں میں کتب فروشوں اور کتب خانوں کو چھان ماریں تو یہ ضروری نہیں کہ منٹو کی چھپی ہوئی ساری کتابوں کی ایک ایک جلد بھی ہمارے ہاتھ لگ جائے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ منٹو کی کتابوں کی مانگ بڑے شہروں کے مقابلے میں چھوٹے شہروں میں زیادہ ہے حالانکہ بڑے بڑے شہر ادب و ثقافت کے مرکز سمجھے جاتے رہے ہیں۔

تر ادو تو منٹو کی تصنیفات میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی۔ انگریزی سکولوں میں تعلیم یافتہ حضرات منٹو کو اس لئے نہیں پڑھتے کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے
ان میں لکھا ہے۔ وہ کسی ایسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے جو ان کے انداز انگریزیت کو ٹھیس پہنچائے۔ کچھ دن ہوئے میں نے ایک پڑھے لکھے نوجوان سے
کیا: کیا آپ نے دوستو وسکی کا کوئی ناول پڑھا ہے؟ اس پر نوجوان نے بڑے حقارت آمیز لہجے میں جواب دیا کہ "معاف فرمایئے! مجھے اردو
پڑھنے کا شوق نہیں"۔

یہ حال تو انگریزی سکول میں جانے والوں کا تھا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم میں مشرقیت کے دلدادہ لوگ بھی منٹو کو پڑھنے کی زحمت نہیں کرتے۔
ان کے نزدیک منٹو فحاشی اور عریانیت کا ترجمان ہے۔ وہی دو آبازی قسم کے ادیبوں کی طرح۔ یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ منٹو کی
کتابیں صرف وہی لوگ پڑھتے ہیں جنہیں منٹو سے شغف ہے۔ میرے احباب میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو منٹو کو پڑھتے پڑھتے اکتا گیا ہو۔ منٹو کے فن
میں پہلے جیسی تازگی موجود ہے اور وہ اب بھی ذہنوں کے لئے وجہ تسکین ہے۔ تیرگی کے چہرے سے روشنی کے جن مقدس نقابوں کو نوچ کر منٹو نے
پھینک دیا تھا، وہی زرتار نقاب خود ہماری ہی حوصلہ افزائی سے اب پھر سینے جا رہے ہیں۔ ہمارے سماج کے وہ کردار بت جن کو منٹو نے اینٹ سے اینٹ
بجا کر اب نئے سرے سے انہیں پھر معبدوں میں نصب کیا جا رہا ہے تاکہ پھر ان کی پرستش شروع ہو جائے۔ سماج کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کو سلجھانے
کے لئے منٹو نے اپنے خونِ دل کی کشید پیش کی تھی لیکن یہ لوگ آج بھی اسی طرح گندی نالیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ سماجی تصنعات اور ریاکاریاں جن پر
منٹو نے کاری ضرب لگائی تھی، آہستہ آہستہ پھر ہمارے معاشرے کا جزو بن کر ظاہر ہو رہی ہیں۔ وہ مکر و فریب جس کی اصلیت کو منٹو نے روزِ روشن کی طرح
عیاں کر دیا تھا، اسے آج پھر ہمارے معمولاتِ زندگی میں خاصی جگہ مل رہی ہے اور وہ عزت و اخلاق کے راہزن کہ منٹو ساری عمر جن کا مضحکہ اڑاتا
رہا، آج مورخ کے مالک بن بیٹھے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ منٹو نے ان سب عناصر کو ختم کر کے سوسائٹی کو پاک صاف بنا دیا تھا لیکن اس بات سے شاید کوئی شخص انکار کر سکے کہ جب تک
منٹو زندہ رہا اور اپنے قلم کی طاقت سے کام لیتا رہا، یہ عناصر بھی خوفزدہ اور سہمے سہمے سے رہتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ منٹو کے دم سے گناہ میں اتنی جرات نہ تھی
کہ وہ زیادہ اودھم مچا سکے۔ بدقماش اور آوارہ لوگ بھی اتنے بے حیا اور بیباک ہو کر اپنی پاکدامنی کا کمر ہی ڈھنڈورا پیٹا کرتے تھے۔ ان کی ناانصافیوں کی راہیں
مسدود رہا کرتی تھیں اور ان کی ڈراؤنی شخصیتیں نئی روشنی اور نئے رجحانات کا لباس بدل کر کم ہی منظرِ عام پر آنے کی کوشش کرتی تھیں۔ لیکن ــــ
آج منٹو موجود نہیں۔ منٹو مر چکا ہے اور ہم نے اس کی موت پر سوگ بھی تو نہیں منایا۔ منٹو کی یاد میں کبھی کبھی جلسے منعقد کروا لینے سے ہم اس فریضے سے عہدہ برآ
نہیں ہو سکتے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس تحریک اور جدوجہد کو آگے بڑھاتے رہیں جسے منٹو نے شروع کیا اور جاری رکھا۔ ریاکاری اور رجعت پسندی کے
اور سماج کے بے رحم شکنجے میں پھنسے ہوئے مظلوم انسانوں کی مدد، رسم و رواج اور قانون کے بندھنوں سے استبداد کی روک تھام لیے اقدامات سے
معاشرے کو صالح بنایا جا سکتا ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے ادیب اور لکھنے والے اب ان نشتروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے
جن سے منٹو نے بیمار معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں کو کریدا تھا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ منٹو کو فحش نگاری کی حیثیت سے بے خطا اور بے جرم ثابت کیا جائے۔ میرے نزدیک اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بے خطا
اور بے جرم اسے ثابت کیا جاتا ہے جو خطاکار اور مجرم ہو۔ منٹو نے زندگی بھر انسانی ذہن کو تعصبات اور دوسری برائیوں سے پاک کرنے کے لئے جدوجہد
کی۔ میری دانست میں وہ ایک کامیاب مصلح ثابت ہوا۔ میرے لئے یہ بات بھی موجبِ حیرت ہے کہ منٹو کے ہمنوا اس کے متعلق بات کرتے ہوئے
معذرت آمیز گفتگو کیوں اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ منٹو اور اس کے فن پر کچھ کہتے ہوئے جھینپتے ہیں اور اس طرح ان کو یہ احساس ہوتا رہتا ہے کہ منٹو کے

متعلق کچھ کہنا جنسی بے راہ روی پر اظہارِ خیال کے مترادف ہے۔ وہ کھلے طور پر اپنے آپ کو منٹو سے ملوث نہیں کرتے اور دیکھا جائے تو
یہی جانب منٹو شناسی میں سب سے زیادہ آڑے آ رہی ہے۔

ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ منٹو ماضی سے تعلق رکھتا ہے۔ گذرے ہوئے دور میں جو برائیاں تھیں اور جو ہمارے معاشرے کو چاٹ رہی تھیں
نے ان برائیوں کو ختم کرنے کے لئے براہِ راست ان کی طرف اشارے کئے تھے۔ زمانہ بدل چکا ہے اور ان اعمالِ شنیعہ میں کمی آ گئی ہے
ہے جو منٹو کے زمانے میں عام ہوا کرتے تھے۔ اس طرح منٹو اپنی تحریروں سمیت گذرے وقتوں میں لے جانے کی کوشش کرتا ہے اور
کہ تیزی سے بڑھنے والی آج کی دنیا میں منٹو کا مطالعہ بے سود ثابت ہو گا۔ اس نظریے میں کس قدر صداقت ہے، اس کا آپ خود ہی اندازہ
صرف اتنا جانتا ہوں کہ منٹو نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے وہ تا حال ترک نہیں ہوئے۔ وہ معائب جنھیں منٹو نے عریاں کیا تھا آج بھی
معاشرے کا جزو بنے ہوئے ہیں۔

ہمارے وہ نوجوان ادیب جنھوں نے منٹو سے اثر قبول کیا ہے، اُن کے متعلق بھی یہ سننے میں آیا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی
کو منٹو کے فن سے ملوث نہ کیا جائے۔ یہ تو وہی بات ہوئی جیسے آج کل کا کوئی نوجوان اپنے نوعمر دوستوں کی محفل میں بیٹھا ہے اتفاق
سے اُس کا چچا اگر وہاں آ جائے تو ان صاحبزادے کی کوشش یہ ہو گی کہ اس کے دوستوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ صاحبزادے انہی کے بھتیجے ہیں۔ ا
بڑھ کر ہمارے لئے باعثِ شرم اور کیا بات ہے کہ ہم منٹو کو اس لئے درخورِ اعتنا نہ سمجھیں کہ اس میں دورِ حاضر کی کوئی بات نہیں ہے
ماضی کا ادیب بن کر رہ گیا ہے۔ یوں اس سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا کیونکہ منٹو کے نقوش ہمارے دلوں پر مرتسم ہیں۔ اُس کی روح ہمارے
پر منڈلاتی رہے گی۔ منٹو کی روح ہیملٹ کے باپ کی شاہانہ روح ہے جس سے عام حیثیت کے آدمی اگر چاہیں بھی تو کنارہ کش نہیں
پڑھے لکھے آدمیوں میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو منٹو اور اُس سے متعلق ہر معاملے کو غیر اہم سمجھتے ہوئے تمسخر سے ٹال
حکومت نے منٹو کی کتاب "شکاری عورتیں" کی اشاعت ممنوع قرار دے دی ہے۔ کسی صاحب نے بذریعہ خط اس پر احتجاج کیا تو
جواب میں جو خط شائع ہوا اُس کا نفسِ مضمون یہ تھا کہ منٹو کی حمایت میں شائع ہونے والا یہ خط پوری طرح "پرلطف" نہیں۔
یہ ذکر بھی کر دیا گیا ہے کہ "شکاری عورتیں" کو ممنوع قرار دینے کا حکم ذرا دیر سے صادر ہوا کیونکہ عصمت فروشی کے سا
منٹو کو بھی ممنوع قرار دیا جانا چاہیئے تھا۔

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ منٹو کے سلسلے میں یہ گھٹیا رجحان آخر کس قسم کی ذہنی و علمی فکر کی نشان دہی کرتا
ہے نہ تو کسی علمیت کا پتہ چلتا ہے اور نہ ہی اچھے مذاق کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ہمیں منٹو کی تمام کتابوں کو پھر سے شائع کرانے کے لئے ٹھوس
کرنے ہوں گے۔ بظاہر یہ کام مشکل ہے لیکن منٹو کو زندہ رکھنے کے لئے اسے سرانجام دینا ہو گا کیونکہ فن کار کا فن ہی مرنے کے بعد اُسے زندہ ر
وہ عوام کے دل و دماغ میں ایک غیر مرئی خیال بن کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کی ذہنی تخلیقات کی نشر و اشاعت ہی اُسے دوام بخشتی ہے۔
منٹو جب تک زندہ رہا اُسے اپنی عظمت کا احساس رہا اور اپنے فن کے زندہ جاوید رہنے کا یقین بھی۔ اب یہ ہمارا کام ہے
اس دعوی کو زندہ رکھیں۔

احمد شریف

منٹو صاحب

منٹو کو میں نے صرف ایک بار دیکھا تھا۔ وہ ایسے حال میں تھے کہ بہت بے حال تھے۔ پیے ہوئے تھے۔ ریگل سینما کی دوسری منزل کی راہداری میں ایک بوسیدہ میز پر سر ڈالے پڑے تھے اور ایک ادھیڑ عمر کرسچین عورت میز کے دوسری طرف بیٹھی انھیں نمناک آنکھوں سے تک رہی تھی۔

قتیل شفائی اور احمد ظفر میرے ساتھ تھے۔ جب قتیل نے منٹو کا شانہ ہلا کر انھیں جگایا تو کرسچین عورت کو ناگوار گزرا — منٹو نے سر اٹھایا اور آنکھیں سکیڑ کر قتیل کی طرف دیکھا۔ قتیل نے ہمارا تعارف کرایا اور کہنے لگے "منٹو صاحب میرے دوست آپ سے افسانہ لینے پنڈی سے آئے ہیں"۔

"مل جائے گا" منٹو نے پیشانی پر سے بکھرے لمبے بال ہٹائے "میرے پاس ایک افسانہ ہے — خالی بوتلیں، خالی ڈبے"۔

"منٹو صاحب" قتیل ہچکچائے۔ "یار یہ ہے — خالی بوتلیں، خالی ڈبے، چھپا تو مقدمہ کھڑا ہو جائے گا۔"

منٹو آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرائے اور کہنے لگے "چنگا، پہلی چوری تے ای پھاہے لگن لگے"۔ پھر بولے "کوئی بات نہیں دوسرا کہہ دوں گا — تیس روپے لوں گا"۔

بس یہیں فیصلہ ہو گیا۔ احمد ظفر نے دس دس کے دو نوٹ دیے۔ منٹو نے وہ نوٹ کرسچین عورت کی طرف بڑھا کر کہا "میں نے کہا تھا نا، اللہ مالک ہے"۔

نہ منٹو کا افسانہ ملا اور نہ ہم نے پرچہ نکالا۔

خالی بوتلیں، خالی ڈبے، کچھ عرصہ بعد غالباً "جاوید" میں چھپا تھا۔

ایک بار دہلی میں میری ملاقات راجندر سنگھ بیدی سے ہوئی۔ باتوں باتوں میں اس وقت کے افسانہ نگاروں کا ذکر چھڑ گیا۔ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی کی ان دنوں بہت شہرت تھی۔ میں نے بیدی سے پوچھا

"منٹو کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

ہنس کر کہنے لگے "منٹو سب بدمعاش ہے"۔

میں ان کی بات سمجھ گیا — اس پر بھی انھوں نے اپنی بات کی وضاحت کرنے کی ضرورت محسوس کی اور سنجیدہ ہو کر بولے، "منٹو سے بڑا مخلص ہے"۔ لوگ کہتے ہیں منٹو مداری تھے، رنگ رنگ کا منظر نکال کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتے تھے۔ اگر دیکھا جائے تو افسانہ نگار سب ہی مداری ہوتے ہیں جو زندہ ہیں اور وہ بھی جو افسانے لکھ گئے — سب مداری ہیں اور زندگی کا تماشہ الفاظ کے ذریعے دکھاتے ہیں۔ کامیاب مداری وہ ہے جو تماشائیوں کو سحر زدہ کر دے اور منٹو نے تو بڑے بڑوں کو سحر زدہ کیا ہے۔ وہ بہت بڑے فن کار تھے۔ اگر میں انھیں بڑا افسانہ نگار نہیں مانتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں خود بہت چھوٹا ہوں"۔

میں افسانہ لکھتے لکھتے جب کسی جگہ پھنس جاتا ہوں اور افسانہ آگے نہیں چلتا تو منٹو کو پڑھتا ہوں۔ وہ بھی افسانہ لکھتے وقت کئی بار ایسی صورت سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہ ایسے موقعے پر بڑی صفائی سے کہتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا یہ بات یوں تھی ——— اور پہلے کہی ہوئی بات کو بلا دہرا دیتے ہیں۔ تکرار افسانے کے تاثر کے لئے مہلک ہونے کے باوجود منٹو کے ہاں بُری نہیں لگتی ——— وہ بہت اچھے داستان گو تھے

میں منٹو کے فن کی خوبیاں نہیں گنوا سکتا۔ البتہ پڑھے لکھے لوگوں کا کہنا ہے کہ منٹو نے کرشن چندر کی طرح نثر میں شاعری نہیں کی۔ ان کے ہاں چٹخارہ نہیں ملتا۔ ان کے ہاں بیدی کی سی گہرائی بھی نہیں اور نہ انھوں نے احمد ندیم قاسمی کی طرح یوں بات کی ہے کہ افسانہ پڑھتے وقت الفاظ کے گھنگھرو کا چھن چھن بجنے لگیں ——— پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ منٹو کے ہاں وہ کون سی خوبی ہے جس کی بدولت منٹو کی کہی ہوئی بات دل کو لگتی ہے ا

منٹو کے ساتھ موپساں اور او ہنری کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تینوں نے اپنے افسانوں میں اکثر ایک سی تکنیک برتی۔ اور مواد کے لحاظ سے منٹو کا موپساں اور ہنری کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

منٹو بیباک رند تھے۔ ان کی زندگی میں بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں جب انھوں نے بڑی بڑی شخصیتوں کے بارے میں بڑی جرأت ا برملا اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے منٹو بمبئی سے لاہور آئے۔ ان کے بمبئی میں قیام کے دوران، فکر تونسوی خاصا نام پیدا کر چکے تھے۔ ادب لطیف میں کسی نے منٹو اور فکر تونسوی کا تعارف کرایا۔

آپ ہیں سعادت حسن منٹو اور آپ ہیں رام لال فکر تونسوی"

منٹو نے حیران ہو کر فکر تونسوی کو بڑی سی گالی دی اور کہنے لگے "اوے تو ہندو ایں؟"

اور آگے بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔

اس واقعے کا ذکر میں نے یہ بتانے کے لئے نہیں کیا کہ منٹو پکے مسلمان تھے ——— وہ جو کچھ بھی تھے مجھے اور آپ کو معلوم ہے لیکن اتنی سی بات ضرور ہے کہ ان کا دل آئینے کی طرح تھا۔

اردو ادب میں بے شمار اچھے افسانہ نگار ہیں لیکن اردو ادب کے منشی پریم چند کے کفن سے لے کر اشفاق احمد کے گڈریا تک افسانے انگلیوں پر شمار کئے جا سکتے ہیں۔ اس میں کسی کو کلام نہیں کہ کرشن چندر، بیدی اور ندیم چغتائی کے افسانہ نگار ہیں ——— لیکن میں جب ان کے ہاں شاہکار افسانہ تلاش کرتا ہوں تو فوری طور پر کوئی افسانہ میرے ذہن میں ایسا نہیں آتا جس کو شاہکار کہہ کر کرشن، بیدی کے نام سے منسوب کر دوں ——— اس کے برعکس جب میں منٹو کے ہاں شاہکار افسانہ تلاش کرتا ہوں تو "ممی" "ہتک" "موذیل" یا "نیا قانون" "ٹھنڈا گوشت" "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور "کھول دو" قطار باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم میں سے منٹو کا افسانہ تلاش کرو ——— اور میں اس کام کو ہمیشہ اگلی فرصت پر ڈال دیتا ہوں۔

ایوب صابر

ایک مقروض کی وصیت

(جسارت پر علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

ہے لازم کہ سب ہوں عداوت میں گم — زن و مرد ہوں سخت نفرت میں گم
جواں سب کے سب ہوں رقابت میں گم — قبائل ہوں قرضے کی لعنت میں گم
کہ ہو قرض لینے کی ہمت بلند

نہ کالوں سے ہے اور نہ گوروں سے ہے — تعلق مرا سود خوروں سے ہے
محبت مجھے اُن چکوروں سے ہے — اُنہی سنگدل کالے چوروں سے ہے
غریبوں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

وہ کہتے ہیں کمبخت ڈر ہی نہ جائے — وصولی سے پہلے گزر ہی نہ جائے
یہ بے فیض حرکت بھی کر ہی نہ جائے — ہماری [illegible] کے مر ہی نہ جائے
یہ مقروض [illegible] ارجمند

سناؤں تجھے ہمنشیں دل کی بات — یہ ہے ایک اندوہگیں دل کی بات
دلوں میں رہے جاگزیں دل کی بات — بجز اس کے کچھ بھی نہیں دل کی بات
وہ پوشیدہ مدفن ہے مجھکو پسند

جو مدفن ہو محرومِ شان و شکوہ — مرے مہربانوں کو ہو جس کی ٹوہ
وہ بے نام سی تربتِ ارضِ روہ[1] — اڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ
مرے قرض خواہوں کی گردِ سمند

[1] روہ: سابق صوبہ سرحد کا قدیم نام

ارشد میر

موٹاپا

شخصیت سازی کے لئے موٹاپا نسخۂ کیمیا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس امر کے شاہد ہیں کہ موٹاپا اکثر خود بخود آتا ہے لایا نہیں جاتا۔ آپ لاکھ جتن پاپڑ بیلیں، اگر آپ کے ہاتھوں میں موٹاپے کی ریکھا نہیں تو آپ ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگانے کے باوجود اس خداداد تحفے سے محروم رہیں گے۔ ڈاکٹروں اور طبّا بڑی چابکدستی سے اپنی اپنی دکانداری چمکانے کے لئے یہ شوشہ چھوڑ رکھا ہے کہ موٹاپا بیماریوں کی آماجگاہ ہے چنانچہ ضعیف العقیدہ، بھاری بھرکم خودساختہ اور خاندانی موٹے ان کی مستند رائے سے متاثر ہو کر ڈائٹنگ کرنے اور موٹاپا دور کرنے کی گولیوں کا استعمال کرتے نظر آنے لگے ہیں لیکن ڈاکٹروں حکماء کے ہاتھ پاؤں مارنے اور ان کے مریدان باوفا کی مکمل پرہیز کے باوجود موٹاپے کا بال تک بیکا نہیں ہو سکا بلکہ موٹوں کے تعداد اور ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا گیا ہے۔ اِکا دُکا ڈبل ڈیکر شاعروں اور تھوک کے حساب سے ڈیل ڈول کے ادیبوں کو موٹاپے نے کافی سہولتیں دیں لیکن چنانچہ اب یہ لوگ بوقت ضرورت آسانی سے بیٹھے لیٹے پیٹ کو بطور میز استعمال کر لیتے ہیں۔

دراصل موٹا ہونے میں کئی انمول اور نادر فائدے مضمر ہیں۔ مثال کے طور پر موٹا آدمی آسانی سے اپنے تیار شدہ پیٹ کو علیحدہ حیثیت میں بھی استعمال میں لا سکتا ہے یا ذاتی ایل ہونے کی صورت میں دوسروں کی خدمت اقدس میں پیش کر کے انہیں صوفہ سیٹ سے بڑھ کر لطف دلا سکتا ہے۔ یہ پیٹ بوقت ضرورت غلاف اور گاؤ تکیہ کا اچھا خاصا نعم البدل ثابت ہو سکتا ہے۔ سیلاب کے دنوں میں موٹوں کو دریاؤں کے ٹوٹتے ہوئے بند پر کھڑے کر کے عوام کو عظیم نقصان سے اور ڈوبتے کو تنکے کا سہارا جیسے ایمنی اور فرسودہ نظریے کی بجائے موٹے کا سہارا دے کر بچایا جا سکتا ہے کیونکہ یہ عظیم الجثہ مخلوق نہ باندھنے میں کافی موثر ہے، بلکہ ان کے چوڑے اور فراخ تر اجسام میں دس بیس ہزار کیوسک پانی جذب کرنے اور کھپانے کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ اکثر موٹوں کو بازار سے بنیان، جوتے، موزے وغیرہ جیسے ضروریات "مفت" کے اصول کے تحت دستیاب ہو جاتے ہیں جو پہنے بہ اہل و عیال کی دردیاں کے کام آ جاتے ہیں۔ رہائش کی قلت اس دور کا سنگین مسئلہ ہے لیکن موٹوں کی آل اولاد آسانی سے اپنے ابا جی کے جہازی جوتوں میں خواب خرگوش کے مزے لوٹتی ہے۔ اسی طرح موٹے آدمی کو دیکھ کر بچے لوگ تالیاں پیٹتے۔ اس کی ناف میں گولیاں کھیلتے، دبلے چوڑے گھر سے اور بچے پیٹ پر اچھلتے کودتے کھیل تماشے کرتے ہیں۔ کئی زندہ دل بیوپاری انہی چیزوں پر ہی کماتے۔ کھو کر روکڑ جلاتے ہیں۔ فرخ نارودی نے شاید کسی موٹے کو دیکھ کر یوں کہا تھا کہ

ہر بحر میں ساحل ہوتے ہیں اس بحر میں ساحل کوئی نہیں

رہی ان حضرات کی کمر جسے کمرہ کہنا زیادہ برمحل اور مناسب ہے تو اس کے بارے میں ایک زندہ دل شاعر کا یہ بولتا ہوا مصرع نذر ہے :

دھوم ہے ان کی کمر کے ناپ کی

یہ حضرات پیٹوں پر کمربند نہیں باندھتے بلکہ کمربندوں پہ پیٹ باندھتے ہیں۔ یوں متعدد مرتبہ کمربند ٹوٹنے کی صورت میں وہ نائلن کی رسی کا استعمال بھی ہی

غالب نے "تاسے" کو رسا باندھ کر شاعرانہ تعلّی نہیں کی بلکہ حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ رسہ کشی کے مقابلوں میں مخالف ٹیمیں آخر میں ایک موٹے سے کھلاڑی کی کمر میں رسّہ باندھ کر بٹھا دیتی ہیں اور پھر جس ٹیم کا جتنا موٹا کھلاڑی دستیاب ہوگا عام طور پر وہی ٹیم فتح و کامرانی سے ہمکنار ہوگی۔ ان دیو پیکروں کی اکثریت ربع دائم سے نابلد ہوتی ہے (ضمناً عرض ہے کہ ان میں سے اکثر کا طول البلد تو نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے البتہ عرض البلد ہی عرض البلد ہوتا ہے) اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے ایک دفعہ نہ جانے کس ترنگ میں یوں کہا تھا کہ "شیخ جی فربہ تھے ان کی طبع میں جودت کہاں"۔ لیکن صاحب ہمارے محلے کے ایک زندہ دل اور بے ضرر موٹے نے جدت طرازی دکھا کر رضاکارانہ طور پر خود ہی گرد و نواح کے بچوں کی فوج ظفر موج کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ وہ اسکول سے واپسی پر ان کے جسم کو بطور تختی یا سلیٹ استعمال میں لے آئیں۔ چنانچہ اس سہولت کے پیش نظر بچوں کے شیطانی ٹولے میں سے کوئی شوخ و شنگ بچہ قلم دوات لئے ان کے شہتیر نما بازوؤں پر ہندسوں اور پہاڑوں کی مشق کرتا نظر آتا ہے۔ اس عالم میں یہ صاحب بڑے سکون سے مسکراتے رہتے ہیں۔

موٹے آدمی کو حسبِ بقدرِ جثّہ کے مصداق والد کی بجائے والدین اور بندے کے برعکس بندگان کہنا چاہیئے۔ اس برادری کے لوگوں کو لاری یا گاڑی میں مسافر دیکھتے ہی "چل تو جلال تو" کا وِرد شروع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ کمانی توڑ سواریاں دورانِ سفر ڈگمگنے کی صورت میں جس طرف جھک جائیں اسی جانب لاری یا ریل کا رُخ بدل جاتا ہے۔ ایسے ہی حضرات کے حسبِ حال یہ شعر کہا گیا ہے:

تم تو بیٹھے ہوئے پہ آفت ہو　　　اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو

چنانچہ اسکی صورت میں کئی دفعہ بسیں ہچکولے کھاتی اور ڈولتی دیکھی گئی ہیں۔ بعض میونسپل کمیٹیاں موٹوں کے مکانوں میں پانی کے نل کے کنکشن توڑنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہی ہیں کیونکہ سینکڑوں گیلن پانی ان کے اجسام کو صرف تر رکھنے کے لئے درکار ہوتا ہے۔ میونسپل کمیٹیوں کو یہ انتہائی قدم نہیں اٹھانا چاہیئے بلکہ کنکشن توڑنے کی بجائے ضلعی سطح پر موٹوں سے سڑک گھسائی اور فٹ پاتھ دھنسائی کا علیحدہ ٹیکس وصول کرنا چاہیئے۔ پھر ان پر نہر بازاری لاگو کرنی چاہیئے۔

موٹوں کا ناپ لینا بھی بڑے دل گردے کا کام ہے۔ بڑے بڑے اہل خیاط ان سے پناہ مانگتے ہیں۔ اکثر لطیف الجثہ درزی تو شرمن ٹینک جیسے ہینڈسم قسم کے موٹوں کا ناپ لیتے ہوئے پسینے میں تر اور کبھی کبھار نیم بیہوش بھی ہو جاتے ہیں۔ ان گرانڈیل شخصیتوں کا یہ دلچسپ پہلو خوب ہے کہ موسم سرما میں تو ان کے وارے ہوتے ہیں مگر موسم گرما ان کے لئے وبالِ جان بن کے آتا ہے جس کی ٹینوں برف اور پنکھوں سے ایک منٹ چھٹکارا ملا تو پسینے سے شرابور۔ دو چار قدم چلے تو نظام تنفس درہم برہم۔ کم خوابی اس دور کا عام مرض ہے لیکن موٹے آدمی کو یہ مرض لاحق نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ شخص مسلسل سونے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اگر یہ کسی دفعہ سونے کے موڈ میں نہ بھی ہو مگر اس کے جسم کا کوئی حصہ آرام کرنے کے لئے بیتاب ہو تو یہ بلا چون و چرا اپنی آرٹ مشینری کے اس حصے میں لچک پیدا کر کے اسے جمہوری تقاضوں کے پیش نظر اور آزادی رائے کے احترام کے نقطۂ نظر سے سلا دیتا ہے۔ چنانچہ اکثر بیٹھتے ہی آپ سے بڑھ کر خراٹے کی گنگا میں مصروف ہوں گے مگر ان کی ٹانگیں یا بازو وغیرہ سوئے ہوں گے۔

انگلستان کے مشہور ڈرامانگار برنارڈ شا اپنے ہم عصر معروف موٹے مزاحیہ انشا پرداز چیسٹرٹن کو "ہنڈرڈ ٹن" کہا کرتے تھے۔ ٹن کے سلسلے میں مزاحیہ شاعر جناب مجید لاہوری مرحوم کا ایک لطیفہ بھی حاضر خدمت ہے۔ ایک دفعہ انہیں ایک دہقان نما عقیدت مند ملا جو دوران گفتگو انہیں بار بار انکسار اور لجاجت سے جناب من کے خطاب سے نوازتا۔ چند بار اس گردان کو سننے کے بعد مجید لاہوری کی رگ ظرافت پھڑکی اور انہوں نے پان کی جگالی کرتے کرتے بڑی سنجیدگی سے فرمایا: "حضرت انکسار، کسر نفسی اور بخل سے کام نہ لیجئے۔ مبالغہ نہیں تو کم از کم صاف گوئی سے کام لے کر میری سو فیصدی خالص تعریف فرماتے ہوئے مجھے جناب ٹن ہی کہہ لیجئے کیونکہ مجھے من کا خطاب دینا تو پہاڑ کو رائی اور ہاتھی کو چیونٹی بنانے کے مترادف ہے۔ ہمارے ہاں تو من چالیس سیر کا ہوتا ہے لیکن ایران میں من تین کیلو یعنی سوا تین سیر کا ہوتا ہے۔ اس حساب سے تو شیر خوار بچے کو بھی جناب من کا خطاب عطا کیا جا سکتا ہے۔"

موٹوں کو دیکھ کر اکثر گھوڑے بدکتے دیکھے گئے ہیں۔ چنانچہ موٹی سواریوں کو تجربہ کار اور خرانٹ کوچوان تانگے کے عقب سے سوار کراتے ہیں اور گا بے خبری میں مارے جاتے ہیں۔ موجودہ ٹیڈی اور دبلے موٹوں کے برعکس پرانے زمانے میں ان دیو ہیکلوں کا ہاتھی تک بھی وزن برداشت کرسکتے تھے، چنانچہ حالیہ ریسرچ کے مطابق راجہ پورس کی شکست کا واحد سبب بھی اس کے توندیل سپاہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تاریخی شکست کے بعد برہ میں توندیلوں کو قانوناً دنگا بھرتی نہیں کیا جاتا تھا۔ میرے ایک قریبی موٹے دوست جنھیں میں متحرک پہاڑ کہتا ہوں بڑے خوش خور ہیں۔ ان کی زندگی کا،

میں شہید ایک ہوں ہوٹل میں ہو تربت مری — خانساماؤں کے کندھوں پہ اٹھے میت مری

خوش خوراکی کے بعد ان کے افضل الاشغال میں سے ایک یہ ہے کہ وہ خاندانی یا بے چارے گھوڑے ٹیسٹ کرتے رہتے ہیں۔ گزشتہ سال ایک یخ بستہ ایک کوچوان لاہور شہر کے ایک چوراہے میں گلے کی رگیں پھلا پھلا کر نیلا گنبد جانے والی دو سواریوں کو مفت لے جانے کی خوش خبری سنا رہا تھا۔ اس ا گر ذرائی آواز پر میں تانگے کے نزدیک گیا تو وہ پرشکوہ شخصیت پچھلی سیٹ پر براجمان تھی اور بے چارا کوچوان کافی دیر سے وزن برابر کرانے کے لئے عام کی رٹ لگا رہا تھا۔ ہمیں قسم کے ایک اور موٹے حضرت کا واسطہ ایک زندہ دل گر پھکڑ کوچوان سے پڑا۔ انھوں نے ایک دفعہ لاہور ریلوے اسٹیشن کوچوان سے پوچھا "کیوں میاں چوک لکشمی کے کتنے پیسے لوگے؟" کوچوان نے ایک آدھ منٹ تک ان کا جائزہ لیا اور پھر بڑے دلربایانہ بلکہ دوکاندارانہ:
"صرف دو تانگے صاب!"

اسی طرح ڈبل عرض کے ایک ایسے ادیب کا بھی ایک واقعہ ہے جس کی توند اس انداز سے تانگے پر چھائی ہوئی تھی جیسے اس نے توند کو آگے کر رکھا ہے اور خود اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ ادیب نے بڑی شان سے تانگے والے سے پوچھا "کیوں بھئی موچی دروازے کے کتنے پیسے؟" تانگے والے نے کہا "ایک روپیہ!" ادیب درشت لہجے میں بولا "غضب، خدا کا دلی دروازے سے موچی تک کا ایک روپیہ؟ میاں ہوش کے ناخن لو۔ میں تو صرف آٹھ دوں گا۔" اس پر مرنجاں مرنج کوچوان بولا "منظور ہے حضور لیکن اس شرط پر کہ دو پھیرے کر لیجئے نصف پہلے چھوڑ آؤں گا اور نصف بعد میں لے جاؤں گا"

انگلستان میں حال ہی میں ایک "لارج گرلز کلب" بنائی گئی ہے جس کی جملہ اراکین موٹی اور جسیم عورتیں ہیں۔ یہ کلب تھوڑے ہی عرصے میں اپنی انفرادیت کی بنا پر کافی مقبول ہو چکی ہے۔ موٹے مردوں اور پرستاران فن موٹاپا کے لئے یہ لمحہ فکریہ ہے۔ انھیں بھی پہلی فرصت میں ایک "گریٹ مینز کلب" یا "ڈبل ڈیکر مینز ایسوسی ایشن" کا اہتمام کرنا چاہئے۔

مظفر حنفی

وقت کے حمام میں

ٹھیک پندرہ سال بعد
وہ مجھے کل شام اک بھٹیار خانے میں ملا تھا
دیر تک اک دوسرے سے ہم گلے ملتے رہے
اور لنگڑی یاد کو سگرٹ سے سلگاتے رہے
اُس نے کہا:
یاد ہے وہ اُونٹ جو انگلش پڑھاتا تھا ہمیں؟
وہ چنے کے کھیت والا واقعہ؟
رات میں گنّے کی چوری؟
دوپہر میں آم کے باغوں پہ ڈاکے؟
اور لوگوں کا ہمیں ہمزاد کہنا،

یاد ہے؟
مسکرا کر میں نے اپنا سر ہلایا اور پوچھا:
کیا تمھیں بھی یاد ہے
گاؤں کا گندہ سا وہ تالاب؟
ہم ننگے نہاتے تھے جہاں؟
وہ ہنس پڑا
دیر تک اک دوسرے کو دیکھتے
خاموش ہم بیٹھے رہے
ان کہی باتوں کو بھی سنتے رہے
آخرش میں نے کہا:
آؤ تم کو شہر کے کچھ خاص لوگوں سے ملاؤں
اُس کی بوسیدہ قمیص اور "چیتھڑا پتلون" ہکلانے لگے
"یار کل سے پاؤں میں تکلیف ہے!"

جابر علی جابر — خالد احمد — زاہد فارانی

میری رائے میں —

ہوا میں تحلیل ہوتا ہوا شعری تجربہ

تازہ فنون میں قاضی عبدالقادر کا مضمون پڑھ کر افسوس بھی ہوا اور حیرانی بھی۔ افسوس اس لئے کہ آپ نے اسے سنجیدگی سے چھاپ دیا اور حیرانی اس لئے کہ آخر صاحب مضمون کا مقصد کیا ہے؟ مضمون کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ شعری تجربے کی اصطلاح کو یک قلم موقوف کر دینا چاہیئے کیونکہ یہ منطقی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ عبدالقادر صاحب نے اپنے اعتراضات کی بنیاد کن نقادوں یا نقاد شاعروں کے "بیانات" پر رکھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ لاہور کے شور مچانے والے نوجوانوں کی باتوں سے انھوں نے شعری تجربے کے متعلق کچھ الٹی سیدھی باتیں سن لی ہیں اور ان باتوں کی "جزویت" سے فائدہ اٹھا کر کسوٹی پر کس کر "شعری تجربے" کو بے معنی قرار دیدیا ہے اور یوں اپنی فلسفیانہ "تحلیل" سے اس اصطلاح کو ہوا میں "تحلیل" کر دیا ہے۔

قاضی صاحب فن شاعری اور فن تنقید سے یکسر بے بہرہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے انھوں نے اسی سال فلسفہ میں ایم اے کیا ہے اور دانشوروں کی الٹی سیدھی باتیں سن کر "شعری تجربے" پر پل پڑے ہیں۔ انھوں نے فن شاعری یا فن تنقید پر کبھی غور نہیں کیا ورنہ وہ منطق کے ہتھیار لے کر حملہ آور نہ ہوتے۔ اس میں قصور سراسر نوجوان نقاد و شاعروں کا ہے جو نئی تحریکیں چلانے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ جب سے سمبلزم، امیجزم، آہنگ پرستی اور ایسی چھوٹی چھوٹی تحریکیں چلی ہیں اور ان کے بانیوں نے ایک دو نظمیں لکھ کر شہرت کمائی ہے اور پھر چند سال کے بعد ہیوم جیسے سربرآوردہ دانشور تاریخ ادب میں اپنا نام لکھوانے میں کامیاب ہو گئے ہمارے نوجوان بھی ان کی نقل کرتے ہیں اور گروپ بنا کر اور انجمن توصیف باہمی بنا کر تحریکوں کے بانی اور ارکان بن جاتے ہیں (تفصیل کی ضرورت نہیں) ہمارے ہاں عجیب و غریب قلابازیاں لگائی جا رہی ہیں۔ آج سے سو سال پہلے میتھو آرنلڈ نے انتشار کا رونا رویا تھا۔ آج اگر آرنلڈ آ کر دیکھے تو اسے انتشار کے صحیح معنی سمجھ آ جائیں۔

قاضی صاحب نے کسی اور معزز نوجوان شاعر سے سوال کیا ہوگا کہ کیا شاعری اپنا معروض آپ ہے؟ ظاہر ہے جواب دینے والا عظیم شاعر کیسے نہ کہے کہ شاعری اپنا معروض آپ ہے۔ وہ معروض کے مفہوم سے آگاہ ہو نہ ہو۔ منطقی نے اپنی منطق کا وار کر دیا اور "شعری تجربہ" دیوار سے جا لگا۔ دوسرے اعتراضات یعنی شاعری کی جزوی (مضمون یا تی تبدیلی، تصوریت، وغیرہ) سے فائدہ اٹھا کر کئے گئے ہیں۔ غرض شاعری کو نادان دوستوں نے مروایا اور شعری تجربے جیسی کار آمد اصطلاح کو قاضی کی منطق کے آگے سرنگوں کر دیا۔ میں نے اوپر چھوٹی چھوٹی تحریکوں کا ذکر کیا تھا۔ ان چھوٹی چھوٹی تحریکوں کے پیچھے دو چیزیں کام کر رہی ہوتی ہیں۔ جلد شہرت اور اوریجنل ہونے کا وہم۔ یہ نوجوان بوڑھے پروفیسروں کو بھی نرم کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر اجمل نے میجر اختر احسن کو "عظیم موجد" کہا کیونکہ انھوں نے اردو شاعری کو ناقص قرار دیا تھا۔ ایسی گندی ذہانت اور جدت آج اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ اور ہم آپ سے سیدھے سادے ادھیڑ عمروں کو آگ بتا رہی ہے شاعری کو تماشا سے ہو نہیں سکتی۔ جدت کی داد کمانے کے لئے لازمی ہو جاتا ہے کہ شاعری کے کسی ایک پہلو کو لے کر اس پر ایک نئی تحریک (ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر ہیں) کی بنیاد رکھی جائے جیسے علامت نگاری، امیجزم، آہنگ پرستی وغیرہ وغیرہ۔ کیا آپ سلیم احمد، ظفر اقبال اور افتخار جالب کے ہتھکنڈے نہیں دیکھ

ںخانوں میں بیٹھ کر پاگلوں کی طرح شور مچا مچا کر ادھیڑ عمروں کو نئے تصورات کی تیز روشنی سے چندھیانا اس گروہ کا امتیازی کارنامہ ہے۔ یہ گر انھوں نے
سے سیکھا ہے جس نے پہلے ملتی کو رگڑا۔ پھر شاعری کی ایک جزوی تعریف کر کے اپنی شاعری کو آگے بڑھایا۔ پھر ملتی سے معافی مانگ لی خیر وہ تو زبردست ذہن
تھا اور ذمہ داری کا احساس بھی۔ اس نے اپنی شاعری کو تنقید اور علمیت سے منوا لیا ہی تو پروفیسر قسم کے شاعر بھی آ رہا ہے جیلانی کامران، صدیق کلیم قسم
لے۔ ابھی چند روز ہوئے جیلانی کامران کو ملتان کے ایک پروفیسر صاحب نے میتھو آرنلڈ سے مشابہت دے دی تو میری ایسی طبیعت خراب ہوئی کہ محفل
ہر نکل آیا۔ دوستیاں استوار کر کے رسالوں پر قبضہ کرنا ایک ایسا ٹرک کا رہے جو اپنے "مقابلے" کر کے کامیاب ہوتا ہے۔ کراچی میں یہ وبا زیادہ ہے۔ لاہور
کافی حد تک موجود ہے "سیپ" اور "تحریک" میں شمس الرحمن فاروقی کے مضمون دیکھیے جرات رندانہ کس طرح شور مچا مچا کر رسالوں پر قبضہ جا رہی ہے
۔ لوگ ہیں جو اپنی "گونگی" نظموں کی خاموشی کو لمبے لمبے مضامین سے پورا کرتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو پڑھے لکھے ہیں مگر بدقسمتی سے اچھے شاعر نہیں
۔ اس لیے جرات رندانہ مضامین کی مدد سے اپنی شاعری کے انداز کو رونق دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ساقی فاروقی صاحب کی کتاب کے اشتہار کے ساتھ ان کا جو شعر منسلک ہوتا ہے، بالکل بے اثر اور ناکارہ ہے خصوصاً دوسرا مصرع:

تو کالی گھٹا ہے تو برس کیوں نہیں جاتی

می انداز نے مصرع کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ ساقی فاروقی، اعجاز فاروقی شمس الرحمن فاروقی کے مضامین اور لمبے لمبے خطوط پڑھ کر توقع ہوتی ہے کہ نظمیں
ہوں گی۔ مگر جب نظمیں پڑھتے ہیں تو ہمیشہ دو چار ہاتھ لب بام رہ جاتا ہے یعنی جانے پہچانے فنون (۔۔۔) میں فہمیدہ ریاض کی نظموں اور باقی صدیقی کی
کے سوا مجھے کچھ پسند نہیں آیا (فیض کی نظم "بلیک آؤٹ" بھی)۔ تازہ شمارے (۔۔) میں احمد فراز کی نظم صحیح شاعری کا نمونہ ہے یعنی تاثر مکمل اور گہرا ہے۔
پر پہنچ گئی ہے۔

دیکھا آپ نے حضرت اقبال کے اس شعر کو:

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے

لکھا ہے تو پیسرغا بافہمی پر مبنی ہے۔ یہ تصویر سے تجرید نہیں ہے۔ اور غزل کا محبوب بھی تجریدی نہیں ہے۔ اس کا سراپا صاف نظر آتا ہے۔ مرقع چغتائی ہی
دیکھیے۔ آپ کی بات ایسی ہے جیسے ہمارے بعض علما اشتراکیت کے غلبے سے متاثر ہو کر کہہ دیا کرتے ہیں کہ اسلام بھی اشتراکیت ہے
میں نے سنجیدہ ہو کر یہ سطر لکھی ہیں۔ ایسے مضامین کے پیچھے کوئی تعمیری خلوص نہیں ہوتا۔ صرف اپنی علمیت اور انفرادیت کا رعب گانٹھنا ہوتا ہے۔
ب مضمون نے ایک آدھ بھی تنقید کی کتاب پڑھی ہوتی تو کبھی ایسا "منطقی مضمون" نہ لکھتے۔

سید حامد علی جابر (ملتان)

تمھی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

ایک صاحب ایک ادیب کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار نہایت بے باک انداز میں کر رہے تھے کہ ان کے پاس بیٹھے ہوئے ایک اور صاحب
نے ٹھوکا دیا اور اشارہ کیا کہ حضرت تو سامنے ہی تشریف فرما ہیں۔ ان صاحب نے فوراً ان الفاظ میں معذرت طلب کی "میں بہت شرمندہ ہوں اور
معذرت خواہ۔ مجھے علم نہ تھا کہ آپ یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ اگر مجھے علم ہوتا اور رائے کا اظہار بھی ضروری ہوتا تو میں یقیناً اظہار تو اسی رائے کا کرتا
لیکن یہ نہ ہوتے"

شہریار کی کتاب "اسم اعظم" پر حضرت سیف زلفی کا تبصرہ پڑھ کر مجھے یہ واقعہ یاد آگیا۔ یقیناً تبصرے کی موجودہ شکل ادارتی قطع و برید کے بعد نکلی ہوگی اصل تبصرہ تو نہ جانے کیا چیز ہوگا۔

شہریار ایک ذہین فن کار ہے اور شاید سیف زلفی صاحب کو بھی اس سے انکار نہ ہو۔ مجھے اعتراف ہے کہ صرف ذہانت کے بل بوتے پر فن کار عظیم فن کار نہیں ہو جاتے۔ اس کے لئے مسلسل محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے جو شفقت کی حد و دچھونے لگتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جناب سیف زلفی شہریار کی ریاضت فن سے مطمئن نہ ہوں لیکن اس بے اطمینانی کا اظہار ایک ادیب کی زبان میں کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح ہم اسے فن میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں کر سکتے" تبصرے کا آخری فقرہ نہ ہوتا۔ اگر تنقید اور تبصرہ نگاری اسی چیز کا نام ہے تو اس تبصرے پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا جا سکتا ہے "سیف زلفی کے اس تبصرے کی اشاعت اردو کے تنقیدی ادب میں کوئی گراں قدر اضافہ نہیں ہے۔ لیکن میں کسی حال میں یہ نہیں کہوں گا کیونکہ اس طرح مجھے خود اپنے آپ سے بھی پوچھنا پڑ جائے گا کہ "تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟"

شہریار، جہاں تک میں اسے پا سکا ہوں ایک ذہین باشعور اور باصلاحیت فن کار ہے۔ اس کی شخصیت، اس کے فن کے توسط سے، جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں، کافی جاذبیت رکھتی ہے اور اپنے فن کے آئینے میں وہ ہر طرح ایک متوازن شخصیت نظر آتا ہے جو ایک اچھے فن کار اور ایک اچھا مستقبل رکھنے والے فن کار کے لئے بنیادی ضرورت ہے۔

شہریار کی غزل کے بارے میں اچھی رائے رکھنے والا قاری سیف زلفی کا یہ فقرہ پڑھ کر چونک اٹھتا ہے "لیکن غزلوں میں ایک "نئے تغزل کی لے" ہمیں اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی۔ غزل کو شہریار آگے نہیں بڑھا سکے جبکہ ان کے بعض ہمعصر ان سے آگے نظر آتے ہیں" کسی نقاد کا قول ہے کہ "عظیم شاعری روایت سے کم از کم انحراف سے جنم لیتی ہے۔" انحراف بہرحال ضروری ہے۔ اسی خفیف سے انحراف میں فن کار کو اپنی شخصیت، اپنا مخصوص لہجہ اور اپنا انداز فکر سب کچھ سمو دینا پڑتا ہے اور یہ پل صراط سے بخیر و عافیت گذرنے سے کم مشکل نہیں مجھے معلوم نہیں سیف صاحب غزل کو آگے بڑھانے سے کیا مراد لیتے ہیں۔ غزل کی موجودہ شکل اتنی "غیر اطمینان بخش" نہیں۔ اگر جدید "روایتی شاعری" کے بنے بنائے سانچوں میں خوبصورت الفاظ ٹھونس ٹھونس کر شعر پر شعر "تیار" کرنا غزل کو آگے بڑھانا ہے تو یقیناً شہریار غزل کو آگے نہیں بڑھا سکا۔ لیکن وہ اردو غزل کی عظیم روایات کو جو اسے درد، میر، غالب، حالی، اقبال، ندیم اور فیض سے ملی ہیں، آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہے، اس سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے لیکن یہ فتویٰ صادر کر دینا کہ "شہریار غزل کو آگے نہیں بڑھا سکے" درست نہیں۔

اس بے دلیل فتوے کے ساتھ ایک اور اعلان بھی فرمایا گیا ہے کہ شہریار کے بعض ہم عصر شعرا، اس سے آگے نظر آتے ہیں۔ اس کے لئے صرف یہ عرض ہے کہ اردو ادب پوری رفتار سے تخلیق ہو رہا ہے اور شہریار بھی اس میں اپنا حصہ بخوبی ادا کر رہا ہے۔ لیکن موجودہ تخلیقی ادب کا معیار کیا ہے؟ کون آگے ہے اور کون پیچھے؟ اس کا فیصلہ میں یا سیف صاحب نہیں بلکہ وقت کرے گا کیونکہ ہم دونوں فرد ہیں اور وقت افراد کی طرح متعصب نہیں ہوتا۔

خالد احمد (لاہور)

فنون ۳ کا جائزہ

زیر نظر "فنون" ۳ کی سب سے بڑی کشش شفیق الرحمٰن کا طویل مختصر افسانہ "دجلہ" ہے۔ خود "دجلہ" کا لفظ ہمارے شعر و ادب میں ایک تہذیبی علامت کی حیثیت رکھتا ہے اور ہمارے افسانہ نگار نے مشرق و مغرب کی قدیم و جدید تہذیبوں کے ملاپ اور ارتقا کی طویل داستان اس خوبصورتی سے

ہے کہ وہ صفحے پڑھ جانے کے بعد بھی قاری کا ذوق و شوق اور تجسس ختم نہیں ہوتا۔ کسی عظیم ناول کے مواد کو ایک مختصر افسانے میں سمیٹ دینا شفیق الرحمٰن
ہی فنی کا رہی کا کام تھا۔ ان کے لطیف مزاج، روانیٔ طبع اور وسعتِ بیان نے کہانی کو گیسوئے دجلہ کی طرح تابدار بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ
شیخ کا افسانہ "لمحے کی بات" ہمارے اُن پڑھے لکھے نوجوانوں کے المیے کا اظہار ہے جو اپنی مغرب زدگی کے باعث حقیقی زندگی سے کٹ کر ہم نے
اطمینان کی دولت سے محروم ہو چکے ہیں۔ محمد خالد اختر کی ہم جولی بھی کامیاب جا رہی ہے جس کے انگریزی لہجے میں اپنی سرزمین کی باتیں سنانا
ب اسلوب ہے۔ رفیعہ فصیح احمد کا انشائیہ بہت پُر لطف اور ذہانت آمیز ہے۔ ان کے انشائیے کے بعد ماہرین لسانیات پر کامیاب طنز کرنے کا
ئی پہلو باقی رہا ہو۔ شعری تجربے پر غور و فکر کرنے میں قاضی عبدالقادر کی محنت قابلِ داد سہی لیکن میری ناقص رائے میں آمد یا آورد کی پہلی
ی شہادت خود شعر ہوتا ہے۔

پروفیسر محمد احمد خاں اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے تجریدی مصوری کے بارے میں آپ کی رائے سے بجا طور پر اتفاق کیا ہے۔ آپ نے ان مصوروں
ول و فعل کے جس تضاد کا ذکر فرمایا ہے۔ ہمارے کچھ افسانہ نگار اور شاعر بھی اس تضاد کا شکار ہو چکے ہیں۔ حیرت ہے کہ اپنے معاشرے اور
ں سے بے تعلق رہنے کے باوجود یہ لوگ فنکار ہونے کے دعویدار ہیں۔ آپ نے اپنے مضمون میں فنی تجرید کا جو صحیح مفہوم واضح کیا ہے خدا
ے اسے سمجھ پائیں۔

حصۂ شعر میں مختار صدیقی نے اپنی نظم "حجا بات" میں اور احمد فراز نے اپنی نظم "روزنا جرمن نژاد" میں خیال کی جدت اور اظہار و بیان کے حسن کا
اج پیش کیا ہے۔ الیاس عشقی اپنی نظم کا نثر کٹ بروج" اگر رومن رسم الخط میں لکھتے تو قارئین کو پڑھنے میں آسانی ہوتی۔
یز۔ وں میں شکیب مرحوم کی آخری غزل اُن کی فنی عظمت کا بھرپور اظہار ہے۔ مظفر علی سید، شہزاد احمد اور سیف زلفی کی غزلیں اس بے بنیاد
ی نفی کرنے کے لئے کافی ہیں کہ صنفِ غزل میں ہمعصر عہد کے خیالات اور مسائل پیش نہیں کئے جا سکتے۔ آپ کی غزل کا مقطع ؎

اب تو پتھر کے زمانے سے نکل آؤ ندیم
اب تو سوچوں کے تصادم سے شرارہ نکلا

ر صورت بکھر دیتا ہے جو اپنے عہد کی قدروں کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں۔ مو جد کے پُر معنی سرورق نے شمارے کا ظاہری حسن دوبالا کر دیا ہے۔
عیارِ ی پرچوں کے اس قحط میں "فنون" کا وجود شائقینِ ادب کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ قارئین کو ہمعصر ادبی اقدار سے
آگاہ رکھنا ہمیشہ "فنون" کا نصب العین رہا ہے۔ "ہمارے شاعر" کے زیرِ عنوان آپ نے نئے شعراء کو قارئین سے ایک وسیع تر پس منظر میں
لے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا تھا وہ اسی نصب العین کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تھا لیکن اس کے بند ہو جانے سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے
عظیم نصب العین کہیں فن کاروں کی انا یا زیادہ کھلے لفظوں میں معاصرانہ چشمک کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔ لیکن مجھے یقین ہے آپ سے
دوبارہ اجرا کی درخواست کرنے میں تمام وابستگانِ فن میری ہمزبانی کریں گے اور اہلِ فن سے زیادہ وسیع النظر کون ہو سکتا ہے؟

زاہد فارانی (لاہور)

فتح محمد ملک ـــــ محمد خالد اختر ـــــ محمد کاظم
آغا سہیل ـــــ سیف زلفی ـــــ حُسین شاھد

تبصرے

دردِ آشوب

مصنف : احمد فراز — ناشر : کتاب نما، راولپنڈی

صفحات : ۲۴۰ — قیمت : پانچ روپے

یہ واقعہ ہماری ادبی اور تہذیبی تاریخ میں یادگار رہے گا کہ سن پچاس کے لگ بھگ ترقی پسند ادب کی تحریک اپنی مقبولیت کی انتہا پر تھی، حساس اور بے چین نوجوانوں کے لئے اس میں بے پناہ کشش تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ سانحہ بھی یادگار رہے گا کہ :

ہو گئے اپنے طراروں میں گرفتار آہو

یعنی اسی دور میں انجمن ترقی پسند مصنفین نے تنگ نظر ادبی آمریت کو نظریاتی استقامت کا پرفریب نام دیا اور قرار پایا کہ ترقی پسند رسائل اور جرائد میں نہ تو کسی غیر ترقی پسند شاعر کی ترقی پسند نظم شائع ہو گی اور نہ ہی کسی ترقی پسند ادیب کی کوئی تحریر غیر ترقی پسند رسائل میں بار پاسکے گی۔ آزادی اظہار کی خاطر قابلِ فخر اور بے مثال قربانیاں دینے والوں کی انجمن کی طرف سے آزادیٔ اظہار پر اس پابندی نے جس ادبی سیاست کو جنم دیا وہ بالآخر سیاسی ادب تک کی تخلیق میں حائل ہو کر رہ گئی۔ ہوا یہ کہ بسا اوقات ادب کے تازہ واردان کا استقبال کرتے وقت صرف ترقی پسندی پر قناعت کر لی گئی اور یہ نہ دیکھا گیا کہ موصوف ترقی پسند آخیرش میں شاعر بھی ہیں یا نہیں ـــــ اس پر مستزاد نقادوں کی سخت گیری۔ ما دشما تو کس شمار قطار میں ہیں، تحریک کے رہنما تک پر نیا قشوز والے عابد حسن منٹو ایسے جرم عائد کرنے لگے کہ ”ریس خانہ“ میں ندیم نے ترقی پسند موضوع کو ندیم کے انداز میں پیش کیا ہے گورکی کے انداز میں نہیں لہٰذا افسانہ غیر معیاری ہے ــــ نتیجہ یہ کہ اس فضا میں فنی سفر کا آغاز کرنے والے نوجوانوں کے شعری مجموعوں کو دیکھیے تو ان کی ترقی پسندی پر تو آپ کوئی حرف نہ رکھ سکیں گے البتہ ان میں بیشتر کے شاعر ہونے میں آپ کو کلام ہو گا۔ ان کے موضوعات، لفظیات اور تلازمات رسمی ہیں تو جذبات، تاثرات ساختہ اور مصنوعی۔ یہ نئی روایتی شاعری ہے جو سنہ ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند شاعری کی روایت میں غیر تخلیقی مشقِ سخن سے آگے نہیں بڑھتی۔ یہ شاعری فرد کی شاعری نہیں تحریک کا منشور ہے۔ یہاں ہمارا واسطہ آدمی سے کم اور امیر شہر اور غریب شہر، سرمایہ دار اور مزدور کے سکہ بند تصورات کے بندھے بندھائے مجموعوں سے زیادہ۔ ان نوجوانوں کے پاس بھی وہ جذبہ ہے، پاور جو ادعائیت ہے شائستی رقت ہے جو سردار جعفری جیسے مکمل اور کٹر ”ترقی پسند“ بزرگوں کے پاس ہے اور وہ نہیں جو ندیم اور فیض کے پاس ہے یعنی انفرادی فکر اور اپنا اندازِ بیان، اور جسے آپ ایک لفظ میں سمیٹنا چاہیں تو شاعری کہہ سکتے ہیں۔

له پاکستان کونسل کے راولپنڈی مرکز میں مصنف سے ملنے کی تقریب میں احمد فراز کی موجودگی میں پڑھا گیا۔ (تبصرہ نگار)

...اشعار پہ مجھے ندیم کے بہت سے اشعار یاد آتے ہیں، چند ملاحظہ فرمائیے:

نارسائی کی قسم اتنا سمجھ میں آیا — حسن جب ہاتھ نہ آیا تو خدا کہلایا

دور سے دیکھا تو پلکوں تک سے سلگنے لگے — جیسے جیسے تم قریب آتے دھواں بنتے گئے

یا

تو اتنا قریب ہے کہ تجھ سے — میں پوچھ رہا ہوں، تو کہاں ہے

یوں تو اس جلوہ گہِ حسن میں کیا کیا دیکھا — جب تجھے دیکھ چکے، کوئی نہ تجھ سا دیکھا

ساری دنیا ہمیں پہچانتی ہے — کوئی ہم سا بھی نہ تنہا ہوگا

اپنے بزرگ معاصرین سے استفادے کا ذکر کر کے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سلیم احمد کے لفظوں میں ان کی اچھی شاعری اچھی شاعری کو آواز دیتی ہے۔ غزلوں میں تازگیٔ احساس اور رعنائیٔ خیال کی جو کیفیات فراز نے پیدا کی ہیں وہ ان کی فنی انفرادیت کا بہترین ثبوت ہیں:

اس اک چراغ کی لو چبھ رہی ہے آنکھوں میں — تمام شہر جو روشن تو اپنا گھر دیکھوں

ذکر اس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فراز — گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

وہ خار خار ہے، شاخِ گلاب کی مانند — میں زخم زخم ہوں پھر بھی گلے لگاؤں اسے

ان اشعار میں اس رنگِ سخن کے جدا جدا نقوش موجود ہیں جسے ہم آگے چل کر "رنگِ فراز" کہہ سکیں گے بشرطیکہ فراز موجود کامیابیوں پر قناعت کیے بغیر خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رکھ سکیں۔

فتح محمد ملک

دو پاٹن کے بیچ

تصنیف: رضیہ فصیح احمد — اشاعت: مکتبۂ ادبِ جدید، لاہور

صفحات: ۲۱۵ — قیمت: پانچ روپے

یہ رضیہ فصیح احمد کے سولہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں سے دو افسانے "فنون" کی بعض گزشتہ اشاعتوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ کسی افسانے سے ...لطف اندوز ہونے کی سب سے اچھی صورت تو یہی ہے کہ اسے علیحدہ کسی رسالے میں پڑھا جائے۔ ایک مجموعے میں شامل ہونے کے ساتھ شامل ہوتے ہوئے افسانے ایک ...پہیلی کا سا تاثر دیتے ہیں جس میں ایک تماشائی تصویروں کے جنگل میں کھو کر رہ جاتا ہے اور جب وہ پوچھتے ہیں تو کی اس نمائش سے وہ میاں باہر نکل کے باہر آتا ہے ...اس کے ذہن پر کسی ایک فن پارے کا مستقل اور دیرپا تاثر نہیں ہوتا، بلکہ سب فن پاروں کا ایک ملا جلا مبہم سا تاثر ہوتا ہے جو آسمان کی دھنک کی طرح تھوڑی

وکر زائل ہو جاتا ہے ــــــ لیکن جب تک افسانوں کی اس دنیا میں افسانے لکھے جاتے رہیں گے، ان کے مجموعے بھی چھپتے رہیں گے، اور پھر افسانوں کو رسائل و
رماق میں چھوڑ دینا بھی تو انھیں گویا نا و نسیان کے گھاٹ اتار دینا ہے۔ کتنے ایسے افسانے ہوں گے جو سے ہم نے اپنی زندگی کے کچھ لمحوں کو فروزاں کیا تھا اور
ہمارے ذہن کے کسی گوشے میں ابھی تک جلتی ہے بلکہ وہ ہم سے ہمارے بچپن کی طرح ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے ہیں، ہم ان سے شاید پھر کبھی دوچار نہ ہوں گے ــــــ
بہر حال میں سب سے اچھا طریقہ وہ ہے جو میں نے اس کتاب کے مطالعہ کے لئے اختیار کیا۔ کچھ اوپر دو سو صفحوں کی یہ چھوٹی سی کتاب اگر میں لے کر بیٹھ جاتا تو یہ
جاڑوں کی ایک لمبی، ٹھٹھری ہوئی رات میں میرا ساتھ دے سکتی، لیکن میں نے ایسا نہ کیا، بلکہ اس کتاب کو سات آٹھ روز یا شاید اس سے بھی زیادہ عرصے
پڑھا، میں اس سے ایک افسانہ پڑھ لینے کے بعد کتاب کو بند کر دیتا اور کچھ وقت اس افسانے کی دنیا میں، اس کے کرداروں کے ساتھ گھل مل کر بسر کرتا،
کی میچ کے وقفے کے دوران تماشائی میدان میں آکر کھلاڑیوں کی پیٹھ تھپکتے اور ان سے ہمدردی جتانے لگتے ہیں ــــــ میں نے محسوس کیا کہ یہی طریقہ
ان کے پڑھنے کا موزوں ترین ہے، اور اس طرح پڑھے ہوئے افسانوں کے متعلق انسان اگر کوئی بات کرے تو وہ اتنی ہلکی اور سطحی نہیں ہوگی ــــــ

لیکن کیا آپ یہ طریقہ افسانوں کی ہر کتاب کے ساتھ برت سکتے ہیں؟ ــــ میرے خیال میں یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ افسانے
تنے اچھے اور کامل مسرت پہنچانے والے نہ ہوں کہ آپ کچھ لمحے ان کی دی ہوئی اس خوشی میں گزارنا پسند کریں! ایک کامل مسرت کا ــــ چاہے اس کا
انسان کے کسی حاسّہ سے ہو ــــ ہمیشہ ایک "مابعد" (AFTERMATH) ہوتا ہے، جس میں انسان پر دیر تک ایک ٹھنڈا، دھیما سرور، اور ڈھلان پر سے
اترنے کی کیفیت طاری رہتی ہے (ڈاکٹر وین ڈی ویلڈی کے مسرت کے گراف بھی اسی حقیقت کے عکاس ہیں) ــــ اور مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک
"دو ہاتھ کے بیچ" کے افسانے واقعی اتنے اچھے اور کامل مسرت پہنچانے والے ہیں!

رضیہ فصیح احمد ہمارے موجودہ ادبی منظر میں اب تک مشاہیر کی دوسری صف کی ممتاز شخصیتوں میں سے تھیں۔ یعنی کسی ادبی مجلے کے پسِ سرورق ان کا نام
لکھے ہوئے ناموں کی اگر پہلی دہائی میں نہیں تو دوسری دہائی میں ضرور نمایاں ہوتا تھا۔ اب ان کے ناول "آبلہ پا" کے انعام پانے کے بعد مشاہیر
کی صف اوّل میں ان کا دعویٰ قائم ہو جانا چاہئے لیکن اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ اب تک سیکنڈ ریٹ تھیں! وہ یقیناً فرسٹ ریٹ تھیں، اور ان کے افسانوں
کی کتاب کو پڑھ کر کوئی بھی انھیں سیکنڈ ریٹ نہیں کہہ سکتا۔

ان صفحات میں اس سے پہلے بھی افسانوں کی بعض کتابوں کا جائزہ دیا گیا ہے۔ ان کتابوں میں یہ خاص بات یہ دیکھنے میں آئی تھی کہ وہ ہمیں اپنے گرد پوش پر، اور
اپنے موضوع اور مصنف کے متعلق بہت کچھ بتاتی تھیں۔ ان میں سے کسی کتاب کے فلیپ پر کوئی افسانہ نگار قلعہ نما افسانے کی قلمرو میں داخل ہوتے ہوئے دکھایا
گیا، کسی کے سرورق پر آفتاب و ماہتاب کے طلوع ہونے کا منظر کھینچا جاتا، اور بعض دوسری کتابوں کے آغاز میں ادب کی بزرگ ہستیوں کے پیٹھ تھپکنے والے مقدمے
بھی میں ادب اور اہلِ ادب کو بہت سہانے مستقبل کی خوش خبری سنائی جاتی ــــ وہ ہمارے رویے کی ایک صورت تھی، اور ہمارے رویے کی ایک دوسری
صورت اس کتاب میں ہمارے سامنے آئی ہے جس میں کوئی مقدمہ یا پیش لفظ نہیں ہے، ادب کے حال یا مستقبل کے بارے میں کوئی اظہارِ خیال نہیں، اور گرد پوش
پر کوئی تحریر نہیں جس سے کم از کم اتنا ہی پتہ چل سکتا کہ رضیہ فصیح احمد کون ہیں، کب سے لکھ رہی ہیں، اور کیا لکھ رہی ہیں؟ ان کی اب تک کی تخلیقات کے بارے
میں پرکھ رکھنے والوں نے کیا رائے قائم کی ہے! یہ معلومات بہت ضروری اور بنیادی ہیں جنھیں ایک قاری کسی کتاب کے سرورق پر ہمیشہ دیکھنا چاہتا ہے
ہمارے ناشر صاحبان نے خدا جانے کیوں یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ یا تو اپنی کتاب کے سرورق پر کاغذی اور فضائی کرتبوں کا مظاہرہ کریں گے اور ستائش اور تحسین
کی زبان چھوڑ دیں گے، ورنہ پھر پورا سرورق خالی رکھیں گے جس سے کتاب اور اس کے مصنف کے ہر طرف، اور پس منظر میں دور دور تک تاریکی چھائی رہے گی
ان دو انتہاؤں کے درمیان ایک اعتدال کی راہ بھی ہے جو کاش ہمارے ناشر حضرات انگریزی مطبوعات میں اور خاص کر پیپر بیک کتابوں کے سلسلوں میں، اکثر

کی جانب اور پشت پر ملاحظہ کر سکتے!

اب کچھ باتیں ان افسانوں کے متعلق! ——— "دو پاٹن کے بیچ" کے افسانوں میں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ ہے ان کا تنوع۔ ان کے موضوع عام روش سے کچھ ہٹ کر ہیں۔ افسانے تو یہ سب آج کے اسی معاشرے سے لئے گئے ہیں جس میں ہم آپ اور رضیہ فصیح احمد رہتے ہیں لیکن ان کی فضا اور کردار ایک سے نہیں ہیں اور افسانہ نگار کہیں بھی اپنے آپ کو دہراتی ہوئی محسوس نہیں ہوتیں۔ پھر ان کے موضوعات میں ایک نیا پن اور تازگی ہے۔ عورتوں کے افسانوں کا ماحول عموماً گھریلو ہوتا ہے اور ان کے کرداروں کا عمل زیادہ تر چار دیواری کے اندر ہی واقع ہوتا ہے۔ باورچی خانے میں، تخت پوش پر یا ڈرائنگ روم میں! رضیہ کے افسانوں میں اس کے برخلاف کھلی ہوا اور دھوپ کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اور ان کے کردار ایک وسیع اور کھلے ہوئے کینوس پر اپنی چلت پھرت دکھاتے ہیں۔ وہ پہاڑوں پر آتے جاتے ہیں، سینما دیکھتے ہیں، سیر و تفریح کرتے ہیں، کاریں چلاتے ہیں! ——— ہمارے یہاں جب اچھی انگریزی فلموں کی نمائش ہوا کرتی تھی تو ہم یہ دیکھ کر متحیر ہوتے تھے کہ ان میں سے کسی ایک فلم کی تھیم بھی دوسری فلم سے میل نہیں کھاتی تھی (یہ ایجنٹ 007 وغیرہ کے زمانے سے پہلے کی بات ہے!!) اور ہم سوچتے تھے کہ مغرب میں زندگی کیونکر اتنی ہمہ رنگ اور گوناگوں ہو سکتی ہے! افسانوں کی یہ کتاب ہمیں یاد دلاتی ہے کہ زندگی ہمارے یہاں بھی، باوجود اپنی ظاہرا سادگی اور یکسانیت کے، کچھ کم گوناگوں نہیں ہے، سوال صرف آنکھیں کھلی رکھنے، اور اس زندگی کو قریب سے دیکھنے کا ہے!

ایک دوسرا وصف ان افسانوں میں ان کی فنی پختگی اور ان میں کہانی کہنے کا وہ سیدھا اور قدرتی اسلوب ہے جو شروع سے آخر تک چلا گیا ہے۔ افسانہ نگار نے کہیں بھی تکنیک کے کرتب دکھانے کی کوشش نہیں کی، نہ افسانوں کے اسلوب کو خواہ مخواہ گہرا، پُر اسرار اور شاعرانہ بنانا چاہا ہے۔ اور نہ ان میں کہیں بلا ضرورت شعور کی رو (Stream of consciousness) دکھائی ہے۔ ان کے پلاٹ اصل زندگی کے بہت قریب اور قابل تسلیم قسم کے ہیں۔ ان میں کوئی ڈرامائیت نہیں، کوئی تیزی و تندی نہیں، کوئی [illegible] نہیں! اس کے باوجود ان کی کہانیاں دلچسپ اور گرفت کرنے والی ہیں! اور ان میں سارا کمال رضیہ فصیح احمد کے کہانی کہنے کی اس غیر معمولی صلاحیت کا ہے جو انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے اور جس کے بغیر کوئی افسانہ نگار افسانہ نگار نہیں بن سکتا۔

اس کتاب میں بعض افسانے بلا شبہ شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ چاہے کسی زبان میں لکھے جاتے ان کا شمار منتخب افسانوں میں ہی ہونا تھا۔ ان میں "دو پاٹن کے بیچ"، "پچھوا"، "ریکھی ماٹی"، "غم نصیب"، "کبھی شعلہ کبھی شبنم"، "پامسٹ" اور "ماموں" شامل ہیں۔ کچھ دوسرے افسانے بیشک ان سے کمتر ہیں لیکن ان کو پڑھتے ہوئے بھی آپ کو افسانہ نگار کی خامکاری یا ناپختگی کا کہیں احساس نہیں ہوتا۔ فن کا ایک کم سے کم معیار ان میں بھی قائم ہے۔ کہانی کہنے کے انداز میں وہی دل کشی ہے، شعور و احساس میں وہی خلوص اور متوازن کیفیت ہے اور اسلوب میں وہی بے ساختگی اور بے ریائی ہے۔ ایسے افسانوں میں اگر کچھ کمی محسوس ہوتی ہے تو اس پہلو سے کہ ان میں کہانی کی اٹھان اور اس کے نقطۂ عروج، یا اس کے عروج اور اس کے مابعد میں وہ توافق قائم نہیں ہو پاتا جو ہمارے نزدیک فن کا کم سے کم تقاضا ہے اور جس سے کہانی ایک یونانی مجسمے کی طرح خوش قامت اور متناسب الاعضا دکھائی دیتی ہے! کہیں نقطۂ عروج کچھ زیادہ ہی سیدھا اور سپاٹ ہو کر رہ گیا ہے، جیسے "بدلہ" میں! ——— کم از کم میری حسِ انتقام اس بات سے بالکل آسودہ نہ ہوئی کہ میرے رسالے اور کتابیں دوسرے ڈبے میں اس جھگڑالو مسافر کے سر پر گر گر کر ناس ہو رہے ہیں جس کو چھوڑ کر میں گاڑی کے دوسرے ڈبے میں چلا آیا تھا۔ اور کہیں ابن کا مابعد (anticlimax) ضرورت سے زیادہ مختصر اور تشنہ محسوس ہوتا ہے، جیسے "پچھتاوا" میں! اس کہانی میں آخری پیراگراف نہ ہوتا تو بالکل نہ ہوتا۔ کہانی ——— خطوں کے سٹائل میں ——— ختم ہوتی:

"نہیں اصلی ہے۔" مدنان نے اپنی بات کے جواب میں پھول کی ساری پتیاں نوچ کر قالین پر پھیلا دیں اور خود کسی سوچ میں ڈوب گیا ———!

یا پھر اس کے اندر جذباتی ہلچل برپا کرنے والی کیفیت کچھ زیادہ ہونی چاہئے تھی۔ اس پیراگراف پر اگر مصنفہ کچھ زیادہ محنت کرتیں تو اس کا صلہ انہیں ضرور ملتا، اور ان کی کہانی کا تاثر زیادہ گہرا اور دیرپا ہو جاتا! ــــــ لیکن ایسے افسانے بھی اپنے لطف کے بغیر نہیں، اور رضیہ فصیح احمد کے کہانی لکھنے کا انداز ایسے افسانوں میں بھی قاری کی دلچسپی کو کہیں سست اور خوابیدہ نہیں ہونے دیتا۔

گجرات کے شاہ دولہ کے چوہے ہم سب نے دیکھے ہوں گے۔ چھوٹے چھوٹے سروں والے، اور پنکھے جیسے کانوں اور کھلی ہوئی باچھوں والے یہ بچے ہمارے خانقاہی ماحول کا ایک ایسا عجیب اور المناک نمونہ ہیں جن کے متعلق میں جتنا بھی سوچتا ہوں سوائے دکھ اور گھٹن کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ رضیہ فصیح احمد نے ایک ایسے ہی بچے کے کردار کا مطالعہ بڑی ہمدردی اور حقیقت پسندی کے ساتھ اپنی کہانی "چوہا" میں کیا ہے۔ اس کہانی کی شہلا کو خاندان کے باہمی تعلقات کی وجہ سے ایک چوہے اجی کے ساتھ ہمدردی ہو جاتی ہے۔ اور اس عجیب الخلقت لڑکے کا خیال اس کے ذہن میں اس طرح بس جاتا ہے کہ جب وہ آرٹ کی کلاس میں اپنے ہاتھ سے پہلی مورت بنا کر پیش کرتی ہے تو وہ غیر شعوری طور پر اسی چوہے ہی کی ہوتی ہے۔ انس اور ہمدردی دو طرفہ ہوا کرتی ہے چنانچہ اجی بھی شہلا کی ذات میں دلچسپی لینے لگتا ہے، اور ــــ شاید اسی واسطے سے ــــ اُس کا جنسی شعور بیدار ہو جاتا ہے، اور وہ بیچارا اس عجیب بے نام جذبے کے ہاتھوں بڑی ٹھوکریں اٹھانے لگتا ہے:

جب وہ سکول جانے کے لئے نکلتی تو اجی مات کے کپڑوں میں سڑک پر کھڑا سکول جانے والی لڑکیوں کو حسرت سے دیکھا کرتا ..... جب وہ پاس سے گزرتی تو وہ اسے ہاتھ اٹھا کر اپنی موٹی آواز میں سلام علیکم کہتا سکول کے اندر کی سڑک پر چلتی ہوئی وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی وہیں کھڑا رہتا، پھر لوٹ آتا۔ شروع میں نہ اس کے پروگرام میں ایسی باقاعدگی تھی، نہ شہلا نے اس طرف دھیان دیا، مگر اس کے آٹھویں کلاس میں پہنچتے پہنچتے اجی کا سڑک پر کھڑے ہو کر سلام علیکم کہنا اور پھر گرجے میں آ کھڑا ہونا اتنا ہی اٹل ہو گیا جتنا سورج کا طلوع ہونا "

یہاں سے نوٹرے ڈیم ڈی پیرس کے اُس کوزہ پشت کی کہانی شروع ہوتی ہے جو باوجود اپنے جسمانی عیب اور بدصورتی کے اپنے سینے میں ایک سچا اور اُجلا دل رکھتا تھا اور اس میں ازامیرالڈا کی خانہ بدوش جوانی نے آ کر ڈیرا ڈال دیا تھا ــــ ایک دن جب ایک ناعاقبت اندیش ہمسائی نے اجی اور شہلا کی موجودگی میں اجی کی شادی کا ذکر اس کی ماں کے سامنے چھیڑا تو وہ جیسے مسرت سے بے قابو ہو گیا:

"وہ خوشی کے جنون میں اس کی طرف اشارہ کرکے پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور پنکھے کی طرح کھڑے ہوئے کان مارے خوشی کے سرخ ہو گئے تھے، اور وہ مارے شرم کے گلنار ہو گئی تھی۔ سب کے ہنس پڑنے پر وہ کیسی بے تحاشا اٹھ کر وہاں سے بھاگی تھی! . . ."

لیکن اس کہانی کی ازامیرالڈا کسی ایسے المیے سے دوچار نہیں ہوتی اور نہ اس کی خاطر کوزہ پشت کو جیتے جی اس کی نعش کے پہلو میں خاک ہونا پڑتا ہے۔ اس میں حالات کچھ مختلف رخ پہ چلتے ہیں جب اس چوہے کا یہ ناآسودہ جنسی جذبہ مرض کے دوروں کی خطرناک صورت اختیار کر جاتا ہے تو شہلا مالی قربانی دے کر اور ساتھ ہی اپنے خاندان کی نیک نامی کو خطرے میں ڈال کر اس کے لئے ایک کرائے کی عورت کا بندوبست کرتی ہے، اور اس طرح اسے بے موت مرنے سے بچا لیتی ہے۔

شاہ دولہ کے ان چوہوں میں جنسی جذبہ واقعی اتنا صحتمند اور توانا ہوتا ہے یا نہیں، اس کے متعلق تو ماہرین ہی بہتر جانتے ہوں گے (یا خود شاہ دولہ کے چوہے!) میرے سامنے البتہ ایک مثال ایسی ضرور ہے جس سے افسانہ نگار کے مشاہدے کی تائید ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے شہر میں ایک آوارہ مزاج عورت ایک ایسے دیوانے لڑکے کی طرف مائل ہو گئی جسے نہ اپنے کپڑوں کا ہوش ہوتا تھا اور نہ ستر ڈھانپنے کا، اور رفتہ رفتہ اپنی تدبیروں سے اسے اس قابل بنا دیا کہ جنسی اعتبار سے وہ اسے ایک بالکل نارمل مرد کا سا کام دینے لگ گیا ــــ یہ قدرت کی نیرنگیاں اور طرفہ کاریاں ہیں! قدرت اپنی باتوں میں بعض اوقات کتنی ناقابلِ فہم لگتی ہے!

زکی مائی، کم نصیب (غم نصیب) اور ماموں اس مجموعے میں کرداری کہانیاں ہیں۔ زکی مائی ایک ایسے بُت کے گھنے اور پاش پاش
کہانی ہے جو پارسائی کے چبوترے پر رکھا ہوا تھا۔ وہ یوں تو ایک ادھیڑ عمر کی ایک بیوہ تھی بھرپور تو پ والی لیکن اس کا رنگ روپ ابھی تک قائم تھا۔ اس کا
لڑکیوں کو باہر لانا لے جانا اور ان کی نگرانی کرنا۔ وہ اپنا یہ فریضہ جس تندہی اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ انجام دیتی تھی۔ اس نے ماؤں اور خالاؤں
دلا دیا تھا کہ ان کی لڑکیاں اگر محفوظ رہ سکتی ہیں تو صرف مائی زکی کے ہاتھوں میں ۔

"کسی کا دوپٹہ سر سے ڈھلک جاتا تو جھٹ ٹوک دیتی لیکن ادھر بیچ وکھیتی زکی کر پہلے ہی بڑی صفائی سے دوسری طرف مونڈ دیتی۔ راہ چلتے
لوگوں کی نگاہیں ٹٹولتی چلتی کہ کہیں کنواری بالیوں کے چہرے کا بال تو نہیں کئے ہیں...."

ایک دفعہ گھر میں ریلوے کے چوکیدار کی شوقین مزاج بیٹی زبیدہ کوئی چیز لینے آئی تو اس نے اسے دور ہی سے دیکھ کر سب کو چوکنا کر دیا کہ مشتبہ
ہے، اس سے احتیاط لازم ہے —— لیکن حالات نے جو پلٹا کھایا تو مائی زکی اچانک کچھ عرصے کے لئے گم ہو گئی۔ لوگوں نے یہی سمجھا کہ وہ اپنے
سے لڑ کر کہیں باہر چلی گئی، اور پھر ایک دن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اسی مشتبہ کردار کی لڑکی زبیدہ نے گھر میں آکر یہ خبر سنائی کہ "مبارک ہو بی بی جی، ا
ہوا ہے!" —— مسز گرنڈی کے ان نمونوں کی ہمارے معاشرے میں کوئی کمی نہیں ہے، اور کوئی نہیں جانتا کہ ان کی ظاہر شرافت اور پرہیزگ
پیچھے ان کے دل کی دنیا میں کیسے کیسے طوفان اُٹھتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ المیہ ان میں سے کسی بدنصیب مائی زکی کے ساتھ ہی پیش آتا ہے کہ وہ
اس کے متعلق کوئی ایسی ویسی بات سننا گوارا ہی نہیں کرتی تھیں۔ آخر کہنے لگیں " اُف توبہ! اگر ایمان کی بات کہوں گی، اس کی چال بیوہ عورتوں

"کم نصیب" کو میں ایک کرداری کہانی اس لحاظ سے کہتا ہوں کہ اس میں افسانہ نگار نے ریستوران کے ایک بیرے کے کردار کی تصویر
طویل اور مسلسل مونولاگ میں اتاری ہے۔ کسی کردار میں زندگی بھرنے کا اس سے زیادہ کارگر اور موثر طریقہ اب تک دریافت نہیں ہوا کہ آپ ا
گفتگو ٹھیک اسی کے الفاظ و لہجے میں نقل کر دیں۔ اور یہ تو پوری کہانی ہی بیشتر بیرے کی گفتگو پر مشتمل ہے۔ اس لئے اس میں بیرے کا کردا
اور وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے وہ ہمارے اردو ادب میں ایک نادر چیز ہے۔ میں اس کہانی کو رضیہ کی شاہکار کہانیوں میں شمار
کہ اس میں انہوں نے فنِ محاکات MIMICRY کا ایک ٹور دی فورس پیش کیا ہے۔

"بیروں والی بھرتی تو چھوکر نہیں کی انہیں، کرمنٹ میں ادھر تو کرمنٹ میں ادھر۔ ایک کو کھانا دیا، ایک کو پانی دیا، کسی کو کھالی
ہوں ہاں میں ٹرخایا، مگر غیلان پہ سولے جی صاب، آیا صاب، اور ابھی لایا حجور کے سوا اور کچھ نہیں —— اور یہ بڑھئی لوگ
صاب لوگ کی کدر کرنا جانتے ہی نہیں۔ کوئی نیا پسنجر آئے گا تو میں یوں دانت کھول کر کھسی دکھاؤں گا جانو میرا سگا ہو اور
اسے لوگ ماتھے پر یوں بل ڈالے رہیں گے جو میں گھنڈے جیسے سوکھی لکڑی میں بل پڑ گیا... .

..... اور مجھے اس وخت یوں لگا جیسے میں گھیراں کو کبر میں اتار کر اس کے اوپر مٹی ڈال کر آیا ہوں۔ کتنے ہی دن مجھے اپنے
تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ صاب ہی چلتے وخت مجھے اس ہوٹل میں رکھا گیا تھا۔ اس جمانے میں اس کا مالک ایک بھلا مانس تھا، میں نے
اس سے چھٹی لی اور گھر میں بڑا رہا پھر آہستہ آہستہ کرکے ہوٹل جانا شروع کر دیا کہ کسی طریوں وخت کٹے....."

ماموں، ایک ایسے بخیل اور پیسہ پیسہ جوڑنے والے بزرگ کی داستان ہے جن پر سو روپے کی رقم جمع کرنے کی دھن بُری طرح سوار تھ
کے لئے انہیں کیسے کیسے جتن کرنے پڑے اور کتنی ہی محرومیوں میں سے گزرنا پڑا۔ لیکن جب وہ ہرا نوٹ ان کے ہاتھ میں آیا تو زیادہ دن ا
نہیں، اور انہیں اپنی جدائی کا ایسا داغ دے گیا کہ اس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ماموں کا یہ کردار جس بصیرت اور جزئیہ نگاری کے سا

وہ ایک اول درجے کی چیز ہے۔ اگر ایسے افسانے آج بھی لکھے جا رہے ہیں تو ہمارے لئے افسانہ نگاری کے حال یا مستقبل کے بارے میں مایوس ہونے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

ٹائیٹل سٹوری کا عنوان بھگت کبیر کے اس شعر سے لیا گیا ہے:

چلتی چکی دیکھ کر دیا کبیرا رو   دو پاٹن کے بیچ آ ثابت گیا نہ کو

اور کہانی میں اس انوکھے تجربے کا بیان ہے جس میں انسان اپنے کسی گذرے ہوئے خیال یا ماضی میں دیکھے ہوئے کسی خواب کو ہو بہو حقیقت کی شکل میں اپنے سامنے دیکھتا ہے اور یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ کسی فلم کا دیکھا ہوا منظر دوبارہ دیکھ رہا ہو۔ یہ تجربہ میں نے ایک دفعہ اپنے لڑکپن میں کیا تھا جب شام کو سکول کی گراؤنڈ میں کھیلنے کے لئے ہندو زرگروں کے ایک محلے میں سے گذر کر جاتا تھا۔ ایک دن اس محلے میں سے گذرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک ہندو لالہ اپنے مکان کی ڈیوڑھی سے نکلا۔ اسے دیکھتے ہی معاً میرے جی میں آئی کہ اب یہ باہر نکل کر پہلے اپنے ہاتھ والی تھیلی نیچے رکھے گا، پھر اپنی پگڑی ٹھیک کر کے باندھے گا، اور پھر کواڑ بند کر کے قفل لگائے گا۔ اس نے باہر نکل کر بعینہٖ یہی کیا اور اسی شکل میں کیا جو میرے ذہن میں پہلے سے تھی ——— میں نے اُسے ایسا کرتے ہوئے شاید پہلے خواب میں دیکھا تھا ——— یہ کیا فینامینا ہے؛ اور کیوں کر انسان کو پیش آتا ہے؛ میرے پاس اس بارے میں کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ اس معاملے میں شاید مشہور انگریزی مصنف اور ادیب جے۔ بی۔ پریسٹلے کی تازہ کتاب Man and Time کوئی رہنمائی کرتی ہو، جس میں اس قسم کے متعدد واقعات مع تصویروں کے، تاریخ کے صفحات سے نکال کر پیش کئے گئے ہیں۔ افسوس ہے میں یہ کتاب پوری طرح نہیں پڑھ سکا۔

رضیہ فصیح احمد کا آبائی وطن مراد آباد ہے، اور ان کے خود نوشتہ حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلیمی کیریر بہت شاندار رہا ہے۔ بی۔ اے کے امتحان میں وہ یونیورسٹی میں اول آئی تھیں۔ عجیب بات ہے کہ درسی و تعلیمی قسم کی ذہانت ان کے ادبی و تخلیقی عمل میں بھی بدستور قائم رہی۔ ورنہ ان دو قسم کی ذہانتوں میں یہ تسلسل کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں اول آنے والے اور وظیفہ پانے والے طلبہ ادب اور فنون لطیفہ میں اکثر گھامڑ ثابت ہوتے ہیں ——— اردو ان کی مادری زبان ہے، اور ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنے مدعا کے اظہار کے لئے زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑتی ——— یا اس کاوش کا اثر ان کی تحریر میں دکھائی نہیں دیتا، جو اس سے بھی زیادہ بڑا کمال ہے۔ ان کے ان افسانوں میں (اب میں اپنے آپ کو دہرانے لگا ہوں) کوئی پرشور کیفیت نہیں، جذبات کی کوئی گرماگرمی نہیں، ان کے پلاٹوں میں رونگٹے کھڑے کرنے والی کوئی ڈرامائیت نہیں، اور نہ ان میں جھٹکا پہنچانے والے اچانک موڑ [illegible] ہیں ——— اس کے باوجود یہ بہت سیدھی سادی، اور دل لبھانے والی کہانیاں ہیں جو بغیر کسی شعوری کوشش اور بناوٹ کے ایک دھیمے دھیمے لب و لہجے میں سیانے پن کے ساتھ کہی گئی ہیں۔

عورتوں کو مژدہ ہو کہ ناول اور افسانے کی صنف میں ان کے اندر ایک اور پختہ اور منجھی ہوئی قلمکار کا اضافہ ہوا ہے۔ ۔ ۔ وہ دن دور نہیں جب اس میدان میں ان کا پلڑا مردوں کے مقابلے میں بھاری ہوگا ——— عصمت، خدیجہ، ہاجرہ، جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو، واجدہ، الطاف فاطمہ، بانو قدسیہ، رضیہ فصیح احمد، فرخندہ لودھی، خالدہ حسن، ندرت الطاف، فہمیدہ ریاض ——— کہیں یہ صورت آج ہی تو واقع نہیں ہو چکی؟ کوئی بتا سکتا ہے!

محمد کاظم

جرمنی نامہ

تصنیف: حکیم محمد سعید دہلوی
صفحات: ۵۸۴

اشاعت: مکتبۂ جدید لاہور
قیمت: پندرہ روپے

دس برس ہوتے ہیں طب کی دنیا کے دو گرامی قدر بھائی حکیم محمد سعید اور ان کے برادر بزرگ عبدالحمید دہلوی یورپ کی سیاحت پر نکلے۔ یہ سفر جو پچیس دن بیس گھنٹے تیس منٹ میں ختم ہوا تھا، ہمارے لئے بے حد مفید ثابت ہوا: اس سفر کے مقاصد کی فہرست میں دس امور شامل تھے، جن میں سے نو طب اور (دوا) سازی اور قدرتی اور نفسیاتی علاج کے اداروں سے متعلق تھے۔ دسواں مقصد "اسلامی مطالعے اور تحقیق کے مرکزوں کو جہاں یہ موجود ہیں" دیکھنا تھا۔ اس سفر کی داستان کا لکھنا چھوٹے بھائی کے حصے میں آیا، اور انھوں نے اس کی پہلی جلد "یورپ نامہ" (صفحات ۵۰۰) میں چار ملکوں یعنی ترکی، یوگوسلاویہ، آسٹریا سوئٹزرلینڈ کی سیاحت کا قصہ بیان کیا۔ مغربی جرمنی چونکہ ایک ہمہ گیر ملک تھا جس میں اس سفر کے سب مقاصد کی تکمیل ایک ہی جگہ ہو گئی تھی، اس لئے اس ملک کے لئے انھوں نے ایک الگ جلد مخصوص کی جو جرمنی نامہ (صفحات ۵۸۴) کے نام سے اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس کے بعد ہالینڈ، برطانیہ، فرانس، سپین، یونان، اٹلی اور ایران کے ممالک رہ جاتے ہیں، جن کے بارے میں اگرچہ قطعیت کے ساتھ کوئی اقرار اس کتاب میں نہیں کیا گیا، تاہم یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ان باقی ملکوں کے سفر کے حالات میں دو مزید کتابیں، کم و بیش اتنے ہی حجم کی، بآسانی شائع ہو کر قارئین کی تسکین کا باعث بن سکیں گی۔

"جرمنی نامہ کو عام سفرنامے کی طرح محض تفریح طبع کا ذریعہ نہ سمجھا جائے"۔ بڑے بھائی اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں "بیانیہ واقعات کے پس منظر میں روحِ عمل ایمانی انداز میں کارفرما دکھائی گئی ہے اس سے سبق حاصل کیا جائے"۔ تو یہ کتاب گویا عام سفرناموں کی طرح نہیں ہے جن کا مقصد سب سے پہلے مسرت اور تفریح کا پہنچانا ہوتا ہے اور اس کے بعد کچھ اور؛ بلکہ یہ ایک متین اور عالمانہ چیز ہے جس میں "گذشتہ عالمگیر لڑائی کے اس پٹے ہوئے مہرے کی حیرت انگیز پیش قدمیوں کا احوال بیان کرکے پسماندہ قوموں کو عبرت دلانا مقصود ہے۔"

برطانیہ میں ایک مفکر فرانسس بیکن گزرا ہے جس کا زمانہ سولہویں صدی کا آخر اور سترھویں صدی کا آغاز تھا۔ اس نے جہاں اور موضوعات مطالعہ، دوستی، کتابیں وغیرہ پر اس نے ناقابل تقلید اسلوب میں مضامین لکھے، وہاں سفر کے موضوع پر بھی اظہار خیال کیا۔ اس مضمون میں وہ لکھتا ہے "(سفر) میں جن چیزوں کا مشاہدہ کرنا لازم ہے وہ یہ ہیں .... شہروں کی دیواریں، قلعے، فصیلیں، گودیاں، ساحل، آثار قدیمہ، کھنڈرات، کتب خانے، دا(رالعلوم)، مکانات، باغات، بارود خانے وغیرہ ...." آگے چل کر وہ اپنے اس نظریے کی مزید وضاحت کرتا ہے "باقی رہیں .... دعوتیں، شادی بیاہ کی رسوم، ماتم کی تقریبات، اور اس طرح کے دوسرے تماشے .... تو سیاحوں کو ان کی طرف زیادہ دھیان نہیں دینا چاہئے!" —— تو سفر کا ایک یہ ڈھنگ جو بیکن نے تجویز کیا ہے۔ اس طرح کے سفر میں جب ایک مسافر کسی اجنبی ملک میں وارد ہوتا ہے تو اس کے مشاہدے کا موضوع اس ملک کی عمارت اور زراعت اور کھنڈر اور بارود خانے قرار پاتے ہیں اور ان در و دیوار کے درمیان بسنے والی انسانیت اور اس کی خوشیاں اور محرومیاں اور ا(منگیں) یہ سب کچھ اس کے موضوع سے خارج رہتا ہے۔ خدا جانے اس میں بیکن کی اس رائے کا کہاں تک اثر تھا کہ اس کے بعد بہت عرصہ (قریبا اڑھائی سو سال) تک مغرب میں جب بھی سفرنامہ لکھا گیا، اسی انداز میں لکھا گیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں جا کر البتہ سفرناموں کے ایک نئے ڈھنگ کا (آغاز) ہوتا ہے جس میں بیکنی فلسفہ و حکمت کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سیاح کے مشاہدے کا مرکز انسان قرار پاتا ہے اور اجنبی ملک کے در و دیوار اور گلیاں اور کھنڈر اور بارود خانے اس انسان کی مرکزی کہانی کے پس منظر اور ماحول (SETTING) کا کام دیتے ہیں۔ ایک انگریز چارلس ڈاوٹی نے صحرائے عرب میں دس مہینے کا طویل عرصہ پرخطر سیاحت اور مہم جوئی میں گذارا، اور عرب کے بدوؤں کی زندگی، ان کے گرد ا

ں کا مطالعہ ان کے اندر رہ کر کیا۔ اس نے اپنے اس مطالعے کی داستان جب اپنی کتاب "ٹریولز ان عربیا ڈیزرٹا" میں بیان کی، تو پڑھنے والے سفرنامہ کی
ٔ نوکھی اور دلچسپ صورت سے آشنا ہوئے۔ اس کتاب نے جو آج بھی سفری ادب میں ایک اونچی اُن گھڑ چٹان کی سی عظمت کے ساتھ موجود ہے
مہ لکھنے کی ایک ایسی طرح ڈال دی جس پر لوگ آج تک چل رہے ہیں، اور جس کی مقبولیت، مروز زمانہ کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی زمانے میں
ادیب آر۔ ایل اسٹیونسن نے بھی دو یا تین سفرنامے اپنے سحر کار اسلوب میں لکھے اور یہ ثابت کر دیا کہ مشاہدے کی سچائی اور بیان کا حسن ایک سفرنامے کو بعض
ت ناول اور افسانے سے بھی زیادہ پُرلطف اور دلآویز بنا دیتا ہے، حالانکہ اس میں حقیقت اور واقعے کا بیان ہوتا ہے —— انگریزی ادب میں ان
ہر دوں کے بعد ایسے ناموں کی ایک بہت ہی طویل فہرست ہے جنہوں نے اسی انداز میں اپنے سفروں کی کہانیاں لکھیں اور سفری ادب کو مالا مال کر دیا۔
ی ایچ لارنس، ہڈسن، ٹاملنسن، نارمن ڈگلس، ڈی ایچ لارنس، آلڈس ہکسلے، فریا سٹارک، ولیم ایمل سمتھ، پیٹر فلیمنگ، ایکرلی، مارٹن، لارنس ڈ ریل، ایلن
یگل، پیٹرمین اور الفرڈ ٹھیسیجر —— یہ کچھ نام ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس لڑی کا دوسرا سرا معلوم نہیں، اس زمانے میں وہاں ایک معمول سا بنا ہوا ہے کہ ہر بڑا
ب، چاہے اس کا اصل میدان ناول ہو، یا افسانہ یا شاعری، ایک یا دو سفرنامے بھی ضرور لکھتا ہے اور اس صنفِ ادب کو پُرمایہ بنانے میں اپنا حصہ ادا
ہے۔ سمرسٹ مام، ایولن واہ، گراہم گرین، ارنسٹ ہیمنگوے، آڈن، ایشروڈ، جے۔ بی پریسٹلے، ان سب نے سفرنامے لکھے ہیں اور ان میں اپنے اپنے خاص
بہت عمدگی سے مظاہرہ کیا ہے —— ایسا لگتا ہے کہ سفر و سیاحت کی خواہش انسان کی ایک فطری خواہش ہے۔ اور ہم سب کی جلد کے نیچے ایک مارکوپولو
دا ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کتنا کچھ بندوبست کر سکتے ہیں۔

سفرنامہ ڈاوٹی اور سٹیونسن سے چل کر زمانۂ حال تک پہنچتے پہنچتے ادب کی ایک ایسی موضوعی اور داخلی [illegible] صنف بن چکا ہے جس
ب فن کار کو اپنی ذات کے اظہار کے لئے سب سے موثر، راست اور نسبتاً سہل ذریعہ میسر آتا ہے۔ ناول اور افسانے میں وہ اس اظہار کے لئے اپنے تخلیق کئے ہوئے
ں کا محتاج ہوتا ہے، شعروں میں اسے قافیہ، وزن اور فنی کمال کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے، لیکن سفرنامے میں وہ جب اپنے قارئین کے سامنے آتا ہے تو اپنی نظر کے زاویے
اقعات کے انتخاب و ترتیب میں، اور ان پر اپنے ڈھیلے ڈھالے اور بے تکلف انداز کے تبصرے میں، نیز سفر میں ملنے والے انسانوں کے ساتھ اپنے رویے
—— ان سب باتوں میں وہ اپنی دلچسپیوں اور امنگوں، اپنی حسرتوں اور نارسائیوں اور اپنی حیرت و استعجاب کے ساتھ اس طرح کھل کر سامنے آتا ہے کہ ہم
، والے اس کے ذہن اور ضمیر کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے بالکل قریب ہو جاتے ہیں اور اس کی رفاقت میں ایک اُنس محسوس کرنے لگتے ہیں۔ افسوس ہے میں نے
ے کی اس صنف کا تذکرہ کرتے ہوئے صرف مغربی ادب کے ناموں کے حوالے دیئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرز کے سفرنامے نے ابھی مشرق کی ادبیات
واج نہیں پایا۔ مشرق کی دوسری زبانوں کا معاملہ بھی کچھ مختلف نہیں ہے اور ہماری اردو زبان میں تو حالت یہ ہے کہ اس میں "سفرنامہ" کو اب تک گویا صنف
ابھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ اردو زبان میں سفرنامے یوں بھی کم لکھے گئے ہیں، اور پھر اس جدید طرز کے سفرنامے میں تو یہ زبان بالکل مفلس اور تہی دامن ہے۔ اگر یہاں
ہ جرأت مندانہ اظہار رائے کی اجازت دی جائے تو میں یہ کہوں گا کہ اردو سفرنامے کی اس طرز کا آغاز کرنے والے محمد خالد اختر ہیں (خدا نہ کرے کہ اس کو
بھی انھیں پر ہو)۔ ان کے دو چھوٹے سفرنامے "کاغانی مہم" اور "سواتی مہم" فنون کے قارئین کی نظر سے ضرور گذرے ہوں گے۔ لیکن میرے خیال میں بہت
ں نے ان کا اس طرح سے نوٹس لیا ہوگا کہ سفرنامہ لکھنے کا یہی وہ انداز ہے جو آج مغرب کے ادب و فن کی دنیا میں پسندیدہ اور مروج ہے، اور
ن اپنی رفتار کے ساتھ وہاں اضافے ہو رہے ہیں کہ عجب نہیں یہ صنف ایک دن اپنی وسعت اور مقبولیت میں ناول اور افسانے کی حریف ثابت
وں محمد خالد اختر سے پہلے بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس طرز میں طبع آزمائی کی ہے جن میں ہمارے نزدیک شوکت تھانوی کا "سفرنامہ" سب سے کامیاب ہے گو
نھوں نے اپنے سفرنامے کے لئے جو زبان اور اسلوب اظہار اختیار کیا ہے وہ اس کے لئے موزوں نہیں ہے۔ دوسرے ان کی کتاب میں اس بے تکلفی اور

والا پن کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے جو اس صنفِ ادب کی جان ہوتی ہے۔ سفرنامہ دیکھنے میں ایک سہل چیز ضرور ہے لیکن دراصل یہ ایک بہت ہی نازک صنفِ
تخلیق ہے۔ اس میں اگر شعور و خود آگہی اور تکلف و آورد کی تھوڑی سی بھی آمیزش ہو جائے تو اس سے اس کی لطافت اور مہک بُری طرح متاثر ہوتی ہے۔
اختر ریاض الدین کا "سات سمندر پار" بھی یوں ایک سفرنامہ تھا لیکن اسے مفید اور معلوماتی بنانے کی ایک شعوری کوشش نے بہت نقصان پہنچایا اور وہ ایک ایسی
کتاب بن کے رہ گئی جس میں جاپان، روس، مصر وغیرہ ممالک کے متعلق کچھ دلچسپ معلومات تھیں ـــــ ایک ذہین مسافر کی جمع کی ہوئی معلومات!

حکیم محمد سعید صاحب کا یہ سفرنامہ بھی جیکسن کے مسائل میں ہے لیکن اس کا انداز عالمانہ اور سنجیدہ ہے۔ ملک جرمنی کے متعلق ایک قاری کے ذہن میں جتنے سوال
پیدا ہو سکتے ہیں ان سب کا شافی جواب اسے اس سفرنامے میں مل جاتا ہے۔ مثلاً پہلے دن کی کہانی کے آغاز میں ہی قاری کو جرمن زبان میں ہفتے کے دنوں کے ناموں
کی گنتی سے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ آگے چل کر جہاں یہ فقرہ آتا ہے کہ "چند منٹ بعد ریل گاڑی چلی اور فراٹے بھرنے لگی" وہاں اس کے فوراً بعد "ریلوے نظام" کے عنوان سے
ساڑھے تین صفحوں پر مشتمل ایک پورا مضمون ہے جس میں جرمنی میں ریلوے کے ارتقاء کی ساری تاریخ آ جاتی ہے اور جس سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ "اس ملک میں پہلی ریلوے لائن ۱۸۳۵ء
میں تعمیر ہوئی جو نورمبرگ سے لے کر فرتھ تک صرف چھ کلومیٹر لمبی تھی"۔ جرمنی کے بڑے بڑے شہر ہائیڈل برگ، فرینکفرٹ، بون، دسلڈورف، برلن اور ہمبرگ،
تاریخی عمارتوں، عجائب گھروں، یونیورسٹیوں، گرم پانی کے چشموں اور شفاخانوں سمیت پوری تفصیل کے ساتھ اس سفرنامے میں بیان ہوئے ہیں اور یوں لگتا ہے
حکیم صاحب اس بارے میں کوئی بھی معلومات اور کوئی بھی تفصیل اپنے قاری سے چھپا کر نہیں رکھنا چاہتے۔ ہائیڈل کے قیام کے دوران ہمارے سیاحوں کا گزر چند ایسے
گرجا گھروں کے پاس سے ہوا جو سب کے سب گوتھک طرز میں بنے ہوئے تھے۔ اس پر حکیم صاحب کا ذہن گوتھک کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور وہ ہمیں اس طرزِ تعمیر
کے بارے میں اپنی معلومات سے بہرہ ور کرتے ہیں۔ گوتھک طرزِ تعمیر وہ ہے جو روم اور بازنطین کے آرائشی طرزِ تعمیر کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آیا جس میں
سادگی کی کوشش کی جاتی تھی کہ اس میں تصنع بھی نہ ہو اور اس کے ساتھ وہ جاذبِ نظر بھی ہو۔ یہ گوتھک کیوں کہلایا؟ اس کے متعلق حکیم صاحب لکھتے ہیں "میرا خیال
ہے کہ اس طرزِ تعمیر کے لئے جو اصطلاحی لفظ گوتھک وضع کیا گیا وہ شاید جرمن زبان کے لفظ گوتھا سے مشتق ہے۔ گوتھا جرمنی کے ایک علاقے تھورنگیا میں ایک چھوٹا سا
تھا"۔ اس طرح وہ قاری کی عملی دلچسپی کے لئے کتاب کے شروع میں یہ معلومات بھی بہم پہنچاتے ہیں کہ جرمنی میں ریلوں کے ہفتہ وار اور ماہانہ ٹکٹ جاری کئے جاتے
جنھیں ٹرمپ کارڈ کہا جاتا ہے۔ اگر آپ ایسا ایک ٹکٹ خرید لیں تو پورا ایک ہفتہ یا ایک مہینہ آپ بلا روک ٹوک جس گاڑی سے چاہیں اور جہاں چاہیں سفر کر سکتے

یہ سفرنامہ اگرچہ موضوعی انداز کا نہیں ہے تاہم اس میں ہمیں حکیم محمد سعید صاحب کی شخصیت کی کچھ جھلکیاں یہاں وہاں دکھائی دے جاتی ہیں۔ مسـ
ان کی پابندیٔ نماز، یورپ ریستوران میں کھانا کھاتے وقت حلال و حرام کے متعلق ان کی بے چینی، ہوٹل کے کمرے میں عورتوں کی تصویریں نہ پا کر ان کی راحت،
کمرے کے ذخیرۂ کتب میں سے صرف معلوماتی کتابوں کا انتخاب ("قصے کہانیوں اور ناولوں کی بجائے میں نے تاریخی کتابوں کا جائزہ لیا")، مغربی لباس سے نفـ
نفرت، اور حسن و عشق کی باتوں سے نابلد ہونے کا اعتراف ("حسن و عشق کے کوچہ و بازار میں اپنا گزر کبھی نہیں ہوا، اپنی زندگی اس منزل سے ناآشنا رہی ہے")
یہ ان کی شخصیت کا ایک رخ ہے جس میں حکیم صاحب اپنی شیروانی کے گلے کا بٹن بند کئے اور چہرے پر متانت قائم کئے رکھتے ہیں۔ کتاب میں بعض مقامات ایسے
بھی آتے ہیں جہاں حکیم صاحب کی طبیعت کچھ دیر کے لئے بشاش ہو جاتی ہے اور وہ اپنے گلے کا بٹن کھول کر اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے مقامات
پر پڑھنے والا چاہتا ہے کاش حکیم صاحب اس موڈ میں باتیں کرتے چلے جائیں لیکن اس کی یہ خواہش عموماً تشنہ رہتی ہے اور حکیم صاحب کی شخصیت کا آفتاب
ایک لمحے کے لئے اپنی چمک دمک دکھا کر پھر تکلف اور رکھ رکھاؤ کے بادلوں میں چھپ جاتا ہے۔ ہمارے ان سیاحوں کو ایک دن ایک شفاخانہ جراحی دیکھنے جانا
وہاں ایک خاتون پہلے سے ان کی منتظر تھیں۔ ہمارے سیاح پاکستانی روایت کے مطابق ذرا تاخیر سے پہنچے تو وہاں انھیں کچھ معذرت کرنی پڑی۔ حکیم صاحب
رہیں کہ اس کے جواب میں "جو جملہ نازک لبوں سے ادا ہوا اس کی کرختگی کو ہم دونوں بھائی اور معنی و مفہوم کو صرف محجوب سمجھ سکے تھے"۔ آگے انھی استقبال کرنـ

والی خاتون کے متعلق لکھتے ہیں "ان کا نام — میں یہ تو ہرگز نہیں کہوں گا کہ میری زبان پہ بار بار خدایا کس کا نام آیا — کیونکہ میں دو منٹ کے بعد بھی اس کا صحیح تلفظ ادا نہیں کر سکا ...... میں نے ان کی آنکھوں کی آنکھوں کی رعایت سے ان کا نام مس نرگس رکھ دیا۔ ہم نے لفظ فرزلین کے استعمال سے سمجھ لیا تھا کہ یا تو وہ یعنی مس صاحبہ ہیں ...... اور جب میں نے مطلب بیان کیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں، اور اس طرح ایک اور قسم کے غیر مرئی پھول ہوا میں بکھر گئے ..."

—— لیکن اس معاملہ میں زیادہ خوش فہم ہونے کی ضرورت نہیں۔ کتاب میں ایسے مقامات بہت شاذ و نادر ہونے کے برابر ہیں۔ ہمیں حکیم صاحب کو وہی کچھ سمجھنا چاہیے جو وہ خود چاہتے ہیں کہ ہم انہیں سمجھیں، اور جس کا بیان کتاب میں بیشتر جگہوں پر ملتا ہے :

اس کتاب کے فاضلانہ اور معلوماتی ہونے سے کسی کو یہ گمان نہیں ہونا چاہیے کہ یہ عالمانہ کتابوں کی طرح خشک اور غیر دلچسپ بھی ہے۔ جرمنی کے متعلق ہر طرح کی جغرافیائی، تاریخی اور معاشرتی معلومات کو جس طرح حکیم صاحب نے ترتیب دیا ہے اور اس کے لئے جو انداز بیان اختیار کیا ہے اس نے اس کتاب کو بہت دلچسپ اور قابل مطالعہ بنا دیا ہے۔ حکیم صاحب اہل زبان ہیں، اور ان کی تحریر میں لطافت اور چاشنی ہے، اور یہ ان کے اسلوب بیان کا اعجاز ہے کہ یہ بظاہر ضخیم اور معلوماتی کتاب پڑھنے میں بہت کم وقت لیتی ہے اور قاری کو کہیں بھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ کتاب میں فاضل مصنف نے کہیں کہیں ظرافت اور طنز کا عنصر بھی شامل کر دیا ہے۔ جہاں ایسے مقامات آتے ہیں وہاں قاری کی مضمحل ہوتی ہوئی دلچسپی پھر سے تازہ دم ہو جاتی ہے۔ جرمنی میں ایک جگہ کا نام "باڈن باڈن" ہے۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں :

"کسی طرح یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس چھوٹے سے شہر کے نام میں ایک ہی لفظ دو بار کیوں استعمال ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ شہر کی داغ بیل ڈالے جانے کے وقت یہ نام کسی ہکلے شخص نے تجویز کیا ہو۔ وہ صرف باڈن کہنا چاہتا تھا، لیکن اپنی معذوری کے باعث، جیسا کہ ہوتا ہے وہ اسے دو بار کہہ گیا۔ اور لوگوں نے جس طرح سنا، اختیار کر لیا۔"

ایک اور جگہ میونک کے عجائب گھر کے تذکرے کے بعد لکھتے ہیں :

"میرے دل نے دعا کی کہ کبھی پاکستان میں بھی ایک ایسی چیز قائم کی جا سکے۔ بلکہ اسے میونک کے عجائب گھر سے بھی زیادہ مضحکہ خیز انداز میں آراستہ کیا جائے۔ پاکستان میں مضحکات کی کمی نہیں ہے حتیٰ کہ یہاں کے بعض ارباب اقتدار کو ذرا سجا سنوار کر ایک خاص صورت میں بٹھا دیا جائے تو جرمنی کے مذکورہ عجائب گھر کے نوادر بھی بازی لے جائیں گے۔"

یہ باتیں انھوں نے غالباً ۱۹۵۸ء میں اپنے روزنامچے میں لکھی ہوں گی اس کے بعد حالات کیا سے کیا ہو گئے۔ اب شاید حکیم صاحب اپنی طنز کے اس انداز سے زیادہ خوش ہوں!!

اس کتاب کو پڑھ کر میں نے یہ تہیہ کیا ہے کہ میں اگر کبھی جرمنی گیا (جس کا فی الحال دور دور تک کوئی امکان نہیں) تو اپنے سفر میں جرمنی نامہ ضرور اپنے ساتھ رکھوں گا۔ اسے پڑھ لینے اور ہضم کر لینے کے بعد ہی جرمنی کی سرزمین میں قدم رکھوں گا۔ اس وقت مجھے کسی ٹرین میں سفر کرتے وقت یہ تک معلوم ہو گا کہ جس ریلوے لائن پر سے میں گزر رہا ہوں اس کی داغ بیل کس سن میں پڑی تھی اور یہ آہن جہاں گاڑی کو کھینچ رہا ہے کس قسم کا ہے اور اس کا رواج جرمنی میں کب پڑا —— جرمنی نامہ میں وہ سب کچھ ہے جو گائیڈ کی مختلف کتابوں اور رسالوں اور پمفلٹوں میں الگ الگ دیا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن جو حسن ترتیب اور خوبی بیان جرمنی نامہ میں ہے وہ سیاحت کی ان ہنگامی کتابوں کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے!

کتاب کی طباعت اور گٹ اپ اور سرورق میں مکتبۂ جدید نے ایک دفعہ پھر اپنے اعلیٰ معیار کا مظاہرہ کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک انڈکس بھی شامل ہے۔ میں یہاں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم اپنے اشاعتی معیار میں اب مغرب سے زیادہ پیچھے نہیں رہے!

حکیم محمد سعید دہلوی کی شخصیت کے متعلق میں نے کچھ نہیں کہا، اس لئے کہ وہ آج ہماری سوسائٹی کے مشاہیر میں سے ہیں۔ حکومت و اقتدار کے دائرے سے

اہر دہتے ہوئے بھی جو شخصیتیں محترم اور معزز اور نامور ہیں، ان میں حکیم صاحب نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ ہوائی اڈے پر کسی وزیر کا استقبال ہوتے ہوئے دیکھا، تو ایک صاحب سے دریافت کیا کہ یہ کون سے وزیر تھے۔ جواب ملا حکیم محمد سعید دہلوی! حکیم صاحب کو جو لوگ جانتے تھے وہ تو جانتے ہی تھے جو نہیں جانتے تھے وہ انہیں شام ہمدرد کی ماہانہ تقریبات کے حوالے سے جان گئے ہیں!

محمد کاظم

اسلامی ریاست (ایک تاریخی جائزہ)

تالیف: ڈاکٹر امیر حسن صدیقی — ترجمہ، اضافہ و حواشی: نثار احمد

اشاعت: جمعیت الفلاح، کراچی — صفحات: ۳۲۰ — قیمت: آٹھ روپے (مجلد)

یہ کتاب اپنی موجودہ شکل میں اسلامی تاریخ کے دو فاضلوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی نے جو تاریخ اسلام میں لندن یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی ہیں، اصل کتاب انگریزی ہی میں لکھی تھی جسے اب ان کے شاگرد رشید نثار احمد ایم اے نے نہ صرف اردو کا جامہ پہنایا ہے بلکہ اس میں مناسب حذف و اضافہ کر کے اس پر مفصل حواشی بھی لکھے ہیں۔ استاد کے اصل متن اور شاگرد کے حواشی کے ساتھ اب یہ کتاب اسلامی ریاست کی تاسیس اور اس کے عہد بعہد ارتقا کے موضوع پر ایک مفید اور اہم دستاویز بن گئی ہے۔ زمانہ حال کے تاریخی ذہن میں اسلامی ریاست کے بارے میں جو سوالات ابھرتے ہیں، ان سے ہماری تاریخ کی قدیم کتابیں اول تو بہت کم تعرض کرتی ہیں اور اگر ان کے اندر ان سوالات کے بارے کچھ مواد ملتا بھی ہے تو وہ اتنا بکھرا ہوا اور غیر مرتب ہوتا ہے کہ اس کو جمع کرنے کے لئے ہزاروں صفحات کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے۔ تین سو سے کچھ اوپر صفحوں کی اس مختصر سی کتاب میں "اسلامی ریاست" کے بارے میں تقریباً سب اہم سوالات کا جواب آگیا ہے۔ اور اس وجہ سے یہ کتاب ہمارے نزدیک اسلامی تاریخ کے موضوع پر ایک ایسی ٹکسٹ بک کا درجہ رکھتی ہے جس کا مطالعہ طلبہ کے لئے ناگزیر ہے۔

اسلام کے ظہور سے قبل عرب کی سیاسی حالت کیا تھی؛ اس کا ایک بنا بنایا جواب ہمارے نیم تاریخ داں اساتذہ طلبہ کو یہ دیتے چلے آ رہے ہیں کہ بس یہ افراتفری تھی، انارکی کا بازار گرم تھا، نظم و اجتماع کا تصور سرے سے غائب تھا، ہر بڑے سے بڑا کسی کے امر و اقتدار کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے ــــ حالانکہ یہ نری مبالغہ آمیزی ہے۔ اسلام سے پہلے جاہل عربوں کا ایک پورا قبائلی نظام تھا جس کے قواعد و ضوابط تھے، روایات تھیں، حقوق اور فرائض تھے پھر عرب میں بعض مجامع کا رواج تھا یعنی مختلف مقامات پر مختلف تقریبوں سے میلے لگتے تھے جن میں تجارت بھی ہوتی تھی، قبائل کے باہمی جھگڑوں کا تصفیہ بھی ہوتا تھا، شعر و سخن کی محفلیں بھی جمتی تھیں اور ان میں اشعر العرب (عرب کے سب سے بڑے شاعر) کا انتخاب بھی ہوتا تھا۔ اسی طرح عرب کی اپنی چھوٹی چھوٹی شہری مملکتیں موجود تھیں جن میں سے مکہ کی شہری مملکت نے قصیٰ کے عہد میں ایک ایسی ارتقائی شکل اختیار کر لی تھی کہ اس کی تفصیل پڑھ کر ہمیں آج بھی حیرت ہوتی ہے۔ اس مملکت میں اکیس عہدے تھے، حجابہ (کعبۃ اللہ کی نگرانی)، سقایہ (حجاج کے لئے پانی کی رسد کا انتظام)، رفادہ (خدمت اور اعانت کے متفرق کام)، ندوہ (اسمبلی)، مشورہ، قیادہ، سفارہ وغیرہ..... جن میں ندوہ یعنی اسمبلی کے محکمے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی کہ اس میں قریش کے تمام معاملات باہمی مشورے سے طے ہوتے تھے!

اس طرح کی معلومات جو تاریخ کو اپنے صحیح رنگ میں پیش کرتی ہیں، اس کتاب کی خصوصیت ہیں۔ کتاب کا اسلوب عالمانہ اور محققانہ ہے اور حقائق کو معروضی انداز ہی میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلامی ریاست کا سنگ بنیاد کب اور کہاں پڑا؛ اس ریاست کی خصوصیات کیا تھیں؛ اس کے ذرائع آمدنی کیا تھے؛ اس کا ڈھانچہ کس طرح کا تھا اس ڈھانچے نے عہد نبوی سے چل کر عباسی خلفا کے دور تک پہنچتے پہنچتے کیا کیا تغیرات دیکھے اور اس کی بنیادی خصوصیات میں کس طرح سے رد و بدل ہوتا چلا گیا۔

طرح کے تمام سوالوں کا جواب اس کتاب میں واقعات و حقائق کی روشنی میں ملے گا۔ اور چونکہ اس کتاب میں کوئی بات بھی سند اور تحقیق کے بغیر نہیں لکھی گئی اس لئے اس کے مندرجات کے بارے میں ہر طرح سے اعتماد کیا جا سکتا ہے!

بس ایک سوال قاری کے ذہن میں ایسا رہ جاتا ہے جس کا جواب شاید اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔ وہ یہ کہ ایسی اسلامی ریاست جو اپنی اصل خصوصیات کے ساتھ صرف پہلی صدی ہجری کے کچھ حصے تک قائم رہ سکی۔ اب اس زمانے میں اس کے قائم ہونے کے امکانات کس قدر ہیں؟ —— اس سوال کا جواب آج سے چند سال پہلے اتنا دھندلا اور غیر یقینی دکھائی نہیں دیتا تھا جتنا اب دکھائی دیتا ہے۔ اسلامی ریاست کو پھر سے برپا کرنے کے لئے جو تنظیمیں عالم اسلام کے اطراف میں اٹھی تھیں وہ اس زمانے میں عروج پر تھیں اور حالات کافی امید افزا تھے لیکن افسوس کہ وہ تنظیمیں قبل اس کے کہ وہ اپنی حریف طاقتوں کے ساتھ کسی فیصلہ کن مرحلے میں زور آزمائی کر سکتیں داخلی انتشار اور خود شکستگی کے ایک ایسے عمل سے دوچار ہو گئیں جس کے بعد کوئی تنظیم مشکل ہی سے اپنے آپ کو سنبھال سکتی ہے —— ایسی حالت میں یہ جذبہ تو بجا طور پر قابل تحسین ہے کہ اسلامی ریاست کے اس مطالعے سے قوم کے اندر اس ریاست کو پھر سے قائم کرنے کا عزم و ارادہ پیدا ہو، لیکن اس کی صورت کیا ہو گی اور اس کی طرف پیش قدمی اب تک کیوں اتنی دشوار اور لاحاصل ثابت ہوئی ہے؟ اس کے جواب کے لئے افسوس ہے کہ محض یہ جذبہ کوئی کام نہیں دیتا۔ ہمارے خیال میں وقت آگیا ہے کہ ہمارے اہل بصیرت اور مورخین و محققین اس امر کی تحقیقات کریں کہ اسلامی ریاست کے احیا کی خاطر اٹھنے والی تنظیموں کو یہ کیا عارضہ لاحق ہو گیا کہ تقریباً ان کے اندر تفرقہ و اختلاف کی ہوا چل پڑی، ان کے دو دو گروپ بن گئے اور ان کے کارکنوں کا جذبہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سرد پڑتا چلا گیا۔ یہ تنظیمیں گو اب بھی موجود ہیں اور کم از کم شاید ان کے ممبروں کی تعداد پہلے سے کہیں زیادہ ہو اور وہ بظاہر پھلتی پھولتی ہوئی دکھائی دیں لیکن عزم اور حوصلے میں بہت فرق ہو تا۔ ان کا اگر آپ قریب سے جائزہ لے کر دیکھیں تو محسوس ہو گا کہ وہ اب اسفل antechamber میں سے گزر رہی ہیں اور خون کی کمی کا شکار ہیں!

یہ بہرحال ایک سوال ہے جو اسلامی ریاست کے موضوع پر یہ مفید اور جامع تصنیف پڑھ کر میرے ذہن میں پیدا ہوا۔ یہی سوال دوسرے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر اس پہلو سے بھی کتاب میں۔ اس کے کسی اگلے ایڈیشن میں تھوڑی سی بحث ہو جائے تو میرے خیال میں کتاب کا یہ پہلو جو اس وقت تشنہ محسوس ہوتا ہے مکمل ہو جائے گا۔

اصل کتاب کا ترجمہ کافی اچھا ہے، اور اس پر ترجمے کا گمان کم ہی ہوتا ہے۔ کتاب میں البتہ کہیں کہیں بعض جملے ایسے بھی نظر آ جاتے ہیں جن میں زبان کا معیار وہ نہیں جو تاریخ کی ایک اچھے پائے کی کتاب کے لئے ضروری ہے۔ مثلاً

"یہ تو دنیا کے سب سے بڑے سیاست دان محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم تھے جنھوں نے حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے"

بلکہ کسی سکول کے طالب علم کا لکھا ہوا لگتا ہے نہ کہ اسلامی تاریخ کے کسی فاضل کا۔ پھر کہیں "جگھوں پر" یہی "کا استعمال دیکھ کر ہمیں مولانا ماہر القادری کی ایک بات کا خیال آیا۔ زبان کو صحیح اور آمیزش سے پاک رکھنے کے لئے "فاران" کے صفحات پر وہ جو جہاد ایک عرصے سے کر رہے ہیں، اس کا اثر کم از کم کراچی کے اسلام پسند حلقوں پر تو ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح شروع کے مقدمے میں ایک جملہ ہے: "جنھوں نے ترجمہ کے ابتدائی مسودہ کو تیار کیا" مجھے یقین ہے کہ مولانا اس عیب سے بھی خوش نہیں ہوں گے لیکن حیرت کی بات ہے کہ یہ بات ان کے شہر میں، اور شاید ان کے حلقے کے اندر ہوگ اس طرح کی عبارتیں بھی لکھ جاتے ہیں۔

لفظ خلافت کی بحث میں (ص ۷۰۱) ایک جگہ حاشیہ میں لکھا ہے کہ خلف عموماً برے معنی میں آتا ہے یعنی ناخلف (برے جانشین) جیسا کہ قرآن میں فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ —— عربی زبان سے کچھ مس رکھنے والے جانتے ہیں کہ عربی میں خلف اچھے اور برے دونوں معنوں میں آتا ہے اور اس کو برے کے ساتھ مختص کر دینا یا عمومیت حاصل نہیں ہے۔ ناخلف کی ترکیب بھی عربی نہیں عجمی ہے۔ عربی میں کہتے ہیں: وَخَلَفَهُ عَلَىٰ أَهْلِهِ فَأَحْسَنَ الْخِلَافَةَ (اس نے اہل و عیال پر اسے اپنا جانشین مقرر کیا، اور اس نے اپنی جانشینی کو بہت عمدگی سے نبھایا) اسی طرح ایک دوسرے موقع پر کہتے ہیں وَهُوَ خَلَفُ صِدْقٍ

وہ اپنے باپ کی صحیح جانشین ہے (یعنی جو صفات باپ میں تھیں وہ بیٹے میں بھی آگئیں) ـــــ علمی اور تحقیقی کتابوں میں کوئی ایسی بات کہنے سے احتراز ہی کرنا چاہیئے جس کے بارے میں پوری تحقیق نہ ہو! امید ہے کتاب میں زبان و بیان کی یہ چھوٹی چھوٹی فروگذاشتیں اگلے ایڈیشن میں دور کر دی جائیں گی

کتاب کی طباعت اور گٹ اپ بہت اچھا ہے اور ایک معیاری کتاب کے لائق! اسلامی ریاست کے موضوع پر اس کتاب کو ایسے نوٹس (NOTES) کا مجموعہ سمجھنا چاہیئے جو اس کے مصنف اور حاشیہ نگار نے برسوں کے مطالعۂ تاریخ سے اکٹھے کئے ہوں گے۔ علم کے صحیح قدر دان جانتے ہیں کہ ایسے نوٹس کتنے قیمتی اور لائق تحفظ ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس کتاب کی قیمت پانچ سات روپے ہو یا آٹھ روپے درحقیقت کچھ بھی نہیں ہے! **محمد کاظم**

ناولوں کی کھیپ

۱. دور تہائی محفل	ذکاء الرحمٰن	〃
۲. کیا وہ ناچار ہی تھی	عثمان علیم	کتاب منزل لاہور
۳. قربانی	مہدی علی صدیقی	〃 〃 〃
۴. دیدۂ تر	عابدی جعفر	〃 〃 〃
۵. انکار	عابدی جعفر	〃 〃 〃
۶. نوشاد۔ ایک معاشرتی ناول	انجم پرواز	چودھری اکادمی لاہور
۷. داغوں کی بہار	اختر سلیمی	حسن کار اشاعت گھر لاہور

اور بہت سے دوسرے ناول جو چھپ چکے یا چھپنے والے ہیں

ہمارے نوجوان امنگ رکھنے والے ناولسٹوں میں کیا خرابی ہے؟ آخر اتنے برے ناول ـــ یا آپ کے الفاظ میں ـــ لکڑی کے ناول ـــ کیوں لکھے جاتے ہیں؟ کیا یہ عجیب نہیں کہ اردو میں پچھلے پندرہ بیس برس میں صرف ایک دو ناول ایسے لکھے گئے ہیں جنہیں صحیح معنی میں ناول کہا جا سکتا ہے، اور جن کے کردار جیتے جاگتے اور قابل یقین لگتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر شخص میں ایک ناول ہے لیکن ہر کوئی ناول نہیں لکھ سکتا۔ ناول لکھنے کے لئے زندگی کا وسیع اور گونا گوں تجربہ، زرخیز اور گہری قوت تخیل، فراواں تخلیقی جودت اور کہانی کہنے کی قدرتی صلاحیت ضروری ہیں اور بہت تھوڑے لوگ ان صفات کو حاصل کر پاتے ہیں۔ کوئی صرف خواہش کرنے سے موپساں، طالسطائی یا ہارڈی نہیں بن سکتا۔ ہم سب البتہ اپنے نام کو جلی حروف میں ایک کتاب کے سرورق پر چھپا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم سب ابدی حیات پر اپنی کمند ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ ہم سے بعد میں آنے والے یہ جان سکیں کہ ہم بھی کبھی اس راستے پر سے گذرے ہیں۔ ہمارے ناولسٹوں کے ساتھ یہی مصیبت ہے۔ وہ ادبی آسمان پر تارے بن کر چمکنا چاہتے ہیں اور اس خواہش سے تلملائے جاتے ہیں کہ ادب کے شاہسواروں میں ان کا شمار ہو۔ مجھے اس خواہش سے پوری ہمدردی ہے۔ میں نے بھی اپنی خوابوں میں موپساں سے زولا تک ہیں اور راسے کھائل کیا ہے۔ میں نے بھی اپنا نام کئی شاہکاروں کی جلدوں پر سونے کے حروف میں دمکتا ہوا دیکھا ہے۔ مگر خواہش سے مراد تکمیل نہیں۔ سالوں کی اذیت کوشی کے بعد میں حقیقت کی اس کڑوی گولی کو نگل سکا کہ میں ناولسٹ نہیں بن سکتا کہ میری قسمت میں روشنیوں کے نیچے سٹیج پر ظاہر ہونا نہیں لکھا۔ بلکہ یہ کہ میں ان گیلری میں بیٹھے ہزاروں تماشائیوں میں سے ہوں جو تالیاں پیٹتے اور واہ واہ کر کے تماشے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو جاننے کے بعد میں اپنے تماشائی کے رول پر قانع ہو گیا اور مزے کی نیند سونے لگا۔

مگر یہ سچ ہے کہ قوت کے بغیر کوئی منزل پر پہنچ بھی نہیں سکتا۔ اس لئے میں ان ناولسٹوں کے : رہرو کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ ان کی امنگ کی میرے دل میں قدر ہے۔ ان کے ناول خاصے بھدے اور بھونڈے اور بناوٹی ہیں مگر اس میں حرج ہی کیا ہے ناول لکھنا ایک معصوم بے ضرر شغل ہے اور اس سے کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اگر ناول برا یا غیر دلچسپ ہے تو تم اسے ختم کر سکتے ہو اور اپنے آپ کو بہلانے کے لئے کچھ اور کر سکتے ہو۔ ایسا کرنے سے ناول لکھنے والے کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا بھی کوئی خدشہ نہیں۔ اسے یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ سیکڑوں میل دور ایک پڑھنے والے نے اس کے عظیم الشان ناول کو لائق توجہ نہیں جانا۔ اور اگر اسے کسی طرح یہ پتہ لگ جائے تو وہ یقیناً تمہاری کور ذوقی پر دست تاسف ملے گا اسے یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ اس نے برا ناول لکھا ہے سب ناول ان کے لکھنے والوں کے نزدیک شاہکار ہوتے ہیں۔ اس طرح ناول نویس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس کا نام ناول کے سرورق پر سرخی میں اپنی آب و تاب دکھاتا ہے اور وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ میرا خیال ہے کہ ولپول نے کہا ہے کہ ناول لکھنا ۔ خواہ برا ناول لکھنا ۔ اعصابی تشنج کے لئے مفید ہے اور پانچ چھ فل سکیپ صفحے لکھنے کے بعد آدمی ایک مطمئن ضمیر کے ساتھ سو سکتا ہے۔

میرا ان ناولسٹوں سے جھگڑا یہ ہے کہ اگر انھیں ناول لکھنا ہی تھے تو وہ مختلف قسم کے ناول لکھتے، انھوں نے وہی رومانی، سماجی اور جنسی زمین روندی ہے جو ہزار بار پہلے روندی جا چکی ہے۔ میں نہیں سمجھتا ایسا کرنے میں انھیں کیا لطف ملا ہوگا اور جب کسی چیز میں کوئی لطف نہ ہو تو آدمی اسے کیوں کرے۔ انہیں پٹے ہوئے ایک راستے سے ہٹ کر ادھر ادھر سبز جنگلوں میں بھٹکنا چاہیئے تھا جہاں وہ درختوں میں پرندوں کو کوکتے اور گلہریوں کو پھدکتے دیکھتے ..... اور اس میں بھی کوئی حرج نہ تھا اگر وہ اپنے کرداروں کو عام نارمل انسانوں کی طرح چلنے پھرنے دیتے۔ اور ان کے "ادبی" ہونے کی مریضانہ کوشش نہ کرتے۔ اگر تمہیں ایک کہانی کہنی ہے تو اسے سادگی سے صفائی سے اور قدرتی طریق سے کہو جیسا کہ بوڑھا میر امن کہتا ہے۔ اگر کہانی کے جاننے کے لائق ہے تو پڑھنے والے کو گرفت میں لے لے گی مگر اس میں شاعرانہ اخوانی ٹکڑے ٹانکنا، دور دراز کی تشبیہیں ڈھونڈ کر جڑنا اور فلسفیانہ موشگافیاں بگھارنا اسے ناقابل برداشت اور چھوٹا بنا دے گا۔

ذکاء الرحمٰن کے ناول کو بڑے دیدہ زیب ٹائپ میں چھاپا ہے اور مجھے اس کی جلد کافی پسند آئی۔ جلد کے اندر جو کچھ ہے وہ مبتدیانہ پلاٹ سازی ہے ۔۔۔ ایک ناقابل یقین کہانی، کردار سب الٹے سیدھے۔ اور کوئی فقرہ ایسا نہیں جس سے کھرے ہونے کی کھنک آئے۔ اس ناول کے متعلق ہر چیز جھوٹی ہے۔ میں نے اسے جھنجلاہٹ سے پڑھا اور ذکاء الرحمٰن کی پیٹھ خاصے کوسنے دیئے۔ مجھے امید ہے کہ اگلی بار وہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرے گا۔ اس ماحول کے بارے میں لکھے گا جس میں وہ پلا بڑھا ہے اور جسے وہ جانتا ہے اور اپنے بیان کو لفظی کرتب اور سستے جذبات سے بوجھل نہیں کرے گا۔ اس کی خواہش تو اتنی ہے لیکن اپنے نام کو سرورق پر دیکھ لینے کے بعد اسے اب ادبی شہرت پیدا کرنے کے لئے بیتابی سے کام نہ لینا چاہیئے، ابھی کافی دور چلنا ہے۔ اگر وہ حقیقی چیز لکھنا چاہتا ہے تو اسے اس فن کی ابجد ایک طالب علمانہ لگن سے سیکھنی ہوگی اور مغربی کلاسیکی اور جدید ناولوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ لکھنا اتنا آسان نہیں جتنا ہم سمجھتے ہیں بلکہ یہ ہے۔ جیسا کہ اسٹیونسن نے کہا ہے، یہ ایک ڈھلانی پہاڑی پر چڑھنے کی طرح ہے۔ بے حد صبر آزما اور مشقت طلب کام۔ اور لکھنے والے کے لئے اتنی کھونٹیں اور کھائیاں آتی ہیں جس میں اس کا اوندھے منہ گر پڑنے کا ہمیشہ خطرہ رہتا ہے۔

دوسری کتابوں کے متعلق میں کچھ نہیں کہوں گا۔ مگر چونکہ میں نے اسٹیونسن کا ذکر کیا ہے سو میں اس بڑے اور ناقابل تقلید کہانی لکھنے والے کی ایک ناول رومانس کے آغاز کے باب کا ترجمہ دینا چاہتا ہوں گا۔ اس نمونے سے کہانی لکھنے کے فن کے بارے میں بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے اور مجھے سارے انگریزی ادب میں اس باب سے بہتر کسی ناول کا آغاز نہیں ملا۔ کاش سماجی اور جنسی خرافات کے بجائے ہمارے نئے ناولسٹ ہمیں KIDNAPPED جیسے ناول دیں۔ ہمیں ہماری تازہ جنگلوں اور چمکیلی دھوپ کی ضرورت ہے اور قلبی روشنیوں کی۔ ہم ایسی کتابیں چاہتے ہیں جو پہلے فقرے سے ہمیں اپنے دام میں لے لیں۔ جن پر ہم ندیدے پن سے پڑیں جو ہمیں اپنے آپ سے بے خبر کر جائیں۔ حقیقتاً کوئی بھی ناول کی شکل میں ناپختہ فلسفہ، فرائڈی تحلیل نفسی یا اخلاقی و معاشی پند و نصائح نہیں چاہتا اور عزالدین لکھنے

والے کو یہ جاننے کے لئے کیے جاتے ہیں کہ مصنف کے سوشلزم، تمدنی اور سیاسی مسائل، جنسی محبت اور فن کے تقاضوں کے بارے میں کیا خیالات ہیں۔ لفظ کے میں ناول ہوتے ہی نہیں۔ الاّ جس کسی نے ایسے ناول اپنی پوری ذہانت اور طبیعت کی پُرانی کو بروئے کار لا کر لکھے اور گویا ان کے خیالات نے ایک وقت میں ا نسل کے طرز فکر اور اخلاقی نظریہ کو متاثر کیا۔ مگر وہ اب بطور ناول مر چکے ہیں جیسا کہ ممکن ہے وہ کچھ مدت اور فلسفیانہ یا سماجی رسائل کی حیثیت میں پڑھے جاتے ہیں مگر وہ ایسی کیونکہ ان کے لوگ عام لوگوں کی بجائے مخصوص رنگ کے ذہنی اور فکری اندازوں کے علامتی اجسام ہیں۔ بوڑھے میزمن کی چہار درویش یا سٹیونسن کی کڈنیپڈ، اس د زندہ رہیں گی اور ہمارے دلوں کو بھاتی رہیں گی جب کئی موسنے، نیچ وبنیچ اور بر کلاؤنی شاہکار کبھی کے بھلائے جا چکے ہوں گے۔

اور یہ ہے کڈنیپڈ کا پہلا باب:

کڈنیپڈ

پہلا باب

<u>میں شاز کی حویلی کو اپنے سفر پر روانہ ہوتا ہوں:</u>

میں اپنی قسمت آزمائیوں کی کہانی کا آغاز سلطنت کے بابرکت سال کے ماہ جون کی ایک خاص صبح سے کرتا ہوں جب میں نے آخری بار اپنے باپ کے میں سے چابی نکالی۔ میں سڑک پر تھوڑی دیر ہی چلا ہوں گا کہ سورج پہاڑیوں کی چوٹیوں پر چمکنے لگا اور میرے پادری کے مکان تک پہنچتے پہنچتے بلیک برڈ پرند کے بنفشی پھولوں میں سیٹیاں بجا رہے تھے اور کہرا، جو پو پھٹنے کے وقت وادی کے گرد اترا تھا، چھٹنا اور بکھرنا شروع ہو گیا تھا۔

مسٹر کیمبل، ایسنڈین کا پادری، باغ کے پھاٹک پر کھڑا میرے انتظار میں تھا۔ اچھا آدمی! اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کچھ کھایا ہے اور یہ سننے کے میں سب انتظام کر کے چلا ہوں، اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور اسے شفقت سے اپنے بازو کے نیچے دبا دیا۔

”اچھا ڈیوی لڑکے“ اس نے کہا ”میں تمہیں رستے پر لگانے کے لئے تمہارے ساتھ فورڈ تک چلوں گا

اور ہم خاموشی سے آگے چلنے لگے۔

”کیا تمہیں ایسنڈین چھوڑنے کا افسوس ہے؟“ اس نے تھوڑے وقفے کے بعد کہا۔

”جناب بات یہ ہے“ میں نے کہا ”کہ اگر میں یہ جانتا ہوتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور میرا کیا بنے گا، تو میں آپ کو صاف صاف بتا دیتا۔ ایسنڈین بلا اچھی جگہ ہے اور میں یہاں بڑا خوش رہا ہوں لیکن پھر یہ بات بھی تو ہے کہ میں اب تک کہیں اور نہیں گیا۔ چونکہ میرے باپ اور میری ماں دونوں مر چکے ہیں، میں ا ایسنڈین میں ان سے زیادہ نزدیک نہیں ہوں گا جتنا ہنگری کی سلطنت میں، اور سچ کہوں کہ اگر مجھے یہ پتہ ہوتا کہ جہاں میں جا رہا ہوں، وہاں مجھے اپنے حالات کرا موقع ملے گا تو میں عیش و مسرت سے جاتا۔

”ہاں؟“ مسٹر کیمبل نے کہا ”بہت اچھا ڈیوی لڑکے! اور اب یہ میرے لئے مناسب ہے کہ تمہیں تمہاری قسمت پر مطلع کر دوں۔ یعنی اس حد تک جتنا ہوں۔ جب تمہاری ماں اٹھ گئی اور تمہارا باپ وہ رحم دل، پارسا آدمی اپنی آخری بیماری میں مبتلا ہو گیا اس نے مجھے ایک خاص خط سونپا جس کے بارے میں ا کہ تمہاری وراثت ہے۔ جونہی“ اس نے کہا ”میں رخصت ہو جاؤں اور گھر صاف ہو چکے اور اسباب وغیرہ ٹھکانے لگ جائے (اور ڈیوی یہ سب کچھ ہو چکا ہے) اس خ لڑکے کے ہاتھ میں دے دو اور اسے شاز کی حویلی کی طرف روانہ کر دو جو کریمانڈ سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہی جگہ ہے“ اس نے کہا ”جہاں سے میں آیا تھا اور بھی ہے کہ میرا لڑکا وہیں لوٹ جائے۔ وہ ایک مستقل مزاج لڑکا ہے“ تمہارے باپ نے کہا ”اور ایک ہوشیار راہرو، مجھے یقین ہے کہ وہ سلامت رہے گا

خوب کہا، بہت خوب، مسٹر کیمبل نے جان و دل سے کہا "اور اب کام کی باتوں کی طرف آتے ہوئے، میں تمہارے لئے یہ پیکٹ لایا ہوں جس میں چار چیزیں ہیں" یہ کہتے ہوئے اس نے اسے بڑی دقت سے اپنے کوٹ کی حاشیہ کی جیب سے کھینچ کھانچ کر کچھ برآمد کیا۔ ان چار چیزوں میں سے پہلی چیز تو وہ ہے جس پر قانونی طور سے تمہارا حق ہے تھوڑی سی نقدی تمہارے باپ کی کتابوں اور فرنیچر کی فروخت کی جنھیں میں نے (اور میں نے یہ تمہیں پہلے ہی سمجھا دیا تھا) اس سے خرید لیا ہے کہ انھیں اگلے آنے والے استاد کو کچھ منافع پر بیچ دوں۔ باقی تینوں چھوٹی چھوٹی تحفیاں ہیں جنھیں اگر تم قبول کر لوگے تو مسز کیمبل اور مجھے ہمدگی بہلی ہوگی۔ پہلی جو گول ہے تمہیں پہلی ملازمت میں غالباً سب سے زیادہ خوش کرے گی لیکن ڈیوی لڑکے یہ سمندر میں ایک قطرے کے مصداق ہے۔ یہ بس ایک ہی تمہارے کام آئے گی اور صبح کی طرح شام کے دم میں اُڑ جائے گی۔ دوسری جو چپٹی شکل میں مربع ہے اور جس پر لکھا ہوا ہے، جو سڑک کے لئے ایک مضبوط لاٹھی کی طرح۔ اور بیماری میں تمہارے سر کے لئے ایک اچھے تکیے کی مانند زندگی بھر میں تمہارا آسرا ثابت ہوگی۔ اور اب آخری چیز یہ مکعب نما آخری چیز میری تمنا ہے کہ یہ تمہیں ایک بہتر سرزمین میں دیکھے گی

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا، اپنے ہیٹ کو اُتارا۔ وہ تھوڑی دیر اونچی آواز میں دعا پڑھتا رہا اور اس کے الفاظ ایک ایسے نوجوان کے لئے جو پہلی بار دنیا میں قدم رکھنے لگا تھا بڑے پُر رقت تھے۔ پھر اچانک اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اور مجھے اپنے سینے کے ساتھ لگا کر خوب زور سے بھینچا۔ پھر اس نے مجھے ایک بازو فاصلے پر الگ کر کے ٹکٹکی لگا کر مجھے اپنے چہرے سے دیکھتے ہوئے جس پر رنج و غم کی علامات ثبت تھیں اور پھر وہ گھڑے کی سی تیزی کے ساتھ گھوما اور رونے میں الوداع پکارتا ہوا اس راستے پر سے واپس چلنے لگا جس پر سے ہم آدھے دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ کسی دوسرے کے لئے شاید یہ منظر ہنسنے کی بات ہوتی لیکن میں ہنسی سے بہت دور تھا۔ میں اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جس وقت تک وہ نظر میں رہا اور اس نے اپنے پورے قدم نہ روکے اور نہ ہی ایک بار پلٹ کر دیکھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میرے جانے پر یہ اس کے رنج کا اظہار ہے اور میرے ضمیر نے مجھے سخت چوٹ کی کیونکہ میں دل ہی دل میں اس خاموش بستی سے باہر نکلنے اور شہر میں ایک امیر اور باعزت لوگوں کے درمیان بڑے معروف گھر کو جانے پر نہایت درجہ خوش تھا۔

ڈیوی ڈیوی! میں نے اپنے آپ سے کہا "کیا اتنی ناشکری بھی کبھی کسی نے کی ہوگی۔ تم ایک نام کی چمک کے لئے سب پچھلی شفقتوں اور پرانے دوستوں کو — یہ کتنی شرم کی بات ہے"

اور میں اس پتھر پر بیٹھ گیا جسے اُس اچھے آدمی نے ابھی ابھی خالی کیا تھا اور پارسل کو کھول لیا تاکہ دیکھوں کہ میرے تحفے کس قسم کے ہیں۔ وہ جسے اس نے مکعب اس کے بارے میں تو میرے دل میں شک نہ تھا۔ یقیناً یہ ایک خانے کے جزدان میں رکھنے کی ایک انجیل تھی۔ وہ جسے اس نے گول بتایا تھا شلنگ کا ایک سکہ تھا اور تیسرا، زندگی بھر صحت اور بیماری دونوں حالتوں میں میرا آسرا بننا تھا، کھردرے بھورے کاغذ کا پرزہ تھا جس پر سرخ سیاہی سے یہ لکھا ہوا تھا۔

وادی کے پانی کی گل سوسن بنانے کی ترکیب: وادی کے سوسن کے چند پھول لو اور انھیں ایک بوتل میں رکھ کر شراب ملاؤ اور جب ضرورت پڑے ایک چمچہ یا دو پی لو۔ اس سے بند زبان کے قوت سے جن کی طاقت گویائی جاتی رہی ہو، واپس بحال کر دیتا ہے۔ گنٹھیا میں اس کا استعمال مفید ہے۔ یہ دل کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے اور حافظہ کو قوی کرتی ہے۔ اور پھولوں کو ایک مرتبان میں ڈال کر اسے خوب بند کر دو اور اسے چیونٹیوں کی ایک پہاڑی میں پورا ایک مہینہ رکھو پھر اسے باہر نکالو اور تم ایک عرق پاؤ گے جو پھولوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اسے ایک چھوٹی بوتل میں رکھو۔ یہ ایک اچھی چیز ہے۔ خواہ اسے تندرستی میں استعمال کرے یا حالتِ بیماری میں۔ خواہ

اور پھر پادری کے اپنے ہاتھ سے یہ فقرہ بڑھایا گیا تھا۔

اسی طرح اگر موچ آجائے تو اس کی مالش کرو اور پیٹ کے درد کے لئے گھنٹے میں ایک چمچہ پینا ہر مرض دور کرتا ہے۔

اور یقیناً میں اس پر خوب ہی ہنسا لیکن میری ہنسی کچھ کپکپاتی ہوئی ہنسی تھی۔ اور میں نے خوشی سے اپنے بنڈل کو اپنی لاٹھی کے سرے پر لٹکایا۔

طرف کی پہاڑی کے ساتھ ساتھ روانہ ہوگیا۔ جب میں اس بڑی درزوں کی سڑک پر آنکلا جو سرخ ہیڈز میں سے پھیلی ہوئی جاتی ہے تو میں نے اینڈرین کے چھوٹے پادری کے مکان کے درختوں اور گرجے کی قبرستان میں، بڑے پہاڑی کوزن کو آخری بار نظر بھر کر دیکھا جہاں میرا باپ اور میری ماں سوئے پڑے تھے۔

ایک ناول کو کتنا دل لبھانے والا، اور گرفت میں لے لینے والا انداز بیان رکھتے ہیں آسانی سے اور دلچسپی سے پڑھی جانے والی تحریر مشکل سے لکھی جاتی ہے۔ اور اسکے بارے میں سب سے صحیح ہے، وہ ایک ایک فقرہ بے انداز کاوش اور محنت سے لکھتا تھا لیکن اسے پڑھتے ہوئے کبھی اس چیز کا احساس نہیں ہوتا۔ اسلوب کی سادگی کا اوج ہمیں اپنے ساتھ بہائے جاتا ہے اور کہانی کی دلکشی ہمیں نہ ہی صرف اپنی مٹھی میں لے لیتی ہے بلکہ ہمارے تخیل کو بھی دھکا دیتی ہے۔ اس کڈنیپڈ کے ایک بھی بناوٹی اور جھوٹا فقرہ نہیں۔

ہمارے اُمنگ رکھنے والے ناولسٹ اگر اویب اور فن بگھارنے کی بجائے سیدھے سادے اور صاف لہجے میں اپنی بات کہتے تو ان کے یہ ناول تر اور زیادہ پڑھنے کے لائق ہوتے۔

ہر کوئی اسٹیونسن نہیں بن سکتا۔ لیکن اگر میں اور ذکار الرحمٰن (اینڈ کمپنی) کبھی زندگی بھر میں اس سے آدھی کتاب بھی کر سکے جیسی کہ کڈنیپڈ ہے تو ہم خوش نصیب ہوں گے اور شادماں موت مر سکیں گے۔

محمد خالد اختر

الف (مجموعۂ کلام)

مصنف: رئیس امروہوی — ناشر: ادارہ ذہن جدید کراچی — قیمت ۳ روپے

رئیس امروہوی کو ابھی تک میں نے قطعہ کے زریم میں فٹ دیکھا تھا اور وہ قطعہ بھی ہنگامی اور اخباری۔ بایں ہمہ میں رئیس کی زود گوئی، قادر الکلامی، فنی ذہانت اور جدت اظہار کا ہمیشہ سے قائل تھا

"الف" کی اشاعت نے رئیس کو قطعہ کے زریم سے نکال کر کائنات سخن کے اُفق پر جلوہ گر کیا ہے۔ اب رئیس ایک آفاقی اقدار کا شاعر نظر آتا ہے میں نے کو فرصت کے لمحات میں پورے خلوص اور احتیاط سے پڑھا ہے۔ اس ضمن میں میں جو کچھ کہوں گا قاری کے اعتماد کو کسی قسم کی جانبداری کے اندھیرے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اس دور کی سب سے بڑی صداقت یہی ہے کہ مخاطب کو تصویر کا سچا رخ دکھا دیا جائے۔

الف کو آپ پورے انہماک اور لگاؤ کے ساتھ پڑھئے تو آپ یہ تاثر ضرور قائم کریں گے کہ رئیس بھی اس دور کے بعض دوسرے شعراء جوش، ندیم، فیض، فراق کی طرح نام رکھتے ہیں اور آئندہ اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام زندہ رہنے والا ہے۔ رئیس نے چودہ سال کی عمر سے شاعری کا آغاز کیا۔ اس مدت میں ان کا قلم بر نالہ سے دوران الملک اور عقل کے کرب سے وجدان کی خلش تک برابر ان میں بغیر تھکے ہوئے چلتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رئیس صاحب کے اپنے ایک بیان کے مطابق آج تک تین چھ ہزار قطعات ۔ تین سو غزلیں ۔۔ ایک ہزار نظمیں ۔۔ ایک سو چھ مثنویاں ۔ اور متعدد مرثیے، سہرے، رباعیات، نیز وغیرہ اسکے نظم میں ہیں۔ شاعر نے اتنا کچھ کہا ہو اس کا فن کس نہج پر ہوگا۔ یہ آپ خود اندازہ لگائیے۔

مجھے اس دور میں دو شخصیتیں ایسی نظر آتی ہیں جو بیک وقت غزل، نظم، قطعہ، مضامین اور دیگر اصناف سخن میں گراں قدر اضافہ کرتی کرتی چلی جا رہی ہیں۔ ان میں سے احمد ندیم قاسمی اور رئیس امروہوی اس منزل کی طرف قدم بہ قدم سرگرم ہیں۔

رئیس کی بسیار گوئی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ وہ اتنی تیزی سے لکھنے کے باوجود فکر کی گہرائی و گیرائی

اور چاہت زندگی اس کے قلم سے ٹپکتی ہے۔

الف کے دو حصے نمایاں ہیں: غزل .... اور .... نظم

غزل جیسی نیم وحشی صنف سخن (یہ ہر چند نیم وحشی صنف سخن نہیں جیسا کہ باسے میں آپ خوب جانتے ہیں کہ اس کا فراوانہ اچھے اچھوں سے قربہ کرالی ہے بڑے بڑے سورما اس کے سامنے سپر انداز ہوگئے ہیں۔ اس دو مصرعوں کے ہلکے پھلکے رابطے کی وسعت کو دائرہ تسخیر میں مقید کرنا ہر چند ناممکن ہے مگر اس دور میں کے بعد چند ایسے ذہن ابھرتے ہیں جنہوں نے نہ صرف تسخیر کی منزل کو پالیا ہے بلکہ اس میں نئی راہوں کا اضافہ بھی کیا ہے

رئیس کی الگ ادا ہے ہر چند اس کی بڑی خصوصیت فلسفیانہ سوچ اور نفسیاتی طرز احساس ہے اور رئیس کے قارئین اپنی عادت کے مطابق رئیس کو اسی کی روشنی میں دیکھتے ہیں مگر یہ رئیس کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ شاعری میں صرف فلسفہ و نفسیات ہی ایک شاعر کا طرۂ امتیاز نہیں ہو سکتا۔ ہمارے پاس سے "زمانہ" تک اور "رومی" سے "غالب" تک ایسی بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ یہ سارا کھیلا رئیس صاحب کے فلسفیانہ مضامین اور نفسیاتی تحریروں نے پیدا کر دیا "الف" میں یہ دونوں عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں اور اسی لئے میں اشعار بطور سند پیش نہیں کرتا لیکن رئیس کی دوسری خصوصیات جو ان کی تصویر میں رنگ بھرتی ہیں اور ان کی شخصیت میں ایک جاذبیت اور کشش پیدا کرتی ہیں سامنے لانا ضروری ہیں۔

"الف" کا مطالعہ یہ بات روشن کر دیتا ہے کہ رئیس کی غزل اس دور کا پورا پورا شعور رکھتی ہے جس میں روایت کی چاشنی بھی ہے، حال کی معنوی اور مستقبل کی جھلک بھی۔ یوں کہئے کہ رئیس نے "روح عصر" کو اپنی غزل میں بکمال حسن سمو لیا ہے۔

رئیس کے کلام میں جو سب سے زیادہ منفرد چیز مجھے نظر آئی ہے وہ "خوف کا عنصر" ہے۔ یہی خوف جب کالرج کی شاعری میں نمایاں ہوا تو اسے مارا دیا گیا۔ انگریزی ادب میں یہی "ازم" کالرج کی حیات کا باعث ہے ورنہ آج کالرج کا کوئی نام لیوا نہ ہوتا۔

اردو ادب میں خوف کا یہ عنصر شاعروں کے ہاں "خال خال" نظر آتا ہے۔ خدا جانے رئیس کے ہاں یہ جذبہ شعوری ہے یا لاشعوری مگر اتنا نمایاں ہو گیا ہے کہ اردو ادب میں ایک مستقل قدر بنتا معلوم ہوتا ہے۔ اگر کالرج اور رئیس کی مارائیت کا موازنہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوگی کہ کالرج نے خوف کی جو فضا بنائی وہ تصوراتی ہے اور بیان کی حد تک محدود ہے مگر رئیس نے طرف کے نفسیات کی مدد سے کچھ ایسے دائرے بنے ہیں کہ قاری اپنے آپ کو ان دائروں میں محبوس پاتا ہے۔

اردو غزل یا نظم میں اگر ماورائیت کی کوئی قدر معین ہوتی ہے تو رئیس پہلا اور منفرد شاعر ہے جسے اس قدر کی علمبرداری کا اعزاز حاصل ہوگا بطور مثال اور پر چند شعر لکھتا ہوں:

یہ فقط شورش ہوا تو نہیں   کوئی مجھ کو پکارتا تو نہیں

میں تنہا جا رہا ہوں سوئے منزل   یہ پرچھائیں کہاں سے آ رہی ہے
یہ شام اور روشنی کی یہ قطاریں   اداسی اور گہری ہو گئی ہے
عروج ماہ ہے اور مقبروں پر   ابد کی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے
گرا ہے شاخ گل سے ایک پتہ   کسی نے کیا مجھے آواز دی ہے

بھوت ہیں کہ مجھے ڈراتے ہیں   میری نا آزردہ تخیلات

کون آیا مرے تعاقب میں — دبی کار رتیاں کے جلوے
دفعتاً کس نے قہقہہ مارا — یہ اندھیرے میں کون گھیرے گا

دیوار پہ دائرے ہیں کیسے — یہ کون ہے کس سے ڈر رہا ہوں

پیڑوں کے گھنے مہیب سائے — یہ کون ہے مجھ پہ حملہ آور

پتوں میں جھپک رہی ہیں آنکھیں — شاخوں پہ چمک رہے ہیں خنجر

اک موت سے ہوتی ہے ملاقات سرِ شام — اک روح ڈراتی ہے مجھے آخرِ شب میں

"غم" ایک ابدی قدر ہے۔ اس کی کیفیت ہمہ گیر ہے۔ شاعری میں غم کی روایت کے دو راستے ہیں: "غمِ جاناں اور غمِ دوراں"۔ رئیس کا غم ان دونوں راستوں کے علاوہ ایک تیسرے راستے پر بھی گامزن نظر آتا ہے اور یہ تیسرا راستہ کرب کی کیفیت اختیار کرتے ہوئے عقل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔ وہ جو عقل و خرد سے جسم و جاں تک سرایت کر جاتا ہو، اس کی شدت محسوس کر لینا بجلی کے ننگے تاروں کو چھو لینے کے مترادف ہے۔ رئیس نے اپنے کرب کا اظہار [illegible] سے کیا ہے:

ذہن پر ایک گہری سی لکیر — کنکھجورے کا راستہ تو نہیں

شگفتگی کو تڑپا کے افسردگی پائی — مسرتوں کو ہنسا کے ٹپک پڑے آنسو

چیونٹیاں جیسے ذہن پر رینگیں — اُف یہ میرے لطیف احساسات

سپردِ فریبِ ملال بخشی بے خبری — خود آگہی کے جہنم میں جل رہا ہوں میں

شاید اسے عشق بھی نہ سمجھے — جس کرب میں عقل مبتلا ہے

مری تخلیق نغمے سے ہوئی ہو — مگر فریاد ہو کر رہ گیا ہوں

عقل کو زخم ہے بہت کاری

غم اور کرب جب سوچ کے سانچے میں ڈھلتے ہیں تو تخلیق کے جوہر نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ غم ہر چند کہ جاں گسل ہوتا ہے مگر شاعر کے لئے یہ زہر کام کرتا ہے۔

گھر سے سمندروں میں سفر کرنے والا رئیس جہاں نو کی تلاش میں سمندرِ اعظم و نیوزا سے اس خرابے میں آیا ہے۔ وہ ہر حادثے کے ساتھ کائنات دیگر کی تخلیق پہ سوچتا ہے۔ ترقی پسند شعرا نے ایک نئے بشر کی بشارت دی۔ حضرت جوش ملیح آبادی سے جب نئے بشر کی تعریف معلوم کی گئی تو انھوں نے اسے بہ صفت موصوف بتایا جب اُن سے سوال کیا گیا کہ اگر انسان کے اعداد و شمار یونہی بڑھتے رہے تو دنیا تنگ ہو کر رہ جائے گی اور پھر غذا کا مسئلہ یوں پیدا ہو گا کہ اس کے اگانے کے لئے جگہ نہ مل سکے گی تو حضرت جوش نے بڑے اعتماد سے فرمایا کہ نیا انسان ہواؤں میں غلہ اگائے گا۔ سائنس کی روز افزوں ترقی نے یہ بات کچھ بعید نہیں ہے کہ وہ ہواؤں میں وہ کیمیاوی عناصر پیدا کرلے کہ جوش صاحب کے بیان کی تصدیق ہو جائے۔ رئیس کے ہاں بھی تخلیق اور تلاش کا یہ کرب "مغرب زدہ" کا روپ دھارتا ہے اور اس کا بیان کچھ اس انداز میں ملتا ہے ؎

جو نئی تخلیق کی دنیا ابھی منزل میں ہے اس کا کرب آفرینش بھی ہمارے دل میں ہے

رئیس صاحب اس گفتگو کے دوران نئے آدمی کی بڑی بڑی توجیہات پیش کرتے ہیں۔ یہ فیصلہ مستقبل میں ہو گا کہ ان شعرا کی فکر کہاں تک صحیح ثابت ہوتی ہے

انسان بنیادی طور پر اپنی ذات کے متعلق بہت کچھ سوچتا ہے۔ یہ سوچ کبھی کبھی اسے بے خبری کے صحرا میں گم کر دیتی ہے کبھی کبھی جنون کی کیفیت اختیار کر جاتی ہے کبھی وہ اپنی ذات میں گم ہو جاتا ہے اور کبھی آفاق اس کی ذات میں گم!

میں اپنی سعیِ طلب کی تلاش میں گم ہوں یہ وہ مقامِ نظر ہے جہاں خرد نہ جنوں

اپنے کو تلاش کر رہا ہوں میں اپنی طلب سے ڈر رہا ہوں

میں خود اپنی ہی خاکسترِ جاں میں مدفون جس طرح دفن خرابہ میں کوئی سرمایہ

کائنات میں گم ہو کر رئیس کہتا ہے ؎

یہ معجزہ کہ ہر اک عہد کی ہوئی تکمیل یہ سانحہ کہ ہر اک داستاں ادھوری ہے

خوشا یہ خاک کہ اس خاک پہ عروجِ حیات خدا کے ساتھ نہیں آدمی کے ساتھ آئی

رئیس کی تازہ دلکلامی کے چند اور نمونے ملاحظہ فرمایئے!

یوں لگا جیسے کہ بل کھا کے دھنک ٹوٹ گئی اس نے دفعتہ جو لیا تازہ انگڑائی میں

اک شخص سے ہم کلام ہو کر ہر شخص سے پیار کر رہا ہوں

میں اور شکایتِ زمانہ اک شخص کا ذکر چھڑ گیا ہے

دل جو لرزاں ہے شاخِ گل کی طرح دفعتاً کون کر گیا ہے دانہ

جس پہ الزام تھا پاکیزگیِ دامن کا اس حسینہ کو نجھدار تو نہ ساحل پایا

نے کا موقع نہیں ——— شاید اس لئے کہ یہ ایک غیر مطبوعہ قلمی تھا ——— یہاں تک کہ کتاب قریب قریب نایاب ہوگئی مجلس شاہ حسین نے اسے
دفعہ پھر زندہ کر دیا ہے۔ انیشل جینتا کو تنگ کرنے کے لئے کیونکہ کتاب انگریزی کی بجائے پنجابی میں ہے! اب اسے کون پڑھے گا؟ لیکن مجلس والے بھی مصر ہیں
اس موضوع پر جب بھی تحقیقی کام ہوا بنیادی اسی کو بنانا ہوگا اور وہ نہیں چاہتے کہ بنیاد مٹ جائے۔ کتاب "آئینہ ادب" کے تعاون سے چھپی ہے اور اس کی گٹ اپ
سے کردہ ادارے کا روایتی سلیقہ جھلکتا ہے۔ کاغذ سفید ہے اور ضخامت ۲۰۴ صفحات۔

کافیاں شاہ حسین (پنجابی): بقول ڈاکٹر موہن سنگھ شاہ حسین نے بزبان شعر جو کچھ بھی کہا اس میں سے باقی صرف کافیاں بزبان پنجابی ہی رہ گئیں ہیں جن کی
تعداد دوسروں سے الگ الگ بتائی ہے۔ کافیاں مختصر حالت میں تھیں انہیں یکجا کرکے چھاپنے کا کام قیام پاکستان سے پہلے ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے کیا۔ یہ اس ضمن میں پہلی
اتنی قدر کوشش تھی، ایک تو کتاب پرانے طرز پر چھپی، دوسرے اس میں املا کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد چند ایک تدریسی اداروں کی طرف
کافیوں کو نئے سرے سے چھاپنے کا اہتمام تو ضرور ہوا لیکن مقصد پیش نظر تعلیم بالغان کی پہلی سیڑھی مہیا کرنا تھا کیونکہ حسن اتفاق سے کافیاں فاضل پنجابی کے کورس میں
شامل کر لی گئی تھیں۔ اس لئے یہاں بھی کافیوں کی ترتیب، املا اور صحیح تعداد کے تعین کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ ادھر موہن سنگھ والا نسخہ بھی نایاب ہو چلا تھا۔ چنانچہ مجلس
شاہ حسین کو کافیاں دوبارہ چھاپنے اور ایک دفعہ پھر غیر مفید کام کرنے کا جواز مل گیا۔ موہن سنگھ کے نسخے میں مزید دو کافیوں کا اضافہ شاہ حسین کے کلام میں ایک نئے رجحان
کی نشان دہی کرتا ہے جو اب تک نظروں سے پوشیدہ تھا۔ مقام حیرت ہے کہ ان دو کافیوں کا ماخذ بھی موہن سنگھ ہی کی کتاب "پنجابی دی تاریخ" ہے۔ اس کتاب کے
پڑھنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاہ حسین کا کلام بطریق احسن محفوظ ہو گیا ہے۔ کتاب دبیز کاغذ پر ٹائپ میں چھپی ہے سرورق حقیقت رکھنے کا عطیہ ہے۔ قیمت درج
نہیں۔ غالباً مجلس کے پیش نظر اس پہلو کی اہمیت کم تھی۔

کافیاں شاہ حسین (انگریزی): انگریزی (انیشل جینتا) ہوشیار باش! اور بعض شاعروں کی محفل میں جانے کا اتفاق ہو یا امریکہ، برطانیہ یا کسی اور
ملک سے کوئی ادیب شہر میں وارد ہو تو موضوع گفتگو اس قسم کا ہی ہوتا ہے کہ فلاں صاحب کی نظم فلاں زبان میں، فلاں صاحب کا افسانہ فلاں زبان میں ترجمہ ہو چکا
ہے۔ غیر ممالک میں کھپت کے خیال سے لاہور ہی میں ایک دو اداروں نے ملکی تخلیقات کو انگریزی میں ڈھالنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس کاروبار میں بعض اوقات
اس قسم کی مصلحتوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ شاہ حسین کے کلام کو انگریزی نظم میں ترجمہ شائع کرنے کی مصلحت بجز اس کے کوئی نظر نہیں آتی کہ غلام یعقوب انور
یہ ترجمہ کرنے کی حرکت سرزد ہو گئی ——— آپ سوچئے تو! پنجابی شاعر کا انگریزی میں ترجمہ!! ——— انور کے تراجم گلڈ کی طرف سے انگریزی میں چھپنے والی پاکستانی
ادب کے مجموعہ میں شامل تھے اور غالباً اسی غرض سے انہوں نے پنجابی شعرا کو بھی انگریزی نظم میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک
کڑی ہے جسے مجلس شاہ حسین نے اپنے اشاعتی پروگرام کی ایک شق کے طور پر اچانک منتخب کر لیا۔ اچانک کا لفظ میں نے دانستہ استعمال کیا ہے۔ وہ اس لئے
کہ انہوں نے جو کافیاں پنجابی میں چھاپی ہیں اور ان کی اور غلام یعقوب انور کے ترجمے کی نمبروار ترتیب ایک نہیں البتہ انگریزی نسخے میں ہر کافی کے نیچے پنجابی لکھنے کا
اہتمام کیا گیا ہے لیکن اس اچانک کا اثر یہیں تک محدود رہا۔ طباعت اور گٹ اپ کی خوبصورتی تو مجلس کے سر الزام تھوپ رہی ہے کہ کتاب کو بڑے اہتمام اور
سلیقے سے چھاپا گیا ہے۔

"پنجابی ادب" کا شاہ حسین نمبر: چار کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مجلس اور "پنجابی ادب" نے مشترکہ مساعی سے شاہ حسین کی زندگی اور
کلام کے بارے میں کم و بیش دو سو صفحات بھی پیش کر دیئے ہیں۔ "پنجابی ادب" ایک عرصہ سے زبان و ادب کی خدمت کر رہا ہے لیکن غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ
اتنا ضخیم نمبر اور وہ بھی صرف ایک شاعر کے بارے میں پیش کیا گیا ہے۔ شاید یہ دعویٰ بھی بے جا نہ ہوگا کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار کسی پنجابی رسالے
نے ایک شاعر کے لئے اپنا پورا شمارہ وقف کر دیا اور شمارہ بھی عام شماروں سے پانچ گنا ہے۔ اس شمارہ میں محمد آصف خان نے شاہ حسین کے حالات